ماہنامہ

فاران

کراچی

ایڈیٹر:- ماہر القادری

جلد ۱۷ | جنوری ۱۹۶۵ء | شمارہ ۱۰

ترتیب

مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

چندہ سالانہ:- سات روپے | پبلشر:- مسرور حسین | قیمت فی پرچہ:- باسٹھ ۶۲ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

جمہوریت اور سیاست کا اصول یہ ہے کہ پہلے جماعتیں اور پارٹیاں وجود میں آتی ہیں، وہ تھوڑی بہت مدت تک ملک و قوم کی خد
انجام دے کر عوام کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں، اس کے بعد عوامی طاقت کے سہارے ملک کے نظم و نسق کی باگ ڈور سنبھالتی ہیں اور حکومت
اقتدار اُن کے قبضہ میں آ جاتا ہے ——— مگر پاکستان میں یہ گنگا الٹی بہائی گئی ہے، یہاں اس ترتیب کو اُلٹ دیا گیا ہے ——— یہ تم کی پ
اور ہمدردی و مقبولیت کے ذریعہ نہیں بلکہ فوجی طاقت کے سہارے اقتدار حاصل کیا گیا، پھر اقتدار کے ایما پر ایک جماعت وجود میں آئی، جس
"کونشن مسلم لیگ" رکھا گیا، اس پارٹی کا اب تک اس کے علاوہ اور کوئی کارنامہ عوام کے سامنے نہیں آیا کہ ہر مسئلہ اور معاملہ میں حکومت وا قتد
کرے، اُن کی ہاں میں ہاں ملائے اور حکومت کی بڑی سے بڑی بے عنوانی اور زیادتی پر بھی کونشن کے رہنماؤں کی زبانوں سے لبیک اور سمعنا و
کی صدائیں بلند ہوں؛ صوبائی اسمبلیوں اور مرکزی پارلیمنٹ میں کونشن مسلم لیگ کے ارکان و وابستگان اور نمائندوں کا جو کردار رہا ہے و
سامنے ہے، ایسے ایسے قابلِ اعتراض قوانین جو جمہوریت کے بنیادی اصولوں سے ٹکراتے ہیں اور کتاب و سنّت کے منشا اور مزاج اور دین کی
خلاف ہیں، اُن تک کی تائید ان "کونشنیوں" نے کی ہے!

یہ واقعہ نہ تو کوئی راز ہے اور نہ اس میں مبالغہ کی ایسی کوئی بات ہے جو محض زیب داستان کے لئے بڑھا دی جاتی ہے، پاکستان کے
کے شاہد ہیں کہ اسمبلیوں کے انتخابات میں جو لوگ کونشن لیگ کے نمائندوں کی حیثیت سے منتخب ہوئے ہیں، ان میں کتنے ایسے سرمایہ دار ہیں جنہوں نے
کھلے خزانے خریدا ہے اور اس طرح ملک کے معاشرے کو لالچی، بددیانت اور ضمیر فروش بنانے کی کوشش کی ہے! اس انتخاب کے بعد دوسرا مرحلہ پچھلا
بنیادی جمہوریت کے الیکشن کا گزر چکا ہے، ان انتخابات میں بوگس ووٹنگ کا جو شرمناک کاروبار ہوا ہے، جائز ووٹروں کو جن میں شریف عورتیں بھی
جس جس طرح پریشان اور بے عزت کیا گیا ہے، حزبِ اختلاف کے کارکنوں پر کھلے بندوں حملے ہوئے ہیں، جن میں لاٹھی، پتھر اور چاقو آزادی کے س
کئے گئے ہیں، اس غنڈہ گردی نے کونشن لیگ کے لئے عوام میں عزت و محبت کا اگر کہیں کوئی مقام باقی رہنے بھی دیا ہے تو اس کا حال برسات میں
دیوار جیسا ہے، عوام نے اس طوفان بدتمیزی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس لئے بڑے آدمیوں کے نیم سرکاری بیانات پڑھ کر عوام اپنی آنکھوں کو
جھٹلا سکتے!

یہ بالکل سامنے کی بات اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی سماجی پروگرام، دینی مقصد اور قومی و سیاسی نصب العین کے تحت کونشن لیگ
نہیں آئی، یہ حکومت و اقتدار کے ایما پر قائم ہوئی ہے، اس لئے منطقی، قدرتی بلکہ نفسیاتی طور پر اس کے ارکان کی ذاتی غرض، مالی منفعت اور مادی
کے بغیر حکومت کا ساتھ نہیں دے سکتے! اس پارٹی کے ارکان کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں سے نہ جانے کتنے لوگ کاروباری پرمٹوں، تجارتی لا

نفعت کے دوسرے ذرائع میں ملوث پائے جائیں گے! ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہ بعض سرمایہ دار حکومت کی خوشنودی کے لئے تواضع کرتے رہتے ہیں! سے بنیادی جمہوریت کے اس انتخاب میں کسوں نے اپنی جیبیں بھری ہیں اور وہ انتخابات میں ہار کر بھی مالی اعتبار سے جیت میں رہے ہیں۔

ایسے اغراض کے بندے اور مرغانِ بادنما جس حکومت کے حامی، مددگار، مؤید اور پشت پناہی کرنے والے ہوں اس حکومت کو کسی معجزہ کے ذریعہ ہی میسر آسکتا ہے! اس کردار و ذہنیت کے افراد پر جہاں کہیں، جو کوئی بھی حکومت بھروسہ کرے گی، اُسے پچھتانا پڑے گا! جہاں ذاتی اغراض ہوں کسی محسن کی خاطر ایثار و قربانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے کردار و ضمیر کی قیمت وصول کی ہے۔

یہ صحافت !!

اخبارات ملک وقوم کے ذہن و فکر کی تربیت کرتے ہیں۔ اُن سے لوگ بہت کچھ سیکھتے ہیں اور اُن کی رائے کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا ہے! مگر جب سے حکومت نے پریس آرڈی نینس نافذ کیا ہے اور پریس ٹرسٹ قائم کرکے بعض اخبارات کو اپنی تحویل میں لیا ہے وقت سے عوام کا اعتماد اخباروں پر سے اٹھ گیا ہے۔ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں یہ ہمارا اپنا ظن، رائے اور قیاس نہیں ہے بلکہ بعض اخبارات نے حقیقت کا اعتراف بلکہ انکشاف کیا ہے! یہ کتنے دکھ اور شرم کی بات ہے، خاص طور سے ملک کے اہل قلم اور دانشوروں کے لئے تو یہ صورت حال بہت المیہ ہے! پاکستان کی صحافت کو پست اور نامعتبر بنانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، حکومت پر، عوام پر یا اخبارات پر! یہ کتنی بڑی بے دلی میں آئی ہے، یہ کس قدر الم ناک بے تدبیری ہے جس سے صحافت کو دوچار ہونا پڑا ہے۔

آپ ہی اپنے ذرا لطف و کرم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

ب و لہجہ !

"متحدہ حزب اختلاف شیطانی طاقتوں کی ٹولی ہے"

"حیدرآباد میں انتخابی ادارہ کے ممبروں سے صدر ایوب کا خطاب" (روزنامہ جنگ کراچی ۵ دسمبر ۶۴ء)

جو لوگ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی جگہ محترمہ فاطمہ جناح کو صدر بنانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ صدر محترم کو "شیطان" نظر آنے لگے تو دکھائی دیے گئے۔ پاکستان کی سب سے بڑی اونچی کرسی پر بیٹھ کر، اس سے اتنا اور کسی دوسرے کے لئے کرسی چھوڑ دینا، جیسے کھیلنے کس طرح گوارا کب حزب اختلاف نے یہ جرأت کس طرح ہوئی، خوفناک انقلاب کی دھمکی سننے کے بعد بھی ان سر پھروں کی ہمتیں پست نہیں ہوئیں اور ان کے جذبات نہیں پڑے! خیر . . . . . اگر . . . . . . مگر!

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

یہ ایک نمونہ تھا "نطق ہمایونی" کا! ۷ دسمبر کا روزنامہ "حریت" (کراچی) ہمارے سامنے ہے، اس کے پہلے ہی صفحہ پر یہ عبارت نظر سے گزری:

"شہداد پور۔ ۴ دسمبر! (حریت نیوز سروس) صدر ایوب نے آج یہاں انتخابی ادارہ کے منتخب اراکین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مودودی پاکستان کے نظریہ کے خلاف تھے، اور قائداعظم کی مخالفت کیا کرتے تھے، لیکن جب پاکستان بنا، تو پٹھان کوٹ سے بھاگنے والوں میں سب سے پہلے مولانا مودودی بھاگے جو اپنے جوتے بھی چھوڑ آئے انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی منافقانہ باتیں کرتے ہیں، **اگر وہ کسی دوسرے ملک میں ہوتے تو ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے!**

صدر ایوب نے کہا جب کشمیر میں جنگ جاری تھی تو اُس وقت مولانا مودودی نے کہا تھا کہ یہ جہاد نہیں ہے اور جو آدمی بھی اس جنگ میں مارا جائے گا وہ کتے کی موت مارا جائے گا ۔ . . . . .

ہم جیسے ٹٹ پونجیوں کی کیا مجال جو اس شریفانہ لب و لہجہ اور خسروانہ اندازِ بیان پر نقد و تبصرہ کی جرأت کر سکیں، کیا ہمیں اپنی زندگی کا چین آرام عزیز نہیں ہے ! واقعی پاکستان کے عوام بڑے بزدل ، نا سمجھ، کودن و غبی اور بے غیرت واقع ہوئے ہیں کہ مولانا مودودی کو زندہ چھوڑ رکھا ہے۔ پارسال جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں جب مولانا مودودی تقریر کر رہے تھے، اُس وقت چند غیرت مندوں نے البتہ لپک کر اپنی غیرت اور فراست کا ثبوت دیا تھا، مگر . . . . ! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ !

پاکستان کے محترم صدر کی اس باخبری کے قربان جائیے کہ مولانا مودودی کے بارے میں اتنی جزئیات تک کا انہیں پتہ ہے کہ پٹھان کوٹ کی آبادی میں جس شخص نے سب سے پہلے راہِ فرار اختیار کی وہ مودودی تھا اور وہ جوتے چھوڑ کر ننگے پاؤں وہاں سے بھاگ چھوٹا ! کاش ! اس کا بھی انکشاف فرما جاتا کہ مودودی صاحب کے چھوڑے ہوئے جوتے کس ہندو یا سکھ کو پہننے کو ملے ! ہو سکتا ہے کہ بھارت کی حکومت نے مولانا مودودی کے جوتے تبرک سمجھ کر نیلام کر دئے ہوں ! حسب گفتنو ہو یہ رنگ ہو کہ مولانا مودودی کی ڈاڑھی اور جرنیل کا ۔ بات پہونچ جائے تو کوئی کیسے بھی تو کیا کہے

؎ مگر آں کہ از غیبم دو نو دست گاہ داری

پاکستان کی مخالفت اور کشمیر کے بارے میں جن الزامات کا مولانا مودودی کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے یہ سب چھپے ہوئے کارتوس ہیں ان الزامات کی اتنی بار پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ تردید کی جا چکی ہے کہ ایسی باتیں سُن کر عوام و خواص سب کی ہنسی نکل جاتی ہے ! جن اشخاص نے محترم صدر کے کانوں تک یہ باتیں پہونچائی ہیں، اُن سے صدر صاحب کو ثبوت طلب کرنا چاہیے، اگر وہ ثبوت دے دیں تو مودودی واقعی ملامت کے نہیں . . . ناک سزا کے مستحق ہیں اور اگر ثبوت نہ دے سکیں تو پھر ایسے غلط گو مخبر اور داستان گو سزا وار احتساب ہیں ۔

اختلاف و عناد

متحدہ محاذ نے جب محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتِ حکومتِ پاکستان کی امیدواری کے لئے منتخب کیا ہے اس وقت مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے اکابر جیلوں میں تھے ! جماعتِ اسلامی کے جو نمائندے متحدہ محاذ کے مشاورتی جلسوں میں شریک تھے وہ محاذ کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ محترمہ کی کوٹھی پر اجازت و رضامندی حاصل کرنے اور مبارکباد دینے کے لئے نہیں گئے ! اُن کے سامنے سیاست اور جمہوریت کے تقاضوں سے بڑھ کر اسلام کی تعلیمات اور دینی اصولوں کی حفاظت و سر بلندی کا سوال تھا ، عورت کی امارت کے معاملے میں امیر جماعت مولانا مودودی کی برسوں پہلے کی تحریر بھی اُن کے سامنے تھی جس میں بے تکلف عورت کو سیاسی میدان میں لانے اور امیر و حاکم بنانے کی شدت سے مخالفت کی گئی ہے ! اور ان سب سے بالاتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک تھا ! جماعتِ اسلامی کے نمائندوں نے اس کی پروا نہیں کی کہ عوام اُن کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے ، متحدہ محاذ والے پہلے ہی قدم پر اُن کی روش سے برہم ہو جائیں گے یا خود محترمہ فاطمہ جناح جماعتِ اسلامی کے نمائندوں کو مبارکباد دینے والوں کی صف میں نہ پاکر برا اثر قبول کریں گی ! وہ اہل علم اور اصحاب فکر سے اس مسئلہ میں مشورہ اور گفتگو کرتے رہے ، وہ واقعی دھندلکے میں تھے جہاں جھٹ پٹا سا تھا ، کچھ اُجالا ، کچھ اندھیرا ! حقیقت یہ ہے کہ اسی دوران میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ اور علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ کی تحریر انہیں مل گئی جس نے اس دھندلکے کو روشنی دی اور بروقت رہنمائی کی ، پھر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور دوسرے علماء اور اصحابِ فکر سے مشورہ کیا ، اسلا

اور فقہ کے ماہرین و اکابر علماء کی اس مسئلہ میں بحث و گفتگو اور احکام و آراء دیکھے! جب انہیں پوری طرح اطمینان اور انشراح صدر ہو گیا بت و اسلام اور ملک و ملت کی بہتری کے لئے ان غیر معمولی حالات میں محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت گوارا کی جا سکتی ہے، تو جماعت اسلامی نے اپنے اعلان کر دیا! اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جیل سے رہا ہو کر جماعت کے اس فیصلہ کی توثیق کر دی!

جماعت اسلامی کا آج بھی یہی مسلک اور عقیدہ ہے کہ غیر محرم مرد و زن کا اختلاط اخلاق کے لئے موجب فساد ہے، عورت کی کارگاہِ عمل پنا گھر ہے اور پردہ عورت کی عصمت و عفت کا محافظ ہے، عورت کی امارت و حاکمیت کو دین میں پسند نہیں کیا گیا! محترمہ فاطمہ جناح کی ۔ کا موقف ناگزیر صورتِ حال اور غیر معمولی حالات میں گوارا کیا گیا ہے "اہون البلیتین" کے تحت! دو شخصیتوں میں سے ایک کو منتخب کرنے ملہ ہے ایک طرف مرد ہے جس کے دورِ حکومت کا تجربہ ہو چکا ہے کہ اس نے نہ کسی منکر کو مٹایا اور نہ کسی معروف کو قائم کیا بلکہ اُس کے زمانے میں اخلاق و قانون اور دینی روایات کو چوٹیں اور جراحتیں میسر آئی ہیں، دوسری طرف ایک عورت ہے جو جمہوریت کی بحالی اور اسلامی قانون کے وعدہ کرتی ہے! اور اس کے میدانِ عمل میں آتے ہی مُلک میں آزادی کی لہر دوڑ گئی ہے! محترمہ موصوفہ نے جب سے یہ کہا ہے کہ میں پاکستان ب پر پابندی لگا دوں گی، لوگ پوچھنے لگے ہیں کہ گھوڑ دوڑ کی شرط اور کلب گھروں کی قمار بازی کا کیا حشر ہو گا؟ لوگوں کی عام گفتگو میں کسی حد تک اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے اور لوگ اس انداز پر سوچنے لگے ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح کے دورِ صدارت میں جمہوریت کی بحالی کے ساتھ دین کی قدریں اُبھر کر۔۔۔۔

بجا کے بن جائیں گی اوراقِ حکومت پہ شکن

اس مسئلہ میں بعض دوسرے علماء اور اربابِ فکر بھی وہی رائے رکھتے ہیں جس کا اعلان جماعتِ اسلامی نے کیا ہے، آج ۳۰ دسمبر کا روزنامہ راقم الحروف کے سامنے ہے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک بیان شائع ہوا ہے:۔۔۔۔

"۸ دسمبر۔ مولانا مفتی محمد شفیع نے صدارتی انتخاب کے سلسلہ میں اپنے فتویٰ کے ضمن میں کہا ہے کہ ملتان شہر سے ایک خط میں مجھ سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا وزارتوں، سفارتوں، عدالتوں میں عورت کی تقرری اسلامی نقطۂ نگاہ سے عین اسلامی ہے؟ کیا اسلامی حکومت کا قاضی القضاۃ غیر مسلم ہو سکتا ہے؟ اگر ان باتوں کا جواب نفی میں ہے تو حقیقت پسندی اور دور اندیشی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے محترمہ فاطمہ جناح کی نامزدگی کو غیر اسلامی کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اس کے جواب میں میرے (یعنی مفتی محمد شفیع صاحب کے) یہ الفاظ تھے:۔۔۔

"بحالات مندرجہ سوال اُمیدوار عورت کی حمایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں"

جس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دو امیدواروں میں سے جب کوئی بھی شرعی شرائط پر پورا نہیں اترتا تو ایسے مواقع پر فقہاء کے اس مسلمہ ضابطہ پر عمل ہونا چاہئے، جو یہ ہے کہ جب آدمی دو بلاؤں میں مبتلا ہو جائے تو اس پہلو کو اختیار کر لینا چاہئے جسے ہلکا سمجھے یہ معاملہ فتویٰ کا نہیں بصیرت و تجربہ کا ہے، جس کو کوئی شخص اپنی بصیرت و تجربہ سے نیک نیتی کے ساتھ ملک و ملت کے لئے دوسرے کی نسبت غنیمت سمجھے اُس کو ووٹ دے سکتا ہے۔"

اسی اخبار میں مشرقی پاکستان کے علماء کی اپیل شائع ہوئی ہے:۔۔۔۔

"ڈھاکہ ۸ دسمبر۔ آج علماء کانفرنس نے جو صوبہ کے بارہ مذہبی رہنماؤں نے طلب کی تھی، انتخابی ادارہ کے ارکان

سے کہا ہے کہ وہ صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ دیں، کانفرنس نے ایک قرارداد میں کہا ہے کہ مکمل
جمہوریت اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے موجودہ حکومت کو تبدیل کیا جانا چاہئے، علماء نے خاندانی منصوبہ بندی
کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا، رویت ہلال کمیٹیاں قائم کرنے پر حکومت کے خلاف نکتہ چینی کی اور اسلامی
مشاورتی کونسل کی نئی تشکیل پر زور دیا مولانا اطہر علی نے اپنے صدارتی خطبے میں انتخابی ادارہ کے ارکان سے
کہا کہ **وہ اسلام کی خاطر فاطمہ جناح کو ووٹ دیں** . . . . "

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے کتنے بہت سے علماء اور مفتی صاحبان ہیں جو محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت کو جائز و مباح سمجھتے ہیں،
اہل حدیث نے فاطمہ جناح کی صدارت کے جواز و عدم جواز کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن اُن کی خاموشی سے یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ
کی صدارت حرام و ناجائز ہوتی تو وہ سکوت ہرگز اختیار نہ فرماتے۔ اُن کا سکوت اس امر کی دلیل ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت ان کے نزدیک
ناجائز و حرام نہیں ہے! اس سلسلہ میں جو تحریریں اکا برا اہل حدیث کی شائع ہوئی ہیں، اُن سے محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت کی جانب ہی رجحان کا پتہ
ہے چاہے وہ کتنا ہی نازک و خفیف کیوں نہ ہو۔ یہ ہمارا قیاس نہیں ہے کراچی کے ایک ممتاز اہل حدیث عالم نے ہم سے یہ بات کہی اور اس نکتہ کی
باتوں باتوں میں اشارہ کر دیا۔

ہم باور نہیں کر سکتے کہ یہ علماء جن میں بعض سے ہم ذاتی طور پر واقف ہیں اور جن کی دیانت، علمی تبحر اور ورع و تقویٰ سب کے نزدیک
ہے، دین و شریعت کے معاملہ میں اتنے مفت بل بلکہ غافل ہو گئے ہوں کہ ایک حرام چیز کو انہوں نے جائز و مباح ٹھیرا دیا ہو! انہوں نے یہ فتویٰ کسی
اور دباؤ کے تحت بھی نہیں دیا ان میں سے کوئی عالم مجتہد اور فقہی مسائل میں آزادی پسند بھی نہیں ہے بلکہ بعض اہلِ علم اور صاحبان ا
تقلید اور اسلاف کی پیروی کے معاملہ میں بڑے متشدد اور بے لچک واقع ہوئے ہیں! یہ عجیب انصاف ہے کہ جو حضرات عورت کی حاکم
امارت کے مسئلہ میں دوسرا نقطہ نگاہ رکھتے ہیں انہوں نے دوسرے تمام علماء اور مفتیوں کو چھوڑ کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو نشانہ ملا
رکھا ہے اور انہی کی تنہا ذات پر طنز و استہزاء کی چاندماری ہو رہی ہے، حالانکہ اس مسئلہ میں مولانا مودودی کو ملاحیاں سنانے سے پہلے
مولانا اشرف علی تھانوی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریروں کی تردید کرنی چاہیے تھی اور ان بزرگوں پر سب سے پہلی فرد جرم لگانی ؟
مولانا حکیم محمد اشرف صاحب مدیر اعلیٰ "المنبر" (لائل پور) جماعت اسلامی سے قطع تعلق کرنے کے بعد جماعت اور مودودی
کی تذلیل و تحمیق اور رسوائی کے درپے ہو گئے ہیں۔ "المنبر" کے فائل اس کے گواہ ہیں کہ انہوں نے جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت
شعار بنا لیا ہے۔ دشمنی کی انتہا ہے کہ پاکستان میں جب مارشل لگا تھا تو حکیم صاحب موصوف نے مخبری فرمائی تھی اور فوجی حکومت کو متوجہ کیا
جماعت اسلامی کو ختم کر دیا گیا مگر اس کا ادارہ مطبوعات اب تک باقی ہے اور فعال و کارگزار ہے! اس موقعہ پر حکیم صاحب بھلا چوک
انہوں نے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کو بدنام کرنے میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور وہ سب کچھ کیا جو اُن کے جذبہ بغض و عداوت
شایان تھا، لائل پور کا روزنامہ "وفاق" جو حکیم صاحب کا ہم مشرب اور ان کا حاشیہ نشین ہے، اس نے بھی جماعتِ اسلامی اور مولانا
کی مخالفت کا حق ادا کر دیا! اب رہے مولانا امین حسن اصلاحی صاحب تو ایک طرف اُن کے مزاج کی شدت، تیزی اور جھلاہٹ ہے اور دو
حکیم محمد اشرف صاحب جیسے معاندینِ جماعت اور دشمنانِ مودودی سے اُن کا گہرا ربط و ضبط ہے، وہ خاموش بھی رہنا چاہیں تو یہ حضرات انہیں
ہیں، مولانا اصلاحی صاحب نے ماہنامہ "میثاق" میں طنز و استہزاء اور استخفاف کا جو انداز اختیار فرمایا ہے وہ ان کے علمی مرتبہ سے بہت گرا

! نیر ۔ نگ اور اسلوبِ بیان ایسا ہے جیسے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی نے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید وحمایت کرکے دین کی بیخ کنی
لام پر خدانخواستہ قیامت نازل ہوگئی ہے اور یہی وہ اصول تھا جس کے اردگرد پورا دین گردش کرتا تھا جس کے ٹوٹ جانے سے دین کی ساکھ
یت معاذاللہ باقی نہیں رہی، جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں مرکزِ اقتدار کی جو قصیدہ خوانی اور [illegible] انہوں نے اپنے مضمون میں کی ہے ۔
لانا اصلاحی صاحب کی تحریر کو اور زیادہ بے وقعت بنا دیا، جماعت اور مولانا مودودی کے خلاف غضب وغصہ کے جھاگ ہیں کہ دہن خا
ہر رہے ہیں ۔

مولانا اصلاحی صاحب کو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ عورت کی حاکمیت وامارت کا مسئلہ دین میں کوئی شک نہیں ناپسندیدہ ہے جس کے لیے
قوم" جیسے الفاظ زبانِ رسالت سے سنے گئے ہیں، مگر پاکستان جن نازک اور غیر معمولی حالات سے اس وقت گزر رہا ہے، اُس کے پیشِ نظر
سربلندی کے لئے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کو گوارا کیا گیا ہے! اور اس معاملہ میں مولانا مودودی ہی منفرد نہیں ہیں، مشرقی ومغربی پاکستان
ت سے علماء ہیں، جن کا وہی موقف ہے جو مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کا موقف ہے، ایک فقہی مسئلہ جس میں علماء کے درمیان اختلاف ہو
یا کفر واسلام اور حق وباطل کا مسئلہ ہوسکتا ہے، کیا اس کی اباحت کو دین کی بیخ کنی اور شریعت کی پامالی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے! مولانا موصوف
ت میں جماعتِ اسلامی سے اختلاف اُس لب ولہجہ میں بھی کرسکتے تھے جو دشمنوں کا نہیں ناصحوں کا لہجہ ہوتا ہے! مگر افسوس ہے اُن کی تحریر کا تو
جیسے جماعتِ اسلامی کی تذلیل وتحقیر کے لئے وہ تاک میں بیٹھے تھے اور اس موقعہ کو انہوں نے غنیمت سمجھ کر اور حاصلِ مراد و امید جان کر جماعتِ
پنے ترکش کے تمام تیروں کی بوچھار کردی! کوئی شک نہیں مولانا اصلاحی صاحب بلند پایہ مفکر عالمِ دین ہیں مگر انہوں نے جماعت کے خلاف طنز و
جو "رنگِ خاص" اختیار کیا ہے، اُسے جو کوئی پڑھ لے گا تو وہ جماعتِ اسلامی اور مودودی کے بارے میں مولانا اصلاحی صاحب کے احتساب
کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا! کہ اعلانِ حق ہی کی کوشش میں لکھنے والا حق گوئی کے تقاضے اور واقعی تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھ سکا۔

برہان (دہلی)، میثاق (دیوبند) سہ روزہ مدینہ (بجنور) اور مولانا محمد اسحٰق سندیلوی نے اپنی تحریروں میں دوسرے علماء اور مفتیوں
مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی ہی پر گرفت کی ہے، ان ناقدین نے اس مسئلہ میں پاکستان کے غیر معمولی حالات کی اہمیت اور ضرورت کو
سے نہیں دیکھا، جس نگاہ سے مفتی محمد شفیع، مولانا اطہر علی، مولانا شمس الحق فریدی، مولانا مصلح الدین، مولانا محمد چراغ اور دوسرے متعدد علماء
ہے اور جس کا انہیں تجربہ ہے! اور سب سے بڑی حیرت تو اس پر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم سید مہدی حسن صاحب دینی مصالح کی
ن کی حاکمیت کو مباح قرار دیتے ہیں، اسی دینی درسگاہ کے مجلہ "دارالعلوم" کے ایڈیٹر صاحب مولانا مودودی کو اپنی عادت کے مطابق خوب جلی کٹی
اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے فتوے کو دانستہ نظر انداز کرجاتے ہیں۔

نفسِ مسئلہ پر اگر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے تو بات بہت لمبی ہوجائے گی، مولانا عامر عثمانی مجلہ "تجلی" (دیوبند) میں عورت کی حاکمیت کے
کچھ لکھ چکے ہیں کہ دل ودماغ کسی خاص جماعت اور فرد کی دشمنی میں مبتلا نہ ہوں تو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مولانا موصوف نے جماعت
ناقدین ومعترضین کی ایک ایک دلیل کا جواب دیا ہے، جب بحث چھڑ گئی ہے تو ہم بھی چند اشارات گزارش کی صورت میں پیش کرنے کی جرأت کررہے ہیں
سامنے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی گھر میں آگ لگ رہی ہو اور اس گھر کی عورتوں کی جانیں بچانے کا سوال ہو تو نامحرم مردوں اور خود ان عورتوں کے لئے
حجاب اور لمسِ بدن کے مسئلہ اصول وضوابط میں وقتی طور پر کیا کسی نرمی کی اجازت نہیں دیتی؟ عام حالات میں حجاب، غضِ بصر اور نامحرم مردوزن
ب واختلاط کی جو پابندیاں ہیں کیا وہ ان ہنگامی حالات میں بالکل جوں کی توں رہیں گی! پاکستان میں بھی ہنگامی اور غیر معمولی صورتِ حال کے تحت

علامہ عبداللہ حقانی
مہتمم مدرسہ جامع العلوم ملتان

دعوتِ اتّحاد

حمد وثنا کے بعد ——— اہل علم بزرگوں کی اس مجلس میں اپنے خیالات کا اظہار —— جسارت نہیں بلکہ تعمیل فرمان ہے۔

لماء کا مقام علماء کا مقام درحقیقت بہت ہی بلند ہے یہاں تک کہ وہ عبادت گزاروں اور شب زندہ داروں سے بھی بلند ہیں ——— حدیث شریف میں ہے :-

فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد

دین کا ایک سمجھ دار عالم ہزاروں عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہے شیطان لعین پر۔

ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو صحابہ دو ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ ایک گروہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہا تھا اور دوسرا اللہ کی کتاب پڑھ — ما دونوں نے آپ کو اپنی اپنی طرف بلایا آپ نے فرمایا۔

بعثنی اللہ معلماً فجلس فیھم

اللہ نے مجھے معلم بنا کر بھیجا ہے یہ کہہ کر آپ تعلیم کا کام کرنے والوں میں بیٹھ گئے۔

علماء ہی خدا کو جانتے اور ڈرتے ہیں :-

اِنَّمَا یَخْشَی اللہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ

بندگانِ خدا میں سے خدا سے ڈرتے ہیں تو یہی عالم لوگ۔

اور وہی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور ہدایتوں کو سمجھتے ہیں۔

وَمَا یَعْقِلُھَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ

انہیں نہیں سمجھتے مگر علم والے۔

ن کا مقام اس لئے بلند ہے کہ ان کی اصلاح سے امت کی اصلاح ہے اور ان کے بگاڑ سے پوری امت کا بگاڑ۔

الا ان شر الشر شرار العلماء وان خیر الخیر خیار العلماء

سنو کہ سب سے بڑا شر برے علماء ہیں اور سب سے بڑا خیر اچھے علماء ہیں

علماء چونکہ اللہ کا اقتدار قائم کرنے کے لئے کام کرتے ہیں اور جب تک اللہ کا نام لیا جاتا ہے قیامت نہیں آئے گی اس طرح حاصل وہ پوری کائنات کی جا- کے ضامن ہیں اس لئے دنیا کی ایک ایک چیز عالم کے لئے مصروف دعا ہے۔

عن ابی امامۃ الباھلی قال ذکر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رجلان احدھما عالم والآخر عابد فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ابو امامہ باہلی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا جن میں سے ایک عالم تھا اور دوسرا عبادت گزار تو آپ نے فرمایا عالم کا مقام ایک عابد

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم
ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ و
ملائکتہ واھل السموات والارض حتی النملۃ فی جحر
ھا وحتی الحوت لیصلون علی معلم الناس الخیر و
ان الملائکۃ لتضع اجنحتھا رضا لطالب العلم

اتنا ہی بلند ہے جتنا تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی سے میرا اپنا مقام بلند ہے پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے اور زمین و آسمان کی ساری مخلوق لوگوں کو خیر سکھانے پڑھانے والے کے لئے دعا و رحمت کرتی ہے یہاں تک کہ وہ چیونٹی بھی جو بل میں ہے اور وہ مچھلی بھی جو پانی میں ہے اور فرشتے علم کے طلبگار کی رضا جوئی کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔

ا چونکہ دنیا کو نیکی سکھانے والے ہیں اس لئے سب کی نیکیوں میں ان کا حصہ ہے اور ساری دنیا کی بھلائیوں میں ان کا بہرہ۔

من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل
بھا ومن سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر
من عمل بھا

جس نے کچھ اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کو اپنا اجر بھی ہے اور ان کے اجر میں حصہ بھی جنہوں نے اس پر عمل کیا اور جس نے کسی بُرے طریقے کا آغاز کیا تو اس پر اپنا گناہ بھی ہے اور ان کے گناہوں کا ایک حصہ بھی جو اس برائی کو اپنائیں گے۔

علما کا جہاں مقام اتنا بلند ہے وہاں ان کی ذمہ داریاں بھی بہت زیادہ ہیں اور ان سے جو جواب طلبی ہونے والی ہے وہ بھی نہایت کٹھن ہے۔ وہ اگر اس لئے پڑھے اور پڑھایا کہ لوگ انہیں عالم کہا کریں تو جہاں غیر مخلص مجاہد اور سخی سے بازپرس ہوگی وہاں وہ عالم دین بھی نہ بچ سکے گا۔

وما کنت تقرأ الا لیقال انک قاری فقد قیل فیؤمر
فیسحب الی النار

تو تو اس لئے پڑھتا تھا کہ لوگ تجھے علامہ کہیں سو وہ کہا جا چکا اب حکم کیا جائے گا اور اسے جہنم کی طرف گھسیٹ لے جایا جائے گا۔ (او کما قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

قیامت کے دن ان سے باز پرس ہونے والی ہے کہ تم نے اپنے فرائض کو ادا کیوں نہیں کیا۔

لولا ینھٰھم الربانیون والاحبار عن قولھم
الاثم واکلھم السحت لبئس ما کانوا یصنعون

علما اور پیر لوگ لوگوں کو جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے۔ یہ بدترین کام ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

ن سے پوچھا جائے گا کہ یہ قومیں جو ان کے سامنے برباد ہوئیں یہ بادی کا شکار ہوتی رہیں وہ کہاں چلے گئے تھے۔

فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیۃ ینھون
عن الفساد فی الارض الا قلیلا ممن انجینا منھم
واتبع الذین ظلموا ما اترفوا فیہ وکانوا مجرمین

تم سے پہلے والی امتوں میں کیوں ایسے خدا کا کچھ خوف رکھنے والے نہ اٹھے جو لوگوں کو زمین میں بدامنی پھیلانے سے روکتے سوائے چند انسانوں کے جنہیں ہم نے نجات بھی دیدی۔ اور ظالم تو اپنی خوشحالی میں مگن ہوگئے اور وہ مجرم ہی تھے۔

یہاں تک کہ جب قیامت کے دن لوگ پاداش عمل میں پکڑے جائیں گے تو وہ ان علماء دین اور پیران طریقت پر دعویٰ کر دیں گے جنہوں نے اللہ کے دین پھیلانے کی بجائے اپنے اقتدار کا تخت بچھایا اور وہ بد دعا کر رہے ہوں گے۔

ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا

بولیں! ہم نے اپنے ان سادات اور بزرگوں کا کہا مانا اور انہوں

...كل حزب بما لديهم فرحون ۔ (۳۲ - روم)

کیا اور ٹولے ٹولے ہو گئے اور ہر ٹولی اپنے خیالات میں مگن ہے۔

...اس میں دین کو حصے بخرے کرنے والوں اور فرقہ بازی کے مریضوں کو مشرک کہا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک خدا کی رضا کی تلاش نفس وعد اور ضد و تعصب پیدا نہیں ہوتا جو فرقہ بازی کی اصل بنیاد ہے یہ بلائیں اُس وقت پیدا ہوتی ہیں جب ساتھ کے ساتھ اپنی ...لی کی جیت اور اپنی بات منوانے میں لذت نفس حاصل کرنا بھی ساتھ ساتھ مقصد جدوجہد بن جائے اور خدا کا منشا پورا کرنے کے ساتھ کا منشا پورا کرنا بھی مقصود بن جائے۔ اور یہی شرک ہے۔ عیاذاً باللہ۔

...نہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صاف حکم دیا گیا:-

...ذين فرقوا دينهم وكانوا شيعا لست ...م في شيء (۱۵۹ - انعام)

جن لوگوں نے اپنے دین کو حصے بخرے کیا اور فرقے فرقے بن گئے آپ کا ان لوگوں سے کچھ بھی تعلق نہیں۔

...لت کسی قوم کے لئے خیر کی علامت نہیں۔ ایک عذاب ہے اور سخت عذاب کی علامت :-

...و القادر على ان يبعث عليكم ... ...ما من تحت ارجلكم او يلبسكم شيعاً ...يق بعضكم بأس بعض۔

کہہ دیجئے کہ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ تم پر عذاب اتارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں تلے سے یا تمہیں فرقہ فرقہ اور ٹولہ ٹولہ کرکے باہم لڑا دے اور ایک دوسرے کی مار کا مزا چکھائے۔

...خدا کی قسم میں یہ کیفیت حال پوری ... بیان کر رہا ہوں ... علمائے کرام کی ... حالت بیان کرنے میں کوئی لطف نہیں ... ...میرا دل روتا ہے۔

...اصل تعلیمات تو یہ ہیں : خلاصہ تو یہ ہے کہ عمل کو اصولوں میں پوری مستعدی اور اتفاق ... سے کام کرنا چاہئے اور فروعات میں ... — رواداری سے کام لیا جائے۔

...ن ابي ثعلبة الخشني رضي الله تعالى عنه قال قال ...رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله فرض ...ئض فلا تضيعوها وحرم حرمات فلا تنتهكوها ...حد حدوداً فلا تعتدوها وترك اشياء ...ن غير نسيان فلا تبحثوا عنها ۔

ابو ثعلبہ خشنی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے کچھ فرائض مقرر کئے ہیں انہیں ضائع نہ ہونے دو، کچھ چیزیں قطعی حرام کی ہیں ان کی حرمت نہ پھاڑو، کچھ حدود متعین کی ہیں ان سے آگے نہ جاؤ اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق اس نے کچھ نہیں طے کرکے دیا حالانکہ وہ بھولا نہیں ہے ان میں جھگڑے بازی نہ کرو۔

...ت ہے کہ قطعی فرض اور قطعی حرام اور واضح حدود کے بعد بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں ہمیں طے کرکے نہیں دیا گیا ہے ان میں اختلا... ...نہ سب مسلمان بھائی بھائی ہو سکتے ہیں ان میں ہر شخص اپنی اپنی رائے پر عمل کرنے کا حق رکھتا ہے یا جس کو جس کی رائے پر اعتماد ہو اس ...کرے لیکن کوئی کسی دوسرے سے ان کی بنا پر نفرت اور تعصب کا برتاؤ نہ کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ خندق سے فراغت کے بعد بنی قریظہ کے محاصرے کا حکم دیا اور فرمایا وہاں پہنچو" ولا الا فی بنی قریظہ" یعنی صرف اس محلہ میں پہونچ کر ہی عصر کی نماز پڑھو۔ اب جو صحابہ چلے تو راستے میں نماز عصر کا وقت تنگ ہونے لگا۔ بعض ہم آپ کے الفاظ مبارک پر عمل نہ چھوڑیں گے نماز کا وقت جاتا ہے تو جانے دو ہم تو جب بنی قریظہ پہونچیں گے تو نماز عصر پڑھیں گے اور کچھ لوگ ہم نماز عصر راستے میں بروقت پڑھ لیتے ہیں کیونکہ منشا صرف جلدی چلنے کا تھا یہ نہ تھا کہ نماز اپنے وقت سے ٹال دو۔ جب رسول اللہ صلی ا آلہ وسلم کے سامنے یہ اختلاف رائے پیش ہوا تو آپ نے ان میں سے کسی کو بھی غلط قرار نہ دیا۔ اسی طرح سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے دونوں گی اور صحابہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی اس سلسلے میں دوسرے کو ہدف ملامت نہیں بناتا تھا۔

علم سے زیادہ اس حقیقت کو کون جانتا ہے کہ صحابہ میں قرأت خلف الامام میں اختلاف رہا کہ وہ واجب ہے یا ممنوع۔ قنوت کے الفا اس کے موقعہ میں اختلاف رہا۔ وضو کے نواقض میں زبردست اختلاف رائے رہا، موجبات غسل کیا کیا ہیں بلکہ ان فقہی کے علاوہ یہ کلامی پیش آئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج جسمانی تھی یا روحانی اور یہ کہ مردے سنتے ہیں یا نہیں انہیں صحابہ کی رائیں با رہیں مگر ہر شخص نے اپنا جتھا بنانے اور دوسری رائے رکھنے والے کے خلاف کسی نفرت سے کام نہیں لیا۔

صحابہ کرام حضرت عثمان سے اس مسئلہ میں سخت اختلاف کرتے رہے کہ وہ مدینہ سے آکر مکہ اور منیٰ نماز میں قصر کیوں نہیں کرتے اختلاف رائے کے باوجود منیٰ میں سب صحابہ ان کے پیچھے پوری نماز پڑھتے رہے۔

صحابہ کے درمیان ہی سیاسی اختلافات بھی پیدا ہوئے جنہوں نے ہمارے علماء کرام کو ایک دوسرے سے بغض پر آمادہ کر دیا ہے۔ ان اختلافات کے باوجود بھی کوئی دوسرے کی جلالت شان کا منکر نہ ہوا۔ امیر معاویہ اور اہل بیت کا اختلاف کسے معلوم نہیں۔ مگر ایک شخص نے عباس سے کہا ذرا معاویہ کو دیکھیے یہ وتر کی ایک رکعت پڑھتا ہے ابن عباس نے جواب دیا معاویہؓ کو یوں نہ کہو" لا تقل ہکذا فانہ فقیہ" کی سمجھ حاصل ہے۔

جنگ صفین میں حضرت علی نے اپنی فوج کو سمجھایا کہ فتح کرنے کے بعد کوئی بھی دوسرے فریق کے مال کو غنیمت نہ سمجھے نہ ان کو غلام جب بعض نے کہا کہ وہ ہمارے خون کے پیاسے ہیں اور ہمیں اس کی اجازت بھی نہیں؟ آپ نے فرمایا ان میں عائشہؓ ہیں ان میں فلاں ہیں ان [illegible] با مہر؟ تم میں سے کون ہے جسے اپنی ماں سے نکاح کرنے کی ہمت ہے؟ حضرت علی نے وہاں بالمقابل فوج کے سپہ سالار زب سے بڑی بیادرانہ ملاقاتیں کیں اور اس پر روئے بھی اور رلایا بھی کہ کیوں ہم ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو رہے۔

حضرت عمار بن یاسر کو کوفہ بھیجا گیا تا کہ وہ حضرت علی کی فوج کے لئے بھرتی حاصل کریں۔ وہاں منبر پر تقریر کر رہے ہیں کہ سوال ہو جاتا عائشہؓ کے متعلق کیا کہتے ہو۔ کتنا نازک مرحلہ تھا، تقریر پوری جولانی پر ہے اور فریق مخالف کے ایک فرد کے متعلق پوچھا جاتا ہے کوئی ہو جانے کیا کچھ نہ کہہ جاتا۔ مگر عمار کہتے ہیں۔

انی لا علم انہا زوجۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی الدنیا والاخرۃ۔۔۔ ابتلیتم (الی آخرہ)

مجھے معلوم ہے کہ وہ یہاں اور وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حرم محترم ہے لیکن یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم آپ کے بھائی علی اور آپ کے حرم محترم دونوں کو بیک وقت راضی نہیں رکھ سکتے تمہیں کسی ایک کا ساتھ دینا ہوگا۔

سیاسی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام اور عظمت کا اقرار۔ کاش کہ ہمارے سامنے بھی یہ اسوہ رہے۔
یا اپنی اپنی رائے کو آسمانی وحی سمجھ کر ضد کرنے والوں کو یہ بھی سننا چاہیئے۔

ی عن عمر انه لقی رجلاً فقال ما صنعت
ے قضی زید وعلی هکذا قال لو کنت لقضیت
ن انا قال فما منعک والامر الیک قال لو کنت
ی ردک الی کتاب الله او سنه نبیه صلی الله
یه وآله وسلم لفعلت ولکن اردک الی
ی والرای مشترک فلم ینقض ما قال علی و
ں ؛ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶۵)

عمر فاروق سے روایت ہے کہ وہ کسی سے ملے اور پوچھا کہ
کیا حال ہے اس نے جواب دیا علی اور زید نے میرا یہ فیصلہ
کیا ہے آپ نے فرمایا میں ہوتا تو فیصلہ یوں کرتا وہ کہتا ہے
عمر تو آپ کو کس نے روکا ہے اختیارات تو آپ کے پاس ہیں
آپ نے فرمایا نہیں میں اگر کتاب اللہ کی صریح آیت یا رسول اللہ
کی کسی نص کی طرف تم کو پھیر سکتا تو کرتا لیکن اب تو صرف
اپنی رائے کی طرف پھیر سکتا ہوں اور رائے قائم کرنا سب کا حق ہے
۔ کیونکہ آپ نے علی اور زید کا فیصلہ بحال رکھا۔

دیکھئے چونکہ عمر فاروق کے پاس بھی رائے اور قیاس تھا اور ماتحت عدالت کے پاس بھی رائے اور قیاس تو آپ نے فیصلے کو اپنی رائے کے
ب ہے اور سنئے ۔۔۔۔۔

ال عبد الله ابن عباس زید ابن ثابت امی کتاب
ں ثلث ما بقی فان انا اقول برائی وانت تقول

عبداللہ بن عباس نے زید ابن ثابت سے کہا یہ ماں کے لئے تہائی مگر باقی
مال کی تہائی یہ کونسی کتاب اللہ میں لکھا ہے انہوں نے جواب دیا کہ میں
بھی اپنی رائے سے کہتا ہوں اور آپ بھی رائے ہی سے کہتے ہیں۔

رت عمر کے کاتب نے ایک دفعہ لکھا۔
ما رای الله ورای عمر
یہی رائے اللہ کی ہے اور یہی عمر کی۔
پ نے کہا اسے فوراً مٹاؤ اور لکھو۔
ما رای عمر فان یکن صواباً فمن الله وان یکن
ہ فمن عمر لاتجعلوا الرای سنة

یہ عمر ہی کی رائے ہے اب اگر صحیح ہے تو اللہ کی راہنمائی سے ہے اور اگر
کچھ اور ہے تو یہ عمر ہی کی طرف سے ہے۔ دیکھو کسی کی رائے کو سنت اور
ضابطہ نہ بنا لیا کرو۔

یا رادر دلائل پر ہی قائم ہوتی تھیں اور دلائل کے بدلنے سے بدل بھی جاتی تھیں۔ حضرت عمر نے پہلے مدتوں حقیقی بھائی کو والدہ، زوج اور
کی موجودگی میں ورثے سے محروم رکھا اور پھر یہ فیصلہ دینا شروع کیا کہ اس صورت میں اخیافی اور حقیقی بھائی سب ثلث مال میں شریک ہیں لوگوں نے کہا یہ کیا م
ن ذالک بما قضینا و هذا بما نقضی۔ وہ ہمارا اس وقت کا فیصلہ تھا یہ ہمارا اس وقت کا فیصلہ ہے ۔۔۔۔۔

ی اختلافات میں صحابہ کے بعد اپنے فقہی ائمہ کرام کا حال سنئے۔
و سب کو معلوم ہے کہ امام محمد اور امام ابو یوسف نے اپنے سب سے بڑے اور محبوب استاد امام ابو حنیفہ سے بیشتر مسائل میں اختلاف کیا مگر نہ ادھر

چال بھی بند ہو گئی تھی، تو اسی زمانہ میں امام محمد سیر کبیر تصنیف فرماتے ہیں تو حال یہ تھا کہ جہاں امام ابویوسف کی بتلائی ہوئی روایت نقل کرنا ہوتی نام لکھنے کی ہمت نہ ہوتی لیکن لکھتے یہ کہ "اخبرنی الثقۃ" "مجھے ایک قابل اعتماد شخصیت نے بتلایا۔ دیکھ لیجئے اختلافات اپنی جگہ ہیں لیکن ا کی دیانت پر پورا اعتماد ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ مالکی حضرات سورۃ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ نہ سراً پڑھتے ہ جہراً مگر امام ابوحنیفہ اور امام شافعی جو بسم اللہ پڑھتے ہیں مدینہ شریف میں مدتوں مالکیوں کے پیچھے نمازیں ادا کرتے رہے اور کبھی ــــ یہ خیال نہیں کیا کہ ہماری نمازیں ناقص ہو رہی ہیں۔

امام ابویوسف سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل ہیں مگر آپ نے ہارون الرشید کے پیچھے یہ جانتے ہوئے نماز ادا کی کہ اس نے سینگی ہے اور وضو تازہ نہیں کیا ہے اور پھر نماز لوٹائی بھی نہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں دونوں آراء کے صحیح ہونے کی گنجائش ہو شریعت نے قطعی طور پر جس میں کوئی فیصلہ نہیں دیا ہے۔

امام ابویوسف نے ایک دفعہ ایک حمام میں غسل کیا اور نماز جمعہ پڑھائی اور اس کے بعد کنویں میں سے مردہ چوہا نکلا امام صاحب نے فرمایا ا دفعہ ہم اپنے مدنی بھائیوں کی رائے پر عمل کرتے ہیں کہ اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث یعنی پانی دو مشکوں کے برابر ہو تو وہ پلید نہیں یہ کہا اور نماز نہیں لوٹائی۔

امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کسیر پھوٹنے اور سینگی بجوانے سے وضو تازہ کرنے کا حکم دیتے ہیں کسی نے عرض کیا یہ فرمایئے اگر کوئی سینگی کھ وضو تازہ بھی نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے آپ نے فرمایا تو کیا میں امام مالک اور سعید ابن المسیب جیسی شخصیتوں کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا

امام شافعی نے صبح کی نماز امام ابوحنیفہ کے مقبرے پر پڑھی تو اپنا مذہب چھوڑتے ہوئے دعاء قنوت نہیں پڑھی لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمانے ہم کبھی کبھی اہل عراق کا مذہب بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ وہاں آمین بالجہر بھی چھوڑ دی اور فرمایا کہ مجھے فرمانے کا احترام ملحوظ ہے کہ وہ بالجہر کو نہیں کرتے۔

امام ابویوسف اور محمد کے متعلق ایک دنیا جانتی ہے کہ باوجود یکہ عیدین میں چھ زائد تکبیروں کے قائل تھے مگر مدتوں حضرت ابن عباس کے قو مطابق عیدین کی تکبیریں پڑھتے رہے اس لئے کہ عباسی خلفاء اپنے دادا کے قول کو پسند کرتے تھے۔

نہ معلوم آج ان لوگوں کو اپنا امام کہنے والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ مختلف رائے قائم کرنے والوں کو یا بد دیانت سمجھتے ہیں یا بیوقوف اور ان سے بد کرتے ہیں یا نفرت۔ ایسی تنگدلی مجھے تو ا تبع تابعین اور آئمہ کے بعد بھی مدتوں تک نہیں ملتی۔

مولانا حسین احمد مدنی کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں کانگریس اور لیگ کے زبردست جھگڑے رہتے اور بعض دفعہ خود طلبہ گستاخی کر بیٹ دن پیشانی پر کوئی شکن بھی نہ آتی۔ ایک دفعہ ایک طالب علم نے یہاں تک پرچی میں لکھ دیا کہ آپ دنیا کو بدیسی کپڑے پہننے سے روکتے ہیں اور آپ آج تک بدیسی کپڑے پہنتے ہیں آپ نے مسکرا کر پرچی سب کو پڑھ کر سنائی اور کہا کہ بھائی میرے گھر سے بھی وطنی اور دیسی کپڑا ہی پہنتے میں اختیار نہ آئے تو کبھی کسی

ایک دفعہ ایک ظالم نے تو اس سے بھی سخت الفاظ لکھے جو مجھے ادا کرنا بھی مشکل ہیں مگر میں ان شاگردوں کے سامنے ان کا نمونہ پیش کئے ب رہ سکتا۔ پرچی میں لکھ دیا گیا تھا کہ تو حرام زادہ ہے۔ عیاذاً باللہ۔ کوئی دوسرا ہوتا تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہ ایسے شاگرد کے ساتھ کیا کرتا۔ آ پرچی بھی زور سے اپنے مخصوص لہجے میں پڑھ دی اور فرمانے لگے بھائی آپ کو کسی نے غلط معلومات دی ہیں میرے والدین کا تو شرعی نکاح تھا او سے نکاح کے گواہ اعظم گڑھ میں ابھی زندہ ہیں آپ دریافت کر سکتے ہیں۔ اللہ اکبر یہ تھا حوصلہ صرف اختلاف رائے کرنے والوں کے ساتھ نہیں

واعلم الناس بالفتوی اسکتھم واجھلھم بھا انطقھم — جو فتویٰ کو جتنا زیادہ سمجھتا ہوگا اتنا خاموش ہوگا اور جو جتنا اس سے جاہل ہوگا اس کی زبان اتنی زیادہ چلتی ہوگی

بھی دیکھیں گے کہ جو حقیقۃً علماء ہیں وہ فتویٰ لکھنے اور دینے سے پہلے بار بار اور مختلف پہلوؤں سے غور و فکر کریں گے جب لکھیں گے تو بہت لفظوں میں لکھیں گے اور جو ہدایت النحو پڑھ کر اور کانیہ ذیل وعظ و نصیحت کا پیشہ کرنے والے ہیں ان کی زبانوں کی مقراضیں بڑے بڑے علماء کرام و عظام کی پگڑیوں اور ڈاڑھیوں کو کتر . . ذرا بھی دیر نہیں لگاتیں اللہ تعالیٰ ہدایت بخشے۔

حضرت براء ابن عازب سے روایت ہے کہ میں ایک سو بیس صحابہ سے ملا ہوں ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ کاش فتویٰ دینے کی . . . ان پر نہ آنے پائے۔ حضرت سفیان ثوری سے روایت ہے کہ ائمہ کرام فتویٰ دینے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ امام احمد ابن حنبلؒ نے فرمایا کہ فتویٰ کی ذمہ داری اٹھائی اس نے سب سے بڑی ذمہ داری اٹھائی۔ وہ کسی استفتاء کا جواب دیتے تو یوں کانپ جاتے گویا جنت و . . . کے درمیان کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ دراصل فتویٰ دینے والا اللہ کے نام سے امر و نہی کا اعلان کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے امر و نہی کے . . . ندگی کے مقام پر کھڑا ہو جانا جرأت کرنے کی چیز نہیں ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ ہر گروہ میں بہترین لوگ موجود ہیں جو خدا کا خوف بھی رکھتے ہیں اور دین کے خیر خواہ بھی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنا کام کرنے کا . . . ائے اور وہ کام لے جس سے وہ راضی ہے اور جو بالآخر ان کے اپنے لئے اور امت کے لئے بھلائی کا موجب ہو مگر جب اچھے لوگ بھی فرقہ واریت کی حوصلہ . . . رتے ہیں اور اپنے عقیدت مندوں کو دوسرے کے خلاف جتھا بندی کرتے دیکھتے ہیں تو وہ اس فتنے کو کیوں نہیں محسوس کر لیتے جو بزرگوں کو ان سے ہٹانے کی کمائی کو اکارت کرنے کا کارگر شیطانی ہتھیار ثابت ہوتا ہے۔

آئیے اب ٹھنڈے دل سے اسے سوچیں کہ اہل علم لوگ یہ سب کچھ کیوں کرتے ہیں کیوں یہ تعصب اور تحزب کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے آخر یہ . . . مارے . . . عالم کی ہدایت کا موجب ہیں اور سب مسلمانوں کو اتفاق و اتحاد . . . سبق دینے والے ہیں وہ خود اختلافات کا کیوں شکار ہو جاتے ہیں۔ جو دین . . . نے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو خدا کا خوف دلاتے ہیں وہ خود کیوں خدا کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے اور نہیں سمجھ سکتے کہ اختلافات میں کس . . . جانا صحیح ہے اور کس حد تک صحیح نہیں۔ جہاں تک ہم نے سوچا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اپنی زندگی کا نصب العین بدل گیا ہے۔ چاہے انہیں . . . در ہو یا نہ ہو بہر حال اب مقصد زندگی کچھ اور ہو گیا ہے۔ حضرات! آئیے ہم سب ایک دفعہ اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا ہماری . . . اپنی عزت کے لئے ہے یا خدا کے دین کی عزت کے لئے۔ ہم خدا کا منشاء پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یا خدا کی زمین میں اپنا منشاء پورا کرنے کی . . . ہد؟ ہم لوگوں کی گردنوں پر خدا کا تخت بچھانے کی کوشش کر رہے ہیں یا اپنا تخت۔ دراصل مقصد زندگی ہی دوستی اور دشمنی کی حدود متعین . . . ور منزل و نصب العین ہی اختلاف و اتفاق کے آداب سکھاتا ہے۔

علماء کا اصل مقصد زندگی تو "العلماء ورثۃ الانبیاء" کے پیش نظر یہی تھا جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا رہا ہے۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون — وہی ہے جس نے اپنے رسول کو راہِ راست اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ مشرک اسے برا مانیں۔

اور یہی کام جو ساری امت کے سپرد تھا سب سے زیادہ وہ انہی اہل علم کے سپرد تھا اور وہ پہلے ذمہ دار ہیں یعنی

ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ

یہ کہ دین حق کو قائم کرو اور اس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔

پھر اسی مقصد سے ہی محبت اور نفرت کے حدود متعین ہوتے ہیں۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو آپ کے ساتھی ہیں وہ کفار پر سخت ہیں مگر آپس میں مہربان و رحمدل۔ تو انہیں ہر وقت رکوع و سجود میں دیکھے گا وہ خدا کے فضل اور اسی کی رضا کے طلبگار ہیں ان کے چہروں پر زیادہ سجدوں کی وجہ سے خاص علامتیں موجود ہیں۔

پھر یہی مقصد "اقامت دین" ہی یہ کہنا سکھاتا ہے کہ

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ

کہدے اے اہل کتاب ایک ایسے کلمے کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکیں اس کے برابر کسی کو نہ ٹھیرائیں اور اللہ کو چھوڑ کر ہم میں سے کسی کو رب نہ بنا لے۔

پھر جب مقصد سامنے ہوتا ہے تو ایک انسان وزن کرتا اور سمجھتا ہے کہ کس سے جڑے اور کس سے توڑے سے

بقول دشمنے پیمان دوست بشکستی　　ببیں کہ از کہ گسستی و با کہ پیوستی

اس وقت پتہ چلتا ہے کہ کرنے کا کام کیا ہے۔ سارے ملک و قوم کی گاڑی اگر کعبہ کی بجائے منحرف روانہ ہو جائے تو اس وقت سب سے بڑی نیکی ڈرائیوروں کو راہ راست پر لانا یا کم از کم انہیں بدلنا ہے یا صرف ڈبے میں بیٹھ کر مسافروں سے بات بات پر لڑنا، مناظرے کرنا یا صرفی نحوی ادبی اور نکات پر مجلسیں گرم کرنا ہے۔

حضرات آپ نے میرا نقطۂ نظر سمجھ لیا ہوگا دین حق کو قائم کرنا، خلافت علی منہاج النبوۃ کو قائم کرنا دین کی بنیادیں پختہ اور مسلمہ قدروں کو اور مضبوط کرنا، اسلامی نظام پر سب مسلمانوں اور غیر مسلموں کو مطمئن کرنا اور اسے عملاً چلا کر دنیا کے لئے ایک عملی مثال قائم کرنا، قرآن و سنت کر دنیا کو اس کی ساری تعلیمات پر یقین دلانا، تلاوت آیات تزکیۂ نفوس تعلیم کتاب و حکمت اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں لانا جس میں نیکی پھلے پھولے اور برائی مٹے اور دبے آپ کا مقصد حیات ہے۔ اسی کو پیش نظر رکھئے جو کچھ کرنا ہے اسی کے لئے کیجئے اور جو تیر چلانا ہے اسی سمت

اب جب ہمارا مقصد متعین ہو گیا تو ہمیں اب طریق کار بھی متعین کرنا چاہئے۔ کچھ ایسے خطوط بھی متعین طور پر سامنے ہونے چاہئیں جن پر ہم یہ مقصد زندگی حاصل کر سکیں تو جہاں تک میری فہم کا تعلق ہے میں یہ کہوں گا کہ:—

ہمارا یقین یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کی اصل طاقت اصولوں میں اتحاد و اتفاق اور فروعی مسائل میں زیادہ سے زیادہ روادار وسعت میں ہے۔ یہ نہ ہوا تو ہمارا مقصد کبھی حاصل نہ ہوگا اور اتحاد و اتفاق بھی ایک پراگندہ خواب بن کے رہ جائے گا۔

اختلافی مسائل میں ہمارا مسلک یہ ہونا چاہئے کہ ہم رائے ہمیشہ دلائل سے قائم کیا کریں اور دلائل بدلنے پر ان مسائل میں رائے کو بدلے

ہے۔ ہٹ اور ضد سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے نیز ان مسائل میں ہم یہ عہد کریں کہ اپنی رائے کے حق میں ہم دلائل تو دیں گے لیکن کسی پر مسلط کرنے
اس کے لئے مجبور کرنے یا اس کے لئے جتھا بنانے اور گروہ منظم کرنے کی کوشش نہ کریں گے اور نفرتیں نہ پھیلائیں گے رائے قائم کرنے کا حق د
مسلم کو بھی ہونا چاہیے۔

علاوہ ازیں اختلاف رائے سے کسی صاحب رائے کی شان کو کم نہ سمجھیں گے بلکہ اس کی خوبیوں اور علمی کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کر
نہ دلوں کے دروازے ہمارے لئے کبھی نہیں کھل سکتے اور ہم حق کا انکار کرنے کے مجرم ہوں گے۔

ہمارا اصول امام احمد ابن حنبل کے قول کے مطابق یہ ہو کہ ان نعرف الرجال بالحق دون ان نعرف الحق بالرجال یعنی حق حق
ہو اسے غیر بھی سمجھائیں اور ناحق ناحق ہے اگرچہ وہ ہمارے استاد اور ہمارے اپنے بزرگوں سے کیوں نہ منسوب ہو۔
ہیں یہ کام اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہیں ہو سکے گا۔ اقامت دین اور خلافت علی منہاج النبوۃ کوئی کھولنا کی چیز نہیں ہے اس کے لئے پہلے ایک جماعت
یہ معاشرہ اور ایک انسانی گروہ ایسا وجود میں آنا چاہیے جس کی تفصیلات یہ ہوں کہ:

(۱) اس میں اہل حدیث، احناف، شوافع اور دوسرے فقہی مسائل پر عمل کرنے والوں کو سب کو آزادی ہوگی کہ سب اپنے اپنے مسلک پر
عمل کریں اس کے لئے دلائل کا تبادلہ بھی شرافت کی زبان اور علمی انداز کے ساتھ بے شک کریں مگر جتھا بندی کرنے کی نہ اجازت ہوگی نہ اس کی
زائی کرنے کی۔

(۲) ہم سب مل کر خلافت علی منہاج النبوۃ کے قیام کی کوشش کریں اور اس کو پیش نظر رکھ کر دین کے مفاد کے نقطہ نظر سے اس کے
مفید لوگوں سے روابط جوڑیں اور غیر مفید اور غیر مناسب لوگوں سے تعلقات توڑیں۔

(۳) ہم سب مسلمانوں کو کافر بنانے کی بجائے کافروں کو حلقہ بگوش اسلام کرنے کی کوشش کریں۔

(۴) ہم اپنے کام کے لئے مثبت طریقے اختیار کریں۔ کسی کی تردید ہمارا کام نہ ہو بلکہ سب کو اچھی طرح پر کرنے کا کوئی صحیح کام اور اصلا
ح کا آغاز لوگوں کی مشترکہ مسلمہ بھلائیوں کے لئے کوشش کے آغاز سے کریں کہ ان سے آغاز کرنا ایک فطری ترتیب ہے۔

(۵) ہم طے کریں کہ ہماری جنگ فرقوں سے نہیں زیادہ محض فرقہ بندی سے ہوگی۔ فرقہ بازی کے سرغنوں یا مرض پھیلانے والوں کی اصلاح
درد مند، دعا اور دعوت اور تفہیم و تنظیم سے کریں گے مگر وہ بھی دل سوزی اور ہمدردی کے ساتھ خدا سے رہنمائی طلب کرتے ہوئے اور استغنا

(۶) باقی تمام لغوی اور شرعی علوم سے زیادہ قرآن و حدیث کی طرف توجہ دیں گے اور اس کے روزانہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہ
وار حلقوں کے قیام کی کوشش کریں گے یہاں تک کہ وہ ہماری خاص علامت بن جائے۔

(۷) علما کو پوری امت کی اصلاح کے لئے چونکہ دوسرے طبقوں سے روابط اور اشتراک ضروری ہے اس لئے علما سے باہر صرف ان
جماعتوں اور سوسائٹیوں سے تعاون کریں گے جو فروعی مسائل کو اپنا مشغلہ بنائیں اور عوام کو اصل دین کی طرف بلائیں۔

(۸) جہاں تک منفی کام کا تعلق ہے ہم زیادہ توجہ اس باطل کے مقابلے کی طرف کریں گے جس کے پاس نسبتاً زیادہ قوت ہوگی کیونکہ
تمام فتنے طفیلی ہوتے ہیں اور شاخوں کے کاٹنے میں وقت صرف کرنے کی بجائے زہر اصل مرکز کو ٹھیک کرنے پر لگانا چاہیے۔ اور بڑے فتنے
کے ختم کر دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ رہ گئی اس کی تنظیم تو یہ آپ کو خود طے کرنا ہے یا آپ دوسرے تمام اداروں اور جماعتوں سے نکل کر
محاذ بنائیے یا پھر ان تنظیموں کے فی الحال ممبر رہتے ہوئے اس کام کے لئے ایک مشترکہ محاذ بنائیے اور اپنے اپنے صالح عناصر کے ذریعے ا

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

عثمانی سلاطین ترکی کے علماء میں سے مندرجہ ذیل اسماء شہرت کے حامل ہیں۔ شیخ صدر الدین قونوی، شمس الدین رومی، قرہ خواجہ علاء الدین اسو
الرسالہ کی شرح لکھی)، قاضی زادہ رومی، برہان احمد فاضی اسفجانی، ابن البزازی، مصنف "مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ"، عبدالرحمٰن بن علی بن احمد البسطامی ا
ناظرہ [illegible]۔ برہان الدین محمد الحرافی البروی، علاء الدین [illegible]

ترکوں نے علوم اسلامی کی ترویج و اشاعت کے لئے ترکستان اور ایران کے علاوہ برصغیر پاک و ہند، کشمیر، افغانستان، ایران، تتار (روس)
مدارس قائم کئے ان میں سے صرف بخارا کے مدرسہ مرزا بیگ میں پانچ ہزار کے قریب طلباء پڑھتے تھے اس کے علاوہ مدرسہ کوکلتاش قائم شدہ ۱۵۶۹ء جس میں
اساتذہ [illegible] قائم شدہ ۱۵۲۹ء جس میں ایک سو کمرے تھے۔

سمرقند میں ایک قدیم مدرسہ "مدرسہ بی بی خانم" تھا جسے امیر تیمور کی چینی بیوی نے تعمیر کرایا تھا اس میں ہزار طلباء بیک وقت درس لیتے تھے
[illegible] وظیفہ [illegible] تھا اس کے علاوہ سمرقند میں مدرسہ شیرداد، مدرسہ طلا قاری اور مدرسہ الوغ بیگ قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر مدرسہ ۱۴۲۸ء میں قائم
اور خوبصورت تعمیر تھی۔ چینی نقاشوں اور معماروں نے اس کو حسن و جمال کا نادر نمونہ بنا دیا تھا۔ الوغ بیگ خود علوم کا قدردان تھا۔ تاریخ، حدیث
علاوہ ماہر ریاضیات بھی تھا اس نے ۱۴۲۸ء میں اس مدرسہ کے ساتھ رصدگاہ بھی قائم کی جو مراغہ کی رصدگاہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہوتی ہے جسے ن
ہلاکو کے لئے تعمیر کیا تھا۔ الوغ بیگ کی رصدگاہ میں صلاح الدین (یہودی ہیئت دان) کے علاوہ حسن چلپی، جو قاضی زادہ رومی کے نام سے معروف۔
تھے اور معین الدین کاشانی کام کرتے تھے۔ الوغ بیگ نے کئی کارآمد آلات ایجاد کئے۔ ان تحقیقات کی جگہ بطلیموسی نظریات سے اختلاف ہوا اس ا
[illegible] اور تمام مشاہدات کو "زیج جدید سلطانی" میں درج کیا گیا جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر یورپ کے لئے وجہ حیرت بنی۔ یہ مدرسہ ثقافت اسلا
تھا۔ کاشغر میں بھی چودہ کے قریب مدرسے تھے۔

ماہنامہ "فکر و نظ

سبدِ گل

نفقت کاظمی :—

ہم ان کے نگر میں رہتے ہیں جیسے پردیس میں رہتے ہیں
ڈھونڈتے ہیں انہیں کو ہم نفقت جو ہر ساری نظر میں رہتے ہیں

جانے کہاں وہ بس رہا ہے جس کے لئے جی ترس رہا ہے
انہیں اب خبر بھی اس کی جو سامنے نفس نفس رہا ہے
جینے کی ہوس وہ کیا کرے گا مرنے کو بھی جو ترس رہا ہے

روح زیدی :—

یہ سفینہ کسی طوفان سے ٹکرایا ہے ڈوبنے والوں کو ساحل کا سلام آیا ہے
ابھی عشرتِ رفتہ کا خیال آیا ہے میں نے پھر دلِ بے تاب کو سمجھایا ہے
عشق نہ سمجھوں تو اسے کیا سمجھوں جذبۂ اخلاص کو اک دست نے ٹھکرایا ہے
بھیگی آنکھیں ستم لطف نمانے کو ہیں شکریہ تم نے مجھے خواب سے چونکایا ہے
گردشِ وقت کی اس مرگِ کی سازش تو نہ ہو کیوں مرا نام مرے نام سا ٹھہرایا ہے
مرگِ حسرت کی خبر صبر کی دشمن ہے عزیز
ضبطِ غم کے لئے اک سخت مقام آیا ہے

تعیش ٹونکی :—

بخشش کرکی ہستیِ غم پرسشِ غم تک پہونچے
کون اب ان کے اس اندازِ کرم تک پہونچے
جام زریں نہ سہی، جام سفالیں ہی سہی
کوئی ساغر تو ہو ایسا کہ جو ہم تک پہونچے
آسماں سے مری راہوں کے اجالے لینے
کتنے خورشید مرے نقشِ قدم تک پہونچے
اب تو یہ عزمِ جنوں ہے کہ بہ پیچ منزل میں
گلستاں اپنی بہاریں لئے ہم تک پہونچے
جیں اس شان سے اٹھے درِ جاناں سے ہم
رقص کرتے ہوئے دیر و حرم تک پہونچے

نظر شاہجہاں پوری :—

اکثر وہ اس ادا سے سرِ رہگذر ملے جیسے اک اجنبی سے اچانک نظر ملے
ناصح! یہ کیا کہا کہ تمنا فریب ہے اے کاش! یہ فریب مجھے عمر بھر ملے
اس گردشِ حیات میں کیسا سکونِ دل تسکین کے نفس بھی بہت مختصر ملے
آ اے نظر چلیں اسی بزمِ جمال میں
شاید ہمیں تمہیں بھی تجلّیِ نظر ملے

سید اسعد گیلانی

وارداتِ زنداں

قید خانہ بھی عجیب عالم کیفیات ہے اسے عالم برزخ سے تشبیہ دیں تو اپنی خصوصی کیفیات کے اعتبار سے بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔۔ اعراف والوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ ان کے اور کفار کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور دوسری طرف عذاب ——

یہاں کتنی ہی باتیں ہیں جو دوست، احباب اور عزیز و اقارب سے کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے۔ کتنی ہی ان کی خبریں ہیں جو سننا چاہتے ہیں کوئی خبر ان کی طرف سے یہاں نہیں پہونچتی۔ آدمی گونگے کے عالم میں اس مقفل چار دیواری کے اندر ڈولتا پھرتا ہے۔ انسان اگر محشرِ خیال ہے تو اس محشر کا طوفان یہاں آکر امنڈتا ہے۔ اس جیل خانہ کا پھاٹک جہاں آکر بند ہوتا ہے جو آدمی کی ہستی میں بند رہتا ہے اور یہاں آکر پتہ چلتا ہے کہ کتنی قیمتی چیز ہے جو انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے اس کی پیدائش کے ساتھ ہی سونپ کر بھیجا ہے۔ اپنی ملت، اپنے ملک، اپنے نظریات اور اپنے تصورات حیات کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے لوگ ان چیزوں کے اس وقت تک محض نظری علمبردار ہوتے ہیں جب تک قید خانہ سے باہر ہوتے ہیں۔ لیکن جب ایک بار قید خانہ کے پھاٹک کے اندر داخل ہو جاتے ہیں تو انہیں ان نظریات کی قدر و قیمت، افادیت، ضرورت اور اہمیت کا پورا پورا احساس ہو جاتا ہے یعنی پہلے اگر انہیں اپنے نظریات پر ایمان بالغیب حاصل تھا تو اب تصدیق بالقلب حاصل ہو جاتی ہے پہلے اپنے مقصدِ حیات کے حق ہونے پر صرف الفاظ کے ذخیرے تھے تو اب انہیں ان پر عین الیقین اور حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے جس کام کے لئے آدمی ایک بار جیل ہو آتا ہے بشرطیکہ اس نے اسے زندگی کا مقصود اور نصب العین بنایا ہو تو اس کام کے لئے اخلاص، ایثار و قربانی، محبت، جانبازی و جانسپاری اور دل سوزی کی بے شمار دولت لے کر واپس آتا ہے۔ یہ نعمت اول تو نصیب ہی نہیں ہوتی اگر کسی با مقصد آدمی کو حاصل ہوتی ہے یہاں کانٹوں کے پھولوں میں رنگ و بو پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں رنگ و بو کے جھونکوں میں بھی نسیم سحر کی ہلکی سی لہر آتی ہے۔ یہاں تنہائی کے مارے بھی پُرنور ہو جاتے اور بھٹکے ہوئے راہیوں کے راستے روشن ہونے لگتے ہیں۔ یہاں شبنم کے جگر میں بھی فولاد کی سختی آ جاتی ہے اور فولاد کے سینے میں بھی شبنم کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ یہاں لوہا پگھلتا ہے پگھل کر سانچے میں ڈھلتا ہے اور پھر سرد ہو کر ثبات و استقامت کا نقش کالحجر بن جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے قید خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا کہ "۔۔۔ میرے دشمنوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ میری جنت تو میرے سینے میں ہے جو کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوتی۔ قید میرے لئے خلوت ہے قتل میرے لئے شہادت ہے، جلا وطنی میرے لئے سیاحت ہے۔ اگر میں قلعہ بھر دولت بھی دیتا تو وہ اس قیمت کے برابر نہ ہو سکتی تھی جو مجھے میسر ہے اس قید کے سبب جو بہتری مجھے ملی ہے اس کا کوئی بدلہ نہیں۔ محبوس تو وہ ہے جس کا دل اللہ کی یاد سے محبوس ہو جائے اور اسیر وہ ہے جو نفس کا اسیر ہو جائے۔"

ایک دوسری نعمت ہے اور بلاشبہ وہ بہت بڑی نعمت ہے جو یہاں آکر حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے مالک کے ساتھ دل کی حضوری کی
کیفیت ہے جو انسان آناد دنیا میں اپنے مالک کے حضور اس طرح کھڑا ہوتا ہے کہ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور اس کا قلب بے نوا اور غیر متحرک
اس طرح سطحِ آب پر کوئی بچہ نلکی سے بلبلے اڑا رہا ہو لیکن دریا کے گہرے سینے کو خبر تک نہ ہو جس طرح کوئی شخص سمندر کی سطح پر دیا سلائی
اور اندر تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوں۔ بس ایسی ہی ایک کیفیت عبادات میں مدتوں تک بندوں پر رہا کرتی ہے۔ انسان ترستا رہتا ہے کہ
ذکو حضوری میسر آئے اس کے دل میں گداز اور حرکت پیدا ہو۔ اس کے اندر خروش ہو۔ اس کے سینے میں عجز و نیاز کی کوئی آندھی اُبلے
جیسے تڑپوں کبھی زبردست، محیط، بے پناہ اور بے نہایت ہستی کے سامنے حضوری کا احساس وجود پر کپکپی بن کر تھرتھرائے۔ ہونٹ
پر وجود انسانی کا خشک پتھر بھیگے اور اس میں سے خشیتِ الٰہی کی نہریں جاری ہوں لیکن انتظار بس انتظار ہی رہتا ہے۔ اور آزاد و معروف
دماغ مدتوں اس کیفیت کے ہجر میں اپنے دل کی اس پتھریلی حالت پر غور کیا کرتا ہے گویا کہ وہ مٹی کا ایک بے نور بوجھل ڈھیلا ہے۔ گویا کہ
بے روح ریزہ ہے گویا کہ وہ لوہے کا بے گداز ٹکڑا ہے لیکن یہاں اللہ کی طرف سے وہ نعمتِ جانفزا اترتی ہے جسے سوز و گداز اور
قلب کہا جاتا ہے۔ یہاں مٹی کے ڈھانچوں کے اندر دل گداز ہو کر موم ہو جاتے ہیں اور آتشِ دروں کے سوز سے موم بتی کی مانند سخت دل
ب کی طرح سراپا اضطراب بن جاتے ہیں۔ خستہ خیال انسان اپنے اندر کتنے ہی طوفان اٹھتے ابھرتے اور پھیلتے ہوئے محسوس کرتا ہے جن کی
آنکھوں کے ساحلوں سے بار بار آکر ٹکراتی اور اکثر باہر چھلک پڑتی ہیں یہ نعمت بار بار میسر آتی ہے پیہم آتی ہے اور انسان محسوس کرتا ہے
ں ہوں جہاں اسے اپنے مالک کے سوا شاید کسی شے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کا مالک حقیقتاً اس کی رگِ گلو سے قریب بہت قریب ہے اس
یک سانس اس کی ایک ایک آرزو اور سرگوشی اور اس کے ایک ایک خیال تصور اور بے تابی و اضطراب کو اپنے قریب سے دیکھ رہا ہے
ٹوں کے ہلنے، الفاظ کے بننے اور اظہارِ مدعا تک کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

دل کی دنیا میں بہار کا یہ موسم بار بار یہاں آتا ہے اور آدمی بار بار اپنے مالک کے سامنے سجدۂ شکر بجا لاتا ہے کہ وہ اپنے لڑکھڑا کر چلنے
ے کی طرف اس طرح پوری طور پر متوجہ ہے کہ گویا مالک کی ساری توجہات صرف اسی ایک پر ہیں ——— سبحان اللہ وبحمدہ
سبحان اللہ العظیم ۞

یہاں ایک اور محبوب شے اپنے موجودہ اور گذشتہ احباب و اعزہ و اقربا و محبین کی یادیں ہیں جو ساون کے بادلوں کی طرح اُمڈ
تی ہیں ان میں سے ہر ایک کی سہانی شخصیت دل میں محبت اور انس پیدا کرتی ہے۔ ان کی خامیوں کی پردہ پوشی اور درگذر اور ان
نیکیوں کے لئے جزاء و ثواب کی دعائیں نکلتی ہیں ان سے محبت و الفت کا رشتہ غائبانہ طور پر دلوں میں راسخ سے راسخ تر ہوتا چلا جاتا
ہ جو اس زنداں سے باہر ہیں اور خوف و ہراس دہشت گردی اور مصائب کے گرد و غبار میں اپنے نصب العین پر نگاہیں جمائے ہوئے
ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں ان کے قدموں کے لئے ثبات کی اور ان کے حوصلے، باہمی ربط و تعلق، خدا ترسی اور تحریکی وابستگی کی د
اختیار، گرمگو دل سے نکلتی ہے ان میں سے ایک ایک کے ساتھ تحریکِ اسلامی کے میدانِ سعی و عمل میں بارہا ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں لیکن مصروف
غبار نے کبھی ان کے بارے میں غور و فکر، ان کے پُر محبت تعلق کے بارے میں گہرے تاثرات حاصل کرنے کا موقعہ نہیں دیا تھا وہ موقعہ یہا
میسر آتا ہے اور پھر وہ دوست یاد آتے ہیں جو اس میدانِ جہاد میں اپنے درخشاں نقوشِ عمل ہم بے عملوں کے لئے چھوڑ کر آگے گزر گئے ہیں
اپنے مالکِ حقیقی کے پاس پہونچ گئے ہیں۔ چوہدری علی احمد خاں، خان محمد باقر خاں، مولانا مسعود عالم ندوی، ڈاکٹر تاج الملوک اور کتنے ہی کتنے

مجاہدین تحریک اسلامی ہیں جو اپنا کام کر گئے اور مالک کے پاس سرخرو ہو گئے ۔ ان کے لئے مغفرت اور جنت میں درجاتِ عالیہ کی د
ہیں ۔ گہرے تاثر کے ساتھ پُرنم آنکھوں کے ساتھ ان کے کام ان کی باتیں ان کا ایثار ان کی قربانیاں ۔ اور تحریک اسلامی کے لئے ان
جذبۂ عمل یاد آتا ہے اور دل اور آنکھیں ان کی یاد اور محبت سے گداز ہو جاتے ہیں ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کرتے ہوئے اپنی کمزو
۔لک کے حضور اپنے عمل کی کوتاہی یاد آتی ہے تو دل امنڈ آتا ہے۔ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور جب بار بار ان کے لئے دعائیں کرتے ہو
ہے کہ ہم بھی جب اس جہانِ عمل سے اٹھ جائیں اور جب عمل سے سارے سلسلے منقطع ہو جائیں تو شاید ہمارے پیچھے رہ جانے والے
ہے بھی کلمۂ خیر کہیں ۔ ہمارے لئے بھی یوں ہی دعائیں کریں اور بلاشبہ آگے چلے جانے والے ساتھی کے لئے جہاں دعائے مغفرت
کوئی ہدیہ نہیں بھیجا جا سکتا یہ ہدیۂ دعا بہت بڑی نعمت ہے اور شاید کہ ہما ۔ رے ساتھی بھی ہمارے بعد ہمیں یہ ہدیہ ارسال کیا کریں
سے دل موم ہو جاتے ہیں اور ہونٹ کانپنے لگتے ہیں یہ بھی ایک نعمت ہے جو یہاں جیل میں میسر آئی ہے ۔

پھر ایک اور نعمت یہاں کے ساتھی ہیں جن کا وجود بڑا پُرلطف ، بڑا دل خوش کن اور بڑا جانفزا ہے ان ساتھیوں میں
جو قدرت نے خود میرے ساتھ بھیجے ہیں میرے اپنے رفیق ہاشمی صاحب ، گلزار صاحب اور اصلاحی صاحب جن کی رفاقت نے اس
مسرت گاہ ، تربیت گاہ بلکہ مسرت گاہ بنا دیا ہے ، ان کی ، ان کی سعر و خیب ، ان کی آمد و رفت ، ان کی خدا ترسی اور
تازہ ذہن جو میرا ہے ، ان کے دل کی دھڑکن جو میرے اپنے دل کی ہے ان ساری چیزوں نے میرے لئے ایک نعمت بنا دیا ہے
۔لک نے میرے ضعف ۔ اور کمزوری ، عجز اور ناتوانی کا خیال کرتے ہوئے اس نعمت کو میرے ساتھ میرے اپنے احاطے اور کم
دیا ہے ۔ ہاشمی صاحب کی خدا ترسی ، تعلق باللہ ، ہمہ تن بیداری ، اور اپنے رفقاء کے لئے محبت و ایثار اور ہر کام کو آگے بڑھ کر
چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنے رفقاء کار کا ہاتھ بٹانے اور زیادہ سے زیادہ ثواب کمانے کا جذبہ قابلِ رشک اور ناقابلِ فراموش
صاحب تو ہمارے قید خانے کی بلبلِ ہزار داستان ہیں ۔ ان کے دم قدم سے بڑی رونق ہے لطیفے سناتے ہیں ۔ کافیاں اور سی حرف
ہمارے ناتجربہ کار باورچی عبدالرحمٰن کی نگرانی وہ خود کرتے ہیں اور اس طرح پہلا باورچی خانہ اور اس کی ہر شے ان کے چارج میں
ہمارے لارڈ چیمبرلین ہیں ۔ ہمیں لکھنے پڑھنے سے روکتے اور پروگراموں کی پابندی توڑنے کی تلقین فرمایا کرتے رہتے ہیں ۔ روزانہ
پروگرام اس طرح بنا کر اس پر عمل کرتے ہیں جیسے دو ماہ بعد ہی چلے جانا ہے بھائی یہاں کمرے کھول کر بیٹھو اور لیٹے رہو کے ۔
خوب مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں اور رات کو ترنم سے مثنویاں سناتے ہیں ۔ اور شام کو بیڈمنٹن کے کھیل میں اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا
وجود ہمارے لئے بڑا غنیمت ہے ۔ اصلاحی صاحب ہمارے ۔ بعنوان الاولون ہیں جو گذشتہ ۲۲ سال سے جماعت کے ساتھ وابستہ
اس تحریک کے ایک ایک قدم سے واقف اور آگاہ ہیں اور بڑے ذہین اور خالص تحریکی ذہن اور پرجوش قلب کے مالک ہیں مطالعہ ا
نے مطلوب حصوں کا ریکارڈ رکھتے ہیں ان رفقا کی موجودگی تیسری نعمت ہے جو مجھے یہاں میسر ہے ۔ اگرچہ شدید پابندیوں کے سبب
پاس دوسرے قیدیوں کی آمد و رفت بند ہے اور ہم اس اپنی ہی بسائی ہوئی دنیا میں اس طرح رہ رہے ہیں جیسے کسی وسیع سمندر کے
ویران جزیرے پر چار مسافر آ پڑے ہوں اور بس وہی اس سارے جزیرے کی آبادی ہوں اور وہ خود ایک دوسرے کے لئے ہی ساری د

جیل کی اس تنہائی اور قطع تعلق میں ایک اور نعمت گلہریوں کا ایک جوڑا ہے جو ہمارے صحن کے پیپل اور دو خشک شہتوتوں
ہے ۔ یہ جوڑا اب اتنا بے تکلف ہو گیا ہے کہ پیپل سے اترتا ہے اور بار ہا محض برائے سیر و تفریح یا تلاشِ رزق کی خاطر ہمارے کمرے میں

ہے۔ کبھی اِدھر اُدھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے کبھی اِدھر چاپ چیں ہوتی ہے۔ انہیں ہمارا سا خوف ہے اور نہ ہمیں ان سے اجنبیت ہے بس
ہمارے احاطے کے باضابطہ باشندے ہیں اور ہم نے جائے رہائش کے سوا باہمی کچھ بانٹ کر نہیں رکھا ہوا ہے ان کی بے تکلفی کا یہ عالم
ہم بیٹھے پڑھتے ہوتے ہیں اور وہ ہمارے پاؤں میں، ہمارے آس پاس ہمارے کمرے میں ہماری چارپائیوں کے اوپر نیچے، ہمارے دو
پر بے تکلفی سے چہل قدمی اور تلاشِ معاش کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ ہمیں ان گلہریوں کی موجودگی سے بڑی تسکین ہے جس طرح کسی شاعر
نے کہا ہے

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

اس طرح ان گلہریوں کا وجود اس اعتبار سے کہ وہ زندہ مخلوق ہے بے ضرر اور معصوم ہے ہمارے لئے بسا غنیمت ہے اس لئے کہ ہم
خطرناک لوگوں کے پاس ان کا بے خطر چلے آنا یہ بھی ایک بہت بڑی چیز ہے۔

اس جوڑے کے علاوہ تین جوڑے اور بھی ہیں اور وہ ہیں چڑے چڑیاں جو کچھ دنوں بعد دو درجنوں بن جائیں گی۔ انہوں نے ہمارے کمرے کی
ں آشیانے بنا رکھے ہیں ان کے آشیانے ہماری چارپائیوں کے عین اوپر واقع ہیں دن بھر وہ اپنے گھونسلوں کا صحن صاف کرکے ہمارے بستروں
رتے رہتے ہیں ہم بے صبری نہیں کرتے بلکہ ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمارے بستروں کو کوڑا ڈالنے کے لئے پسند کیا ہے جب ہم علی الصبح
ں تو یہ تینوں جوڑے چھت سے اتر کر نیچے برتنوں کے ڈھیر میں آ بیٹھتے ہیں اور پھر ان برتنوں کے ڈھیر میں انہیں بہت کچھ مل جاتا ہے۔ چنانچہ
برتنوں میں کافی کچھ مصروف رہتے ہیں اور بار بار جگہ بدل بدل کر ایک دوسرے کو چوں چوں کی آواز سے پکار پکار کر باہم کھانے پینے کا تبا
تے ہیں اور ساتھ ہی جگہ بدل بدل کر اور پھدک پھدک کر اپنے رزق کے دانوں کا چننا انہیں بہت پسند ہے۔ چڑوں کی گردنوں کے گرد سیاہ
ہیاں اور چڑیوں کی سفید روپہلی صاف گردنوں کے گرد نرم مخمل ان کے امتیاز کا نشان ہوتا ہے برتنوں سے رزق کی تلاش کے بعد پھر وہ ہماری
کے اشیاء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کتاب پر پاؤں ٹکا ٹکا کر اپنی برتری اور ہمارے علم ظاہر سے بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں۔ جب ہم سو رہے
ہمارے کمبلوں اور لحافوں اور تکیوں اور سرہانوں پر بے تکلف ہو کر بیٹھ جانا اور چوں چوں کا نغمۂ سحر خیز بلند کرنا انہیں بہت پسند ہے
پر ہم جاگ جائیں تو پھر گویا ایک فرض ہے جو انہوں نے ادا کر دیا۔ اس طرح اللہ کی یہ آیات انسان کو غفلت سے بیداری کا سبق برابر دیتی رہتی ہیں
بس یہی ہمارا حال اور یہی کیفیت ہے۔ قیدخانے کے اندر انسان سمجھتا ہے کہ باہر کیا کچھ خوبیاں ہیں جن کی اسے خبر نہیں ہے لیکن قیدخانے سے با
ہر وہ سمجھتے ہیں کہ آخر نئی بات ہی کون سی ہوتی ہے جس کی خبر دی جائے۔ بس آزادی و بندش کا یہی فرق ہے جسے ملحوظ رکھنا مشکل ہے یہ وہی فرق
آدمی کے اندر بیٹھنے والے مسافر اور گاڑی سے باہر کھڑے ہوئے مسافر کے جذبات میں ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ قیدخانے میں خط بڑی
ہے اور باہر تو شاید لیکن اندر تو بلاشبہ بعض ملاقات سے بھی کچھ زائد ہی ہوتا ہے۔ افسوس کہ باہر والوں کو اس کی خبر اور احساس نہیں ہے۔

کل دو نمبر دار قیدی ہمارے قریب آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ جانتے ہو کہ ہم لوگ جیل کے اندر کیوں آئے ہیں انہوں نے کہا اللہ ہی بہتر جا
م تو کئی کئی سال سے یہاں جیل میں پڑے ہیں۔ پھر اچانک مجھے حضرت یوسفؑ یاد آئے جن کے دم قدم سے اس جیل خانے کو ہمیشہ کے لئے فخر حاصل
ے اور جہاں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سینکڑوں کو مسلم و مومن بنایا تھا چنانچہ میں نے ان سے کہا "میرے قیدخانے کے ساتھیو! کیا واقعی تم ہمارے
الشان جرم سے واقف نہیں ہو ——— وہ کہنے لگے: "ہم تو بے خبر ہیں اتنا جانتے ہیں کہ تم نے کوئی ہمارے جیسا جرم نہیں کیا ہے تم سب تو نیا
جرم ———"

(بقیہ صفحہ ۷۰ پر)

ہماری نظر میں

کامل اکمل حقانی

تصنیف و تالیف :- پیر میر عزیز اللہ حقانی ، ضخامت ۴۴۴ صفحات ، مجلد ، رنگین و جیبی
قیمت دس روپے ، ملنے کا پتہ :- علمی بک ڈپو اردو بازار کراچی ۔

اس کتاب کے مندرجہ ذیل عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دینی نقطۂ نگاہ سے یہ کس قدر مفید اور معلومات آفریں کتاب
صفت باری تعالیٰ ـــــ پیدائش ـــــ ایک حور کی عبادت ـــــ ایمان کا ثبوت ـــــ مشرک ـــــ منافق ـ
ـــ نماز پنجگانہ ـــ پاکی کی ترغیب ـــ زکوٰۃ ـــ ہجرت ـــ ریاکاری ـــ فریضۂ حج ـــ حقوق والدین و اقربا ـــ حقو
ـــ حقوق یتیم و مساکین ـــ پیغام حق ـــ چپ رہنا ـــ پردے اور فتنہ بازلیڈر ـــ تقلید ـــ انصاف ـــ حسن سلوک
ہر عنوان کتاب اللہ کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے مزین ہے ، عام فہم ترجمہ کے ساتھ ! فاضل مصنف
دردمندی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے ، مقصود مسلمانوں کی اصلاح احوال اور ان کے اندر خشیت الٰہی اور محبت خدا و رسول کے
ہے ! پیر حقانی صاحب اردو زبان کے مشاق لکھنے والے نہیں ہیں اسی سے جگہ جگہ زبان کی کمزوریاں اور غلطیاں ملتی ہیں ـــــ
" درود ہو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ۔ " (ص ۴۲) "ختم" کے لغوی
ہو جانے اور تمام کرنے کے بیشک آتے ہیں مگر اردو میں جب لوگ بولیں گے کہ اس نے فلاں شخص کو "ختم کر دیا" تو اس کے معنی قتل
ـــــ " کلام الٰہی میں ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں ہے " (صفحہ ۲۹) یہ انداز بیان اہل قلم کو زیب نہیں دیتا ـــــ " اگر کوئی
مداخلت کرنے کا ارادہ کرے تو یہ اس کے لئے ناممکن ہے " (صفحہ ۲۹) اس جملہ میں کتنا کچا پن پایا جاتا ہے ۔

" ولقد عمہ نفسہ بینھم " (بے شک ہم نے اُن کے درمیان طرح طرح سے بیر پھیر کر لیا) (ص ۵۹) "ہیر پھیر" میں ذم
کی طرف لیلۃ القدر کی رات کا ترجمہ کیا گیا ہے (ص ۲۵۳) "لیلۃ القدر کی رات" ـ عجب ؟! ص ۲۵۱ پر ایک حدیث درج کی گئی ہے ،
بر یہ لکھا ہے ۔ "یعنی عمر تک خلافت نبوت ہے " بہت کچھ محل غور ہے ، چاروں خلفا راشدین خلافت نبوت ہی کے مظہر اور نمائندے تھے
اس کتاب میں سینکڑوں آیتیں اور ہزاروں حدیثیں ترجمے کے ساتھ درج ہیں ، جن کا مطالعہ باعث خیر و برکت ہے ! لیکن
دیباچے میں اس کتاب کی تالیف کو جو صاحب تالیف کی "کرامت" سے تعبیر کیا ہے اس میں اُن کے حسن عقیدت کو بہت کچھ دخل ہے ، پیر
صاحب نے اپنے کشف و کرامت اور ریاضت وغیرہ کے جو واقعات لکھے ہیں اُن کے بعض اقتباسات وجدان و ذہن کو کھٹکتے ہیں ، اس
اور واردات کو تحریر میں نہ لایا جائے تو اچھا ہے ـــ

حقیقت رمضان

از :- پروفیسر فضل احمد عارف (ایم - اے) ضخامت ۲۶ صفحات ، قیمت سفید کاغذ ایک روپیہ ۲۵ پیسے فی
ملنے کا پتہ :- دارالتصنیف والاشاعت ۱۴ - بی شاہ عالم مارکیٹ ، لاہور

ان کی وجہ تسمیہ، فضیلت رمضان، رمضان کی تاریخی اہمیت، عبادات ماہ رمضان —— ان عنوانات کی شرح و تفسیر بڑا جامع اور ایمان افروز ہے! اس کتاب میں روزہ کی فرضیت، افادیت اور سعادت و برکت کو فاضل مصنف نے خاصے دل نشین انداز میں واضح کیا ہے، اسی طرح یہ کتاب ہر اعتبار سے مفید اور مطالعہ کے قابل ہے! اسلوبِ نگارش بھی جاذبِ توجہ ہے!

[رکع]اتِ تراویح تالیف:- مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، ضخامت ۱۰۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
ملنے کا پتہ:- مجلس علمی جامعہ مفتاح العلوم، مئو اعظم گڑھ (یو۔پی) — انڈیا

[ب]عض جزوی مسائل جن میں احادیث و آثار ہی کی بنا پر اختلافات کی گنجائش پائی جاتی ہے، ایسے مسائل نہیں ہیں جن کو مبحث و موضوع بنا کر ایک دوسرے [پر تفس]یل و تحسین کی جائے! مثلاً ماہ صیام کی تراویح کی رکعتوں کا اختلاف ہے، یہ اختلاف ایسا نہیں ہے جس پر حق و باطل کا حکم لگایا جا سکے، جو کو[ئی آٹھ] میں یا اس سے زائد تراویح کی رکعتیں پڑھ لیتا ہے وہ عند اللہ اجر و ثواب ہی کا مستحق ہوگا! افسوس ہے بعض متشدد اہل حدیث اس مسئلہ میں [اپنے] مسلک پر سخت جوش کرتے ہیں۔ اور ایک اہل حدیث عالم نے تو چیلنج کے انداز میں یہ انکشاف فرمایا کہ اب تک جو مسلمان تراویح کی بیس رکعتیں [پڑھ]تے رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، صرف آٹھ رکعتیں سنت ہیں اور قابل عمل ہیں۔

اسی چیلنج کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، فاضل مصنف نے شرح و بسط کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو فرمائی ہے اور استدلال و تفہیم کا حق [ادا کر] دیا ہے، چند اقتباسات :—

- —— "ترمذی میں ہے، ھکذا ادرکت ببلدنا بمکۃ یصلون عشرین" یعنی میں نے اپنے شہر مکہ میں لوگوں کو بیس رکعت پر عامل پایا۔
- —— "یہ تھے عہد فاروقی سے لے کر تیسری صدی کے تقریباً اوسط تک کے علماء و ائمہ کے مذاہب رکعات تراویح کے باب میں، اور یہ تھا اُس عہد کے مسلمانوں کا معمول، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، بغداد اور بلاد خراسان میں۔ ایک بار اس کو آپ پھر پڑھ جائیے اور دیکھئے کوئی بھی آٹھ رکعت پر اکتفا کرنے کا قائل نہ تھا اور کہیں بھی اس پر عمل تھا۔"
- —— "تابعین میں یزید بن رومان، یحییٰ بن سعید، عبدالعزیز بن رفیع عہد فاروقی میں بیس ہی پڑھنے کا ذکر کرتے ہیں"
- —— "واکثر اھل العلم علی ما روی عن علی وعمر وغیرھما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشرین رکعۃ (ترمذی)
اور اکثر اہل علم اس بات کے قائل ہیں جو حضرت علی و حضرت عمر اور دوسرے صحابہ سے مروی ہے۔ یعنی بیس رکعت کے!"

[ان روای]ات کی روشنی میں عقل و ضمیر کسی طرح اس بات کو نہیں مان سکتے کہ صحابہ کرام اور تابعین کی کثیر جماعت رکعاتِ تراویح میں سنتِ رسول کی معاذ اللہ مخالف[ت کرتی رہی۔ ...]ی اچھی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کی کوئی قطعی معین تعداد ثابت نہیں ہے! اس لئے اہل حدیث اور احناف یا دوسرے [مسلک] والے آٹھ یا آٹھ سے جتنی بھی زائد تراویح پڑھتے ہیں، ان پر خلافِ سنت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ چونکہ تمام مسلمان اتباع سنت ہی کی بہ[...]

---

۹۲ پہ "سرمہ ڈالنا" لکھا ہے، روزمرہ "سرمہ لگانا" ہے، سرمہ ڈالا نہیں جاتا، لگایا جاتا ہے۔

تراویح پڑھتے ہیں، اس لئے تعداد رکعات کے اختلاف کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ اس مسئلہ میں شدت اختیار کر
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن نے یہ کتاب بڑی تحقیق کے ساتھ لکھی ہے اس کے مطالعہ سے احناف کے فقہی مسلک کے بارے میں علم
ہوتا ہے کہ یہ مسلک بھی کتاب و سنّت اور آثارِ صحابہ ہی سے عبارت ہے؛ اور تفقہ فی الدین میں حنفی مذہب ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

حیات حافظ رحمت خاں (طبع ثانی)

تالیف:- سید الطاف علی بریلوی، ضخامت ۴۲۴ صفحات مجلد رنگین گردپوش (قیمت)
ملنے کا پتہ:- آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد، کراچی۔

جناب سید الطاف علی بریلوی نے اردو فارسی اور انگریزی کی درجنوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد حافظ رحمت خاں مرحوم کی سوانح عمری مرتب
کی اور اسی خاندان کے ایک لائق فرزند صاحبزادہ عبدالواجد خاں صاحب کی مالی اعانت کی بدولت یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں زیورِ طبع
سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آگئی، اب تیس سال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے!

"حیات حافظ رحمت خاں" کو عوام سے زیادہ خواص نے پسند کیا، سید الطاف علی بریلوی کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
کا عہدہ ملا، وہ اسی تالیف کے سبب ملا، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم و مغفور جو ایجوکیشنل کانفرنس کے
انہوں نے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں سید صاحب موصوف کے بارے میں فرمایا۔

"ہمیں کام کا آدمی مل گیا ہے، اس لئے دوسری درخواستیں دیکھنے کی ضرورت نہیں"

سید الطاف علی بریلوی صاحب واقعی کام کے آدمی نکلے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے عہدے کے اہل ثابت ہوئے ۲۴ سال تک ہندوستان میں
بعد پاکستان میں وہ اپنی ذہانت، قابلیت اور فرض شناسی کا مسلسل ثبوت دیتے رہے ہیں۔

اس کتاب میں حافظ رحمت خاں کی زندگی کو اس قدر تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اب سے دو سو سال پہلے کی ہندوستانی
سیاسی واقعات اس ذیل میں آگئے ہیں: صفدر جنگ، سعداللہ خاں، نواب قائم خاں بنگش، نواب احمد خاں، نجیب خاں، عماد الملک،
شاہ عالم، قاسم علی خاں نواب مرشد آباد، راجہ بلونت رائے، نول سنگھ، عنایت خاں، مظفر جنگ، ضابطہ خاں، ہیسٹنگز اور نواب
وغیرہ جو اس عہد کی مشہور سیاسی شخصیتیں ہیں، اس کتاب کے ذریعہ ان سے تعارف ہوتا ہے اور یہ بھی کہ کس نے کیا کردار ادا کیا؟ شاہ
کی تفصیل اور مرہٹوں کی جنگوں کا حال بھی اس میں ملتا ہے؛

حافظ الملک نواب رحمت خاں کے ذاتی حالات، اخلاق و عادات، معمولات، علم و فضل شجاعت و شہامت اور طرز حکومت
سے یہ کتاب مزین ہے، عروج کے بعد اس زوال کا منظر بھی کتاب مذکور میں نظر آتا ہے کہ حافظ الملک کی شہادت کے بعد روہیلوں کا
جاتا ہے اور روہیل کھنڈ کے علاقہ کے سینکڑوں گاؤں جلا کر خاک سیاہ کر دئے جاتے ہیں پھر حافظ خاں کے خاندان کو نکبت و ادبار اور
... پڑتا ہے۔

همین است رسمِ سرائے فریب گہے بر فراز و گہے بر نشیب

غرض یہ کتاب زمانہ کے عروج و زوال کا عبرت انگیز مرقع ہے اور "وتلک الایام نداولہا بین الناس" کی شرح و تفسیر کتاب کا آخری حصہ
کے خاندان کے حالات پر مشتمل ہے۔

فاضل مورخ کی یہ پہلی تالیف ہے اس وقت تک قلم میں خاطر خواہ پختگی نہیں آئی تھی اس لئے بعض مقامات پہ زبان و بیان کی کمزوری

رقطب الدین خاں مع بہت سے ہمراہیوں کے جنگ کرتا ہوا مارا گیا" (ص ۸۰) "مع" کا اس طرح استعمال قدیم انداز بیان اور
ے ـــــ "قلعہ اللہ آباد کی تسخیر کی اور بھی کاوش بڑھ گئی" (ص ۱۰۰) "کاوش بڑھ گئی" کھٹکتا ہے ـــــ "چار سو مرد مردانہ کے
ـ صفدر جنگ کے لشکر میں پہنچ گئے" (ص ۱۰۵) "مرد مردانہ" محلِ غور ہے ـــــ "بہت سے سخنانِ نصیحت آئین ارشاد فرمائے"
ف انداز بیان ـــــ "تیس کوس پر آکر افواج بلائے ناگہانی اور قابض ارواح کی طرح جھنکو کے سر پر نازل ہو گیا" (ص ۱۵۰)
سے کیا مراد ہے! غالباً وہ ارواح جو اجسام سے قبض کر لی جاتی ہیں مگر "قابض ارواح" کا سر پہ نازل ہونا کوئی مسئلہ
ارواح کی جگہ "بُری ارواح" لکھنا تھا ـــــ "کسی طرح احمد خاں کی مشارکت ترک نہیں کرتے" (ص ۱۶۷) شرکت،
تھ دینے کے معنی میں "مشارکت" اردو میں عام طور پر نہیں بولا جاتا! یہ لفظ جگہ جگہ ان معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔
اب سعد اللہ خاں حاں کی سالِ وفات (ص ۱۷۰) "سال" تو بالاتفاق مذکر ہے ـــــ "حافظ الملک کی خواہش سے
بریلی میں رہتے تھے" (ص ۱۷۱) اس جملہ میں تو متقدمین کا سا انداز بیان پایا جاتا ہے ـــــ "نواب صاحب کو حضرت شاہ
ہت عقیدت تھی اکثر مزار اقدس پہ تشریف لے جاتے، اور یہ شعر پڑھتے:

خوب واقف ہے مرے حال سے شاہ دانا
عرضِ حاجت تری درگاہ میں نادانی ہے

کے اس عقیدے پر لائق مؤلف کو تنقید کرنی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی خبیر و علیم نہیں ہے! اور وہی سمیع الدعا، دافع البلا
ات ہے۔
کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ۱۶۶۷ء میں راجہ مکرند رائے نے بریلی کی مسجد بنوائی تھی اور آج کے "بھارت" میں ہزاروں مسجدیں
توڑ پھوڑ دی ہیں یا ان پر قبضہ کر رکھا ہے ~~ وہ بھی کیا زمانہ تھا، آج کیا زمانہ ہے
اضل مصنف کوئی شک نہیں حافظ رحمت خاں سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں مگر اُن کے قلم نے دیانت دارانہ تنقید کا فرض بھی انجام
کتاب کے ایک باب کا عنوان ـــــ "سردارانِ روہیلہ پر تقسیم ملک اور حافظ الملک کی سیاسی غلطی" ہے (ص ۱۰۰)، دوسری جگہ

"حافظ الملک کا اس موقع پر شجاع الدولہ کو انگریزوں سے صلح کا مشورہ دینا ایک سیاسی غلطی تھی۔" (ص ۱۸۹)
حیاتِ حافظ رحمت خاں" کوئی شک نہیں سید الطاف علی بریلوی کا قابلِ ستائش کارنامہ اور اردو تاریخ میں لائق ذکر اضافہ ہے۔

رت فریدیہ

مؤلفہ:۔ سر سید احمد خاں، مرتبہ:۔ محمود احمد برکاتی، ضخامت ۷۶، اصفحات (مجلد) قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ:۔ سلطان حسین اینڈ سنز عیدگاہ بندر روڈ، کراچی۔

ان مرحوم نے اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید احمد خاں بہادر مصلح جنگ وزیر ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی کی سیرت
پہلی بار ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی اور اب تقریباً ستر سال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے! "سیرت فریدیہ" کو مولانا حکیم
ٹونک کے مشہور خانوادے کے چشم و چراغ ہیں، جن کا مطالعہ خاصہ وسیع ہے۔ اور شعر و ادب کا

پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں ۔

فاضل مرتب نے "سیرتِ فریدیہ" پر خاصہ بسیط و مفصل دیباچہ لکھا ہے، جس میں سر سید احمد خاں کے حالاتِ زندگی پر تنقید بھی کی ہے! انہوں نے مولانا حالی کی تحریر کی بنا پر لکھا ہے کہ سر سید احمد خاں کی تعلیم ناقص اور نامکمل رہی، اور وہ نہ بہرہ مند تھے اور نہ مغربی علوم سے آشنا تھے نہ عربی پر قدرت رکھتے تھے، نہ انگریزی میں درک نہ ماخذ کی خبر نہ اُن تک رسائی رہی سر سید کی سیاسی زندگی، اُس کے بارے میں حکیم محمود احمد صاحب برکاتی کی یہ رائے ہے ۔

"اس جنگ (۱۸۵۷ء) میں اربابِ ہند دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، ایک طرف ——— ہماری طرف ——— بخت خاں، فیروز شاہ، فضل حق اور محمود خاں وغیرہم تھے، جب بھی ان کا ذکر چھڑ جاتا ہے ہمارے دل دھڑک دھڑک کر اُن کو سلامی دیتے ہیں! دوسری طرف ہمارے مقابل منشی رجب علی الٰہی بخش اور سر سید وغیرہم تھے، ان کے دامنوں پر فرنگیوں کی اعانت و حمایت اور نصرت کا داغ ہے ..!"

"سر سید اس معرکہ (جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) میں ہماری صفوں میں نہیں دشمن کی صفوں میں دیکھے گئے ان کی ہمدردیاں اور وفاداریاں ملک و اہلِ ملک کے ساتھ نہیں تھیں حکامِ انگریزی کے ساتھ تھیں"

حکیم صاحب نے سر سید کی زندگی کے بعض اقتباسات درج کرکے لکھا ہے کہ ۔

"ان سے ان کا ایمان، صداقت اور معرفت الٰہیہ میں نقص پایہ کر قدر گراں گذرتا ہے"

انہوں نے مثالیں دیکر بتایا ہے کہ اس کتاب میں زبان کی متعدد غلطیاں پائی جاتی ہیں مثلاً سر سید نے ننگی کے لئے "تہمت" استعمال کیا ہے جو بگڑ کر "تہمد" ہو گیا ہے "تہمت" ذکر عنصر دن کی زبان ہے! سر سید نے "لوز" کی جمع الجمع "لوزاتیں" لکھا ہے درست اور مانوس نہیں "سیرتِ فریدیہ" کے بارے میں حکیم صاحب موصوف کی یہ رائے ہے ۔

"سیرتِ فریدیہ زبان و ادب کے نقطۂ نظر سے ایک غیر معیاری کتاب ہے اور فنی اعتبار سے مجموعۂ اغلاط و تناقض"

حکیم محمود احمد برکاتی صاحب نے اس کتاب کی بعض تاریخی اور واقعاتی غلطیوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے مثلاً سر سید نے لکھا تحصیل علوم میں یہ قصبہ میں زیادہ مشہور نہ تھا اس پر حکیم صاحب نے حاشیہ میں تنقید کی ہے ۔

"یہ حضرات دہلی پر بہت بڑا اتہام ہے آخر علامہ فضل حسین خاں نے بھی تو دہلی ہی میں تحصیل کی تھی، پھر اُسی دور میں علامہ فضل امام خیرآبادی شاہ ولی اللہ اور اُن کے صاحبزادگانِ کرام شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین وغیرہ بکثرت یہ صفات کے فاضل و ماہر علماء موجود تھے"

حکیم صاحب موصوف نے کتاب کے آخر میں ان مشہور شخصیتوں کے مختصر حالات لکھے ہیں، جن کے نام "سیرتِ فریدیہ" میں آئے حکیم غلام نجف خاں کا سلسلۂ اسناد جو انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملایا ہے وہ ایک چٹکلا دینے والا تاریخی لطیفہ ہے ۔

حکیم ناصر الدین احمد خاں مرحوم کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ "ان کا شہرہ دکن تک پہونچا اور پھر سلطانِ دکن کے محلوں تک پہونچے ۔ (ص ۱۶۹) اس میں واقعیت کم اور مبالغہ زیادہ ہے ۔

"سلسلۃ الملوک کے نام سے جو جدول شائع کیا تھا" (ص ۱۱۰) "جدول" مذکر نہیں، مونث ہے، ناسخ لکھنوی فرما

جا بجا تعریف لکھی ہے خطِ رُخسار کی
چاہیے جدول مرے دیوارگر زنگار کی

لکے اس جملہ " ایک کمپنی سپاہیوں کی بطور تنظیم تعینات کی گئی " پر حکیم صاحب نے جو گرفت کی ہے کہ ـــــ " فصحا اس جگہ " متعین " یہی صحیح بھی ہے ، تعینات کا استعمال اہلِ علم کے یہاں نہیں دیکھا گیا " (ص ۶۵) وہ درست نہیں! " تعینات " اُردو روزمرہ ہے! غالباً وہین کی " قاموس الاغلاط " پڑھ کر انہیں یہ مغالطہ ہوا کہ " تعینات " فصحا کی زبان نہیں ہے۔

ن کا ایک جملہ ہے :-

چند سال وہاں بھی نہایت عروج سے رہے " (ص ۱۲۹) " عروج سے رہنا " محلِ غور ہے ـــــ " اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادۂ رِف ہو گئی ہے " (ص ۱۴۷) یہ کس قدر پُر تکلف اندازِ بیان ہے جو سر سید کو زیب نہیں دیتا۔

ل کتاب (سیرت فریدیہ) کوئی شک نہیں ایک اہم تاریخی دستاویز ہے اور اس پر حکیم محمود احمد برکاتی کا نقد و تبصرہ بھی خوب ہے۔ سر سید حکیم صاحب کا نقد و احتساب ناگوار گزرے گا مگر کوئی ناقد اور اہلِ قلم کسی کی ناگواری کے خیال سے اپنے ضمیر کی آواز کو تو نہیں دبا سکتا

معاہدہ عمرانی یا قانون سیاسی

از :- ژاں ژاک روسو مقدمہ و حواشی :- ڈاکٹر محمود حسین
ضخامت ۴۴۶ صفحات (دیدہ زیب ٹائپ ، خوبصورت پائدار جلد ، دبیز کاغذ) قیمت نو روپے۔
ملنے کا پتہ :- شعبہ تصنیف و تالیف کراچی

وسو (پیدائش ۱۷۱۲ء) کی شہرۂ آفاق کتاب " کونترا سوسیال " (Contrat social) ـــــ معاہدہ عمرانی ـــــ کا سے تیس سال پہلے جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا تھا ، اب لائق مترجم ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے طبع اول پر نظرِ ثانی فرما کر اس میں معمولی رد و بدل کیا اور تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی نے بڑے اہتمام سے اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپا۔

ڈاکٹر محمود حسین نے اس کتاب پر فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں روسو (Rousseau) کے حالاتِ زندگی کے علاوہ اُس کے فلسفہ سے متعلق بہت کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

" فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں روسو کی یہ تصنیف انقلابیوں کی انجیل تھی۔ اُن کے لئے دنیا کے تمام سیاسی حقائق اس کے اندر موجود تھے۔

روسو کے " معاہدہ عمرانی " کا جو درجہ فلسفۂ سیاسیات میں ہے وہی رتبہ " ایمیل " کا فلسفۂ تعلیمات میں ہے ـــــ روسو کی تمام تصانیف کو پڑھتے وقت ایک بات کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہیے ، وہ یہ کہ اس نے اپنے خیالات شاعرانہ زبان میں ادا کئے ہیں۔

اس فلسفہ کی اہمیت کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ جدید فلسفہ کا سب سے بڑا امام " کانٹ " اپنے تمام سیاسی اور عمرانی نظریوں کے لئے خود اپنے قول کے مطابق روسو کا رہینِ منت ہے "

روسو کی کتاب کے چند منتخب اقتباسات :ـــــ

ـــــ " ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کی بقا کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالے کبھی بھی کسی نے اس شخص

کیونکہ اپنے آپ کو آگ سے بچانے کے لئے کھڑکی میں سے کود پڑے کیا خودکشی کا مجرم قرار دیا ؟

- "ہم اگر خود قاتل ہوتے ہیں تو اپنے مرنے پر رضامند ہو جاتے ہیں"
- "ریاست جتنی بڑی ہوگی آزادی میں اسی اعتبار سے کمی واقع ہوگی"
- "حکومت اور ریاست میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ریاست کا وجود بذاتہ ہوتا ہے مگر حکومت کا وجود ریاست سے وابستہ ہوتا ہے"
- ریاست جتنی وسیع ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی حقیقی طاقت بڑھتی جاتی ہے (مگر روسو ریاست کے وسیع ہونے میں یہ عیب دیکھتا ہے کہ ریاست کی وسعت کے بقدر آزادی میں کمی واقع ہوگی ——— م۔ ق)
- حقیقی حکومت عوام کا وجود اپنے اصلی معنوں میں کبھی بھی دنیا میں نہیں رہا اور نہ آئندہ ہوگا (روسو کا یہ خیال صحیح نہیں ہے ۔ م۔ ق)
- "مطلق العنان حکومت رعایا پر حکومت نہیں کرتی کہ اسے مرفہ الحال بنائے، وہ اسے انتہا تباہ حال بناتی ہے تاکہ اس پر حکمرانی کر سکے"
- "لوگ اپنی دولت کا ایک حصہ اس لئے قربان کر دیتے ہیں کہ بقیہ دولت میں بلا مزاحمت اور فراغت سے اضافہ کر سکیں"
- "اگر کوئی شہری معاملات ریاست کے متعلق یہ کہہ دے کہ ان سے مجھے کیا غرض ؟ تو سمجھ لینا چاہئے کہ ریاست کا خدا ہی حافظ ہے"
- "مسیحی شریعت ریاست کے مستحکم دستور کے لئے اتنی مفید نہیں جتنی مضر ہے"
- "مسیحیت ایک خالص روحانی دین ہے، جو صرف نے آخرتک آسمانی امور سے متعلق ہے، مسیحی کا ملک یہ دنیا نہیں"

اعتراف ——— "مذہبی عبادت اور ریاست کے درمیان لازمی طور پر کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس مسئلہ میں حضرت محمدؐ کی رائے نہایت صائب و سلیم تھی۔ انہوں نے اپنے نظام سیاسی کو کامل طور پر متحد و محکم بنا لیا تھا اور ان کے خلفاء کے ماتحت ان کا مقرر کیا ہوا طریقہ حکومت قائم رہا، حکومت واحد و غیر منقسم رہی اس لحاظ سے بہت اچھی رہی . . . "

اس کے برخلاف روسو دوسرے مذاہب کے بارے میں یہ حکم لگاتا ہے ۔

"مذہب کی ایک تیسری اور بہت انوکھی قسم بھی ہے جس میں دو قسم کے قوانین دو حکمران اور دو ملک ہوتے ہیں اور جو اپنے پیروؤں پر متضاد قسم کے فرائض عائد کرتا ہے اور نہ تو دیندار انسان بننے دیتا ہے اور نہ شہری ! یہی مذہب لاما کا ہے، یہی جاپانیوں کا اور یہی رومن کیتھولک کا ہے، اسے پادریوں کا مذہب کہا جا سکتا ہے یہ مذہب ایک ایسی مخلوط اور معاشرتی شریعت کی طرف لے جاتا ہے جس کا کوئی خاص نام نہیں ؟"

روسو کے اس جملے میں کتنی ادبیت اور ندرت پائی جاتی ہے ـــــــ

"یاد رکھو شہر پناہ گاہیں گاؤں کے کھنڈروں کی اینٹوں ہی سے تعمیر ہوتی ہیں اور دارالحکومت کے ہر عالی شان محل میں مجھے ایک پورے دیہاتی علاقے کی تباہی و بربادی نظر آتی ہے۔"

کوئی شک نہیں روسو کی یہ کتاب مقبول خاص و عام ہے اور شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ اُس نے 'معاہدہ عمرانی'' کا جو فلسفہ اس کتاب میں پیش کیا ہے، وہ جمہوریت، حکومت، شورائیت اور عمرانیت کے حدود متعین کرتا ہے! روسو کے خیالات بے شک بہت اعلیٰ ہیں مگر اس قسم کی کمزوریاں بھی اس کتاب میں ملتی ہیں:ـــ

"بہر کیف اگر ریاست مناسب حدود میں محدود نہ کی جا سکے، جب بھی ایک تدبیر ہے، وہ یہ کہ کوئی ایک دارالحکومت قرار نہ دیا جائے بلکہ حکومت باری باری ہر شہر میں منتقل ہوتی رہا کرے۔" (ص ۱۶۱)

ہمارے موجودہ دور سیاست میں تو یہ مشورہ ایک مضحکہ اور اعجوبہ سے کم نہیں ہے! کتاب کا ترجمہ خوب نہیں، بہت خوب ہے جس پر فاضل مترجم علمی دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں!

فارقلیط از:- عبدالعزیز خالد، ضخامت ۲۹۶ صفحات اردیدہ زیب دہلی ٹائپ، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ، قیمت ۴ روپے۔ ملنے کا پتہ:- الیان پبلشرز ۴ فیض محمد فتح علی روڈ، پاکستان چوک کراچی۔

جناب عبدالعزیز خالد نظم گوئی میں اپنا خاص رنگ رکھتے ہیں اُن کا مطالعہ بہت وسیع اور حافظہ قوی ہے، اس لئے تاریخ و ادب اور اخلاق کی تلمیحات کی رنگا رنگی اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے!

انجیل مقدس میں حضرت خاتم الانبیاء احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو "فارقلیط" کہا گیا ہے، جس کے معنی ستودہ صفات (احمد) ہیں۔ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نے اپنے بعد حضور کی بعثت کی بشارت دی تھی (یاتی من بعدی اسمہ احمد) یہ بات اپنی جگہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حضور دعائے خلیل بھی ہیں اور بشارت مسیح بھی ہیں (فداہ ابی و امی)

عبدالعزیز خالد کی یہ نظم نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت سے عبارت ہے، پوری نظم جو ۲۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ایک ہی قافیہ میں ہے، اُردو، فارسی اور عربی کے کسی شاعر نے ـــــ اس التزام کے ساتھ اتنی طویل نظم نہیں کہی یہ دلیل ہے شاعر کی قدرتِ سخن اور پرگوئی کی! اور اس کی بھی کہ وہ حضور رسالت مآب کی ذات گرامی سے گہری عقیدت رکھتا ہے (اللھم زد فزد)

عربی الفاظ کی کثرت اور گراں باری کا یہ عالم ہے کہ ـــــ حسن التبغل، ترفل، تہمقس، منکرس، حالقہ، سالقہ، شاقہ، دفتار، اشتلم (یہ لفظ ترکی معلوم ہوتا ہے) بھر البغی، جیسے الفاظ اس نظم میں استعمال ہوئے ہیں، جن کے معنیٰ جاننے کے لئے لغات کی ورق گردانی کرنی پڑے گی۔

کردار و شخصیات کی یہ رنگا رنگی اور فراوانی ہے کہ حبابہ، خلیدہ، شماسیہ ـــــ ابن میمون، مجدلانی، ایکلیذ، عمونی، ... ، الیفز، بلدد اور صوفر و اہل کبد جیسے نام آئے ہیں جن کے حالات معلوم کرنے کے لئے بہت سی کتابوں کو پڑھنا ہوگا! کتاب کا آخری باب

ص ۲۲۱ پر غالباً کمپوزیٹر کی غلطی سے "مفروضہ" کی جگہ "فرضیہ" چھپ گیا ہے، ص ۲۲۲ کے ذیلی نوٹ میں "لالچ" کو مونث لکھا ہے، حالانکہ بالاتفاق مذکر ہے (م-ق)

خریدی ہے دل بیچ کر جان میں نے — یہ سودا مگر پھر بھی سستا پڑا ہے

تو دل جوئی و غم گساری کا پیکر — تو خیر البشر اشرف الانبیاء ہے

لتاب: وہ محبوب اعظم ہے صلّوا علیہ — وہ جانِ محبت ہے کانِ وفا ہے

مبلّغ چلے داعیٔ خیر بن کر — قضا ساربان ہے، اجل رہنما ہے

مجھے کوہ تنعیم ہے، کوہ سینا — یہ دہلیز دروازۂ کبریا ہے

لٹاتا ہے دیکھو صہیب اپنی دولت — زخارف کی آخر حقیقت ہی کیا ہے

تولالا تغا نوا ولا تحزنوا کی — دلیلِ رہ شدت و ابتلا ہے

فطوبیٰ لکم ایہا السابقون — شرف افضلیت کا تم کو ملا ہے

سب انسان آدم سے مٹی سے آدم — تفوق کا معیار خوفِ خدا ہے

تراشو نہ بت رنگ و نسل و وطن کے — فضیلت کا معیار صرف اتقا ہے

ب: ترازو میں تولا ہے ٹیلوں کو کس نے — ہواؤں کو کس نے مسخر کیا ہے

ہے اضداد سے رونقِ بزمِ عالم — بہار و خزاں ہے تموز و شتا ہے

تنوع پہ قائم ہے یہ کارخانہ — ہر اک شے کا منہاج و مسلک جدا ہے

ہے مدح و ملامت موحد کو یکساں — خدا کی فقط وہ رضا ڈھونڈتا ہے

بشر گھاس کا پھول شبنم کا قطرہ — نوامیس فطرت سے جنگ آزما ہے

وہ حصنِ حصیں دل کا بُرجِ مقفّیہ — ان آسانیوں نے مسخر کیا ہے

اب: ہے سرمایہ عافیت، بیمِ دریا — سفینہ رہی گرداب میں ڈوبتا ہے

لتاب: ہے سجادہ خونِ مسلماں سے رنگیں — یہ اسلام کی سُنّتِ جاریہ ہے

تھا عاشق کا خوں رنگ لا کر رہے گا — جو دُھل جائے پانی سے رنگِ حنا ہے

وفا و حمود ہمراہ کاسِ مروّق — نہ بیمِ عسس ہے نہ خوفِ خدا ہے

ب: کتابِ خدا زینتِ طاقِ نسیاں — کتاب الاغانی کا دفتر کھلا ہے

حسینانِ نوشیں لب و سیمبر نے — گزشتہ زمانے کو لوٹا دیا ہے

ہیں گرد عزیباں پہ چھینٹے لہو کے — یہ اجرِ شہیدانِ خونیں قبا ہے

ناب: یہ نظارگی شہرِ بیگانگی کی — زباں آشنائے السّرا ہے

کہاں نعت و نامِ رسولِ تہامی — کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

پیمبر کہ ہے امّی لکنت بتاؤ — کہ یہ مرتبہ میرے مملوک کا ہے

خ: دمِ گفتگو منہ سے کرنوں کی بارش — دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے (ص ۱۱)

"دہن" کی نہیں چہرے کی تشبیہ مہرِ تاباں سے دی جاتی ہے۔

بوئے مشکِ اذفر سی ہے بدن میں — ترا پیرہن تختہ گلزار کا ہے (ص ۱۲)

"ادا"، "رو" وغیرہ الفاظ صوتی طور پر واؤ معروف کے ساتھ بولے اور شعروں میں استعمال کیے جاتے ہیں" اس طرح ...

ط عمل میں آیا۔ اُن کے بارے میں اس کتاب میں لکھا ہے :۔

> "حیدرآباد دکن کی صدارت عظمیٰ پر کسی زمانے میں سالار جنگ اول، سر علی امام اور سر اکبر حیدری جیسے مدبرین اور غیر معمولی صلاحیت اور قابلیت والی ہستیاں فائز رہی ہیں، اس پر پہلی مرتبہ ایک ایسے عوامی صدر اعظم (یعنی میر لائق علی) کا تقرر منظور ہوا، جس کو نہ سیاست کا تجربہ تھا نہ پبلک لائف سے واسطہ بلکہ محض ایک صنعت کار تھا اور یہ تقرر ایک ایسے زمانے میں ہوا تھا جب کہ ملک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا . . . . اگر لائق علی کو بلا کسی پابندی کے خود مختاری کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ حالات کو سازگار بنانے کی کوشش کرتے، لیکن وہ قاسم رضوی کے نامزد کردہ تھے، اتحاد المسلمین نے جو حیدرآباد کے مستقبل کے منصوبے تیار کئے تھے، اُس سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔" (ص ۱۵۲-۱۵۳)

ن مصنف کی خوش خیالی اور حسن ظن سے، میر لائق علی کو پاکستان میں حیدرآباد ٹرسٹ کی نگرانی کا موقع ملا، وہ کسی پابندی اور روک ٹوک کے ٹرسٹ کے سپید و سیاہ کے مالک تھے مگر ٹرسٹ کا جو حشر ہوا ہے وہ اُن کا افسوس ناک کارنامہ ہے۔

سر والٹر مانکٹن، سر سلطان احمد وغیرہ نے حکومت دکن کے نمائندوں کی حیثیت سے بھارت گورنمنٹ سے جو معاہدہ کیا تھا، اُس "معاہدہ ام جاریہ" کو قاسم رضوی نے حیدرآباد کے خاتمہ سے تعبیر کیا۔ اور اس پر میر عثمان علی خان نظام دکن کے دستخط نہیں ہونے دئے قاسم رضوی کی اُ کے بارے میں مصنف کی یہ رائے ہے :۔

> "ہندوستان سے گفت و شنید کی طویل مدت میں قاسم رضوی سے یہی سب سے بڑی غلطی سرزد ہوئی جس نے حیدرآباد کی قسمت پر مہر لگا دی، ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان اختلافات کی جو خلیج تھی وہ وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔"

صاحب چھتاری (سر احمد سعید خاں) کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :۔

> "معاہدہ انتظام جاریہ پر نظام کے دستخط سے قبل ہی وزارت عظمیٰ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ نواب چھتاری طبعاً شریف، مسلمانوں کے ہمدرد اور خانوادۂ آصفی کے بہی خواہ ضرور تھے، لیکن حالات جو تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے اُس سے نپٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، علاوہ ازیں صوبہ متحدہ ہند میں ان کے مفادات زمینداری سے وابستہ تھے، جن کو وہ اپنی ملازمت پر قربان نہیں کر سکتے تھے۔"

رضوی اور جنرل العیدروس پر تنقید و احتساب :۔

- "قاسم رضوی کو پہلے ہی سے اس بات کا اندازہ تھا کہ صیانتی کونسل میں حیدرآباد کا مسئلہ پیش ہوتے ہی ہندوستان، حیدرآباد پر حملہ کر دے گا، اور بالکل ایسا ہی ہوا، اس بیان پر رضوی نے یہ دعا مانگی تھی کہ ہندوستان اور حیدرآباد کی کشمکش کا جلد خاتمہ ہو تاکہ دونوں میں سے کوئی ایک فنا ہو جائے، انہیں اس کا علم بھی تھا کہ قوی اور ضعیف کی کشمکش میں ضعیف ہی خسارے میں رہتا ہے، اس کے باوجود انہوں نے حیدرآباد کو جو کسی طرح ہندوستان سے جنگ کرنے کے موقف میں نہ تھا، فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔
- "حیدرآباد کی فوج جنرل العیدروس کے زیر کمان تھی، جنہیں نہ صرف حیدرآباد کی فوجی بضاعتی کا علم تھا بلکہ ہندوستانی

فوج کی طاقت و قوت کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ لیکن اپنی اہمیت جتانے کے لئے بادشاہ، وزیر اعظم اور قائد قوم سب کو انہوں نے اس فریب میں مبتلا رکھا کہ حیدرآباد کی فوج کا مورال (M O R A L E) اتنا بلند ہے کہ وہ آسانی سے تین مہینوں تک ہندوستانی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے، لیکن فوج کو جنگ تیار کرنے کے لئے جو جتن کئے جاتے ہیں، اس سے جو مجرمانہ غفلت برتی، اُس سے اُن کی وفاداری بھی مشکوک ہوتی جاتی ہے۔"

● ـــ "الیدرُوس شخصی طور پر ہندوستان کے فوجی کمانڈروں کی صلاحیتوں سے بھی واقف تھے، حیدرآبادی فوج کی بے مائگی، تعداد کی قلت، اسلحہ کا فقدان اور بمبار طیاروں کی عدم موجودگی کا بھی اُنہیں علم تھا، دیانت داری کا اقتضا یہ تھا کہ وہ قاسم رضوی اور لائق علی دونوں کو اچھی طرح جتلا دیتے کہ حیدرآباد کی فوج ہندوستان کی فوج کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی ۔ ۔ ۔"

جناب باسط شکیب نے حالات کا کس قدر صحیح اور معقول تجزیہ کیا ہے ـــ

"ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ انتظام جاریہ کے بعد ہندوستان سے مستقل معاہدہ ہو جاتا تو اس میں شک نہیں کہ ہمارا سیاسی موقف اور اقتدار ختم ہو جاتا، لیکن ہمیں پھر بھی حیدرآباد میں ایک باعزت زندگی بسر کرنے کا موقع کم از کم چند سالوں تک حاصل رہتا، معاشی حیثیت سے مسلمان تباہ نہ ہوتے ان کی جائدادیں محفوظ رہتیں اور لاکھوں کی تعداد میں وہ قتل و غارت گری کا شکار نہ ہوتے۔"

انگریز کی بے وفائی اور ڈپلومیسی کو باسط شکیب کے قلم نے اس طرح بے نقاب کیا ہے۔ ـــ

"انگریزوں کے پاس حیدرآباد کو اس وقت تک بڑی اہمیت حاصل رہی جب تک اُن کے دل میں ہندوستان سے دامن جھٹک کر چلے جانے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ لیکن جونہی ہندوستان چھوڑنے کا انہوں نے فیصلہ کیا اس کے سارے احسانات، اُس کی دوستی اور وفادارانہ خدمات کو فراموش کر دیا، اُس کے سوا وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے، انہیں ہندوستان کی نئی قومی حکومت سے اپنے معاشی اور تجارتی تعلقات قائم رکھنے تھے۔ تاکہ یہاں کی سیاست سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد ہندوستان کو برطانیہ کا معاشی اور اقتصادی حیثیت سے دست نگر کیا جا سکے اپنے اس مفاد کی خاطر وہ نظام حیدرآباد اور کسی والیٔ ریاست کے ساتھ مخصوص سلوک کرنے کے موقف[1] میں نہیں تھے۔"

صفحہ ۲۰ پر وہ لکھتے ہیں ـــ

"۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ والیٔ ملک کی اولاد والاشان تک ساہوکاروں اور مہاجنوں کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔"

اس میں مبالغہ کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، نظام حیدرآباد کے دونوں فرزند اعظم جاہ اور معظم جاہ بے شک مہاجنوں اور ساہوکاروں سے قرض لیتے

---

[1] لیکن ایسا کرنے پر قاسم رضوی علامہ اقبالؔ کا یہ مصرعہ پڑھ دیتے ـــ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی ـــ "موقف" کی جگہ صحیح لفظ "حق" ہو سکتا تھا ـــ م۔ق

، مگر وہ ایسا فرض نہیں تھا جسے "مہاجنوں کے بنجوں کے جھگڑے" سے تعبیر کیا جائے۔

لائق مصنف نے حیدرآباد کے رضاکاروں کی دست درازی کا بھی اعتراف کیا ہے اور اس کمزوری پر پردہ نہیں ڈالا، وہ لکھتے ہیں :-

"ضلع ناندیڑ کے قصبہ لوہا کا واقعہ قابلِ ذکر ہے، جو نہ صرف ہندوؤں کی بڑی تجارتی منڈی تھی بلکہ یہاں کے ہندو بڑے مالدار بھی تھے ایک منظم منصوبہ کے تحت اس قصبہ کو تاراج کیا گیا، یہاں کی غارت گری کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ناندیڑ میں لوٹ کا سونا فی تولہ تیس بتیس روپیہ سے فروخت ہوا جب کہ بازار کا نرخ نوے روپیہ تھا"

بہادر یار جنگ کی تعریف میں یہ جملہ :-

"اردو کے علاوہ عربی اور فارسی زبان پر انہیں اتنا عبور تھا کہ ان زبانوں میں تقریر کرتے تھے" (ص ۲۹۴)

لغہ آمیز ہے نواب صاحب موصوف فارسی جانتے تھے اور مطلب براری کی حد تک عربی بھی بول لیتے تھے۔ مگر فارسی اور عربی میں تقریر کا انہیں ملکہ نہ تھا !

"سالار جنگ اول کے زمانہ میں جدید حیدرآباد کا احیاء ہوا اور حکومت کی مشنری کو زمانہ کی ضروریات کے مطابق کرنے کے لئے عہد آفریں تبدیلیاں عمل میں آئیں تو شمالی ہند کے علماء و فضلاء ہی کی طرف سالار جنگ کی نظریں اٹھیں، سرسید کی انقلاب انگیز تحریک کے جتنے بھی ساتھی تھے انہیں ایک ایک کرکے حیدرآباد کھینچا گیا اور یہ سلسلہ حیدرآباد کے سقوط تک جاری رہا، اس کا ناخوش گوار پہلو وہ تھا کہ ہر عالم کے ساتھ جو کسی اچھے عہدہ پر طلب کیا جاتا تھا، متوسلین اور نااہل طالبانِ کرم کا ایک لشکر ہوتا تھا جو دیگر ذیلی عہدوں اور ملازمتوں میں جذب ہو کر مقامی آبادی کے لئے روزگار کے دروازے بند کر دیتا تھا یہ چیز ہندوؤں اور مسلمانوں بالخصوص اول الذکر کے لئے بڑی سوہانِ روح بن گئی تھی جس نے بالآخر ملکی تحریک کی صورت اختیار کی، حیدرآباد میں ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ باہر سے آنے والوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا لی تھی اور مقامی آبادی کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اعلیٰ خدمتیں شمالی ہند کے مسلمانوں کا اجارہ بن گئی تھیں اور حیدرآباد کا قابل فرد پریشان اور بدحال نظر آتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۹۱)

حیدرآباد دکن میں ملکی اور غیر ملکی کی تحریک مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والے ہندوؤں نے شروع کی تھی، جس سے عثمانیہ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان خاصے متاثر ہو گئے، راقم الحروف کو یاد پڑتا ہے کہ غالباً ۱۹۳۰ء میں کانگریس کے سب سے بڑے دکنی نیتا اور متعصب لیڈر نایک کی زیر سرکردگی دکن دو جنی تھیٹر میں جلسہ ہوا، جس میں نواب بہادر یار جنگ نے بھی تقریر کی اور بڑے جوش کے ساتھ اس سبھائیت زدہ ملکی تحریک کی حمایت فرمائی مگر نواب صاحب مرحوم اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت جلد اس چکر سے نکل کر عالم گیر دینی اخوت اسلامی وحدت کے داعی اور مبلغ بن گئے مگر افسوس ہے کہ سقوطِ حیدرآباد کا دردناک انقلاب بھی جناب بدر شکیب کے دل سے اس غبار کو دور نہ کر سکا۔

جہاں تک ملکی اور غیر ملکی مسئلہ کا تعلق ہے خود حکومت آصفیہ کے بانی مبانی دکنی نہیں غیر ملکی تھے ! بلکہ اس تلخی اور تکدر کا سلسلہ تو اس ہی دور تک پہونچتا ہے ! واقعہ یہ ہے کہ شمالی ہند یعنی یو۔ پی کے ذہین اور تعلیم یافتہ مسلمان خدانخواستہ کسی سازش یا محض جلب منفعت

کی خاطر حیدرآباد دکن نہیں گئے ؟ اور دکن ہی پر کیا منحصر ہے بھوپال، ٹونک، چھتر پور، جے پور، بہاولپور، پٹیالہ وغیرہ ریاستوں میں یو۔پی کے مسلم افراد نے بڑے بڑے عہدوں پر رہ کر وہاں کے نظم و نسق کو سنبھالا اور اُسے چار چاند لگائے ! نواب سالار جنگ نے بھی ریاست حیدرآباد دکن کے نظم و نسق کو زیادہ بہتر اور مستحکم بنانے کے لئے یو۔پی کے متعدد تعلیم یافتہ مسلمانوں کی خدمات حاصل کیں ! ظاہر ہے کہ یہ افراد اپنے ساتھ متعلقین کو بھی دکن لے گئے، اُن کی اولاد وہاں پلی بڑھی اور چونکہ ملازمت ہی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا واحد ذریعہ روزگار تھا، اس لئے یہ لوگ سرکاری ملازمتوں میں جذب ہوتے چلے گئے ! مثال کے طور پر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل تھے، جو نواب میر عثمان علی خاں فرماں روائے دکن کے شعر و سخن میں استاد تھے، انہوں نے جوانی کے بعد ساری زندگی دکن ہی میں گزار دی اور اُسی زمین کا پیوند ہو رہے گئے اُن کی اولاد اگر نہ کرتی تو آخر کیا کرتی !

دو چار افراد کے علاوہ یوپی کے مسلمانوں نے یہ نہیں کیا کہ دکن کی ملازمتوں سے پنشن لے کر وہاں سے چلے آئے ہوں اور اپنے وطن میں کوٹھا بنوائی ہوں یا جائدادیں خریدی ہوں، انہوں نے تو حیدرآباد کو اپنا محبوب وطن بنا لیا اور اُن کی کمائی ہوئی دولت دکن ہی میں رہی ! کوئی شک نہ اُن کی ذہانت، وفاداری، قابلیت اور فرض شناسی سے ریاست حیدرآباد کو فائدہ پہونچا اور وہاں کے تمدن و تہذیب میں نکھار پیدا ہوا ! ۔ حکومت دکن کی اعلیٰ خدمتیں شمالی ہند کے مسلمانوں کا اجارہ نہیں تھیں بلکہ ان کی قابلیت و استعداد کا فطری مظہر تھیں ۔

جناب بدر شکیب نے ملکی اور غیر ملکی کا ذکر جس انداز میں چھیڑا ہے اُس کے سبب اُن کی اچھی خاصی کتاب داغدار ہو گئی !

" اب تقی الدین کے اثر میں علی یاور جنگ کی مخالفت شروع کی " (ص ۱۶۱) " زیر اثر لکھنا تھا ——— " حیدرآباد سے بیل و مرام واپس ہونا پڑا (ص ۱۶۲) لکھے پڑھے افراد کو زیب نہیں دیتا کہ وہ " بے نیل مرام " کو " بے نیل و مرام " لکھیں اور بولیں !

جناب بدر شکیب نے جس دیدہ ریزی کے ساتھ واقعات کا تجزیہ فرما کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور اس انقلاب کی جو تفصیل پیش ہے اس پر وہ تحسین و تبریک کے مستحق ہیں ! آنے والے مورخین اور اہلِ قلم اس کتاب سے استفادہ کریں گے اور زمانے کے ساتھ اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہے گا ۔

ماہنامہ " افکار " کا حفیظ نمبر

مرتبہ :۔ صہبا لکھنوی، زرِ سالانہ بارہ روپے، اس خاص نمبر کی قیمت دس روپے
ضخامت ۲۰۰ صفحات (حفیظ جالندھری کی متعدد تصاویر کے ساتھ ۔
ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ " افکار " رابسن روڈ، کراچی

ماہنامہ " افکار " نے " جوش نمبر " کے بعد " حفیظ نمبر " بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے ! سرورق عبدالرحمٰن چغتائی کے موئے قلم کا رہینِ منت جدید زیب اور حسین کم، مگر " فنی " زیادہ ہے " حفیظ نمبر کا منظوم تعارف " ڈاکٹر عندلیب شادانی نے لکھا ہے، اس خاص نمبر میں حفیظ صاحب کی شاعری اور زندگی پر متعدد مشاہیر اہلِ قلم کے مضامین ہیں اور خود حفیظ جالندھری نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہیں، انہوں نے کوئی بات چھپائی نہیں ہے، اپنی زندگی اور شاعری کے بارے میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اُسے کتابی شکل میں یکجا کر دیا جائے تو اس طرح ان پوری الف لیلیٰ سامنے آجاتی ہے، انہوں نے یہ تک بتا دینے میں عار محسوس نہیں کیا کہ ریلوے لائن میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے بائیس روپے ماہوار تنخواہ حفیظ صاحب نے چند مہینے ملازمت کی، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ترقی کے دروازے ان پر کھلتے چلے گئے اور اب حفیظ کی ہزار روپیہ کی ماہانہ آمدنی ہے، کوٹھی، بنگلے، نوکر چاکر، روپیہ پیسہ، عزت آبرو، شہرت سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے !

ان کا نام محمد حفیظ ہے، کنیت ابوالاثر، سنہ پیدائش ۱۹۰۰ء، باپ کا نام حافظ شمس الدین، تعلیم ساتویں جماعت تک، اس
کے بعد جو کچھ حاصل کیا کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیا۔ سب سے پہلا شعر سات سال کی عمر میں کہا، پہلی غزل ۱۹۱۱ء میں کہی جس کا مطلع یہ ہے۔

خواب میں دلدار کی تصویر ہم نے دیکھ لی　　　رات کو جاگی ہوئی تقدیر ہم نے دیکھ لی

حفیظ صاحب نے شاعری میں مولانا عبدالقادر گرامی کی شاگردی اختیار کی اور پھر دوسروں کو اصلاح دینے لگے دوارکا داس شعلہ اُن کے عزیز شاگرد
ہیں، ان کا مقالہ اس شمارے کی زینت ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس :-

"ایک صاحب نے مشورہ دیا، مولانا تاجور نجیب آبادی سے رجوع کرو، بڑے بھاری بھرکم استاد ہیں، فن
گھول کر پلا دیتے ہیں، جی میں آئی، چلو ان ہی سے فیض حاصل کیا جائے، مگر جب ایک مشاعرے میں یہ دیکھا کہ
وہ ایک شاگرد کو فن کی جگہ ڈانٹ پلا رہے ہیں، تو یہ دیکھ کر شاعری سے میرا جی اُچاٹ ہو گیا۔۔۔۔"

ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے تنقیدی مضمون (معیار) کا یہ اقتباس کس قدر ادبیت سے لبریز ہے فرماتے ہیں ——

"حفیظ نے اپنے مقصد کو اس طرح متعین کر کے اپنے راستے میں بہت سی مشکلات پیدا کر لی ہیں، ہومر کے سامنے
ایک افسانہ تھا جس میں وہ عشق و محبت، حسد و نفاق اور رقابت کی کش کش کے ساتھ ہر طرح کے عقلی اور غیر عقلی
واقعات بیان کئے جاتا تھا، فردوسی کے شاہنامے کا زمانہ بھی ماقبل تاریخ ہے، ہمارے مرثیہ نگاروں نے تاریخ
کو ——— طلسم بنا رکھا ہے، جو چاہا جس طرح بیان کر ڈالا، حفیظ ان سب کے بعد آتا
ہے اور سب سے بڑی مہم پیش نظر رکھتا ہے اس کے سامنے کوئی ایسی مثال نہیں جو اس کی رہنمائی کر سکے، وہ اپنی
منزل ہی آپ تلاش کرتا ہے اور اپنا راستہ بھی خود بناتا ہے، یقیناً اس کا راستہ پل صراط سے زیادہ کٹھن
ہے تخیل کو دبائے تو شاہنامہ محض منظوم تاریخ رہ جائے واقعات کو بدلے تو تحریف کا مرتکب ٹھیرے۔۔۔"

"حفیظ نمبر" میں حفیظ جالندھری کی شاعری اور شخصیت کے علاوہ اُن کے خطوط، افسانے اور کلام کا انتخاب بھی شامل ہے، جن مشاہیر
نے حفیظ کو خراج ستائش و عقیدت پیش کیا ہے ان کی غالب تعداد اکابر کی ہے، اتنے بہت سے بڑے آدمی عقیدت مند اور مداح کی حیثیت سے ہر شاعر
یا ادیب کو کہاں میسر آتے ہیں۔

حفیظ صاحب کی جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے وہ سیدھے سادے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کر لیتے ہیں، ان کی نثر میں طنز و مزاح کی
چاشنی بھی ہوتی ہے مگر اُن کی شاعری کے مقابلے میں اُن کی نثر قابل ذکر نہیں ہے: ان جملوں میں کتنی ناپختگی پائی جاتی ہے ——

- —— "وہ کون شاعر ہے جو کسی نہ کسی جہت سے اہل دانش و بینش کے حضور پیش کیا جاتے تو وہ منہ سے اظہار انکسار
کرتا ہوا اندر ہی اندر اپنی اہمیت پر پھولا نہ سمائے"۔
- —— "پھر اگر زندگی ہی میں میری باری آ گئی تو میرا چلتا دھندا بھی مر جائے گا"۔　　(ص ۲۵)
- —— "محفلوں اور مشاعروں میں بھی جانا بند نہیں کیا، تعلیمی، معاشرتی مجالس میں بھی انٹ سنٹ اردو ہی میں
کچھ سناتا ہوں"　(ص ۲۶)
- —— "جناب سائل دہلوی، جناب فانی بدایونی سب مجھے بہت ہی قریب سے جانتے اور اپنی مرضی کا ماننے والا

ہیں سے بیٹھے، اب وہ عالم بالا پر ہیں ——— (ص ۲۹)

- —" خداوند کریم والدہ کا سایہ آپ پر قائم رکھے یہ ذات پھر کبھی حاصل نہ ہو گی " (ص ۱۲۶)
- —" میرے کریم النفس منور بھائی! یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیائے دوں پر میری نگاہِ واپسیں کے وقت آپ اور آپ کے استی بھی اسی دنیائے دُوں میں نظر آگئے " (ص ۱۴۳)
- —" میرا پروگرام، فی الحال کوئی نہیں حرکتِ مذبوحی میں مبتلا ہوں " (ص ۱۳۵)
- —" اور یہی وہ دن تھا جس کے بعد میرے محترم سیماب اور نوجوان ساغر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ پنجابی کے خلاف اپنے رسائل میں جو جی میں آیا لکھتے چلے جانے کی روش اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے " (ص ۱۴۵)

اس جملے کا آخری ٹکڑا "ترجمہ" سا لگتا ہے، پھر حفیظ صاحب نے "پنجابی" کہہ کر جس بحث کو چھیڑا ہے وہ پسندیدہ نہیں ہے، اُن کی برائی میں بھی اس قسم کے طنزیہ فقرے اُن کی زبان سے سُنے گئے ہیں! حالانکہ یو۔ پی کے بڑے بڑے شہروں اور خاص طور سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جو پذیرائی ہوئی ہے اُس نے حفیظ صاحب کی شہرت کو چار چاند لگائے ہیں! بدایوں جو شعر و ادب کا گہوارہ ہے وہاں برسوں "شاہنامہ اسلام" رہی ہے اور اس طرف کسی کا خیال تک نہیں گیا کہ جس شاعر کی منظومات سے وہ اس قدر شغف، دلچسپی اور عقیدت رکھتے ہیں، وہ کس خطہ کا ہے —— اسلامی اخوت نسل و وطن کے امتیازات اور تعصبات کو باقی نہیں رہنے دیتی!

جناب حفیظ جالندھری کے منتخب اشعار:—

روزِ روشن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اچھا جناب شیخ ہیں تشریف لائیے
خوب آئے آپ، آئیے حضرت کہاں رہے

زندگی کی منزلوں میں جس قدر آگے بڑھے
دلکشی کے ساتھ رستہ پُرخطر ہوتا گیا

ہاں! اس لئے کہ خاک کا رتبہ بلند ہو
مٹ مٹ گئے دبے نہ مگر آسماں سے ہم

نازک مزاج پھول کا منہ سُرخ ہو گیا
چٹکی سی ایک لی تھی نسیم بہار نے

کس قدر ناآشنا نکلے مآلِ عشق سے
کر گئے جو وضع رسمِ عاشقی میرے لئے

سرخ پھولوں سے زمیں کشمیر کی ہے سرخرو
لالہ بن کر پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو

میں اُس کی بزم میں آیا تو اُٹھ گیا وہ بھی
طلب نے ہاتھ بڑھایا تو کچھ نہ تھا موجود

ناکامیٔ عشق یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

نہ توڑو دوستو رشتہ وفا کا
میں دل کے زخم سینا چاہتا ہوں

سہارا کیوں لیا تھا نا خدا کا
خدا بھی کیوں سُنے فریاد میری

فرشتے کیا مرتب کر سکیں گے
بہت بے ربط ہے روداد میری

کیا پابندِ نے نالے کو میں نے — یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

مل جائے مے تو سجدۂ شکرانہ چاہئے — پیتے ہی ایک لغزشِ مستانہ چاہئے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں

پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے

حال یہ ہے کہ ہم غریبوں کا — حال تم نے کبھی سنا ہی نہیں

باغِ فردوس تو منزل ہے تھکے ہاروں کی — ہم تو چلنے میں ٹھہر جائیں، ٹھہرنے والے

بے تعلق زندگی اچھی نہیں — زندگی کا کیا موت بھی اچھی نہیں

آنکھ کم بخت سے اس بزم میں آنسو نہ رُکا — ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

آ تجھ کو دکھا دوں کہ ستاروں سے بھی آگے — انسان کے نقشِ کفِ پا ہیں کہ نہیں ہیں

وہ سامنے رکھی ہے صراحی بھری ہوئی — دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

ایک کعبہ نہ بن سکا ہم سے — توڑ ڈالے ہزار بُت خانے

سوچ کر غم دیجئے ایسا نہ ہو — آپ کو کرنی پڑیں غم خواریاں

دُوسرا رُخ :- نئے دور میں محنت سرمایہ گردانی جائے گی

مفت خور کی ترند نہ عالی پایہ مانی جائے گی (ص ۸۸)

مصرعہ ثانی کس قدر پست بلکہ بچکانہ ہے!

کشتی نئی بنی کہ اُٹھا لے گیا کوئی — تختے جو لگ گئے تھے کنارے کہاں گئے (ص ۹۹)

غزل کا شعر اور اس قدر بے مزہ! پھر کشتی کیا کوئی چارپائی ہے، جو اُسے کوئی اُٹھا لے گیا!

اُن کی مشہور نظم متاصہ کے یہ اشعار :-

اسلام پہ قائم ہیں وہ — پاکیزہ و صائم ہیں وہ

مصرعہ ثانی اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے، قافیہ کی مجبوری تھی، تو مصرعہ اول کو یوں کیا جا سکتا تھا — قائم ہیں وہ اسلام پہ —— اس کے بعد دوسرا مصرعہ اور زیادہ چست ہو سکتا تھا۔

ملی سیاست اُٹھ گئی — بازو کی طاقت اٹھ گئی

"سیاست اور طاقت کا اُٹھ جانا" زبان و روزمرہ کے اعتبار سے کس قدر کمزور اور نامانوس اندازِ بیان ہے!

ایسا بہک جاتا ہوں میں — منہ آئی بک جاتا ہوں میں

یہ کیا شاعری ہے!

مجھ کو زمانے سے غرض — مٹنے مٹانے سے غرض

دوسرا مصرعہ بس "برائے بیت" ہے۔

"تصویر کشمیر" اچھی نظم ہے اُس کے بعض مصرعوں میں کہیں کہیں جھول آگیا ہے۔ مثلاً:۔

جس کی محنت سے چمن میں بوٹے گل پرخندہ ہے — اس کا گھر تاریک اُس کا اپنا منظر گندہ ہے

"اُس کا اپنا منظر گندہ ہے" اس ٹکڑے نے شعریت کے آب زلال کو گدلا بنا دیا۔

چشم شاعر کے ہیں آنسو ان کو مٹی میں نہ رول — بے خبر انمول جوہر کو ترازو میں نہ تول

آنسو مٹی میں ملائے جا سکتے ہیں مگر اُن کو کنکروں اور ذروں کی طرح کون رولتا ہے؟

خط نہیں آیا مہینہ ہو گیا — جعفری بالکل کمینہ ہو گیا (ص ۱۲۳)

"بالکل" کی جگہ "شاید" کہتے تو طنز کا لُطف بڑھ جاتا۔

ڈپٹی نذیر احمد پر ایک نظم ہے، جس کے اس شعر میں کتنی ناپختگی پائی جاتی ہے ——

نبض تو نے دیکھ لی بگڑا ہوا تھا ہر مزاج — اے مسیحائے قلم! تو نے کیا اس کا علاج

—— اور ——

تیری ہر تحریر ہے تصویر خورشید علوم — کرتے ہیں کسب ضیا اس نور سے ماہ و نجوم

"خورشید علوم" اور پھر اُس کی "تصویر" یہ آخر بات کیا ہوئی!

دشمنِ اسلام کا منہ تو نے کالا کر دیا — علم و فن کا روئے عالم میں اُجالا کر دیا

ڈپٹی نذیر احمد کی یہ مدح ومنقبت کہ انھوں نے دشمنِ اسلام کا منہ کالا کر دیا تھا، عجیب سی لگتی ہے، مصرعہ ثانی کو شعر بنانے کے لئے چند لفظوں کی ضرورت تھی، انھیں جوڑ کر مصرعہ تیار کر دیا! پھر مصرعہ ثانی میں "روئے عالم" کی جگہ "سارے عالم" کہنا تھا۔

دشنام کا جواب نہ سوجھا بجز سلام — یہ مجھ سے ایک اور بڑی بات ہو گئی (ص ۲۱۵)

مصرعہ ثانی میں زم پایا جاتا ہے!

حفیظ صاحب کی نظمیں جب وہ مشاعرے میں ترنم سے پڑھتے ہیں تو بہت خوش آہنگ لگتی ہیں، مگر کاغذ پر آکر اُن میں وہ بات نظر نہیں آتی! اُن کی نظم "سحر" کے یہ مصرعے :——

اٹھے حسین خواب سے — کہ دھوئیں منہ گلاب سے

یہ عشوہ سازیوں میں ہے

ادا طرازیوں میں ہے

اُدھر سے عشق بھی اُٹھا — مگر ہے اپنی تانک میں

ادھر گیا، اُدھر پھرا — فضول تاک جھانک میں

شباب جس کی رات بھی

نشاط و عیش میں کٹی (ص ۳۳۰)

"یہ کہاں کی زبان ہے کہ فلاں شخص عشوہ سازی اور ادا طرازی میں ہے! "محو" "مصروف" یا "غرق" کو مقدر مانا جائے، تب جاکر کہیں

بات بنتی ہے !

؎ مگر ہے اپنی بانک میں

یہ مصرع لپسٹ بھی ہے اور مہمل بھی ! اور "شباب" کی رات تو نشاط و طرب ہی میں بسر ہوتی ہے، اس لحاظ سے "بھی" حشو و زاید ہے !

"ابھی تو میں جوان ہوں" حفیظ کی بہت مشہور اور مقبول نظم ہے، فرماتے ہیں۔

یہ گشتِ کوہسار کی — یہ سیرِ جُوئبار کی
یہ بلبلوں کے چہچہے — یہ گل رخوں کے قہقہے
کسی سے میل ہوگیا
تو رنج و فکر کھو گیا
کبھی جو بخت سو گیا
یہ ہنس گیا وہ رو گیا

"رنج و فکر دور ہو گئے" کی ترجمانی یوں فرمائی گئی ہے ؎ تو رنج و فکر کھو گیا ——— روزمرہ یوں ہے ——— ہنس دیا، ہنس پڑا رو دیا رو پڑا ——— مگر شاعر یوں کہتا ہے ———

"یہ ہنس گیا، وہ رو گیا"

پھر "یہ" اور "وہ" کا اشارہ آخر کس طرف ہے ؟

یہ عشق کی کہانیاں — یہ رس بھری جوانیاں
اِدھر سے مہربانیاں — اُدھر سے لن ترانیاں
یہ آسمان، یہ زمیں
نظارہ ہائے دل نشیں
انہیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ ایک طرف سے لطف و توجہ ہے اور دوسری طرف سے اجتناب و گریز ! مگر "لن ترانیاں" اردو میں شیخی بگھار اور ڈینگیں لینے کو کہتے ہیں، جس کا یہاں استعمال قطعاً بے محل اور غلط ہے !

؎ بھلا میں چھوڑ دوں یہیں

یہ مصرعہ یہاں بالکل بے جوڑ لگتا ہے ! شاعر آسمان و زمین کے دل نشین نظاروں کو آخر کہاں اٹھا کر لے جانا چاہتا ہے !

آ ہی گیا وہ مجھ کو لحد میں اتارنے — غفلت ذرا نہ کی مرے غفلت شعار نے

اس شعر میں محبوب کی تاخیر اور غفلت شعاری پر طنز مسلّم ! مگر یہ اندازِ فکر و بیان موجودہ دور کے مزاج سے کس قدر غیر ہم آہنگ ہے،

قیامت ڈھائے گا جوشِ جنونِ اہلِ دانش کا — اُڑے گا دامنِ دُنیا کسی دن دھجیاں ہو کر (ص ۲۳۹)

" ابنائے دانش " کی جگہ " ارباب دانش " کہنا تھا -

رزاق دوجہاں کے خزانے کو کیا ہوا ملتا ہے رنج وہ بھی کسی کا دیا ہوا (ص ۳۴۲)

زنشقی کے زمانہ کا شعر!

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے سر جائے پر میت نہ جائے (ص ۳۶۰)

" میت " تو دوست اور ساتھی ... کو کہتے ہیں، یہاں " میت " کس غرض سے لایا گیا ہے !

اک کشتی ملاح سے خالی میں نے اُٹھا طوفان میں ڈالی (ص ۳۶۲)

" اُٹھا " اس شعر میں وجدان کو کس بری طرح کھٹکتا ہے -

موج ہائے اشک میں بہتی رہی رفتگاں کی یاد میں رہتی رہی (ص ۳۶۲)

مصرعہ ثانی کس قدر بچکانہ ہے !

حسن والے مرے قائل ہیں یہ دعویٰ ہے مرا حسن والوں کو سزا ہو مجھے منظور نہیں (ص ۳۸۲)

شاعری کے ساتھ مذاق !

اب دال نہ جاگیروں کی گلے گی آگ مگر دن رات جلے گی
چمڑے کے تنوروں میں اب ٹال پڑے گا غلہ کا
بیوپاریوں بے مقدوروں میں اب پیٹ بھرے مزدوروں میں
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اسے شاعری کون بے ذوق کہہ سکتا ہے !

بلبل گل پر منڈلاتی ہے پیڑ پہ چڑیاں بولتی ہیں
میرے دل میں توبہ کی کمزور بنائیں ڈولتی ہیں (ص ۴۱۵)

مصرعوں کے آخری ٹکڑے پڑھنے اور گنگنانے میں صوتی طور پر ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں : " توبہ کی کمزور بناؤں کے ڈولنے " نے ادرسیا خرابی پیدا کر دی ہے :

" شاہنامہ اسلام " کوئی شک نہیں ابوالاثر حفیظ جالندھری کا شعری و اخلاقی کارنامہ ہے، جہاں یہ رنگ ہے وہاں رُوح وجد کر ہے، فرماتے ہیں ـــــــــــــــ

کہاں تھے یہ نصیب اللہ اکبر سنگ اسود کے یہاں کے پتھروں نے پاؤں چومے تھے محمدؐ کے
مساوات واخوت کی یہاں تعلیم ہوتی تھی بشر کو دولت انسانیت تقسیم ہوتی تھی
قبولیت کے دامن تھام رکھے تھے دعاؤں نے مرادِ زندگی کے ساز چھیڑے تھے ہواؤں نے
مجاہد تھے کہ جوش و ضبط کی خاموش تصویریں مجاہد تھے کہ دین اللہ افواجا کی تفسیریں

مگر یہ " رطب " بھی " یابس " سے خالی نہیں ہے -

شعاعیں برچھیاں بن کر اندھیروں کی طرف لپکیں　　بلائیں بھاگ اٹھیں اپنے ڈیروں کی طرف لپکیں (ص ۴۲۲)

مصرعہ ثانی کتنا پس پھسا ہے۔

خودی نے بھر دئے تھے کبر کے طوفان ہر سر میں　　ڈبونے جا رہے تھے کشتیٔ حق آب خنجر میں

"سروں میں کبر کے طوفان بھر دئے تھے" ــــــ خوب!؟ پورے شعر میں تکلف کے سوا اور کیا رکھا ہے۔

لگایا بدر کے میدان میں کفار نے ڈیرا　　یہاں تدبیر کی تزویر کو تقدیر نے گھیرا (ص ۴۲۳)

"تدبیر کی تزویر" اور پھر اس کو "تقدیر کا گھیرنا" غیر شاعرانہ اندازِ بیان!

پتہ دیتی تھی اُن کی خاکساری سربلندی کا　　نگاہوں میں مرقع تھا دلوں کی دردمندی کا (ص ۴۲۴)

مصرعہ ثانی دیکھنے میں کتنا چست ہے مگر معنی؟! دلوں کی دردمندی کا مرقع کیا ہوتا ہے!

ہوئے تھے اسلحہ کفار کے تپ تپ کے انگارے　　نکل آئی تھیں مونہوں سے زبانیں پیاس کے مارے (ص ۴۲۵)

منہ کی جمع "مونہوں" غلط نہیں ہے مگر شعریت!!!

جناب حمزہ نے تلوار پہ تلوار کو روکا　　سبک دستی سے تھپکی دے کے ہلکے وار کو روکا (ص ۴۲۶)

"تھپکی دینا" تیغ زنی کا کون سا کرتب اور TACT ہے!

گلے کے ہار زنجیروں کی لڑیاں کاٹ کر نکلی　　زرہ بکتر کے بندھن اور کڑیاں کاٹ کر نکلی

"خود، مغفر، چار آئینہ، جوشن، زرہ بکتر... کے نام تو سنے تھے، یہ پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ عرب کے تیغ زن گلوں میں فولادی ہار بھی پہنا کرتے تھے...!!

یہ تیغِ حمزہ تھی دعوے تھے اس کو خاکساری کے　　زمیں پہ آ رہی کر کے دو ٹکڑے جسم ناری کے

تیغ کو اور خاکساری کا دعویٰ! عجیب فکر اور نرالا اندازِ بیان ہے! پھر دوسرا مصرعہ اس قدر کمزور ہے کہ پورا شعر کا داغ بن گیا: "ٹکڑے" کے ساتھ "دو" کا تلفظ زبان پر کس قدر گراں گزرتا ہے!

صف آرا تھے اُحد میں آج تین اقسام کے انساں　　شریف انساں، خبیث انساں، نمود و نام کے انساں (ص ۴۲۷)

"تین اقسام کے انساں" کا جواب نہیں! پھر کافروں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں ایک تو خبیث اور دوسرے نمود و نام والے!

بہم کثرت نے وحدت کو بہا دینے کی ٹھانی تھی　　زمانے سے نشانِ حق مٹا دینے کی ٹھانی تھی (ص ۴۲۹)

"بہم کثرت" اور پھر اُس کا وحدت کو بہا دینے کی ٹھان لینا ــــــ غیر شاعرانہ فکر و اندازِ بیان!

صحابہ مرکزی نقطے تھے ان مہلک دوائر کے　　اٹھے تھے اسلحہ جیسے قفس ہر گرد طائر کے

اس قبیل کے کمزور اشعار "شاہنامۂ اسلام" کی چمکتی ہوئی پیشانی کے داغ دھبے ہیں!

یہ پتھر اور سانپوں کے مماثل سنگ دل کیڑے　　یہ زہر آلود نطفے بے مروت تنگ دل کیڑے

"کیڑے" نے شعریت کا خون کر دیا۔

یہ کیڑے جن کے سر میں مغیانہ جوشش سر ساما　　خدا جن کا ہے خود لاتی خودی جن کی ہے خود کامی

پہلا مصرعہ مضحکہ انگیز حد تک پست ہے!

یہ اندھے سونگھتے پھرتے ہیں زر کی بُو اندھیرے میں ۔۔۔ بھیڑیں بو گیر کتے جس طرح ہر سو اندھیرے میں (ص ۱۳۱)

وجدان کے لئے ناگوار انداز بیان!

بناتے ہیں یہ مل جل کر ادارہ خانہ دُزدی کا ۔۔۔ بہت بھاری عظیم الشان بے باکانہ دُزدی کا (ص ۱۳۲)

اسے شاعری کون کہہ سکتا ہے! توبہ!

یہ قانونی ادارہ ہے ریاست نام رکھا ہے ۔۔۔ یہ تخویف و تعدی ہے سیاست نام رکھا ہے

مصرعہ اولیٰ کا مفہوم "بطنِ شاعر" ہی میں گھٹ کے رہ گیا! تخویف و تعدی کتنے بوجھل الفاظ ہیں، پھر "یہ" نے اور زیادہ خرابی پیدا کر دی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے حفیظ کی شاعری پر جو مقالہ تحریر فرمایا ہے، اُس میں حیرت ہے کہ شاعر کے ایسے کمزور اشعار مثال میں پیش کئے

جاگ سوزِ عشق جاگ ۔۔۔

پھر اُسی اٹھان سے ۔۔۔ تیر اٹھے، کمان اُٹھے

صبر کس زبان سے ۔۔۔ شور الامان اُٹھے

جاگ اٹھیں دلوں کے بھاگ

اس بند میں نہ لُطفِ بیان اور نہ رجز کی شان! بس لفظ جوڑ دیئے ہیں!

رنگ دے، رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے، قدیم رنگ، بے دریغ رنگ

جس کی ضو سے مات ہو، رنگ بازئ فرنگ

عشق کے لباس کو رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے، رنگ دے، قدیم رنگ (ص ۱۰۵)

یہ اشعار ابہام، اہمال اور بے لُطفی سے عبارت ہیں! یہ کیسے ناقد اور مشاق نثر نگار ہیں جو شاعر کے بُرے شعروں کو اُس کا شاہکار سمجھا کرتے ہیں!

اس نمبر میں شاعر کے کلام کا جو انتخاب پیش کیا گیا ہے اُس میں "راوی میں کشتی" ۔۔۔ "نیرنگِ فرنگ" ۔۔۔ "تین نغمے" اور "لب پنہاری کا گیت" خاصی جان دار اور شگفتہ نظمیں ہیں کاش! حفیظ صاحب کے کلام میں یہی رنگ غالب ہوتا۔

اس نمبر میں ایک مضمون ہے:۔

قومی ترانے کا افسانہ

(جناب صہبا اپنی زیر تصنیف کتاب سے دو باب ارسال کرتا ہوں ۔۔۔ حفیظ)

اس باب میں راقم الحروف کو بھی کچھ عرض کرنا ہے! جب مسٹر چھاگلہ جنہوں نے اس ترانہ کی دُھن بنائی ہے، انہوں نے سب سے پہلے تو دُھن کو نظم کرنے کی مجھی سے فرمائش کی! ہز ماسٹرز وائس کمپنی میں ایک صاحب ذمہ دار عہدے پر تھے جن کو سب "خاں صاحب" کہہ کر پکارتے

اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ مسٹر چھاگلہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، چنانچہ ملنے کا وقت اور مقام طے ہوا، ایک دن شام میں ہم پانچ آدمی (مسٹر چھاگلہ، خان صاحب، راغب مراد آبادی، مجاز دہلوی اور میں) کراچی کلب (KARACHI CLUB ANNEXE) میں جمع ہوئے، چھاگلہ مرحوم نے ترانہ کی دُھن سنائی، اور مجھ سے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ اس دُھن میں ترانہ تیار کر دیں، میں دُھن سُن کر خاموش ہو گیا، اس پر وہ بولے کہ آپ "مستقل ترانہ" تو فرصت سے کہیں مگر شاہنشاہ ایران پاکستان تشریف لے آرہے ہیں، ان کی تقریبوں میں ترانہ گائے جانے کے لئے مناسب "بول" موزوں کر دیں! اس نشست کے بعد میں نے خان صاحب سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اس ترانہ کی دُھن میں مشرقیت نہیں پائی جاتی؛ اس کا آہنگ ہی کچھ اور ہے! لہٰذا........

پھر کچھ دِنوں بعد بعض دوسرے شاعروں کو جب "ترانہ" کہنے کے لئے سرکاری طور پر مراسلے بھیجے گئے تو میرے پاس بھی مراسلہ آیا، میں نے اُس کا تحریری جواب دیا اور محکمہ متعلقہ کے ڈپٹی سکریٹری سے بھی تبادلہ خیال کیا، وہ پوری گفتگو اور مراسلت تو یاد نہیں رہی، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ علامہ اقبال کی مشہور نظم ـــــ مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا ـــــ کہیں کہیں جزوی ترمیم و اضافہ کے ساتھ پاکستان کا قومی ترانہ بن سکتی ہے، یا پھر.... "اللہ اکبر اللہ اکبر" کو ترانہ کا "انترہ" قرار دیا جائے اس پر ایک یا چند شاعر کچھ مصرعے موزوں کریں! میں نے ان سے کہا تھا کہ فرانسیسی حکومت کا ترانہ کیا ہے اور امریکہ اسٹیٹ کا کیا "NATIONAL ANTHEM" ہے! ہم پاکستانی نہیں جانتے، اسی طرح پاکستانی ترانہ سے دوسرے ملکوں کے لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، پاکستانی ترانہ کا اصل تعلق، پاکستانیوں سے ہے، اُن کے مزاج، روایات، کلچر اور ذوقِ سماعت کی رعایت ترانہ میں رہنی چاہئے۔

پھر "ترانہ" لکھنے کے لئے حکومت کی طرف سے عام اعلان ہوا، میں نے اس مقابلے میں حصہ نہیں لیا، بعض احباب سے میں نے پیش گوئی البتہ کر دی تھی کہ صرف "ایک شاعر" کا ترانہ منظور ہوگا، اور یہ بات ہو کر رہی!

مجید لاہوری مرحوم جو نہ صرف اچھے شاعر اور طنز نگار تھے بلکہ شعر و ادب میں بصیرت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے روزنامہ "جنگ" کے فکاہی کالموں میں حفیظ کے "قومی ترانے" پر طنز و تنقید کی!

حفیظ جالندھری کے حالات میں یہ عبارت بھی نظر سے گزری۔

"قائد کے لئے قیام پاکستان سے قبل برطانوی حکومت نے پوچھا مگر قائد اعظم کے حکم پر حفیظ نے انکار کر دیا" (ص ۴۰)

جب شاعروں کو خطابات دینے کا ذکر چھڑ گیا ہے، تو ہم اس مقام سے سرسری گزرنا پسند نہیں کرتے ـــــ انگریزی دور میں شاد عظیم آبادی کو "خان بہادر" کا خطاب ملا تھا، اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے صوبہ کے خاصے کھاتے پیتے باحیثیت زمیندار بھی تھے! جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے انگریزی دور میں کمشنر کے عہدے تک ترقی کی، اُن کا عہدہ "انگریزی خطابات" کے شایانِ شان تھا، رضا علی وحشت مرحوم پروفیسر تھے اور پروفیسروں کو انگریزی دور میں "نائٹ ہڈ" (K.C.S.I) تک کے خطابات ملے ہیں، حفیظ کو "خان صاحب" کا خطاب ملا، جو سب سے چھوٹا خطاب تھا، اسے انہوں نے قبول کر لیا! اُس کے بعد انہیں "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا گیا، انگریزی دور میں "سرکاری خطابات" کی درجہ بدرجہ ترقی (خان صاحب کے بعد خان بہادر، او، بی، ای کے بعد سی، آئی، ای) صاحبِ خطاب کی کوشش کے بغیر نہیں ہوتی تھی!

اس تصویر کا ایک "رخ" یہ بھی ہے کہ اب سے تقریباً ۲۰ سال قبل حیدرآباد دکن، بھوپال، بہاول پور، خیر پور وغیرہ ریاستوں سے حفیظ جالندھری کو جو ماہانہ وظائف ملتے تھے اُن کی مجموعی تعداد پندرہ سترہ سو روپے سے کیا کم ہوگی پھر ان کے لئے جنگِ عظیم کے زمانہ میں "پبلسٹی" "SONG PUBLICITY"

ـــــــ

ل حفیظ صاحب کے اس قسم کے گیت ـــــ میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئے رے! دیہات میں انگریزی فوج کے لئے رنگروٹ بھرتی کرنے کے کام کو تقویت پہونچاتے تھے۔

ہندوستان اور پاکستان میں حفیظ جالندھری سے بڑے شاعر پہلے بھی ہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں ——— مگر انگریزی دورِ حکومت سے کر اس زمانے تک ریاستوں اور حکومتوں کے لطف و عنایات کا مرکز جو اُن کی ذات رہی ہے اس کے عوامل و محرکات پر "حفیظ نمبر" میں کوئی مقالہ نہیں ملتا حالانکہ اُن کی زندگی کا یہ وہ نمایاں رُخ ہے جس پر سیرت نگاروں اور تذکرہ نویسوں کو کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیے تھا، بڑے آدمیوں کی نبض شناسی کا یہ فن خاص حفیظ ہی کا حصہ ہے!

"حفیظ نمبر" میں اس قسم کے مضامین آنے چاہیے تھے، مگر اس کو کیا کیجیے کہ ایک طرف پاکستان رائٹرز گلڈ کی مصلحتیں ہیں اور دوسری طرف جناب صہبا لکھنوی مدیر "افکار" کے حالات اور تعلقات ہیں! ان تمام مشکلات اور نزاکتوں کے باوجود "حفیظ نمبر" شاعر کی زندگی اور شاعری پر کامیاب ادبی پیشکش ہے، جس پر مدیر "افکار" مبارکباد کے مستحق ہیں!

ووٹ کی شرعی حیثیت

از:- کوثر نیازی مدیر "شہاب" ضخامت ۸ ا صفحات، قیمت:- دو آنے فی سینکڑہ دس روپے
ملنے کا پتہ:- شہاب ہفت روزہ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

اس کتابچے میں سیاسی اور فقہی نقطۂ نگاہ سے ووٹ کی اہمیت اور اُس کی اثر آفرینی و گیرائی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ہر قسم کی عصبیت سے دور اور لالچ سے بالاتر ہو کر ووٹ ایسے لوگوں کو دینا چاہیے جو خدا ترس، فرض شناس اور معاملہ فہم ہوں، اور جن سے توقع ہو کہ عوام کے مسائل اور دینی معاملات میں صحیح نمائندگی کر سکیں گے! مولانا کوثر نیازی نے اس کتابچہ کو مرتب فرما کر تبلیغ حق کا فرض ادا کر دیا ہے! فجزاہ اللہ خیر الجزاء

نصاب تعلیم جامعہ اسلامیہ بہاولپور

بہاول پور کی مشہور دینی درس گاہ جامعہ عباسیہ کو ترقی دے کر "الجامعۃ الاسلامیہ" بنا دیا گیا اور اُس کی حیثیت علوم مشرقی کی یونیورسٹی کی ہو گئی! جناب ڈاکٹر سید حامد حسین بلگرامی "رئیس الجامعہ" مقرر کئے گئے اور بہت سے فاضل اساتذہ اور علماء کی خدمات حاصل کی گئیں!

محکمہ اوقاف مغربی پاکستان سے جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے نظم و نسق کا تعلق ہے۔ محکمہ اوقاف کے ناظم اعلیٰ شیخ محمد اکرام صاحب نے جامعہ کا منصوبہ تیار فرمایا اور گورنر صاحب مغربی پاکستان نے سرکاری طور پر اس کو شرفِ منظوری عطا فرما دیا۔

ہمارے سامنے اس جامعہ کے درجہ تخصص کا نصاب تعلیم ہے، جسے دورِ حاضر کی تعلیمی ضروریات اور علمی معیار کے مطابق بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اس نصاب میں درسِ نظامی کا جوہر بھی موجود ہے اور جدید طریقۂ تعلیم کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے!

اب سے تقریباً ۲۰ سال قبل متحدہ ہندوستان کے علماء نے اسی انداز پر سوچا تھا، اور ندوہ نے قریب قریب اسی طرز پر نصاب تعلیم مرتب کیا تھا، کوئی شک نہیں کہ بچوں کے جدید مضامین اور قدیم عربی مضامین کو یک جا کرنے کا خیال مستحسن ہے مگر اس باب میں جو کوتاہی ہو جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ دونوں مکاتیب فکر کے سارے مضامین جمع کر دئے جاتے ہیں، جن کے ہجوم میں خاطر خواہ کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نہیں ہیں، جامع العلوم ملتان نے بھی قدیم درسِ نظامی کی روش سے ہٹ کر نصاب مرتب کیا مگر تمام مضامین (جدید و قدیم) نہیں رکھے۔

قدیم مدارس عربیہ کے نصاب میں بعض ایسی کتابیں داخل ہیں، جن کے بارے میں ماہرین تعلیم کی رائے ہے کہ انہیں نصاب سے خارج کر دینا چاہیے مگر وہ کتابیں جامعۂ اسلامیہ بہاولپور کے نصاب میں باقی رکھی گئی ہیں! مثلاً نحو میں کافیہ اور شرح جامی سے زیادہ سلجھی ہوئی اور مفید تر کتابیں موجود ہیں، جن کو جدید نصاب میں شامل کرنا چاہیے، اسی طرح معقولات میں مسلم العلوم جس عمر کے طلباء پڑھتے ہیں اُن میں اس کتاب کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

مقاماتِ حریری میں قافیہ اور سجع کے التزام کے سبب عربی زبان و ادب کی سلاست (سادگی) کی جگہ تصنع اور تکلف پیدا ہو گیا ہے، اخلاقی

نقطۂ نگاہ سے بھی اس کتاب کا طلباء کا پڑھانا احتیاط کے خلاف ہے؛ اس کتاب کے اسلوب کی نقل کرنے والے طلبہ بھی سادہ عربی مشکل ہی سے لکھ کریں گے یہ تو ایک ایسی کتاب ہے کہ فارغ ہونے کے بعد طلبہ اس کا از خود مطالعہ کریں، اور اس کا اندازہ لگائیں کہ سادگی اور تکلف میں کتنا فرق ہے؟ اور عربی ادب میں کس قسم کے اسالیب مانے جاتے ہیں؟

جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے نصاب میں "تصوف" کو بھی شامل کیا گیا ہے حالانکہ تصوف پڑھانے کی چیز نہیں ہے، اسلامی علوم کی پوری تاریخ میں ایسا نہیں ہوا کہ "تصوف" کو درسی کتابوں کی طرح پڑھایا گیا ہو! تصوف کو آپ پڑھائیں گے تو وہ عملی تزکیۂ نفس کی جگہ محض فلسفہ اور مصطلحات کا لغت بن کر رہ جائے گا۔ اور جس طرح آج پیشہ ور مولوی پیدا ہو رہے ہیں، اسی طرح پیشہ ور صوفیا بھی پیدا ہونے لگیں گے؛ پھر "فصوص الحکم" جیسی مغلق نادق کتابوں کو پڑھانے کے لئے کہاں سے اساتذہ آئیں گے، پیچ در پیچ رموز و اسرار کو کون حل کرے گا! اس پر مستزاد یہ کہ عقائد کے اختلافات و اضطرابات جو ابھریں گے، ان سے علمی فضا اور تعلیمی ماحول مکدر ہوگا: متشابہات پر بحث، گفتگو خطرے سے خالی نہیں۔

ہم جامعہ اسلامیہ بہاول پور کی ترقی، مقبولیت اور استحکام کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ یہ جدید نظم درسی حق دین و ملت ملک اور علوم و معارف کے لئے خیر و برکت کا سبب ثابت ہو! (آمین)

بقیہ ص ۳۰ سے آگے۔

میں نے کہا ـــــ "ہم سب کے مالک اللہ واحد کی حکومت اپنے ملک میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے قرآن کے قوانین کو عدالتوں میں جاری کرنا چاہتے ہیں: وہ حیران ہو کر کہنے لگے۔ "یہ کام تو بہت اچھا ہے ایسا ہی ہونا چاہئے:" ـــــ میں نے کہا "ہمارا یہ ملک اللہ کے قانون کے لئے ہی بنایا گیا تھا۔ جو لوگ قانون چلاتے ہیں اور ہم انہیں روکتے ہیں انہوں نے غصے میں آ کر ہمیں قید خانے میں بھیج دیا ہے۔"

وہ کہنے لگے "یہ تو انہوں نے اچھا کام نہیں کیا، ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو کامیاب فرمائے:"

میں نے دل میں سوچا کہ دعا تو ساری قوم ہی مل کر کر رہی ہے لیکن محض دعاؤں سے اگر زندگی کے معرکے سر ہو سکتے اور لوگوں کو اللہ کی راہ میں امتحان نہ دینے ہوتے تو بدر و احد کے معرکے بھی وجود میں نہ آتے۔

اللہ ہی ہے جو مالک الملک ہے اس پر ساری آرزوؤں، تمناؤں، توقعات، مساعی اور کوششوں کا مدار ہے۔ وہی کمزوروں کا سہارا اور غیب سے مدد دینے والا ہے ہم اسی کے کرم پر تکیہ لگائے ہوئے ہیں اور اسی کے در کے سائل ہیں۔ کہ وہ اس ملک کو "وہ" بنا دے، جس کے لئے یہ ملک وجود میں آیا

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز۔ لانڈھی۔ کراچی

اس کی مقبولیت کا
سبب اس کی عمدہ
کوالٹی
CAVANDER'S
۳۵ پیسے میں ۱۰

ماہنامہ

فاران

کراچی

ایڈیٹر: ماہر القادری

جلد ۱۷	فروری ۱۹۶۵ء	شمارہ ۱۱

ترتیب

مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

چندہ سالانہ: سات روپے	پبلشر: مسرور حسین	قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

طابع: انٹرنیشنل پریس کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
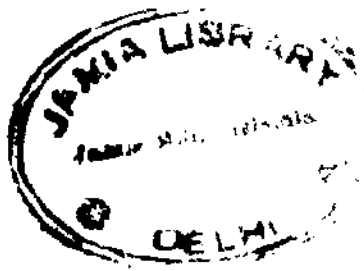
نقشِ اوّل

امارت و حکومت کی تین سیاسی ہئیتیں ہیں ــــ بادشاہت، آمریت اور جمہوریت ــ ان میں پہلی دو (بادشاہت و آمریت) غیر عوامی ہونے کے ساتھ ساتھ مطلق العنان ــــ اختیار و اقتدار کا مظہر ہوتی ہیں، مطلق العنان بادشاہ اور خاص طور سے آمر کی زبان ملک کا دستور اور حکومت کا قانون سمجھی جاتی ہے' اس مزاج و ہیئت کی حکومتوں میں عوام بھیڑ بکریوں کی طرح بے اختیار بن کر رہتے ہیں، اُن کی کوئی آواز نہیں، وہ کسی مسئلہ میں اپنی رائے اور اختلاف کا اظہار نہیں کر سکتے اور یہ شامت کے مارے کبھی کبھار ایسا کر بھی گزریں تو حکومت اُن کی اچھی طرح گوشمالی کر دیتی ہے' ایسی گوشمالی جو دوسروں کے لئے درس عبرت بن جاتے ــــ مازی مارا ترکی کا نپا ــــ جیسی کیفیت! جابر بادشاہ اور آمریت کے دور میں عوام کی صلاحیتیں اور توانائیاں اُس پودے کی طرح ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں جس پر پالا پڑا ہو اور اس طرح اُس کی بڑھوار ماری گئی ہو! بادشاہ اور آمر عوام کو اپنا دست نگر اور زیر دست اور خود کو سچ مچ "مالک رقاب اُمم" سمجھتے ہیں کہ رعایا میں جس نے بھی زبان کھولی اور سر اٹھایا، اُس کی گردن ناپ دی گئی! بادشاہت اور آمریت کا مزاج کسی پبلک گورمنٹ اور عوامی جماعت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ثبوت میں مارشل لار کی حکومتیں پیش کی جا سکتی ہیں جہاں سب سے پہلے عوامی جماعتوں اور سیاسی اداروں کو ختم کیا جاتا ہے!

جہاں تک عوام کو بے اختیار کر کے، تمام اقتدار کو ایک ہی شخصیت میں مرتکز اور مجتمع کر دینے کا تعلق ہے، بادشاہ اور آمریت کا قریب قریب ایک ہی جیسا مزاج اور کردار ہے' ان کے درمیان جو نمایاں فرق ہے وہ یہ ہے کہ بادشاہت میں خاندانی وراثت کا عمل جاری ہوتا ہے' خود فرماں روا اور سلاطین اپنے ولی عہد اور جانشین مقرر کرتے ہیں، قرابت، عزیز داری اور خویش پروری کی یہ شاہانہ سنت حکومت و فرماں روائی کے لئے صلاحیت اور اہلیت کے پہلو کو نظر انداز کر دیتی ہے' آمریت میں اس قسم کی خاندانی وراثت کا سوال پیدا نہیں ہوتا!

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے :ــــ

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

تاریخ میں بادشاہت کی ناپسندیدہ ہیئت کے باوجود کوئی شک نہیں، کتنے ہی خدا ترس اور منصف و عادل بادشاہ بھی گزرے ہیں! اس مسئلہ کی اصل صورت یہ ہے کہ کوئی بادشاہ نیک، خدا ترس اور عوام کا ہمدرد ثابت ہو جائے اور عوام اُسے پسند بھی کرتے ہوں، تو عوام کی اس پسندیدگی کے سبب اس بادشاہت میں جمہوریت کی جھلک اور صفت پیدا ہو جاتی ہے، حکومت و سیاست کی دنیا میں اصل چیز عوام کا کسی نظام حکومت کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا ہے (انتباہ ــــ یہاں ہم کفر و اسلام کے نظام سے بحث نہیں کر رہے ہیں)

یہ تھا بادشاہت اور آمریت کا سرسری تعارف! اب رہی جمہوریت تو یہ بادشاہت اور آمریت کی بالکل ضد ہے یہ دونوں انتہائیں ہیں وہ اس

برسرِ پر، یہ اس سرے پر! آمریت اور بادشاہت میں عوام کو جس قدر بھی بے اختیار، بے حوصلہ اور پست ہمت بنایا جائے، اُتنا ہی بادشاہت اور آ
کو استحکام میسر آتا ہے، جمہوریت میں جو کچھ ہیں عوام ہیں، اُنہی کی رائے اور مرضی سے حکومت کے دستور و قوانین بنتے ہیں، ان کی مرضی کے بغیر حکومت کا دارالـ
تو بہت بڑی چیز ہے، پولس کا تھانہ اور تحصیل کا مستقر بھی منتقل نہیں کیا جا سکتا، جمہوریت میں عوام اپنی پسند اور مرضی سے حکومت چلانے کے لئے ا
کو منتخب کرتے ہیں، جمہوری حکام عوام کے صحیح نمائندے ہوتے ہیں، عوام انہیں جب چاہیں ہٹا سکتے ہیں اور اول تو جمہوری حاکموں میں خود بھی اتنی
اور غیرت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ میں عوام کو اپنا مخالف پاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان پر عوام کو جو اعتماد تھا وہ مجروح ہو گیا ہے، تو یہ حضرات از
منصب واقتدار کی کرسیاں چھوڑ دیتے ہیں، جمہوریت میں کرسیاں ادلتی بدلتی رہتی ہیں اور سب سے زیادہ خوبی کی بات یہ ہے کہ جمہوری حکومت میں عوام کو
رائے کی پوری آزادی ہوتی ہے اور تمام داخلی اور خارجی پالیسیاں عوام کے نمائندوں کے صلاح و مشورہ ہی سے مرتب اور متشکل ہوتی ہیں! مقصد نیک ہو
آپس کی "مشورت" میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت رکھی ہے!

!!

یہ دور جس سے آج کی "دنیا گذر رہی ہے" جمہوری دور" ہے دنیا کے پردے پر جو بادشاہتیں باقی رہ گئی ہیں وہ انگلیوں
پا گنی [illegible] ہیں اور اُن میں بھی عوام کی نمائندگی کا تصور اور عقیدہ عملاً قوت نافذہ بنتا جا رہا ہے اور جہاں نہیں بن سکا
وہاں کسی نہ کسی عنوان سے اس کی داغ بیل پڑ رہی ہے!

جمہوریت کی اس آفاق گیر فضا میں وہ لوگ جو عوام کے انتخاب و پسندیدگی کے ذریعہ نہیں بلکہ طاقت کے زور سے اقتدار حاصل کرتے ہیں اُن کو
اقتدار برقرار رکھنے کے لئے جمہوریت کا سہارا لینا پڑتا ہے، بس یوں سمجھئے کہ کامل اختیار فردِ واحد کی مٹھی میں ہوتا ہے مگر اس مٹھی پر جمہوریت کا ملمع
جاتا ہے۔ جمال عبدالناصر کی ذات اس دور میں "جمہوریت نما آمریت" کا نمایاں مظہر ہے۔

؎ پیتل پہ چاندی کا جھول

سچی صاف اور سامنے کی بات یہ ہے کہ اقتدار کا چسکا اور حکومت کرنے کی ہوس طرح طرح کے رُوپ دھارتی رہتی ہے! جہاں بھی ہوسِ اقتدار پائی
وہاں خرابیاں ضرور پیدا ہوں گی اور پراگندگی اور انتشار لازمی طور پر رونما ہو کر رہے گا۔ جمہور پسند افراد کا یہ مزاج نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ اقتدا
میں آ گیا تو وہ اس سے کسی عنوان دست بردار ہونا ہی نہیں چاہتے، یہ تو بادشاہوں اور مطلق العنان فرماں رواؤں کا مزاج ہے کہ عوام چاہے کتنے ہی
کیوں نہ ہوں، عام حالات نے خواہ کوئی بھی رُخ کیوں نہ اختیار کر لیا ہو یہ حضرات کرسیوں سے چمٹے رہیں گے!

جمہوریت زیادہ سے زیادہ وسعت اور پھیلاؤ چاہتی ہے، عوام کی آزاد نمائندگی! جمہوریت پابندی اور حد بندی کو گوارا نہیں کر سکتی،
اور محدودیت جمہوریت کے ساتھ دردناک مذاق ہے! جہاں کہیں بھی جمہوریت کو پابند اور محدود کیا جائے گا وہاں اقتدار کی ہوس آنکھ مچولی کھیلتی ہ
حکومت کے ذریعہ جلبِ منفعت کا جذبہ پتے بازی اور بازی گری کرتا ہو گا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص کو منصب و عہدہ دینے کی ممانعت فرمائی ہے جو منصب و عہدہ کی ہوس اور تمنا رکھتا ہے! ا
میں یہی نفسیاتی نکتہ پنہاں ہے کہ اقتدار کی ہوس سے معاشرے کو طرح طرح کے نقصانات پہونچنے کے امکانات ہیں! وہاں ضرورت سے زیادہ
اخراجات اور شاہانہ مصارف ہوں گے، رنگ رلیاں ہوں گی۔ شان و شکوہ اور ٹھاٹ باٹ ہو گا۔ اقربا پروری اور خویش نوازی ہو گی، جن
سے نفس کو لذت ملتی ہے اُن کی کھلی چھوٹ آزادی، اور جن نیک افعال سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اُن سے بے پروائی اور بے تعلقی!

؟

بادشاہت، آمریت اور جمہوریت پر ہم نے اوپر کی سطروں میں عام باتیں کہی ہیں اب ہم اس ملک کے حالات کی طرف شہدیزِ خامہ کی باگ موڑتے ہیں، جو ہمارا محبوب وطن ہے اور جس کا ذرہ ذرہ ہماری آنکھوں کا تارا ہے ہم اس ملک کے باشندے ہیں، اس پاک سرزمین سے ہمارا دینی تعلق ہے اور دین سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ مضبوط اور مستحکم نہیں ہوتا، یہ کیسے ممکن ہے کہ پاکستان کے حالات ہم خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہیں اور زبان سے کچھ نہ کہیں! یہ نہیں ہو سکتا ——

؎ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں ضرور

ہم سیدھی سادی بات کو اچھالنے اور پھیلانے کے عادی نہیں ہیں اور نہ ہمارا یہ شعار رہا ہے کہ کسی فرد یا جماعت کی مخالفت میں اس حد تک نکل جائیں کہ کسی کا عیب تو ہو رائی برابر اور ہم اسے پربت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی ہم پر لعنت ہو اگر ہم کسی پر تہمت جوڑیں یا اسے معلون کریں!

ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر" بالغ رائے دہی" کے ذریعہ بنا ہے اور جمہور کا عام استصواب تقسیم ہند اور پاکستان کی تشکیل کا سبب قرار پایا ہے آخر اس آزمائے ہوئے کامیاب ذریعہ کو ترک کر کے "بنیادی جمہوریت" کیوں اور کس لئے ایجاد کی گئی! اس محدود اور پابند جمہوریت کے واسطہ سے شروع سے لے کر اب تک جو انتخابات ہوئے ہیں، ان میں بنیادی جمہوریت کے ارکان کی خاصی بڑی تعداد نے جس سطحی کردار اور پست ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ کوئی راز اور پردے کی بات نہیں ہے کہ جس کا ہم پہلی بار انکشاف کر رہے ہیں، خاص طور سے صدارتی انتخابات میں جو کارستانیاں ہوئی ہیں اُن کو جو کوئی منصفانہ کہتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ پاکستان میں عدل و انصاف کے معنیٰ بدل دئے گئے ہیں۔ اور یہی لیل و نہار رہے تو یہاں اس قسم کالغات کی ایک جدید ڈکشنری تیار ہو کر رہے گی!

یہ واضح حقیقت اور سامنے کی بات ہے کہ پابند جمہوریت کے ارکان کی رائے جمہور عوام کی رائے نہیں ہو سکتی یہ بات پہلے سے بھی معلوم تھی مگر انتخابات نے اس علم کو یقین سے بدل دیا! بھارت اگر استصواب عام کی جگہ اس قسم کی پابند اور محدود جمہوریت کے ذریعہ کشمیر میں رائے شماری کرائے تو پاکستان بھارت کے اس موقف کو کیا تسلیم کرے گا؟ ہرگز نہیں کرے گا۔ بس اس سے سمجھ لیجئے کہ جمہوریت پر پابندیاں اقتدار برقرار رکھنے کے لئے لگائی جاتی ہیں۔ دھن دولت، دھونس، دھاندلی اور دباؤ سے دل نہیں جیتے جاتے، دلوں کے جیتنے کے لئے بڑے حوصلے، ایثار، ہمدردی، عدل و انصاف اور خلق و مروت کی ضرورت ہے عوام کی ہمدردیاں اور دعائیں ان حاکموں کو میسر آتی ہیں جن کے بارے میں عوام کو یقین ہو جائے کہ یہ حضرات حکومت ذاتی اور شخصی دلچسپی نہیں رکھتے اور انہوں نے قوم و ملک کی خاطر ذمہ داری کے اس بارِ گراں کو قبول کیا ہے اس دنیا میں نہ کسی کا ایثار چھپا رہتا ہے اور نہ خود غرضی نقاب پوش رہ سکتی ہے، پچھلے غلط کار بادشاہوں اور فرماں رواؤں نے کس رازداری کے ساتھ سازشیں اور بدعنوانیاں کی تھیں مگر ظاہر ہو کر رہیں اسی طرح ہر دور میں قصر و ایوان کی ایک ایک بات عوام تک پہونچ کر رہتی ہے یہاں تک کہ سب افواہیں ایک جیسی نہیں ہوتیں، بعض افواہوں سے واقعات کا سراغ اور حقائق کا اتا پتا ملتا ہے۔

پاکستان کے منصب صدارت کا انتخاب ہو چکا اور جو کچھ ہوا پاکستان کے آئین کے تحت ہوا اس صورت میں آئین پسندی کا تقاضا کیا ہے؟! دستور یا وحی الٰہی کی طرح تسلیم و اطاعت! بات بظاہر خاصی معقول اور اصول ہے مگر آئین کا احترام کرتے ہوئے ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ جب آئین بنا تھا تو پاکستان کے اہل الرائے اور ارباب فکر نے بتا دیا تھا کہ اس آئین کی تدوین کس مقصد کے تحت کی گئی ہے اور اس کے کیا نتائج ہوں گے! جو نتائج سامنے آئے وہ سب نے دیکھ لئے! آزاد جمہوریت میں اصول کی اور پابند جمہوریت میں شخصیتوں کی فتح ہوتی ہے! جب آئین کی دیز

میں اسمبلیاں تک پابند و مجبور اور بے اثر ہوں اُس آئین کو کیا نام دیا جائے ؟

پاکستان کے عوام جس کشمکش سے دوچار ہیں وہ یہی تو ہے عوام یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا نظام حکومت اسلام، اخلاق اور جمہور کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے ! پاکستان آمرانہ نفسوں کی حکومت اور شخصی اقتدار کے فروغ دینے کے لئے نہیں بنا عوام کی یہ خواہش حق ولا جائز و درست ہے اس مطالبہ کو آئینی ذرائع سے منوانے کے لئے عوام کی اس جدوجہد کو جو کوئی وطن دشمنی یا انتشار سے تعبیر کرتا ہے اس کی یہ جنبش اور یہ خود اس کے باطن اور عزائم کا پتہ دیتی ہے ! حکومت کو عوام کی تمناؤں کا مظہر ہونا چاہئے۔ جہاں یہ صورت مفقود ہو وہاں اضطراب اور بے چینی کا پایا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

عوام جس بات کو اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں اُس کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کر سکتے ہیں یہ اُن کا فطری حق ہے، اُن کے اس حق کو چھینا نہیں جا سکتا !! احتجاج و کشاکش کی فضا میں بے شک ملک کی تعمیر کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے مگر جو لوگ وطن کے خیر اندیش اور ملک کے بہی خواہ ہیں اور جن کے قبضہ میں کشودِ کار ہے وہ عوام کے مطالبہ کو مان کر اس کشاکش کو ختم کر سکتے ہیں !

پاکستان کے عوام کی پیشانیوں میں شکر کے سجدے اس دن کے لئے تڑپ رہے ہیں جس دن یہاں کے افق پر اسلام و جمہوریت کی تابناک صبح طلوع ہوگی !

ع مری آواز مکے اور مدینے

دیکھیے وہ روز سعید کب آتا ہے اور وہ روشن صبح کب نمودار ہوتی ہے ؟

ماہرالقادری ۲۱ فروری ۱۹۶۲ء

میرا کلام

میرے کلام کے پانچ مجموعے (محسوسات ماہر، نغمات ماہر، جذباتِ ماہر، ذکرِ جمیل اور فردوس) شائع ہو چکے ہیں "فردوس" کے علاوہ چار مجموعے متحدہ ہندوستان میں شائع ہوئے ہیں جو پاکستان میں نہیں ملتے میں اپنے تمام شائع شدہ کلام کا انتخاب کر رہا ہوں تاکہ جو بھرتی کی غزلیں اور نظمیں ہیں انہیں نکال دیا جائے۔ قدیم کلام کا انتخاب اور جدید کلام ایک ہی ہوگا میں اس پر خود تنقید لکھوں گا جس میں اپنے کلام کی کمزوریوں کی خود نشاندہی کروں گا کہ جن اشعار کو خارج کیا گیا ہے اُن کے اظہار و بیان کے کیا اسقام تھے۔

ومناقب کے مجموعہ (ذکرِ جمیل) کا انتخاب ہو چکا ہے توقع ہے تین چار مہینہ میں یہ انتخاب آجائے گا۔ خریدار صاحبان اسے رجسٹر کرا دیں تو کتاب ملنے میں انہیں سہولت ہوگی ! اس انتخاب میں حمد و نعت پر مشتمل نئی غزلیں اور نظمیں !

ماہرالقادری

مکتبہ :- "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

پروفیسر محمد عبداللہ — مشرقی پاکستان

نذر الاسلام اقبال اور ربندرناتھ ٹیگور ایک نظر میں

آزادی کا حصول کوئی فوری حادثہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک طویل عمل کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن درخت کی جڑ پکڑنے اور پھلنے پھولنے سے پہلے کئی ہاتھوں کے ذریعے اسے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے حصولِ آزادی کی بھی یہی روداد ہے۔

پاک و ہند کی قومی بیداری اور حصولِ آزادی میں تنہا کسی ادیب یا شاعر کا حصہ نہیں۔ بلکہ حالی (۱۸۳۷ء ۔ ۱۹۱۴ء)، اکبر (۱۸۴۶ء ۔ ۱۹۲۱ء) اقبال، نذر الاسلام (۱۸۹۹ء ۔) اور دوسرے ادباء و شعراء نے یکے بعد دیگرے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کے ذہنی نشو و نما میں اہم رول انجام دیا ہے۔ یکایک قومی بیداری کا شعور نہیں اُبھرا اور نہ بیک روز پاک و ہند آزاد ہوا بلکہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ہماری قوم موجودہ درجے پر پہونچی ہے۔

سب سے پہلے حالی نے اپنی قومی نظموں سے ہماری قومی بیداری کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے بعد اکبر اور اقبال نے قومی شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ انہوں نے حالی کی بتائی ہوئی راہ میں گامزن ہو کر مسلمانوں میں مذہبی جوش و جذبے کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اکبر نے مسلمانوں کو اپنی ثقافت و معاشیات کو مغربی تہذیب و تمدن کے حربوں سے بچانے کی تلقین کی۔ اقبال نے "خضرِ راہ" بن کر "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی" کی ہدایت دی۔

سرزمین بنگال حالی اور اقبال کی شاعری سے خاطر خواہ متاثر نہیں ہوئی اس لئے کہ یہ دونوں اردو کے شاعر تھے، انہوں نے اردو زبان میں قوم کو پیغام دیا۔ تقسیم ملک سے پہلے مشرقی پاکستان میں اردو کی اشاعت نہ ہونے کی برابر تھی۔ یہاں کے لوگ صحیح معنوں میں ان کے کلام سے استفادہ نہ کر سکے البتہ ربندرناتھ ٹیگور اور نذر الاسلام نے ان کے مقاصد کو یہاں پاک و ہند بنایا۔ (گو بنگال کے ہر اردو دیں طلباء اردو جانتے ہیں)۔ (م ۔ ق)

نذر الاسلام اور ربندرناتھ دونوں معاصر ہیں۔ دونوں ایک ہی علاقے اور ایک ہی زبان کے شاعر ہیں۔ نذر الاسلام نے شاعری کے میدان میں اس وقت قدم رکھا، جب ربندرناتھ کی شاعری بام عروج پر تھی۔ تمام شعراء و ادباء انہیں کے چشمۂ فیض سے استفادہ کر رہے تھے، شروع شروع میں نذر الاسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے، مگر وہ ایک غیر معمولی ذہانت و فطانت کے مالک تھے ان کی غیور طبیعت نے زیادہ دنوں تک کسی کی تقلید گوارا نہ کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے اپنا راستہ الگ نکالا اور ربندرناتھ ٹیگور کے زمانہ میں بھی اپنی عبقری کا ثبوت دیا ایک تو فطرت نے ان کی طبیعت کو جودت و حدت ودیعت کر رکھی تھی، مزید برآں زمانے کے تقاضوں نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ مظلوم انسانیت کی پکار۔ نے ان کی شاعری میں ایک طوفانی اور جذباتی کیفیت پیدا کر دی۔ یہی جذباتیت مظلوم انسانیت کے حق میں تو مفید ثابت ہوئی۔ مگر اس کی وجہ سے ان کی ہنگامی نظموں میں گہرائی نہ آنے پائی۔ یہی چیز ان کے اعلیٰ درجے کے خلاق ہونے کی راہ میں رکاوٹ بنی، ان کی نگارشات میں جو تندی و تیزی

ملتی ہے وہ نہ ٹیگور میں ملتی ہے نہ اقبال میں۔

رابندرناتھ کی شاعری ایک اتھاہ سمندر ہے جس میں گہرائی تو ہے مگر تلاطم نہیں۔ نذرالاسلام کی شاعری ایک جوئبار ہے جو گہرا تو نہیں مگر پُرہیجان تندرو ہے جو اچھلتے، پھیلتے، اور سر کرتے ہوئے تیزی سے آگے نکل جاتا ہے۔ رابندرناتھ کی شاعری میں ظلم و ستم کے خلاف صرف احتجاج ملتا ہے نذرالاسلام کی شاعری میں وہ جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

نذرالاسلام، رابندرناتھ اور اقبال تینوں کو انسانیت سے والہانہ محبت تھی۔ تینوں نے انسانیت کے گیت گائے۔ فرق یہ ہے کہ رابندرناتھ اور اقبال نے عوام سے دور رہ کر انہیں محبت کا پیغام سنایا۔ مگر نذرالاسلام نے دلدل میں پھنسے ہوئے انسانوں کے قریب پہونچ کر انہیں نکالنے کی کوشش کی۔ ٹیگور کی شاعری کا جو منتہا تھا۔ اقبال اور نذرالاسلام کا بھی وہی تھا ٹیگور نے جو باتیں نیاز مندانہ انداز میں سنائیں، وہی اقبال اور نذرالاسلام کے یہاں جیتی جاگتی اور انقلابی شکلوں میں رونما ہوئیں۔ اقبال اور ٹیگور عوام سے اتنے قریب نہیں جتنے کہ نذرالاسلام ہیں انہوں نے عوام کو اتنے قریب نہیں دیکھا جتنے کہ نذرالاسلام نے دیکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ٹیگور کی شاعری میں ایک عالم گیر اور گہری محبت کی تلقین ہے جو سرزمین بنگال کے کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ روحانی زبان کی ملاحت و حلاوت، خیالات کی بلندی، مضامین کے سوز و گداز اور فنکارانہ کمال میں کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں۔ نذرالاسلام اور ٹیگور بنگلہ شاعر اقبال فارسی اور اردو دونوں میں اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں یہ تینوں قادر الکلام شاعر ہیں جس میں نذرالاسلام اتنے بڑے خلاق نہیں جتنے کہ ٹیگور ہیں ٹیگور اور نذرالاسلام نے نظم و نثر دونوں کے اہم شعبوں میں قابل ذکر کارنامے چھوڑے ہیں۔ نذرالاسلام شاعر، گیت نویس، موسیقی داں، نگار، ناول نگار، ناٹک نگار، صحافی اور مترجم ہیں، ٹیگور بیک وقت شاعر، گیت نویس، موسیقی داں، افسانہ نگار، مقالہ نگار، ناول نگار، ناٹک نقاش، نقاد اور صحافی ہیں۔

نذرالاسلام ٹیگور اور اقبال تینوں کو جمالیاتی قدروں کا احساس تھا حسن و عشق سے دلچسپی تھی۔ غلامی، ناانصافی، افلاس، جہالت ظلم و ستم کے خلاف تینوں کے یہاں احتجاج ملتا ہے مگر فرق نوعیت اور کیفیت کا ہے۔ اقبال مظلوم انسانیت کی غمخواری میں "کاخ امراء کے در و دیوار" کا پیغام سناتے ہیں ـــ "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" سے گمراہ قوم کو راہِ راست پر لانا چاہتے ہیں، نذرالاسلام طبل اور دمامہ بجا کر لوگوں کو جور و استبداد کے خلاف لڑنے کے لئے میدان جنگ میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ٹیگور عالم گیر محبت اور بے لوث ہمدردی کی دعوت دے کر مفاہمت میں مرض کا علاج ڈھونڈتے ہیں منزل تینوں کی ایک ہی ہے۔ تینوں حرکت و عمل کے شاعر ہیں۔ "ترک آب و گل" سے کسی کا واسطہ نہیں۔ کسی کے یہاں فراری کیفیت نہیں بلکہ کام کرنے کا آگے بڑھنے کے جوش و جذبے سے ان کی شاعری لبریز ہے ان میں مغرب کے عمل اور مشرق کی روحانیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

باایں ہمہ اشتراکِ خیالات، نذرالاسلام، رابندرناتھ اور اقبال میں تھوڑا بہت فرق بھی پایا جاتا ہے۔ نذرالاسلام فلسفی شاعر نہیں وہ اور عوامی شاعر ہیں۔ وہ فلسفیانہ مسائل میں نہیں الجھتے۔ اقبال اور رابندرناتھ فلسفی شاعر ہیں مگر رابندرناتھ اتنے فلسفی نہیں جتنے کہ وہ شاعر ہیں برخلاف اس کے اقبال بیک وقت شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ یہ کہا نہیں جاسکتا کہ ان کا کون سا پہلو راجح ہے اور کون سا مرجوح۔

ٹیگور ظلم و ستم کی طرف قوم کی توجہ منعطف کرکے اس کی خامیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں وہ قوت اور انقلاب کے شاعر نہیں وہ اپنی منزل کو پہونچنے کے لئے قوت کا استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ صلح و آشتی اور میل محبت کے حربوں سے میدانِ جنگ جیتنا چاہتے ہیں۔ نذرالاسلام کی طرح "نقش کہن" کو مٹا کر ایک "جہان نو" کی تخلیق کرنے کے آرزومند تو ہیں مگر وہ اسے بروئے کار لانے کے لئے کوئی واضح اور منظم طریقہ

(باقی ص ۱۶)

مُلّا واحدی

تاثرات

ایمان کے درجات

اس وقت، آج کل کے معیار کے مطابق اور آج کل کے حساب سے، جیسا اچھا مسلمان بھارت میں ہے ویسا کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات نے بھارت کے مسلمانوں کو اللہ کی یاد دلا دی ہے اور اُن کی غفلت خاصی کم کر دی ہے۔ یہ بات میں بھارت کے اوسط طبقے کے مسلمانوں کی بابت کہہ رہا ہوں۔ اونچے طبقے اور نیچے طبقے کا مسلمان وہاں بھی دوسرے ملکوں کی مانند ہے۔ وہاں کے نیچے طبقے میں بہ کثرت مسلمان ایسے ہیں جنہیں کلمہ ٹھیک پڑھنا نہیں آتا اور اونچے طبقے میں ایسے مسلمان ہیں جن کی زبان سے السلام علیکم اس طرح ادا ہوتا ہے، گویا پہلی دفعہ السلام علیکم زبان پر آیا ہے۔ ہم ہندوؤں کی طرف سے بے اطمینان تینوں طبقے ہیں لہٰذا مسلمان کی ایک تعریف اور DEFINITION یہ کی جا سکتی ہے کہ مسلمان وہ ہے جو بھارت میں بے اطمینان اور بے چین ہے، خواہ اسے کلمہ پڑھنا اور السلام علیکم کہنا بھی نہ آتا ہو، بس ہندو جسے مسلمان سمجھیں اور وہ خود اپنے آپ کو مردم شماری میں مسلمان لکھوائے۔ ہندوؤں کا اس کو مسلمان سمجھنا اور اُس کا اپنے آپ کو مردم شماری میں مسلمان لکھوانا ایمان کا ایک درجہ قطعی ہے۔ عاقبت میں اُسے مسلمانوں ہی کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔

دوسرا درجہ ایمان کا یہ ہے کہ مسلمان اسلام کی باتوں کو تھوڑا بہت جانے اور انہیں مانے، اُن پر عمل کرنے کی نیت رکھے اور حسبِ توفیق عمل کرے ٹھوکریں کھا کھا کر سنبھلے اور اللہ کے ہاں ایمان سلامت لے جائے۔ اوسط طبقے کے مسلمان عموماً اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ انہیں نیچے طبقے کے مسلمانوں کی نسبت علماء کے وعظ سننے اور علماء کی صحبت میں بیٹھنے کے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ اُن کے ایمان کا درجہ پہلے درجے سے بظاہر بلند ہے۔

تیسرا درجہ ایمان کا یہ ہے اور یہ بلند ترین درجہ ہے کہ اسلام کی تمام باتوں کے علم کے علاوہ اس بات کا بھی علم ہو جائے کہ اسلام نام ہے قوتِ اختیار کے صحیح استعمال کا یعنی اپنی قوتِ اختیار کو قوتِ اختیار عطا کرنے والے کے احکام اور منشا کے تابع کر دینے کا۔

جو شخص اسلام کا پورا عالم ہو کر بھی قوتِ اختیار کا استعمال غلط کرتا ہے، مثلاً لوگ اُس کے پاس اسلام کی باتیں معلوم کرنے آتے ہیں، مگر وہ انہیں فرقہ بندی کے جھگڑوں میں پھنسا دیتا ہے، تو اُسے ایمان کا یہ بلند درجہ کیا، دوسرے اور تیسرے درجے کا ایمان بھی نصیب نہیں ہے وہ اللہ کی عطا کردہ قوتِ اختیار سے اللہ کے احکام نہیں بجا لاتا اپنے نفس کے احکام بجا لاتا ہے، اُس کا ایمان اُس کے معتقدوں کے ایمان سے کم تر ہے، وہ مخلص مریدوں کا غیر مخلص پیر ہے۔

عالموں سے بڑھ کر حاکموں کا معاملہ ہے۔ کاش مسلمان حکام حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی طرح اپنی قوتِ اختیار کا استعمال کرتے رہتے، مسلمانوں کو جتنا نقصان قوتِ اختیار کے خلافِ قرآن و سنت استعمال نے پہنچایا ہے اتنا اور چیزوں نے نہیں پہنچایا۔ بہرحال قوتِ اختیار کا مطابقِ قرآن و سنت استعمال ایمان کا سب سے بڑا درجہ ہے۔

غیر عالموں اور حاکموں کا تذکرہ چھوڑیئے اور اپنے اوپر غور کیجئے۔ ہم ان کے ساتھ اپنی قوتِ اختیار کا کیا استعمال کر رہے ہیں، جن پر ہمیں

تھوڑی بہت فضیلت حاصل ہے۔ جن سے ہمارا علم اور ادراک لسنافی ہے۔

خوش قسمت بدنصیب

قسمت کیا ہر ایک کو قسّام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

سب سے بڑا خوش قسمت بادشاہوں کو سمجھا جاتا ہے' یا اب جہاں بادشاہ نہیں رہے تو جوان کے قائم مقام ہیں، وہ سب بڑے خوش قسمت سمجھے جا[تے ہیں۔] جن کے آگے اہل علم تک جھکنے لگیں[1]۔ اور جن کے ہاں دن عید اور رات شب برات بنے، انہیں خوش قسمت خیال کرنا غلط یا عجیب بات نہیں ہے۔ اُ[ن کے] خوش قسمت ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے وہ یقیناً خوش قسمت ہیں، بشرطیکہ مسلمان نہ ہوں۔ غیر مسلمان بادشاہ یا سربراہ جتنا خوش قسمت سمجھا جائے، بجا کیوں کہ اس کی عقبیٰ بہر حال خراب ہونی ہے، دنیا میں دن عید اور رات شب برات بنائے عقبیٰ تب بھی خراب ہو گی۔ اور نہ منائے تب بھی خراب، لہذا اس کے لئے اپنی پوزیشن سے لطف اٹھا لینا ہی خوش قسمتی ہے۔ لیکن مسلمان بادشاہ یا سربراہ کی خوش قسمتی اس میں نہیں ہے کہ اس نے کس کس [کو] آگے جھکایا اور کیا کیا مزے اڑائے اس کی خوش قسمتی تو یہ ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ نے موقع دیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے کی پیروی کرے۔ یہ موقع ہر کس و ناکس کو نہیں ملتا۔ یہ خوش قسمتی ہمہ شما کو میسر نہیں آتی۔ خوش قسمت ہیں اور اہل علم اور اہل عرفان سے بڑھ کر[2] خوش قسمت [وہ] لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی جگہ بٹھایا ہے لیکن اگر وہ اس منصب جلیل کا استعمال حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرح نہ کر[یں تو] ان سے زیادہ بدنصیب بھی دوسرا نہیں ہے پھر وہ خوش قسمت بدنصیب ہیں۔ آغاز اچھا اور انجام بُرا۔ اُن کے مقابلے میں تو وہی قابل رشک ہے جس کا [آغاز] بُرا ہوا اور انجام اچھا ہو۔ دنیا کیسی بھی گزرے مگر عاقبت بخیر ہو جائے۔ جیسے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی جانشینی کا شرف تو نہیں بخشا گیا، لیکن حشر اُ[ن کا] حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ساتھ کر دیا۔ یہاں نہ سہی، وہاں وہ اپنے پیشواؤں کے قدموں میں جا بیٹھا۔ مسلمانوں کے نزدیک اعتبار انجام کا ہے۔ جس[نے] عقبیٰ کو پیش نگاہ رکھ کر دنیا کو برتا وہ فلاح یاب ہوا، اور جو خالی دنیا کا ہو رہا وہ دنیا کے اعتبار سے خوش قسمت ہے بھی، تو عقبیٰ کے اعتبار سے بد[نصیب ہے]۔

فقط اس نکتے پر غور کیجئے کہ اُسے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے رنگ میں (جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ تھا) رنگ جانے کا [موقع] دیا گیا۔ مگر اُس نے اپنے تئیں اُن کے رنگ میں نہیں رنگا۔ یہ عظیم ترین بدنصیبی ہے یا نہیں ؟

نہ بولنے کے وقت بولنا

آپ کسی کا ایسا راز جانتے ہوں۔ جسے وہ چھپانا چاہتا ہے، لیکن آپ اُسے ظاہر کر دیں تو یہ گویا ایک بم کا گولا گرے گا جو خود آپ کے بھی[...]!

---

[1] بادشاہوں کے آگے پیچھے پھرنے والے علماء کے ساتھ سوء لگایا جاتا ہے، لیکن ہوتے تو وہ اہل علم ہی ہیں۔ (واحدی)

[2] حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسند خلافت پر تشریف لانے کے بعد پہلے خطبہ میں فرمایا تھا کہ تم میں مجھ سے بہتر لوگ موجود ہیں یہ فقرہ حضرت ابوبکر جیسے سچے انسان کا تھا اسے تکلف کا فقرہ نہیں کہہ سکتے حضرت ابوبکر نے سچ فرمایا تھا لیکن جب انہوں نے خلافت کا زمانہ کامیابی کے ساتھ ختم کر لیا تو وہ افضل البشر بعد الانبیاء تسلیم کئے گئے اُن [سے] بہتر لوگوں نے بھی انہیں افضل البشر بعد الانبیاء تسلیم کیا۔ کوئی خوبی اور کوئی وصف، نبوت کے سوا، سربراہی کی خوبیوں اور وصفوں سے اولیٰ نہیں ہے جو شخص، خلفائے راشدین کے نمونے کے مطابق کر سکے وہ یقیناً اہل علم اور اہل عرفان سے افضل ہے۔ (واحدی)

دوسرا گمان ہو یا نہ ہو، آپ ضرور گمانی ہو جائیں گے، آپ کا ضمیر اگر مردہ نہیں ہے تو قطعی محسوس کریں گے کہ میں نے بُرا کیا۔ وہ لفظ زبان سے نکال کر آفت مول لے لی جس کا ساز تھا، اُسے تو دشمن بنا ہی لیا، دوسرے بھی مجھے ناقابل بھروسہ اور پردہ پوشی نہ کرنے والا کہہ رہے ہیں۔ میری ساکھ اور عزت میں فرق آگیا۔

انسان سب طرح کی باتیں سنتا اور دیکھتا ہے، سننے اور دیکھنے سے بچنا اتنا قبضے کا نہیں ہے جتنا اُن معلومات کا اظہار قبضے کا ہے، جو سننے اور دیکھنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ آپ زبان پر قابو رکھ سکتے ہیں۔

جہاں تک میں نے سمجھا ہے، کوئی معلومات بغیر کرید کے کانوں میں پہونچ جائے تو اُس کی اللہ کے ہاں گرفت سخت نہیں ہوگی۔ مگر معلومات کے اظہار پر اللہ نے پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ ارشاد ہے: ہم انسان کے خالق ہیں، ہم ان وسوسوں اور خطروں تک سے باخبر رہتے ہیں جو انسان کے دل میں گزرتے ہیں ہم رگ و جان سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہیں۔ جب ریکارڈ کرتے ہیں (ہمارے) دو ریکارڈ کرنے والے دائیں بائیں بیٹھ کر، تو زبان سے لفظ نکلتے ہی (اچھی باتیں دائیں طرف کا فرشتہ اور بُری باتیں بائیں طرف کا فرشتہ لکھ لیتا ہے) پہرہ دار (اُسے لکھنے کے لئے) بغل میں موجود ہوتے ہیں (سورہ ۵۰۔ آیات ۱۶ تا ۱۸)

بقول شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ رگ جاں باہر نمایاں ہے اور اللہ باہر اور اندر سب جگہ نہاں ہے ؎

جاں نہاں در جسم و اُو در جاں نہاں

فرشتوں کا لکھنا فعل عبث نہیں ہے۔ ایک ایک لفظ کی جزا ملے گی اور ایک ایک لفظ کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔

چھوٹا سا فقرہ ایٹم بم کا حکم رکھتا ہے۔ چھوٹا سا فقرہ دنیا میں انقلاب برپا کر سکتا ہے اور دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ تقسیم ہند سے چند دن پہلے ایک فارمولا تجویز کیا گیا تھا جسے مسلم لیگ اور انڈین کانگریس دونوں نے مان لیا تھا۔ اس فارمولے کے مطابق عمل درآمد ہوتا تو پھر تقسیم کی ضرورت نہ پڑتی۔ مگر فارمولا منظور کر لینے کے بعد کچھ الفاظ پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان پر اس نوعیت کے آ گئے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے کہا کہ بھائی! کام نہیں چلے گا۔ اب ہمیں پاکستان ہی چاہیئے۔ پاکستان کے نقوش ابھر گئے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے دو چار لفظوں نے انہیں پھر اُجاگر کر دیا۔ پنڈت جی بلند پایہ سیاست داں اور مدبر شخص تھے، لیکن کبھی کبھی زبان کو آزاد چھوڑ دیتے تھے۔

ہماری اور آپ کی زبان بھی بگڑ جاتی ہے، مگر اہل سیاست اور اہل اقتدار کی زبان ہم سے اور آپ سے زیادہ بگڑ جاتی ہے ؎

جن کے رتبے ہیں سوا، اُن کی سوا مشکل ہے

اہل سیاست اور اہل اقتدار کو واقعی تول کر بولنا چاہیئے اور جو تول کر کے نہیں بولتے ان کی سیاست اور ان کے اقتدار کی عمر طفلی کے دور سے آگے نہیں بڑھتی۔

عوام کی باتیں زخم زبانی ہیں اور خواص کی باتیں ناسور بن جاتی ہیں۔ عوام کی باتیں گھر بگاڑتی ہیں اور خواص کی باتیں سلطنتیں تہ و بالا کر دیتی ہیں۔ کوئی بچہ کیچڑ کے قریب کھڑا تھا۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے اُسے سمجھایا کہ ذرا دور کھڑے ہو، ورنہ پیر پھسل جائے گا۔ وہ بچہ کیا تھا فرشتہ تھا اُس نے کہا قبلہ آپ بھی احتیاط سے قدم اٹھائیے۔ میں گروں گا تو اکیلا میں چوٹ کھاؤں گا، آپ گرے تو ساری قوم چوٹ کھا جائے گی آپ کا پھسلنا ساری قوم کا پھسلنا ہے۔

بہت نہیں بولنا چاہیئے فقط بولنے کے وقت بولنا چاہیئے۔ بولنے کے وقت نہ بولنا نقصان رساں ہے اور نہ بولنے کے وقت بولنا نقصان رساں ؎

حضرت علی تو ابتدائے اسلام کے بے لوث اور خدا کار مسلمان ہیں، ابتدائے اسلام کے نہیں روز اول کے مسلمان۔ ادھر نبوت کا اعلان ہوا ادھر حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ایمان لے آئے، امیر معاویہ حضرت علی کے مقابلے میں آ گئے تھے تو حضرت علی نے امیر معاویہ سے کشمکش کیوں کی۔ یہ یزید تو نہ تھے کہ حضرت علی حضرت امام حسینؓ کی طرح سینہ سپر ہو جاتے۔ امیر معاویہ میں یزید سا کوئی عیب نہ تھا پھر امیر معاویہ اگر حضرت علی کے مقابلے کے واسطے کھڑے ہو گئے تھے تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی تو حضرت علی کا مقابلہ کرنے اٹھی تھیں۔ حضرت طلحہ اور زبیر جیسے بے شمار جلیل القدر اور مقدس اصحاب جھگڑوں کو نمٹانے کی بجائے جھگڑوں میں تیغ بکف ہے۔ امیر معاویہ کے طرفدار بھی صحابہ ہی تھے۔ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی نصف خلافت سے کشمکش شروع ہوئی اور برابر بڑھتی گئی۔ یہ کشمکش کیوں شروع ہوئی اور کیوں بڑھی۔

حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما جیسا زمانہ چلے جاتا تو کیا دنیا کا کوئی حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آنے سے بچ سکتا تھا۔ اللہ کی کیا حکمت تھی کہ مسلمان آپس میں لڑ پڑے، براہ راست پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تربیت پانے والے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے۔ خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما درآں باشد۔

میری تمہید آپ نے پڑھ لی، اب مولانا نجیب آبادی کا بیان ملاحظہ فرمایئے:- اللہ تعالیٰ نے یہ اندرونی جھگڑے پیدا کر کے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو لڑائیوں میں مصروف کر دیا اور دوسری جماعت نے ان جھگڑوں سے بددل ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ جب تک یہ جھگڑے پیدا نہیں ہوئے صحابہ کرام کی تمام تر ہمت کفار کا مقابلہ کرنے میں صرف ہوتی تھی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا زمانۂ خلافت معرکہ آرائیوں سے پُر ہے جمع قرآن کا کام اُس زمانے میں انجام دیا گیا باقی یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ صحابہ کرام یکسو اور فارغ بیٹھ کر فقہی مسائل مرتب کرنے اور احادیث نبوی کی اشاعت کا انتظام فرماتے۔ جوں جوں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا تھا جنگی مصروفیت ترقی کرتی جاتی تھی، اور وہ حضرات جنہیں درس شریعت دینے اور حکمت سمجھانے تھے، نیزوں کی انی کے سامنے سینے کھولنے میں زیادہ مصروف تھے، اس جنگی مظاہرے کی اُس وقت یقیناً ضرورت تھی مگر اب دنیا کی زبردست طاقت مان لی گئی تھی، اب ضرورت یہ تھی کہ اسلام کا مکمل نظام اور شریعت کے جملہ پہلو محفوظ و مامون ہو جائیں۔ صحابہ کو موقع اور فراغت میسر ہو کہ وہ ایسی نسل تیار کر سکیں، جو آئندہ آنے والوں کی نگہداشت رکھے اور اسلام کی حفاظت کا سلسلہ جاری رہے خدائے بزرگ و برتر نے عبداللہ بن سبا اور اُس کے متبع مسلم نما یہودیوں کو جنم دے کر حضرت عثمان کی شہادت اور جنگ جمل اور جنگ صفین کے سامان یکے بعد دیگرے مہیا فرمائے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے صحابی تلواروں اور تیر کمانوں کو توڑ کر اور سپہ سالاری چھوڑ کر علم میں لگ گئے۔ صحابہ کرام کی بہت کثیر تعداد ایسی تھی کہ انہوں نے ان جھگڑوں میں مطلق حصہ نہیں لیا یہ کثیر تعداد شریعت اسلام کی حقیقت اور سیرت نبوی سے آگاہ کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ خدائے تعالیٰ نے صحابہ کرام سے تعلیم اسلام کا فریضہ ادا کرانا چاہا تو مدینہ منورہ سے خلافت ہٹا دیا اور وہ مدینہ جو چند دن پہلے فوجی کیمپ تھا دارالعلوم کی شکل میں بدل گیا۔ حدیث و فقہ کی کتابیں تحقیق و تدقیق کی نگاہ سے دیکھو، یہ حقیقت نظر آ جائے گی کہ حدیث و فقہ و تفسیر کا پورا مواد اُسی زمانے کا رہین منت ہے جس زمانے میں بعض صحابہ کے درمیان مشاجرات تھے۔ اگر یہ مشاجرات برپا نہ ہوتے اگر حضرت امیر معاویہ اور حضرت علی مرتضیٰ آپس میں نہ جھگڑتے تو ہم شریعت اسلام کے بڑے اور ضروری حصے سے محروم اور تہی دست رہ جاتے مگر کیوں رہ جاتے خدائے تعالیٰ اسلام کا محافظ ہے اُس نے امیر معاویہ اور حضرت علی کے اختلاف کی

ملحوظ: اس کشمکش میں "حق" حضرت علی کے ساتھ تھا (م-ق)

ں میں اسلام کی حفاظت کا سامان کیا۔

اس مدعا کے ایک اور پہلو پر بھی غور کرو۔

ہر حکومت اور ہر نظام تمدن کے راستے میں جس جس قسم کی رکاوٹیں، دقتیں اور پیچیدگیاں آنی ممکن ہیں اور آج تک آتی رہتی ہیں
کے نمونے حضرت امیر معاویہ اور حضرت علی مرتضیٰ کے مشاجرات میں موجود ہیں۔ ان مشکلات کے رونما ہونے پر دوسرے حکمرانوں اور بادشاہوں
بکہ جن اخلاق اور جن کوششوں اور اقدامات کا نمونہ پیش کیا ہے اُن سب سے بہتر اور قابل تحسین طرزِ عمل وہ ہے جو صحابہ کرام نے ظاہر فرمایا
زن کے بننے اور بگڑنے، قوموں کے گرنے اور اُبھرنے بلکہ خاندانوں کے عروج و زوال کے واقعات سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ چالاکیوں
دوانیوں اور فریب کاریوں سے کوئی زمانہ اور کوئی عہد حکومت خالی نہیں رہا ان باتوں کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہ اور امیر معاویہ
فتوں کی روئداد ہمارے سامنے نمونے پیش کرتی ہے اور ہم اپنے لئے بہترین طریقہ کار اور اعلیٰ ترین راہ عمل تجویز کرنے میں دشواری نہیں
یہ ہماری کور چشمی اور بدنصیبی ہے کہ ہم نے صحابہ کرام کی اجتہادی مخالفتوں اور امیر معاویہ اور حضرت علی کے مشاجرات کو بجائے اس کے کہ اپنے
بب عبرت و بصیرت اور باعث خیر و نفع بناتے اپنی نااتفاقی و درندگی اور اپنی فلاکت و نکبت کا ذریعہ بنا لیا ہے ؎

ہر چہ گیرد علتی علت شود
آنچہ گیرد کاملے ملت شود

مسلمانوں کی علوم و فنون سے دلچسپی

قرآن و حدیث کی موجودگی میں ہمیں اور کتابیں پڑھنے اور علوم سیکھنے کی ایک تو اس لئے ضرورت ہے کہ اسلام نے اس کا حکم دیا ہے، دوسرے
ضرورت ہے کہ قرآن و حدیث کی صداقت اور برتری کے زیادہ سے زیادہ ثبوت بہم پہونچائیں۔ عباسیوں کے زمانے سے پہلے مسلمانوں کو دوسرے
نون کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا عباسیوں میں مامون الرشید نے دوسرے علوم و فنون سے بے حد دلچسپی لی ——— دارالترجمہ اور
تصنیف کی بنیاد مامون الرشید کا باپ ہارون الرشید ڈال گیا تھا، مامون الرشید نے اُس سے اتنا کام لیا کہ شاید ہی کوئی بڑے سے بڑا حکمراں
تا ہے۔ مامون الرشید نے قیصر روم کو لکھا کہ میں ارسطو کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتا ہوں ارسطو کی کتابیں مجھے بھیج دیجئے، قیصر کتابیں بھیجنی
ہتا تھا، لیکن عیسائی پادریوں نے اُس سے کہا کہ ارسطو کی کتابیں مسلمانوں کے پاس ضرور جانی چاہئیں۔ عیسائیوں کو مذہب سے برگشتہ ان ہی کتابوں
ہے مسلمان انہیں پڑھیں گے تو کچھ قرآن کا دینی جوش ٹھنڈا ہوگا۔ لیکن عیسائی پادریوں کا اندازہ صحیح نہیں تھا۔ دوسرے علوم و فنون مسلمانوں
مان صرف اسی صورت میں پہونچا سکتے ہیں کہ مسلمان قرآن و حدیث سے بہرہ ور ہونے کی صورت میں مسلمان دوسرے علوم و فنون کی وہی چیزیں
یتے ہیں جن پر یہ حدیث صادق آتی ہے کہ حکمت مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث ہے جہاں ملے اُسے لے لو۔ باقی نامعقول خیالات کے مسلمانوں
نے اُڑا کر رکھ دیے ہیں۔ انہوں نے محض ترجمہ نہیں کیا، مضامین کو پرکھا بھی اُن پر کتابیں لکھیں۔ حق کی تائید کی، اور ناحق کی تردید کردی، انہوں
سرے علوم و فنون کو نیا جامہ پہنا کر اپنا لیا۔

مامون الرشید نے قیصر کے علاوہ اپنے عیسائی ملازم باہر روانہ کئے کہ جگہ جگہ سے علوم و فنون کی کتابیں جمع کرکے لائیں۔ مجوسی علماء کو بھی اس
بلایا۔ بعض مترجموں کی تنخواہیں ڈھائی ڈھائی ہزار درہم تھیں اور مترجم دو چار نہیں تھے، بے شمار تھے، ترجمہ تیار ہو جاتا تھا تو ترجمہ جس حیثیت

کا قرار پاتا، اُسے چاندی یا سو میں تولا جاتا اور چاندی سونا مترجم کو تنخواہ سے الگ دیا جاتا۔

ہندوستان کے راجا رَر نہ مامون الرشید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سنسکرت کے عالم خود حاضر کردیتے تھے، غرض ہر ملک، بلکہ ہر شہر کا منتخب عالم مامون الرشید کے دربار میں جمع تھا۔ علمی مجلسیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ مامون الرشید اُن میں شرکت کرتا تھا اور حصہ لیتا تھا

مامون الرشید کے دل میں علما کی قدر تھی۔ اصمعی، عربی لغت اور نحو کا امام مامون الرشید کے زمانے میں بُڈھاپے کے باعث اس قابل نہیں رہا تھا کہ ترک وطن کرے اور بغداد آبسے۔ مامون الرشید اُس سے وطن ہی میں کام کراتا تھا اور وظیفہ دیتا تھا۔ فرّا نحوی کے واسطے شاہی محل کا ایک کمرہ وقف تھا جہاں بیٹھ کر علما، فرّا سے استفادہ کرنے تشریف لاتے تھے۔

مامون الرشید نے دارالمناظرہ بھی قائم کردیا تھا۔ جہاں ہر مذہب اور ہر مشرب کے لوگ آزادی کے ساتھ مناظرہ کرسکتے تھے۔ مامون الرشید علم کا فطرتاً قدردان تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیجئے۔ مامون الرشید کے ایک استاد ابومحمد یزیدی کہتے ہیں کہ میں جب مامون کو پڑھاتا تھا، کسی نے مجھ سے شکایت کی کہ مامون آپ کے پیچھے نوکروں کی ٹھکائی کرتا ہے۔ میں نے اس پر مامون کو مارا۔ مامون رو رہا تھا کہ اُس کا اتالیق اور سلطنت کا وزیر اعظم جعفر برمکی آ گیا۔ میں اب وہاں نہیں بیٹھ سکتا تھا، باہر جا بیٹھا۔ جعفر برمکی رخصت ہوا تو میں نے مامون سے پوچھا تم نے کہیں میری شکایت تو نہیں کردی مامون نے جواب دیا آپ کی شکایت تو میں والد سے بھی نہیں کروں گا۔ آپ استاد ہیں آپ نے مجھے دشمنی کی وجہ سے نہیں مارا تھا۔ میرے فائدے کے لئے مارا تھا۔

(صفحہ ۸ سے آگے)

نہیں کرسکتے، یہ فضیلت حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال کو حاصل ہے۔ وہ "زمین و آسمان مستعار" کو مٹا کر اپنی دنیا آپ پیدا کر" کا پیغام سناتے ہیں۔ وہ تشخیص مرض کے بعد اس کا علاج بھی پیش کرتے ہیں، قوم کو اپنی منزل مقصود تک پہونچانے کے لئے ایک منظم طریقہ کار پیش کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر نذرالاسلام کے یہاں "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" تو ہیں، مگر "خضر راہ" نہیں۔ رابندرناتھ کے یہاں "طاؤس و رباب" تو ملتا ہے مگر "شمشیر و سناں" نہیں ملتی۔ ہاں حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کے یہاں "بانگ درا" بھی ہے "ضرب کلیم" بھی ہے اور "خضر راہ" بھی۔ "طاؤس و رباب" بھی ہے اور "شمشیر و سناں" بھی۔

ٹیگور کی شاعری، ان کی تشبیہات و استعارات، ان کے محاورے اور کہاوتوں میں عام طور پر ہندو تہذیب و تمدن کی ترجمانی ملتی ہے۔ دوسری طرف اقبال نے اپنی شاعری کو اسلامی جذبات و خیالات، مذہبی واقعات و سانحات کے لئے وقف کردیا۔ مگر نذرالاسلام کی شاعری گنگا، جمنا اور دجلہ فرات کا سنگم ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے تہذیب و تمدن کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہر فرد بشر میں اپنے اپنے مذہب کی انقلابی روح پھونک کر ان میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال تینوں قومی رہبر ملک کے علمبردار اور آفاقی شاعر ہیں۔ قومی تعمیر میں کسی کا حصہ کم نہیں، تینوں قومی تعمیر کی صف اولین میں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ قوم تینوں کی مرہون منت ہے اور تینوں کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔ پاک و ہند کی آزادی پر تینوں کا زبردست احسان ہے۔

(صفحہ [illegible] کا بقیہ)

معاشی کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے اور اس کے معاشی نظام کے بعض اہم مسائل بھی روشنی میں آجاتے ہیں اب رہی یہ بات کہ اسلام کے اس معاشی نظام کو اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ کس طرح عملی شکل دی جائے اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس کے لئے ہمیں تدریج اور حکمت کے اصول پر عمل کرنا ہوگا البتہ اس سے ان تنظیمی مصالح کا خیال رکھنا ضروری ہے جن کی اسلام نے موجودہ حالات میں ہدایت کی ہے و لہ مکان آخر انشاء اللہ۔

محمد حسام اللہ شریفی

نبی کریمؐ اور اصلاحِ معاشرہ

آج سے چودہ سو سینتیس برس پہلے ۱۲ ربیع الاول کو اُس ذات قدسی صفات نے اس دنیا میں ظہور کیا جسے کائنات کے لئے رحمت بنا کر [بھیجا] گیا تھا اور جس نے اپنی اسی رحمت سے کام لیتے ہوئے کائنات کی ساری تاریکیوں اور ظلمتوں کو روشنی سے بدل دیا اور انسانی معاشرے کی تمام خرابیوں کو دور کر دیا۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ظہور سے پہلے کی دنیا کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو دنیا میں نہ پائی جاتی ہو کوئی برائی ایسی نہ تھی جس میں اہل عرب مبتلا نہ ہوں۔ غرض سارا معاشرہ بگڑ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کے لئے اپنے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جنہوں نے بہت قلیل عرصے میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح نہایت عمدہ اور احسن طریقے سے فرمائی۔

رسول معظم نبی آخر علیہ السلام نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح فرمائی اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا جس تک آپکی نگاہ نہ پہونچ سکی ہو۔ معاشرے کی اصلاح کی خاطر نبی مکرم کو ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں لیکن تمام مصیبتیں سہنے کے باوجود بھی آپ نے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کا کام جاری رکھا اور عمر مبارک کے کسی لمحے میں بھی یہ مقصد آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکا اور آپ کی جہد مسلسل اور سعی پیہم کے نتیجے میں تیئس سال کی مختصر سی مدت میں وہ مثالی معاشرہ وجود میں آگیا جس کی نظیر دنیا آج تک پیش نہیں کر سکی۔

کسی شخص کی عدم موجودگی میں اُس کی برائی بیان کرنے کو لوگ کتنا حقیر کیوں نہ سمجھتے ہوں لیکن بظاہر اس معمولی سی چیز سے معاشرے میں جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور گھر کے گھر جس طرح تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اُس سے ہر شخص واقف ہے اسی لئے ایک دوسرے کے دلوں میں کدورت، نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہی چیز معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو روکا گیا اور ارشاد فرمایا:

لَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضاً (القرآن) تم میں سے کوئی شخص کسی کی غیبت نہ کرے۔

غیبت کیا ہے؟

ذِکْرُکَ اَخَاکَ بِمَا یَکْرَہُ قیل: اَفَرَأَیْتَ اِنْ کَانَ فِی اَخِی مَا اَقُوْلُ؟ قَالَ: اِنْ کَانَ فِیْہِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَہٗ وَاِنْ لَمْ یَکُنْ فِیْہِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَہَتَّہٗ

(مسلم عن ابی ہریرہ)

اپنے مسلمان بھائی کا ذکر اُن الفاظ میں کرنا کہ اگر وہ اُن الفاظ کو سن لے تو نا پسند کرے۔ پوچھا گیا: اگر وہ برائی جو بیان کی جا رہی ہے اس میں موجود ہو تب بھی؟ فرمایا: اگر وہ عیب جو تم نے بیان کیا ہے اس شخص میں موجود ہے تو غیبت ہے

اور اگر تمہارا بیان کردہ عیب اس میں نہیں پایا جاتا تو یہ
بہتان ہے (جو غیبت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے)

رشوت ۔ معاشرے کا ایک رستا ہوا ناسور ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں اس کی مذمت کی جاتی رہی ہے حضورؐ نے اس کی مذمت ان الفاظ میں فرمائی
الراشی والمرتشی فی النار (الحدیث) رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے کا ٹھکانا جہنم ہے ۔ بلکہ اس کی جڑ بھی کاٹ کر رکھ دی ۔
عن ابن عمرؓ نہینا عن التکلّف (بخاری) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل فرماتے ہیں کہ ہمیں تکلف سے روکا گیا اور یہ تکلف اور نمود و نمائش ہی رشوت لینے کا سبب بنتے ہیں اور جب کوئی معاشرہ تکلّف کی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اور لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس کے بجائے طبقۂ اعلیٰ میں شامل ہونے کی خواہش ان میں پیدا ہو جائے تو پھر ان تکلفات میں اُن کی آمدنی ان کا ساتھ دینے سے انکار کردیتی ہے اور لامحالہ انہیں "دست غیب" کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے امت کو تکلفات میں پڑنے سے روک دیا ۔

سود کے ذریعہ جس طرح غریبوں کی دولت کو ان سے چھینا جاتا ہے اور جس حالتوں میں انہیں نانِ شبینہ تک سے محروم کر دیا جاتا ہے اُسے کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ پھر اس سے وہ لوگ جن کے پاس کچھ رقم ہوتی ہے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور بغیر محنت و کوشش کے اپنے سرمائے میں اضافہ اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں جس سے وہ لوگ کاہل اور معاشرے کے لئے ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں یہ لوگ صرف اپنا بھلا چاہتے ہیں دوسروں کی بھلائی او نفع سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی ایسے لوگوں سے معاشرے کی کسی قسم کی بھلائی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی اور اسی وجہ سے اسلامی معاشرے میں سود کے لئے کوئی گنجائش نہیں ۔

عن ابن مسعودؓ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربا وموکلہ رواہ مسلم زاد الترمذی وغیرہ وشاھدیہ وکاتبہ (ریاض الصالحین ص ۶۱۶)	جناب عبداللہ بن مسعودؓ نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ نے سودی کاروبار کرنے والے (سود لینے اور سود ادا کرنے والے) سودی کاروبار کے متعلق گواہی دینے والے اور سودی کاروباری خط و کتابت کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے ۔

جب کسی قوم اور کسی ملک کے لوگوں میں امارت کی حرص پیدا ہو جاتی ہے اور ہر آدمی امیر قوم، ہر شخص امیر صوبہ اور ہر راہنما امیر ملک بننے کا خواہاں ہو اور اس مقصد کے لئے وہ ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈے اختیار کرنا شروع کر دے تو سمجھنا چاہئے کہ اس معاشرے میں بگاڑ کی ابتدا ہو چکی ہے کیونکہ ایسے موقعے پر ہر شخص اپنے مقابل کی پگڑی اُچھالنے کی کوشش اور اُس کی معمولی سے معمولی غلطی اور برائی کو بڑھا چڑھا کر دوسروں کے سامنے پیش کرنے میں مصروف نظر آتا ہے ۔

وعین السخط تبدی المساویا

اسی لئے جناب نبی کریم علیہ التسلیم ارشاد فرماتے ہیں ۔

انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیامۃ (بخاری عن ابی ہریرہ)	تم لوگ امارت کے خواہش مند ہو گے حالانکہ یہی چیز قیامت کے دن تمہارے لئے ندامت کا باعث ہو گی ۔

اور امت کی راہنمائی کرتے ہوئے اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی فرما دی کہ تمہیں اپنے لئے امیر منتخب کرتے وقت کن امور کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور کس قسم کے لوگ کو اپنا حاکم بنانا چاہئے ۔

خیار ائمتکم الذین تحبونہم ویحبونکم وتصلون	تمہارے بہترین حاکم اور امراء وہ ہیں جن سے تم محبت رکھتے

علیکم - وشرار ائمتکم الذین تبغضونھم و یبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم قال: قلنا یا رسول اللہ، أفلا ننابذھم؟ قال: لا ما اقاموا فیکم الصلاۃ -

(مسلم عن عوف بن مالک)

ہو اور وہ تم سے محبت رکھتے ہیں۔ تم ان کے لئے دعائیں مانگتے ہو اور وہ تمہارے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ اور تمہارے بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم نفرت کرتے ہو اور وہ تم سے عداوت رکھتے ہیں اور تم اُن پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ایسے حاکموں کی اطاعت کرنے سے ہم اپنے آپ کو آزاد نہ کرلیں؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں بہترین حاکم وہ لوگ کہلانے کے مستحق ہیں جو عوام سے قریب ہوں ان سے اپنا رابطہ قائم رکھتے ہوں اور ہمہ وقت ان کی بھلائی میں مصروف رہتے ہوں عوام ان کی حکومت کی سلامتی اور ان کی درازئ عمر کے لئے دعاگو ہوں۔ اور جن لوگوں نے عوام سے دوری کو اپنا شیوہ قرار دے رکھا ہو اور ان کی بھلائی سے انہیں کوئی غرض نہ ہو بلکہ ان کے لئے مزید مشکلات پیدا کرتے رہنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہو، ان کی زبان پر اُن کے قلم پر اور ان کی آواز پر پابندی لگا دینے کو اپنی کامیابی سمجھ رکھا ہو ان کا شمار ناپسندیدہ حاکموں میں ہوتا ہے۔

دوسری روایت میں اطاعتِ امیر کے متعلق مزید وضاحت فرمائی کہ ان کی اطاعت اسی وقت کے لئے ہے جب تک اُن کے احکام ۔ اور اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو، اور اگر اس کے برعکس صورت پیدا ہو جائے تو پھر ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ ان کی بات سننا بھی گوارا نہ کرے۔

فان اُمِرَ بمعصیۃٍ فلا سمع ولا طاعۃ

(بخاری ومسلم عن ابن عمرؓ)

اگر اس کی جانب سے اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو اسی صورت میں اس کی بات سننا بھی گوارا نہ کرو اور نہ اس کی اطاعت کرو۔

معاشی اور دوسری مختلف پریشانیوں کی بنا پر جب معاشرے سے ذہنی سکون و اطمینان رخصت ہو جائے اور ہر طرف بے اطمینانی کا دور دورہ ہو جائے تو اس معاشرے میں معمولی معمولی باتوں پر دوسروں کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو ختم کرنے کی وارداتیں عام ہونے لگتی ہیں ـــ ضبطِ تولید کا پرچار کیا جانے لگتا ہے۔ مثبت اقدام اختیار کرنے کے بجائے منفی قدم اٹھائے جانے لگتے ہیں مگر اسلامی معاشرے میں ان میں سے کسی بھی چیز کو درست نہیں سمجھا گیا اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے ضبطِ تولید کو کسی طور مستحسن قرار نہیں دیا ـــــــــــ کہ اس کے ذریعے عصمت و عفت کے ختم ہو جانے کا امکان ہی نہیں بلکہ یقین ہے اور یہ چیز زنا کے پھیلنے میں ممد ثابت ہوتی ہے اور حالات و واقعات اس پر شاہد ہیں ـــ تو کیا محض ایک موہوم امید کے سہارے اتنے عظیم نقصان کو برداشت کرنا عقلمندی اور دانائی کہا سکتا ہے؟

معاشرے سے اس برائی کو ختم کرنے کے لئے خود اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا:

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق (القرآن) ۔ بھوک سے ڈر کر اپنی اولاد کو ختم نہ کرو۔

اور جناب نبی کریمؐ نے معاشرے کی اس گندگی کی دور کرتے ہوئے فرمایا:

الکبائر الاشراک باللہ وعقوق الوالدین وقتل النفس والیمین الغموس

(بخاری عن عبداللہ بن عمرو بن العاص)

کبائر میں - خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے اور والدین کی نافرمانی نیز اور قتلِ نفس اور جھوٹی قسم کھانا یہ تمام افعال کبائر میں سے ہیں۔

رسول معظم نے ان چار باتوں کی نشاندہی کرکے ان سے بچنے کا حکم دیا اور ایک دوسری حدیث میں تنگی رزق کا سبب بتلا دیا کہ جب کسی قوم میں زنا زنت ہو جاتی ہے اور وہ لوگ ناپ تول میں کمی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے رزق میں کمی کر دی جاتی ہے اور غلہ کم پیدا ہونے ہے۔ اور پھر وہ لوگ یہ رونا روتے ہیں کہ غلہ کم اور کھانے والے زیادہ ہیں لیکن اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ اپنے معاشرے سے زنا کو ختم کریں ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو سختی سے اس حرکت سے منع کریں اور اسی طریقے سے معاشرے کو فساد سے بچایا جا سکتا ہے۔

معاشرے میں فتنہ وفساد اور خرابی پیدا کرنے میں مرد وزن کا آزادانہ اختلاط بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے اس سلسلے میں مغربی ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں مرد وزن کے آزادانہ اختلاط سے معاشرہ جس تیزی سے تباہی و بربادی کے گڑھے کی طرف جا رہا ہے اہل مغرب خود اس سے نالاں ہیں اور ہمارے کے اہل عقل و دانش ان حالات سے بخوبی آگاہ ہیں اسلامی معاشرے میں اس اختلاط کو روکنے کے لئے پردے کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور اپنے خاص رشتے داروں کے علاوہ کسی بھی مرد کے سامنے آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حد یہ ہے کہ امہات المومنین رضوان اللہ علیہن اجمعین کو سب سے پہلے پردے کا پابند کیا اور اپنے رشتے داروں کے سوا سارے مسلمانوں سے پردہ کرنے کا حکم دیا گیا اس معاملے میں ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں برتی گئی:

وقرن فی بیوتکن　　(القرآن)　　اور وہ سب اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں۔

عن ام سلمة قالت کنت عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعندہ میمونة فاقبل ابن ام مکتوم (و ذلک بعد ان امرنا بالحجاب) فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: احتجبا منه. فقلنا: یا رسول اللہ الیس ھو اعمی - لا یبصرنا ولا یعرفنا؟ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أفعمیاوان انتما، الستما تبصرانه؟

(ابو داؤد . ترمذی)

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ (پردے کا حکم نازل ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ) میں اور میمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ عبداللہ ابن ام مکتوم آ گئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو پردہ کر لینے کا حکم دیا کہ تم دونوں پردے میں چلی جاؤ۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ نہ یہ ہم کو دیکھتے ہیں اور نہ یہ ہمیں پہچانتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم دونوں اندھی ہو، تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟ (یعنی وہ تو دیکھنے سے معذور ہیں لیکن تم تو ان کو دیکھ رہی ہو اور پردہ دونوں ہی طرف سے ہے)

مرد و عورت کے دائرۂ کار بالکل الگ الگ ہیں اور اسلامی معاشرے کی جانب سے ان دونوں کی حدود متعین ہیں۔ گھریلو ذمہ داریاں — عورت کو سونپی گئی ہیں اور بیرونی معاملات مرد کے سپرد کئے گئے ہیں ان دونوں میں سے جو فریق بھی اپنے حدود سے تجاوز کرکے دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کرتا ہے معاشرے میں فتنہ وفساد اور بگاڑ کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

معاشرے کے بگاڑ میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے اور اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری انہی لوگوں پر ہے جو ذہنی غلامی میں مبتلا اور احساس کمتری کا شکار ہو گئے ہیں اور جو صرف دوسروں کی نقالی کرنا جانتے ہیں خواہ یہ نقالی زبان کی حد تک ہو یا لباس، رہن سہن اور کھانے پینے کے طریقوں تک پہنچ گئی ہو اور مرد زنانہ قسم کے لباس پہننا اور بال بنانا پسند کرتے ہوں یا عورتیں بالوں اور لباس میں مردوں کی نقالی شروع کر دیں یہ تمام باتیں کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دی جا سکتیں اور اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ان تمام قسموں کی نقالی سے روکا ہے۔

المرء مع احب ۔
(بخاری ومسلم عن ابی موسیٰ الاشعری)

آدمی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن سے اُسے محبت اور تعلق ہو (اور جن کے راستے پر چلنا اسے پسند ہو)

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال : لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المتشبہین من الرجال بالنساء والمتشبہات من النساء بالرجال
(بخاری)

جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ان مردوں پر جو عورتوں کیساتھ مشابہت پیدا کرتے ہیں اور ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو مردوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتی ہیں۔

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تحلق المرأۃ راسہا ۔
(نسائی عن علی)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو سر کے بال منڈوانے سے روکا ہے۔

درحقیقت اس میں وہ تمام صورتیں آجاتی ہیں جن کا آج کل عام طور پر رواج ہے کہ چٹیا کٹا کر مردوں کی طرح بال بنا لئے جاتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پیغمبر آخرالزماں جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بگڑے ہوئے معاشرے کی مکمل اصلاح و تطہیر فرمائی اس کی بنیاد خوف خدا پر رکھی۔ جس معاشرے کی بنیاد خوف خدا کے علاوہ کسی اور چیز پر ہو گی وہ معاشرہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس معاشرے کا درست ہونا اور اس کی اصلاح ہونا قطعی ناممکن ہے اسی بنا پر اسلام نے خوف خدا کو اپنے معاشرے کی اصلاح کے لئے بنیادی ستون قرار دیا ہے۔

حضورؐ نے معاشرے کے جن جن پہلوؤں کی اصلاح فرمائی ان میں سے چند پہلو آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے —— آج معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں وہ اسی طرح دور ہو سکتی ہیں کہ ان معاملات میں نبی کریمؐ کی اطاعت کو اپنے لئے لازم قرار دے لیا جائے اور ان ہدایات سے سر مو انحراف نہ کیا جائے۔ بصورت دیگر معاشرے کے بگاڑ میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور آخر ایک دن وہ آئے گا جب اس کی اصلاح ناممکن ہو کر رہ جائے گی اس دن کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیئے

لیتی ہے یا معمولی تبدیلی سے مغالطے میں پڑ جاتی ہے۔ (عقل رہنمائی کرتی ہے یا اُن بدبختوں میں سے ہے، جن کی عقل رہنمائی نہیں کرتی۔ عقل ہوگی تو ہدایت پائے گی ورنہ ہدایت نہیں پائے گی۔ خیر) جب ملکہ آگئی تو (اُس سے) پوچھا کہ تمہارا تخت (بھی) کیا ایسا ہی ہے۔ وہ (اپنا تخت پہچان گئی لیکن چونکہ تھوڑی سی تبدیلی تھی) بولی گویا یہ (بعینہٖ) ویسا ہے ہمیں تو اس (معجزہ کے دیکھنے) سے قبل ہی معلوم ہو گیا تھا (کہ آپ نبی ہیں اور قابل پرستش وہی اللہ ہے۔ جس نے آپ کو نبی بنایا ہے) ہم (یہاں آنے سے قبل ہی) مسلمان (ہو گئے) ہیں۔ سلیمان نے اُسے اللہ کے علاوہ اور چیزوں کی عبادت و اطاعت سے روک دیا۔ البتہ (سابق میں) وہ اللہ کی منکر تھی۔ اُس سے کہا گیا کہ محل کے اندر تشریف فرما ہو جیئے۔ محل کے اندر قدم رکھا اور محل کے صحن کو دیکھا تو سمجھی کہ صحن میں پانی ہے، اُس نے اپنے دونوں پائنچے اونچے کرلئے اور پنڈلیاں کھول دیں۔ سلیمان نے کہا یہ ایسا محل ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں (اور شیشے ہی کا فرش ہے) ملکہ نے اللہ کو پکارا کہ اے پروردگار (اب تک) میں (شرک وکفر میں مبتلا تھی اور) اپنی جان پر ظلم کرتی رہی۔ (اب) میں (توبہ کرکے اور) تیری حکم بردار بن کر، کہ تو سارے جہان کا پروردگار ہے، سلیمان کا راستہ اختیار کرتی ہوں۔

(مفہوم سورہ ۲۷۔ آیات ۱۵ تا ۴۴)
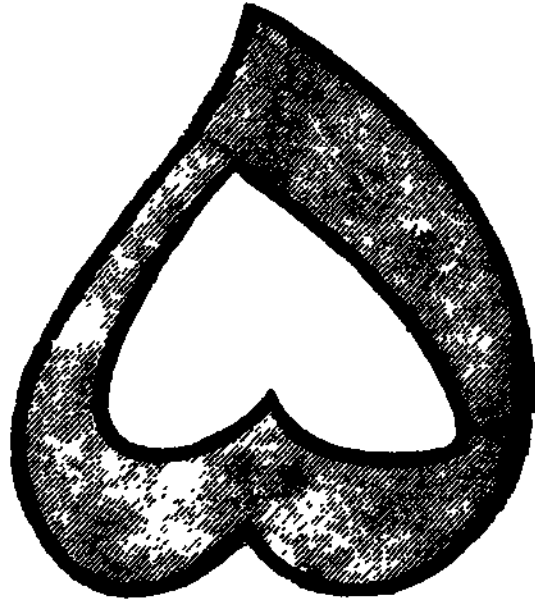
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit
01 63

مُلّا واحدی

حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا

ہم نے داؤد اور سلیمان کو (ایک خاص) علم عطا فرمایا، اور (انہیں شکر گزاری کی توفیق بھی دی) دونوں نے (ہمارا شکر ادا کیا اور) کہا الحمدللہ اللہ نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت بخشی ہے۔ سلیمان داؤد کے (بیٹے تھے، وہی داؤد کے) جانشین (اور قائم مقام) ہوئے اور انہوں نے (لوگوں سے) کہا، اے لوگو ہمیں (اللہ نے) اڑنے والے جانوروں کی زبان بھی سکھا دی ہے اور (الٰہی عظیم الشان سلطنت اور نبوت کے لئے جس جس چیز کی ضرورت ہے) ہر (وہ) چیز مہیا کر دی ہے۔ لاریب (اللہ کا یہ کھلا ہوا فضل ہے سلیمان کے پاس جن وانس اور طیور کے لشکر (کے لشکر) جمع کئے گئے تھے اور ان میں (نظم و ضبط) اور جماعت بندی تھی، حتیٰ کہ (ایک مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ سلیمان) جب (اپنی فوج کے ساتھ) اُس میدان میں پہنچے جو چیونٹیوں کا میدان تھا، (جہاں چیونٹیاں ہی چیونٹیاں تھیں، تو) کسی چیونٹی نے (دوسری چیونٹیوں کو) سمجھایا کہ اے چیونٹیو! اپنے اپنے مسکنوں میں گھس جاؤ، (نہیں) سلیمان اور سلیمان کے فوجی ظالم نہیں ہیں، جان بوجھ کر نہیں کچلیں گے، لیکن ممکن ہے بڑھتے چلے آئیں اور انہیں خبر نہ ہو (کہ یہاں چیونٹیوں کی بستی ہے) سلیمان (چیونٹیوں کی زبان بھی جانتے تھے، انہوں نے چیونٹیوں کی بات سنی تو) مسکرائے اور ہنسے اور (پھر) دعا مانگنے لگے کہ الٰہی! مجھے توفیق عنایت کر کہ تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر نعمتوں کی جس قدر بارش کی ہے، اُس کا شکر بجا لاؤں، اور (محض زبانی شکر نہیں) وہ نیک عمل بھی انجام دوں جو تجھے پسند ہیں۔ اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں شامل فرما۔ (ایک دن) سلیمان نے اُڑنے والے جانوروں کے لشکر کا جائزہ لیا تو (ہُدہُد موجود نہ تھا) کہا، کیا ماجرا ہے، ہُدہُد دکھائی نہیں دیتا۔ (مجھے تو بتاؤ) یا غائب ہو گیا ہے (اُس کی مت تو نہیں ماری گئی۔ غائب ہے تو) اُسے سخت سزا دوں گا، (بال اور پر نوچ لوں گا) یا ذبح کر ڈالوں گا۔ (موجود ہو تو سامنے آئے) یا (پھر غیر حاضری کا) واضح عذر پیش کرنا چاہئے۔ (ہُدہُد واقعی غائب تھا، لیکن) اُس نے پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ (جائزے اور پڑتال کے دوران ہی میں حاضر ہو گیا اور) بولا، میں ایک خبر لایا ہوں، (جو آپ کے لئے نئی ہے،) جس سے آپ ابھی واقف نہیں ہیں میں آپ کی خدمت میں ملک قوم سبا سے ہو کر اور وہاں کی خبر لے کر آ رہا ہوں۔ میں نے (وہاں) ایک عورت کو (قوم سبا پر) راج کرتے پایا۔ اُسے تمام (وہ) نعمتیں حاصل ہیں (جو مرد حکمرانوں کو حاصل ہوتی ہیں حُسن و جمال اُن کے علاوہ ہے) اُس کا تخت بڑا (مکلّف، مرصّع اور بیش قیمت) تھا۔ (ایسا شاندار تخت کسی مرد بادشاہ کا بھی نہیں ہو گا، مگر) میں نے دیکھا کہ ملکہ اور ملکہ کی قوم اللہ کی بجائے (آفتاب) کے پرستار ہے، سب (آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں۔ شیطان نے اُن کے (مشرکانہ) عملوں کو اُن کی نظر میں اچھا بنا رکھا ہے، شیطان اُن کے راستے میں حائل ہے اور وہ صحیح راستے پر نہیں پڑتے۔ (کیوں نہ آپ اُن کی طرف متوجہ ہوں اور) کیوں نہ وہ (آفتاب کی بجائے خالق آفتاب) اللہ کو سجدہ کرنے لگیں، جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ اشیاء کو ظاہر کرتا رہتا ہے اور اُسے بھی جانتا ہے جسے تم پوشیدہ رکھتے ہو اور اُسے بھی جانتا ہے جسے تم ظاہر کر دیتے ہو (سجدے کے لائق تو صرف وہی ہے۔ اُس ملکہ کو شاید اپنے شاندار تخت اور اپنی کامیاب حکومت کا زعم ہو، مگر) اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں ــــــ

رب العرش العظیم ہے۔ (تخت عظیم کا پروردگار اور مالک، جس کے تخت سے اُس ملکہ کے تخت کو نسبت نہیں دی جا سکتی) سلیمان نے کہا، اچھا ہم جانچ کریں گے کہ تو سچا ہے یا (یوں ہی باتیں بگھارتا اور) جھوٹ بولتا ہے۔ لے یہ میرا خط لے جا اور ملکہ سبا (اور اس کے درباریوں) کے سامنے ڈال دے، اور ملکہ اور ملکہ کے درباریوں کے پاس سے (جواب کے ساتھ) واپس آ۔ دیکھیں ملکہ اور ملکہ کے درباری کیا جواب دیتے ہیں۔ (خط پہونچا تو ملکہ سبا) بولی۔ اے درباریو! مجھے ایک گرامی نامہ موصول ہوا ہے، جسے (شہنشاہ) سلیمان نے بھیجا ہے، اور وہ خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے —— (مضمون) یہ ہے) کہ تم لوگ میرے مقابلے میں سرکشی (اور زور آزمائی) کا اقدام نہ کرنا۔ (بہتر یہی ہے کہ اسلام قبول کرو اور) حکم بردار بن کر میرے حضور حاضر ہو جاؤ۔ (خط سنا کر ملکہ سبا نے) کہا، اے (میرے) درباریو! مجھے اس معاملے میں مشورہ دو، (کیا کرنا چاہئے، کیا جواب لکھنا چاہئے) تمہیں معلوم ہے) تمہارے مشورے کے بغیر میں کسی اہم معاملے کا فیصلہ نہیں کیا کرتی۔ درباری بولے۔ (ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے) ہم طاقت ور ہیں اور لڑنے کے فن سے واقف ہیں۔ (ہمارے ہاں سامان حرب بھی بہ افراط ہے، ہم مقابلے کو تیار ہیں) باقی آپ مختار ہیں، آپ سوچ لیجئے۔ ہمیں جو حکم کیجئے گا بجا لائیں گے (درباریوں کا رجحان لڑائی کی جانب تھا۔ لیکن ملکہ نے) کہا (لڑائی اچھی شے نہیں ہے) بادشاہ جب (اپنے مقابل کی) بستی میں داخل ہوتے ہیں تو (اُس کا ہرا بگاڑ دیتے ہیں) اُسے (تباہ اور) برباد کر ڈالتے ہیں، اور وہاں کے معززین کو بے عزت (اور خوار) کر دیتے ہیں اور (سلیمان بھی دستور کے مطابق) ایسا ہی کریں گے۔ (تم ذرا صبر وضبط سے کام لو) میں سلیمان کو (خط کے جواب میں) تحائف روانہ کرتی ہوں، اور دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا اثر لے کر لوٹتے ہیں چنانچہ قاصد (تحائف اُٹھائے) سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو (سلیمان نے) کہا۔ (میرے خط کا کیا جواب دیا ہے۔ اپنی ملکہ سے کہنا) تم کیا (قیمتی) مال (واسباب سے) میری مدد کرنا چاہتی ہو۔ اللہ نے مجھے اس سے بہتر (اور بڑھ کر مال واسباب) دے رکھا ہے، جیسا تمہیں دیا ہے —— (یہ تحائف تمہاری ملکہ ہی کو مبارک رہیں، ملکہ سے کہنا، مجھے مال اور اسباب کی طمع نہیں ہے) تم ہی ان تحائف سے محظوظ ہوتے جاؤ۔ (اے سفیروں کے سردار! یہ تحفے لو اور) تم اُن ہی لوگوں میں واپس پہونچو (جنہوں نے تحفے بھجوائے ہیں، اور اُنہیں آگاہ کرو کہ) ہم (عنقریب ایسے لشکروں کے ساتھ وہاں آئیں گے، جن کا مقابلہ وہ نہیں کر سکیں گے۔ ہم سب کو اس طرح ذلیل کر کے شہر بدر کریں گے کہ وہ عاجز ہو جائیں گے (اطاعت نہ کرنے کا مزا چکھا دیں گے۔ ملکہ سبا نے روئداد سُنی تو سمجھ گئی کہ اطاعت سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ اطاعت کرنی ہو گی۔ چنانچہ چل پڑی۔ ابھی راستے میں تھی کہ) سلیمان نے کہا۔ اے اہل دربار! تم میں کون ہے جو ملکہ سبا کے پہونچنے اور اظہار اطاعت کرنے سے پہلے اُس کا تخت لے آئے، (تاکہ ملکہ جان جائے کہ میں عام قسم کا اور نرا بادشاہ نہیں ہوں۔) ایک دیو از قسم جنات بولا، جب تک آپ (دربار برخاست کر کے) اپنی جگہ سے کھڑے ہوں گے، اُس سے پہلے میں لے آؤں گا اور آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ (تخت خواہ کتنا ہی وزنی ہو) میرے بازو اس قدر مضبوط ہیں کہ اسے لا سکتا ہوں (نیز خیانت نہیں کروں گا) معتبر (اور قابل بھروسہ) ہوں۔ (اس پر) ایک اور صاحب نے کہا جنہیں کتاب (آسمانی) کا علم حاصل تھا (اور جو اللہ کے اسما اور کلام کی تاثیر سے واقف تھے) کہ آپ (ذرا ادھر دیکھئے اور اُدھر سے) نگاہ دوسرے رُخ کیجئے، میں نگاہ مڑنے سے پہلے تخت کو حاضر کئے دیتا ہوں (اور چشم زدن میں تخت حاضر تھا۔) سلیمان نے تخت اپنے قریب رکھا دیکھا تو کہا، یہ میرے رب کا کرم ہے اعجاز وکرامت بندے کے بس کی نہیں ہوتی، مگر اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ یہ کرم اس لئے کیا گیا ہے) کہ مجھے آزمایا جائے کہ شکر کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت۔ شکر گزاری کا نفع شکر کرنے والے ہی کو ملتا ہے، اور جو کفرانِ نعمت کرے تو اللہ تو (شکر) سے بے ہے، (شکر کا محتاج نہیں ہے اور بڑا) کریم ہے (کہ کفرانِ نعمت پر فوراً نہیں پکڑتا۔ بہرحال کفرانِ نعمت کرنے والا اپنا نقصان کرتا ہے۔ کچھ کھوتا۔ سلیمان نے (اس کے بعد) کہا، (اچھا اب) ملکہ کی عقل کا اندازہ کرنے کے لئے اُس کے تخت (کی ہیئت) میں (تھوڑی سی) تبدیلی کر دو، (دیکھیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

مولانا عبید اللہ کوٹی ندوی

معاشی مسائل اور اسلام

" ویسئلونک ماذا ینفقون قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمی والمساکین وابن السبیل وما
تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم " لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں آپ فرما دیجئے کہ مال حلال جو بھی خرچ کرو وہ والدین، اعزا، یتامیٰ
مساکین اور مسافروں کے لئے ہونا چاہئے۔ اور جو بھلائی بھی تم کروگے اس کی حقیقت خدا پر عیاں ہوگی۔

صحابہ کرام کی طرف سے دریافت کردہ دوسرا سوال ہے جس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جواب
عنایت فرمایا ہے۔ مگر غور کرنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں جو بات دریافت کی گئی تھی قرآن نے اس کے جواب کو زیادہ اہمیت نہیں دی، سوال
کیا گیا تھا کہ کیا کیا خرچ کریں، اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ " حلال مال تم جو بھی خرچ کرو " اور یہ کہتے ہی وہ فوراً اسی فقرہ میں تفصیل یہ بیان کرنا
شروع کردیتا ہے کہ مال کا مصرف کیا ہوگا، دولت کہاں خرچ کی جائے گی، سرمایہ کے ذریعہ تعاون کے مستحق لوگ کون ہوں گے، گویا معاشیات کی اصطلاح میں
قرآن پیدائش دولت (Production) کے بجائے تقسیم دولت (DISTRIBUTION) کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے اور یہی وہ
بنیادی فرق ہے جو اسلامی نظام حیات کو دنیا کے دوسرے معاشی نظاموں سے ممتاز کرتا ہے دنیا کے تقریباً تمام ہی نظام فکر مفاسد کا سرچشمہ " پیدائش
دولت " کے غلط ذرائع کو قرار دیتے ہیں افلاطون کے یوٹوپیائی نظام سے لے کر موجودہ زمانہ کے مارکسی طرز فکر یا قدیم وجدید سرمایہ دارانہ نظاموں تک،
سب کے غور و فکر کا مرکز یہی حصول دولت کا مسئلہ قرار پایا ہے۔

مفاسد کا سرچشمہ چند لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ حصول دولت کے غلط ذرائع فروغ پا چکے ہیں، سرمایہ داروں نے حصول دولت کے جو ناجائز
طریقے اپنا لئے ہیں انہیں کی وجہ سے معاشرہ میں بے اعتدالی اور عدم توازن رونما ہوتے ہیں۔ غربت و افلاس کا اضافہ ہوتا ہے اور حصول دولت کے غلط ذرائع
اختیار کرنے کی وجہ سے امیر امیر تر اور پھر خود غرض ہوتا چلا جاتا ہے دولت کے حاصل کرنے میں وہ فریب دھوکہ اور غریبوں کے قتل سے بھی دریغ نہیں کرتا،
دوسری طرف غریب اپنا یہ انجام دیکھ کر خود بھی رنگ بدلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں چوری کرتے ڈاکہ ڈالتے اور ماحول کو فتنہ و فساد کا اکھاڑہ بنا لیتے ہیں،
لہٰذا ان حضرات کے نزدیک صحیح راہ عمل یہ ہے کہ غلط ذرائع حصول کو بند کرنے اور حصول دولت کے جائز طریقوں کو رواج دینے کے لئے دولت کو تھیا لیا
جائے حکومت کو سارے اختیارات جزا و سزا دے کر ہی یہ ممکن ہے کہ مفاسد کا سرچشمہ خشک ہو اور معاشرہ امن و سکون سے ہمکنار ہو سکے۔

ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ وہ ہیں جو پیدائش دولت کے غلط ذرائع کو منبع فساد قرار دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اسی رخ پر غور کرتے
کرتے وہ یہ نتیجہ برآمد کرتے ہیں کہ دراصل مفاسد کا سرچشمہ حصول دولت کے غلط ذرائع ہی نہیں بلکہ خود حصول دولت بھی ہے دولت کی محبت ہی تو وہ مرض
ہے جس کی وجہ سے افراد غلط ذرائع اختیار کرتے ہیں اور پھر فساد اور خرابی کا لاوا پھوٹ پڑتا ہے اس لئے ان حضرات نے علاج یہ تجویز کیا کہ خود دولت سے ہی
لوگوں کو متنفر بنا دیا جائے دولت کی برائی اگر ان لوں کے ذہنوں میں بیٹھ گئی تو وہ حصول دولت کے ان غلط ذرائع کو اختیار کرنے سے بچیں گے جو ملک و قوم

کو معاشی کشمکش میں مبتلا کرتے ہیں یہ معاشی نظریہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے وہی نظریۂ رہبانیت ہے جو کسی زمانہ میں عیسائیوں کو دنیا بیزاری پر آمادہ کرتا رہا، ایران میں اس نے مانی ازم کی شکل اختیار کی اور ہندوستان میں وہ جوگ کی صورت میں نمودار ہوا۔

انسان کی معاشی زندگی میں یہی دونوں نظریئے کارفرما رہے ہیں مگر جس طرح کہ پہلے نظریہ نے ــــــ جس کی مثال ہمارے سامنے کمیونزم کی شکل میں موجود ہے ــــــ انسانیت کا علاج کرنے کے بجائے اس پر پے در پے ظلم وستم ڈھائے، حصول دولت کے غلط ذرائع کو طاقت کا سہارا دیا، ملک کے باشندوں کو آہنی دیواروں میں محبوس کر دیا۔ عوام کے ہاتھ سے سب کچھ چھین کر اس کی گردن میں غلامی کی سنہری زنجیر ڈال دی۔ اسی طرح دوسرے نظریہ نے خود انسانی فطرت سے بغاوت کی۔ اس نے فلاح وکامرانی عطا کرنے کے خوبصورت نعرے لگائے، پھر خود انسانوں اور انسانیت سے جنگ کرنے کی سازش کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آگ اور بھڑکی اور بہتے تنکوں کو بھی بہالے جایا کرنے گیا اور اس طرح گویہ نظریہ کتابوں کے نقوش میں پنہاں ہے مگر اس کے نام لیوا دیکھتے ہی دیکھتے فنا ہو گئے۔

ان دونوں نظریوں کے بالمقابل قرآن اگرچہ حصول دولت کے غلط ذرائع کو ناجائز ٹھیراتا ہے لیکن وہ تنہا استعمال کے غلط ذرائع کو مفاسد کا اصل سرچشمہ قرار نہیں دیتا وہ اگرچہ دولت سے عشق کرنا نہیں سکھاتا مگر اس کی تعلیمات میں دولت کی نفرت کو امن وامان کی جنت کا ٹکٹ بھی نہیں قرار دیا گیا ہے اسلام کے نزدیک مفاسد کا سرچشمہ یہ نہیں ہے کہ انسان غلط ذرائع حصول اختیار کرتا ہے یا دولت سے اسے محبت ہے بلکہ مفاسد کا سرچشمہ اور خرابیوں کی جڑ یہ ہے۔

۱۔ انسان دولت وسرمایہ کو غلط راہوں میں صرف کرتا ہے۔

اور اس کی وجہ سے اس کے اور معاشرہ کے حق میں تخریب کے اسباب بہم پہونچتے ہیں۔

۲۔ انسان دولت وسرمایہ کو صحیح راہوں پر خرچ کرنا۔

اور اس کی وجہ سے معاشرہ میں تعمیری مقاصد کو تکمیل تک پہونچنے کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کے نزدیک خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ "تقسیم دولت" کا نظام غلط بنیادوں پر قائم ہے اور تقسیم دولت کی صحیح راہیں مسدود ہیں اور اس طرح انفاق کی صحیح راہوں کے مسدود کرنے اور انفاق کے غلط دروازوں کے کھل جانے کی وجہ سے معاشرہ خرابیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے فتنوں کے پھوٹنے اور خرابیوں کے جڑ پکڑنے سے امن وامان غارت ہو کر رہ جاتا ہے اور انسانی سوسائٹی معاشی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے بھی بے اعتدالیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

اسلام کا یہی انداز فکر اسلامی معاشیات کی بنیاد ہے دوسرے غلط معاشی نظاموں نے اپنے غور وفکر کا مرکز حصول دولت اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو قرار دیا اور اسلام ان سب کے برخلاف "تقسیم دولت" کو اپنے فکر کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ حصول دولت کے غلط ذرائع کو اختیار کرنے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا سبب بھی اگر غور کیا جائے تو دولت کی ناجائز تقسیم یا سرمایہ کا غلط مصرف ہی ٹھیرتا ہے یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان زیادہ خرچ کرنے کے لئے ہی زیادہ حاصل کرتا ہے وہ اپنے دماغ میں دولت کو صرف کرنے کے لئے جائز اور ناجائز بہت سے "پلان" بناتا ہے۔ فخر وپندار اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ نمائشی کاموں میں یا سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے دولت کو زیادہ سے زیادہ لٹائے خوب لٹائے اور بے مرتع لٹائے، خود غرضی اسے مجبور کرتی ہے کہ اپنے عیش اور تن آسانی کے لئے مصروں کا بھی پیٹ کاٹے۔ غریبوں کا خون چوسے، انسانوں کو فریب دے کر حصول دولت کے زیادہ سے زیادہ آسان طریقے اپنائے راہروں کو قتل کرے اور عوامی بیداری کے امکانات کو ناممکن بنا دے۔ غرض انفاق کا جذبۂ بے پایاں، حصول دولت کے غلط ذرائع پر آمادہ کرتا ہے۔ تعیش اور خود غرضی کا شیطان ہی وہ بدترین جذبہ محرکہ ہے جو دولت کے ناجائز استعمال سے بھی نہیں چوکتا۔ اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ انفاق کی ان راہوں کو بھی بند کیا ہے جن میں دولت کو بے اندازہ صرف کرنے کی وجہ سے۔ کثر وبیشتر انسان قلاش ہو جاتا ہے اور یہ قلاشی اسے بالآخر مفاسد اور جرائم کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اسی طرح

اسلام نے انفاق کے ان طریقوں کو بھی رائج کرنے پر آمادہ کیا ہے جن کی وجہ سے معاشرہ کے دوسرے افراد ـــــ غریبوں، ناداروں، اپاہجوں وغیرہ ـــــ میں حصول دولت کے غلط ذرائع اختیار کرنے کا جذبہ ابھرنے نہیں پاتا۔

اسلام کے معاشی نظام کا ستون دراصل یہی مخصوص انفاقی نظام ہے جس کی طرف قرآن نے جگہ جگہ توجہ دلائی ہے اور یہ بات جو میں نے قرآن کے معاشی نظریہ کے متعلق عرض کی ہے یہ کچھ میرا ہی نظریہ و خیال نہیں ہے بلکہ خود قرآن مجید نے اسے اپنے نظام فکر کی اہم بنیاد قرار دیا ہے اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ قرآن جو نظام حیات پیش کرتا ہے وہ اپنی اصل و فرع، بنیاد اور عمارت ہر لحاظ سے دنیا کے مذاہب اور نظریات سے یکسر مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کو ماننے والے بھی اپنے فکر و عمل میں، طور طریق میں، مزاج اور انداز میں دوسروں سے ہر طرح ممتاز ہیں مگر ان کے یہ امتیازات کیا ہیں۔ یہ قرآن ہی کی زبانی معلوم ہو سکتا ہے قرآن دو ٹوک الفاظ میں صاف صاف اعلان کرتا ہے۔

ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین، الذین یومنون بالغیب، ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنٰھم ینفقون ـــ یعنی عقائد میں قرآنی نظام فکر کی بنیاد "ایمان بالغیب" ہے، عبادات میں اس کا امتیازی نشان "اقامت صلوٰۃ" ہے اور حیات باہمی میں قرآن میں قرآنی نظام فکر کی اساس اس کی انفاقی تعلیمات ہیں،

گویا حیات باہمی یا اجتماعی زندگی میں مسلمانوں کے نظام عمل کا اصلی اور امتیازی نشان انفاق ہے، مسلمانوں کا انفاقی طرز عمل دراصل ایک ایسا عنصر ہے جو ان کے رہن سہن، طرز بود و باش، جذبات تعاون، معاملات باہمی، فکر اور مزاج غرض ہر شے کی تشکیل کرتا ہے۔

---

(۲)

اسلامی نظام انفاق اپنے وسیع معنوں میں مختلف پہلوؤں پر حاوی ہے ان کی طرف اگرچہ ابھی کئی جگہ اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قدرے تفصیل کے ساتھ ان کی وضاحت کر دی جائے۔ انفاق کے بارے میں اسلامی ہدایات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے انفاق کی ان تمام راہوں کو مسدود قرار دیا ہے جو معاشرہ کو درہم برہم کرنے کا باعث ہوں اور جن کی وجہ سے انسانی معاشرہ میں طرح طرح کی خرابیاں رونما ہوتی ہوں یہ چند چیزیں درج ذیل ہیں

۱:- دولت و سرمایہ کا ایک بڑا مصرف شراب ہے۔ زمانہ قدیم میں جس طرح اس پر پانی کی طرح دولت بہائی جاتی اور شراب کے پرانے ذخائر پر فخر کیا جاتا تھا اسی طرح آج بھی شراب دنیا کی ایک بڑی لعنت ہے جس پر ملک کے عوام اور خواص کروڑوں کا سرمایہ ضائع کر رہے ہیں۔ دولت کا یہ مصرف اگر ایک طرف سرمایہ کی بڑی مقدار کی بربادی کا سبب ہے تو دوسری طرف اس کی وجہ سے صحت اور ذہن و دماغ پر جو برے اثرات پڑتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں پھر شراب کے نقصانات کی یہی حد نہیں بلکہ جنگ و جدل کو ہوا دینے اور زندگی کے روز مرہ میں بڑے بڑے حادثات کو بروئے کار لانے میں بھی وہی ذمہ دار ہے پھر شراب کے کتنے ہی رسیا اسی نشہ مے نوشی کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے غربت و افلاس کا شکار ہو جاتے ہیں اور کتنے ہی نوجوانان قوم ہیں جنہوں نے شراب نوشی کی خاطر جرائم کی راہ اختیار کی۔

انہیں مفاسد کی وجہ سے اسلامی نظام انفاق میں دولت کا یہ مصرف ناجائز قرار دیا گیا ہے، شراب نوشی کا سدباب کرنے کے لئے اسلام نے صرف وعظ و پند یا محض اخلاقی نصیحتوں پر ہی قناعت نہیں کی ہے بلکہ ساتھ ہی خلاف ورزی کی صورت میں سزائے سخت کا بھی اعلان کیا ہے۔

۲:- شراب کے بعد قمار وہ دوسری لعنت ہے جس پر دولت کو زمانہ قدیم سے لے کر اب تک بے دریغ قربان کیا گیا ہے منٹوں میں دولت و سرمایہ کے بڑے بڑے ٹھیکیداروں کو بیچ چوراہے پر "ننگ و عار" سے ہمکنار کر دینا بس قماری کی کرامت ہے زمانہ قدیم میں کیا ہند چین اور کیا عرب و عجم بڑی بڑی سلطنتوں یہاں تک کہ بیوی بچوں تک کی بازی لگا دی جاتی اور تب بھی قمار بازی کا بھوت سر پر سوار رہتا، باہمی اختلاف، غربت و افلاس اور غربت و افلاس کے بعد قمار کے شوق

کو پھر بھی ترفعانہ رکھنے کے لئے یا گھریلو ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر پھر دولت کی مزید تلاش ہوتی اور چوری، ڈاکہ، فریب، لوٹ مار غرض کمائی کے تمام ہی ذرائع اختیار کئے جاتے، قمار بازی کے یہ فیوض و برکات عہد قدیم میں گو موجود تھے، مگر موجودہ زمانہ کی سائنٹیفک دنیا میں اس نے معاشرہ کو ہزار ہا نت نئی خرابیوں سے دوچار کیا ہے۔

اسلام نے دولت کے اس مصرف کو بھی ناجائز قرار دیا ہے قمار خواہ کسی بھی صورت میں نمودار ہو اور خواہ اس کے چہرے پر کیسے ہی خوبصورت پردے ڈال دئے گئے ہوں اسلام اس کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتا اور اس نظام میں قمار بازوں کے لئے سخت سے سخت سزائیں مقرر ہیں۔

۳۔۱۰ عام نمائش و تفاخر کی ان تمام صورتوں کو بھی ناجائز اور لائق نفرین قرار دیا ہے جس کا بنیادی محرک فخر و پندار ہو۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی نیک اور بھلے کام کو بھی محض نام آوری کے لئے انجام دے اسلام کے نزدیک وہ شخص بھی تعریف کا مستحق نہیں پہلے زمانہ میں جب کہ قوموں پر حکومتوں کی گرفت مضبوط نہ تھی اور ہر طرف جاگیرداری قائم تھی اس فخر و غرور کا شکار صرف افراد تھے۔ عرب میں ایک بدو اپنی سخاوت کا سکہ بٹھانے کے لئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتا جاتا دوسرا غیرت میں آکر اپنی عزت بچانے اور عار سے بچنے کے لئے مقابلہ میں خود بھی اونٹ ذبح کرنے لگتا، جس کے ہاتھ پہلے رک جاتے یا جس کے اونٹ جلد ذبح ہو جاتے وہ شکست خوردہ تسلیم کیا جاتا اور فخر و پندار عز و شرف کی خیالی دولت اس کے حریف کے حصہ میں آتی، لیکن آج جب کہ کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے اور افراد بتدریج ایک طاقت ور مرکزیت کے گرد جمع ہوتے جا رہے ہیں فخر و پندار کی پرانی عادتوں میں حکومتیں بھی مبتلا ہو گئی ہیں "معیار زندگی کو بلند کرنے" کے الفاظ جتنے خوبصورت ہیں اتنا ہی وہ ان کے لئے سند جواز ہیں ملک کے باشندے جنہیں روٹی کپڑا، مکان، دوا اور علاج کے ضروری سامان بھی میسر نہیں انہیں ملک کی اعلیٰ صنعتی ترقیاں، رسل و رسائل، آمد و رفت کے بیش قیمت ذرائع اور ایٹمی ہتھیاروں کے ذریعہ خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس دولت و سرمایہ سے ملک کی غریبی کو مٹانا ضروری تھا اور لازم تھا کہ اس کے ذریعہ قوم کی تعلیمی، معاشی اور دیگر بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا آج اسی دولت کو دوسرے ملکوں اور قوموں سے مفاخرت پر صرف کیا جا رہا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ہمارے ممالک میں بھی جلد از جلد تمدن کی آب و تاب آئے ثقافتی رنگ و روغن بڑھے اور بازار کی رونق میں اضافہ ہو۔ ہر ملک اس کوشش میں ہے کہ اس کے سالانہ منصوبوں کی چمک دمک دوسرے ملکوں سے کچھ زائد ہی ہو اسے اس کی مطلق پرواہ نہیں کہ بزم حیات کے ان تکلفات سے ملک کی غریبی مٹے گی بھی یا نہیں۔

فخر و غرور کا جذبہ افراد میں ہو یا قوموں اور ملکوں میں، وہ تنگ نظری کی آغوش میں ہی جنم لیتا ہے اس کی پرورش کے لئے وہی ماحول سازگار ہوتا ہے جہاں حقیقی کے بجائے سطحی، اصلی کے بجائے نقلی، اور فطری کے بجائے مصنوعی زندگی پر زور دیا گیا ہو، فخر و غرور جہاں بھی بنیادی کار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے وہاں زندگی جلد ہی بے اعتدالی اور عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے دولت کا مصرف غیر ضروری مواقع بن جانے میں اور بالآخر پوری قوم سب کچھ ہونے کے باوجود اپنی بنیادی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے نہیں پاتی۔

۴:۔ دولت و سرمایہ کا ایک بڑا مصرف موجودہ زمانہ میں تصاویر اور مجسّمے ہیں زمانہ قدیم میں بھی ان کا رواج تھا البتہ اس زمانہ میں یہ کام مادیت پرست قوموں کے ہاتھ میں تھا اور وہ اپنے بزرگوں معبودوں اور مقدس شخصیتوں کی یادگار تصویروں، مجسموں کے ذریعہ باقی رکھتے لیکن موجودہ زمانہ میں جاہلیت جدیدہ یہ مقدس کام اپنے سرپرستی میں انجام دے رہی ہے وہ اپنے بابرکت ہاتھوں سے قوم کا بیش قیمت سرمایہ ایسے ہی کاموں پر بے دریغ صرف کرتی ہے اور آرٹ کا نام لے کر چاہتی ہے کہ دولت کی یہ بربادی فنکاری کے پرفریب لفظوں کے ذریعہ ہنرمندی کا لبادہ اوڑھ لے۔ [1]

---

[1] اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابھی ابھی مصر کے شہر قاہرہ میں فرعون کا جو مجسمہ نصب کیا گیا ہے اس پر لاکھوں روپے کی لاگت آئی ہے۔

کے نزدیک دولت کا یہ مصرف بھی فضول ہے۔ حیرت ہے کہ جو لوگ غربت و افلاس کو ختم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ قوم کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے دولت کی ایک بڑی مقدار کو تصویروں اور مجسموں پر کیوں کر قربان کر دیتے ہیں۔

۵۔ اسی طرح اسلام نے ان رسموں کی بھی ممانعت کی ہے جن میں دولت کو بے حساب خرچ کیا جاتا ہے اور ان کی بدولت قوم دن بدن غربت میں مبتلا ہوتی جاتی ہے۔ یہ رسمیں عموماً شادی بیاہ اور غمی کے موقعوں پر ہوتی ہیں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ شادی بیاہ میں گھر کا سارا اثاثہ صرف کر دیا جاتا ہے اور فخر کے جذبات لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ قرض لے کر اپنی خواہشوں کو پورا کریں غمی کے موقعوں پر لواہل شرک اور مسلم عوام میں عجیب عجیب رسمیں پائی جاتی ہیں، یہی رسمیں عربوں میں بھی کم و بیش موجود تھیں۔ عہد جدید کی حکومتوں اور موجودہ زمانہ کی مہذب قوموں میں یادگاری دن منانے کی وبا عام ہو گئی ہے۔ اور انسانوں کی آبادی میں بڑے آدمیوں کا جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہے دولت کو ضائع کرنے کے مواقع بھی اتنے ہی زیادہ فراہم ہوتے جاتے ہیں کسی کی یادگار منانا بجائے خود کوئی عیب نہیں لیکن اسے فیشن بنا دینا اور ان کی یاد میں سال بسال بے مقصد تقریبات منعقد کرنا یہ قوم اور ملک دونوں کی تباہی کا سامان ہے۔

انفاق کے یہ سب طریقے اسراف ہیں۔ دولت کی یہ طرح بربادی غربت کا باعث بنتی ہے اور اس غربت کو مٹانے کے لئے بے چارہ انسان اپنے گھر کی خوشی یا غم کی قیمت قوم کو فریب دے کر ناجائز طریقوں سے وصول کرتا ہے۔ دولت کو حاصل کرنے کے لئے وہ ایسے ایسے عجیب و غریب طریقے ایجاد کرتا ہے جو پوری قوم کو تنگ حالی، معاشی بدامنی اور بے کرداری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

---

(۳)

دولت کے مندرجہ بالا پانچ مصرف ایسے ہیں جن کی اسلام کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دیتا لیکن انفاق کی بعض ایسی بھی صورتیں ہیں جن میں دولت کے ناجائز استعمال کا قوی خدشہ موجود ہے اس لئے اسلام نے ان کے بارے میں "ترمیم و اصلاح" کا طریقہ اختیار کیا ہے وہ ان صورتوں میں دولت کو صرف کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ ترغیب بھی دیتا ہے مگر اس نے چند ایسی شرطیں بھی لگا دی ہیں جن کی وجہ سے ان میں دولت بے حد تک صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے یہاں چونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں اس لئے چند صورتیں بطور نمونہ بیان کی جاتی ہیں جن سے اسلام کے انفاقی نظام کا یہ پہلو بھی روشنی میں آ جائے گا۔

۱۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی "روم و عجم میں جو شخص ایک لاکھ درہم کا پٹکا یا اتنی ہی قیمت کا تاج استعمال نہ کرتا لوگ اسے عار دلاتے"[1]۔ اسی طرح جیسا کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں میں رواج رہا ہے کہ وہ اور ان کی عورتیں لمبی لمبی شلواریں استعمال کرنے اور خدام یا کم سن بچے شلوار کے زائد حصوں کو پیچھے سے اٹھائے رہتے، عربوں میں بھی لوگ فخر و غرور کے طور پر محض اپنی خوش پوشی اور کشادہ حالی کے اظہار کے مظاہرہ کے لئے بڑی بڑی ازاریں سلواتے پہناوے کی یہ صورتیں اگر دولت کی بربادی کا سبب ہیں تو ان کی وجہ سے معاشرہ میں نازک مزاجوں اور عیش پسندوں کی ایک بالائی سوسائٹی بھی آہستہ آہستہ جنم لینے لگتی ہے۔ اور ان کے نشو و نما پانے سے عزت حاصل کرنے کا ایک ایسا معیار وجود میں آ جاتا ہے جس پر پورا اترنا غریب عوام کے بس کی بات نہیں، وہ عزو شرف کو حاصل کرنے کے لئے یا تو پر فریب طریقوں سے دولت حاصل کریں گے یا ننگ و عار کے احساس میں ڈوب کر اپنی خود داری کو ہی زائل کر کے احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔ اسلام باوجود اس کے کہ لباس کو انسان کی زینت قرار دیتا ہے لباس کے ان فیشن ایبل طریقوں کے حق میں نہیں وہ اگرچہ اچھے لباس، اچھے مکان، اور اچھی غذا کو خدا کی نعمت اور اس لئے پسندیدہ قرار دیتا ہے لیکن چونکہ اسے بہت سی دیگر خرابیوں کا بھی سدباب کرنا ہے اس لئے وہ مردوں کے لئے ریشمی لباس کو عام حالات میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ صفحہ ۱۰۲ ج ۲

۲۔ اسی طرح مردوں کے لئے اسلام نے سونا چاندی کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا ہے دونوں کو لباس میں استعمال کیا جائے یا کھانے پینے کے برتن بنائے جائیں بہرحال مرد کے لئے ان دونوں کا استعمال ناجائز ہے اور چونکہ سونا چاندی کے برتن استعمال کرنا دولت کی بربادی کا سبب ہونے کے ساتھ ہی انسان کی عیش پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی تن آسانی کی علامت ہیں اس لئے ان برتنوں کا مرد اور عورت کسی کے لئے بھی استعمال کرنا جائز نہیں[1]

اسلام کے نظام انفاق کے اس پہلو پر غور کیجئے ، اسلام نے زیب و زینت کے سامان رکھنے، اچھے سے اچھا لباس پہننے کی اجازت دی ہے لیکن چند قیود کے ذریعہ اس نے ان راہوں کو بھی مسدود کر دیا ہے جن کی وجہ سے کوئی فرد یا قوم دولت کا بے جا استعمال نہیں کر سکتی ، کیونکہ دولت کا غلط مصرف اگر ایک طرف تنگ دستی کو جنم دیتا ہے تو دوسری طرف عوام کو بھی اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ لباس میں کھانے کے برتنوں اور دوسرے استعمالی سامانوں میں اس معیار کو برقرار رکھیں جو ان کے ماحول میں عزو شرف کا نشان سمجھا جاتا ہے اس طرح پوری قوم میں دولت کے ناجائز استعمال کا جذبہ بیدار ہوگا اور پوری کی پوری قوم سرمایہ دارانہ کشمکش میں مبتلا ہو جائے گی ، رشوت ، چوری ، قمار اور فریب وہی کے جو بھی طریقے ایک فرد کو اس کی قوم کے مطلوبہ معیار تک پہونچانے میں معاون ہوں گے وہ ان طریقوں کو اپنانے میں دریغ نہ کرے گا ۔ لہذا دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انفاق کے ان غلط مصرفوں کو فوراً ہی ممنوع قرار دیا جائے جو ایسے غلط نتائج کا باعث بنتے ہوں ۔ اسلام نے یہی کیا ہے اور اس کے نظام کی کامیابی کا ایک راز اس کی تعلیمات کا یہ پہلو بھی ہے ،

اسلام نے اپنے انفاقی نظام میں دولت کی جن صورتوں میں صرف کرنے سے منع کیا ان کی تفصیل گزر چکی ، قرآن مجید نے صحابہ کرام کے سوال کا جو جواب دیا ہے اس کی تشریح کے لئے ضروری ہے کہ ہم انفاق کے منفی پہلو کا بھی ذکر کریں ، ہم نے اس سے پہلے عرض کیا تھا کہ اسلام کے نزدیک معاشی زندگی کا بگاڑ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ کا انفاقی نظام نادرست ہے انسان اپنا سارا سرمایہ غلط راہوں پر خرچ کر دیتا ہے پھر جب اس کے جیب و دامن مزید انفاقی جذبات کو تسکین دینے سے عاجز ہو جاتے ہیں تو وہ حصول دولت کے غلط طریقوں کو اپناتا ہے اور پھر جس طریقہ سے بھی ممکن ہوتا ہے وہ دولت کو حاصل کرنے کے لئے فریب و دغا سے کام لیتا ہے اس طرح پوری کی پوری قوم انفاقی عدم توازن کے برے نتائج سے دوچار ہو جاتی ہے پھر فرد سے گزر کر یہ بدامنی معاشی لوٹ کھسوٹ اور جرائم پسندی قومی سطح پر ابھرنے لگتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ ان تکلیف دہ حالات کی وجہ سے چیخ پکار کرتا ہے انتشار اور بدامنی کی وجہ سے پوری کی پوری قوم تڑپتی اور صبح و شام کروٹیں بدلتی ہے مگر اسے کسی پہلو سے بھی چین نہیں ملتا ۔

اسلام نے پہلی ضرب انفاق کی ان غلط راہوں پر ہی لگائی ہے جو قوم کی بدحالی اور انتشار کا باعث بنتی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ انفاق کی ان چند راہوں کو بند کر دینے سے ہی قوم کی معاشی حالت درست نہیں ہوتی جب تک کہ انفاق کے لئے مثبت (POSITIVE) ہدایات موجود نہ ہوں ، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انفاق کی بعض صورتوں کو ضروری قرار دیا ہے تاکہ وہ خامیاں جو پچھلے طریقہ کار کی بدولت یا بعض ناگہانی حالات کی وجہ سے قوم میں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کیا جا سکے یہ بات کہ دولت کو فلاں اور فلاں موقعوں پر خرچ نہ کیا جائے ، ایک طرح سے احتیاطی تدبیریں ہیں تاکہ اس کے ذریعہ قوم میں غربت و افلاس یا بعض دوسری مزید خرابیاں پیدا نہ ہوں ، لیکن وہ غربت جس میں کہ [illegible] پوری قوم مبتلا ہے اور جو قوم کو طرح طرح کے اخلاقی امراض میں مبتلا کرنے کا سبب بن رہی ہے اسے کیسے ختم کیا جائے ، اس کے لئے مثبت تعلیم کی ضرورت ہے ۔ قرآن نے صحابہ کرام کو جو جواب دیا ہے اس میں اس مثبت پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ دولت کا مصرف اور امداد کے جائز حقدار کون لوگ ہیں ——— یہ اشخاص قرآنی بیان کے مطابق بترتیب حسب ذیل ہیں ۔

---

[1] احادیث کی روشنی میں فقہاء نے صرف تین ماشہ کے برابر چاندی کی انگوٹھی پہننے کی اجازت دی ہے ۔

والدین، رشتہ دار، یتامیٰ، مساکین اور مسافر (قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتٰمیٰ والمساکین وابن السبیل، وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم)

---

(۴)

زیر بحث آیت پر غور کرنے سے ہمیں اسلام کے معاشی نظام کے متعلق جو چند رہنما اصول ملتے ہیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کی طرف بھی اشارے کر دیے جائیں۔

اہم پہلی بات یہ کہ آیت میں جن افراد کو مدد کا مستحق قرار دیا گیا ہے ان کی تقسیم مذہب اور نظریہ کی بنیاد پر نہیں کی گئی ہے بلکہ مستحق افراد خواہ وہ کسی بھی مذہب اور نظریہ کے حامی ہوں وہ سب احتیاج کی بدولت امداد کے یکساں مستحق ہیں، والدین، دیگر اعزا، یتامیٰ، مساکین اور اہل سفر خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم امداد کے مستحق سب ہی لوگ ہیں۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے دور میں جو کہ بعد کی مسلم حکومتوں کے لئے بہترین اور نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے اپاہج اور نادار ذمیوں کی کفالت کا ذمہ دار بیت المال ہی تھا[1]۔

فتح خیبر کے موقع پر جو معاہدہ ہوا تھا اس میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں "اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے سے معذور ہو جائے یا کوئی آفت آئے یا دولت مندی کے بعد غربت سے دوچار ہو اور اس کے اہل مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور ――― اس کی اولاد کو مسلمانوں کے بیت المال سے خرچ دیا جائے گا[2]"

یہ معاہدہ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں ہوا تھا حضرت فاروق اعظمؓ نے اسے برقرار رکھا اور قرآنی استدلال کے ذریعہ اس امداد کے لئے مزید ثبوت بہم پہنچا دیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دست سوال دراز کرتے ہوئے دیکھا آپ نے فرمایا بھیک کیوں مانگتا ہے اس نے عرض کیا مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور مجھے اس کو ادا کرنے کی قدرت نہیں یہ سن کر آپ اسے اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقد دے کر بیت المال کے داروغہ کو کہلا بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے اور فرمایا کہ "قرآن مجید کی آیت" انما الصدقات للفقراء والمساکین" میں "فقراء" سے مراد مسلمان اور مساکین اہل کتاب ہیں۔ بخدا یہ انصاف نہیں ہے کہ ان لوگوں کی جوانی کی توانائی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں لیکن جب بڑھاپا آجائے تو ان کو ہم گھروں سے نکال دیں[3]۔

غربی کو مٹانے کے لئے اسلام تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ جو ملک غربت سے دوچار ہوا ہے وہ مسلم ہے یا غیر مسلم، دوست ہے یا دشمن، چنانچہ امام محمد کی کتاب سیر کبیر کے "باب صلۃ المشرک" کی درج کردہ روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خمس ماۃ دینار الی مکۃ حین قحطوا وامر بدفع ذالک الی ابی سفیان بن حرب وصفوان بن امیۃ لیفرقا علی فقراء اھل مکۃ فقبل ذالک ابوسفیان وابی صفوان وقال ما یرید محمد بھذا الا ان یخدع شبابنا[4]

مکہ میں جب قحط پڑا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچسو دینار روانہ فرمائے اور فرمایا کہ مکہ کے نادار باشندوں پر تقسیم کرنے کے لئے یہ رقم ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کے سپرد کر دی جائے ابوسفیان نے تو قبول کر لیا لیکن صفوان نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ محمدؐ اس طرح ہمارے نوجوانوں کو فریب دینا چاہتے ہیں۔

---

[1] کتاب الخراج [2] کتاب الخراج ص ۸۵ [3] کتاب الخراج ص ۲، [4] دیکھئے امام شمس الائمہ سرخسی کی شرح سیر الکبیر ص ۶۹ ج ۱ باب صلۃ المشرک۔

۱۲۔ آیت میں دولت کا مصرف سب سے پہلے والدین کو قرار دیا گیا ہے اس کے بعد دوسرے رشتہ داروں کو، پھر یتیموں کو اس کے بعد مسکینوں اور مسافروں کو، یہ ایک قدرتی ترتیب ہے جس میں اسی اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اصلاح کی ابتدا ہمیشہ اپنے قریبی ماحول سے کرنی چاہئے یہ انداز نگر خالص تعمیری ہے اپنے گھر یا گردوپیش کو بھول کر ملک وقوم کی غربت کو مٹانے کے لئے قدم بڑھانا ایک سنہرا خواب تو ہو سکتا ہے لیکن عملی دنیا میں ایسے تجربات ناکام ہوتے ہیں اس سے غربت ختم نہیں بلکہ نظر انداز ہو جاتی ہے، امداد کا مستحق جن لوگوں کو قرار دیا گیا ہے اس میں قرآن کی بیان کردہ ترتیب کا خیال رکھنا ضروری ہے اس طرز عمل سے ہمیں " الاقرب فالاقرب " کا اصول ملتا ہے یعنی جو جتنا قریب ہو وہ تعاون کا اتنا ہی زیادہ مستحق ہے علاقائی قرب کا بھی اسی لئے لحاظ کیا گیا ہے حدیث شریف میں ہے " توخذ من اغنیاء ھم و ترد علی فقراء ھم " یعنی جس علاقہ کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کی جائے اسی علاقہ کے فقراء پر اسے تقسیم بھی کردیا جائے اور اس کے بعد جو کچھ بچ رہے اسے مرکزی حکومت اپنی تحویل میں لے کر ملک کے دوسرے غریبوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کرے حکومت اگر چاہے تو انتظامی سہولت کے لئے ملک کو مختلف انفاقی منطقوں میں بھی تقسیم کر سکتی ہے تاکہ ایک علاقہ کا سرمایہ اسی علاقہ کی فلاح و بہبود میں زیادہ منظم طریقہ سے صرف کیا جا سکے، حضرت عمرؓ اپنے صوبائی گورنروں کو اس کے متعلق ہمیشہ تاکید کرتے رہتے مصر کے والی (گورنر) حضرت عمرو بن عاص کو انہوں نے جو فرمان دیا وہ یہ تھا " خزانہ میں جو آمدنی جمع ہوتی ہو اس میں سے سب مسلمانوں کے وظائف اور ضروری اخراجات سے جو کچھ بچ جائے اس کو میرے پاس بھیج دو " (کتاب الخراج)

۱۳۔ آیت پر غور کرنے سے ہمیں ایک بات اور معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ آیت میں اس کا مذکرہ تو کیا گیا ہے کہ والدین، رشتہ دار، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کو مالی امداد دی جائے ان کی ضرورتوں کو جنہیں وہ خود پورا کرنے سے قاصر رہے ہیں ہم تکمیل تک پہونچانے کی سعی کریں مگر کیا یہ ضرورتیں صرف غذا مکان اور خوراک تک ہی محدود ہیں ؟ ضرورتوں میں تو ہر وہ احتیاج شامل ہے جو شریعت کے نزدیک صحیح ہو اور حالات اس کو پورا کرنے کی بھی اجازت دیں۔

اہل حاجت کو تعلیم و تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور دوا علاج اور شادی بیاہ کی بھی، یہ اور ایسی جو بھی ضرورتیں ہوں انہیں پورا کرنا ملک اور قوم کے ذمہ ہے اسی طرح ملکی اور غیر ملکی باشندوں میں تبلیغ اسلام بھی ایک نہایت اہم قومی خدمت ہے اور یہ کام اس وقت تک منظم نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود حکومت اسے اپنے ہاتھ میں نہ لے اس لئے یہ کام بھی اسلامی حکومت کو اپنے ذمہ لینا چاہئے تبلیغ اسلام کے ذریعہ اسلامی حکومت نہ صرف یہ کہ اپنے اسلامی فریضہ سے عہدہ برآ ہوگی۔ بلکہ اس کی وجہ سے اسے ملک کے اندر داخلی استحکام بھی نصیب ہوگا اور بیرونی ممالک میں دائرہ اسلام کی وسعت خود اسلامی حکومت کے بین اقوامی وقار اور وزن میں اضافہ کا باعث ہوگی۔

۴۔ آیت میں مدد کا حکم حاجت کی وجہ سے دیا گیا ہے جس سے قرآنی حکم کی حقیقی روح کا اندازہ ہوتا ہے اب اگر کوئی شخص امداد میں اس حد کو پہونچ جائے کہ خود وہ بھی اپنی حاجت پوری کرنے کے قابل نہ رہے تو اس سے قرآنی حکم کی تعمیل کے بجائے آیت کے مقصد اور اس کی اصلی روح ہی کو نقصان پہونچ جائے گا ادھر غربت مٹے گی اور ادھر وہ پھر نادار ہو جائے گی ، اسی وجہ سے قرآن حکیم نے صحابۂ کرام کے سوال کا ایک دوسری جگہ جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ

ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو — لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں آپ فرما دیجئے کہ تمہاری ضرورتوں سے جو کچھ بچ رہے اسے خرچ کرو۔ ایک دوسری آیت میں اس بات کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے " ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسوراً "

۵۔ آیت میں انفاق کے حکم سے " غربت کی بیخ کنی " مقصود ہے اور اسی لئے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے حالات کا بھی خیال رکھے اور اتنا خرچ کر ڈالے کہ بعد میں اسے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دست سوال دراز کرنا پڑے جس طرح انفاق کا یہ انداز چونکہ قرآنی حکم کی اصل روح کے

کے خلاف تھا اس لئے اس سے منع کیا گیا ۔ اسی طرح اگر معاشرہ کے ہر فرد کو اس کی یا دوسروں کی دولت میں تصرف کرنے کا حق دے دیا جائے تو یہ بھی قرآنی حکم کی روح کے خلاف ہوگا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام ایسے افراد کو جن کے ہاتھوں میں دولت انفاقی عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے اپنے اور دوسروں کے سرمایہ میں تصرف کے حق سے محروم کر دیتا ہے، مجنون اور پاگل قسم کے اشخاص، نادان بچے، یتیم نابالغ اور اس کے علاوہ بعض مخصوص قسم کے افراد کو تصرف کے حقوق سے یا تو بالکل محروم کر دیا گیا ہے یا پھر کم قیمت کے معاملات کو چھوڑ کر اہم تر اور بڑے کاروباروں میں انہیں تصرف کی اجازت نہیں دی گئی، موجودہ زمانہ کے فیشن پرست نوجوان جنہیں غیر سنجیدہ اور فحش تفریحات میں والدین کی پونجی برباد کرنے کا چسکہ لگ جاتا ہے اسلام بعض حالات میں انہیں بھی تصرف کے حقوق سے محروم کرنے کی اجازت دیتا ہے اور اس طرح ان کے "عاق" ہو جانے کی وجہ سے دولت کے ضائع ہونے یا فیشن کی دل دادہ اولاد کی وجہ سے غربت میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔

۴:- معاشیات سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ دولت صرف دھات سے بنے ہوئے سکوں اور کاغذ کے نوٹوں کا ہی نام نہیں ہے بلکہ دولت کے ذیل میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جو کسی بھی اعتبار سے انسانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہوں، خارجی دنیا میں زمین، مویشی، سامانِ تجارت، زیورات پھلوں کے باغات، یہ سب دولت کی مختلف قسمیں ہیں انسان کی اندرونی دنیا کو دیکھئے تو صحت و تندرستی، طاقت اور قوت، ذکاوت اور ذہانت مختلف کاموں کی صلاحیتیں اور ہنرمندی، شخصی، خاندانی یا علمی اثرات یہ سب انسانوں کا بیش قیمت سرمایہ ہیں مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے میں ان کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے اس لئے قرآن مجید نے انفاق کا جو حکم دیا ہے اس سے صرف سکوں اور کاغذ کے نوٹوں کا ہی انفاق مراد نہیں لینا چاہئے، انفاق کا قرآنی حکم دولت کی تمام قسموں پر حاوی ہے البتہ خارجی دنیا میں دولت کی جو قسمیں پائی جاتی ہیں ان کا شمار آسان ہے ان کی مقدار کا اندازہ لگانا عام لوگوں کے لئے کچھ مشکل نہیں اس لئے اسلام نے ان کے انفاق کے لئے حدود مقرر کئے ہیں اور حکومت پر یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ ملک کے باشندوں کو اس انفاق پر مجبور کرے، سامانِ تجارت میں، زیورات میں، غلہ جات اور پھلوں کے باغات میں، مویشیوں اور آمد و رفت کی سواریوں غرض خارجی دنیا کی تمام ہی دولت کی اقسام میں اسلام نے انفاق کے لئے احکام دئے ہیں اور ہر جگہ اور ہر حال میں باشندوں پر یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اپنے سرمایہ کی مخصوص مقدار نکالیں اس کے بعد اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سرمایہ کو صحیح اور بہتر جگہوں پر صرف کرے۔

دولت کی دوسری قسم جس کا انسان کی اندرونی دنیا سے تعلق ہے یعنی صحت اور صلاحیت وغیرہ ان کے بارے میں بھی اگرچہ اسلام میں متعین اور واضح احکام موجود ہیں لیکن چونکہ ان کو صرف کرنے اور استعمال میں لانے کے لئے کسی شخص کو قانونی طور پر مجبور کرنا مشکل ہے اس لئے اسلام نے اخلاقی نصائح کے ذریعہ انسانی پونجی کے اس اندوختہ کو ملک اور قوم کے لئے نفع بخش بنانے پر آمادہ کیا ہے، خدا کا خوف، آخرت کا ڈر، رضائے الٰہی کی امید، جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی توقع یہ تمام باتیں انسانوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنی صلاحیت، ذہانت، تندرستی اور اپنے شخصی اور خاندانی اثرات سے ملک اور قوم اور ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کام کریں، دولت کی یہ قسم جس کا ہر شخص کی اپنی اندرونی دنیا سے تعلق ہے اس کو صرف نہ کرنے پر اگرچہ اس دنیا میں دارو گیر ممکن نہیں تاہم محض اس بنا پر اس پونجی سے اہل حاجت کو محروم رکھنے والوں کو اس دن سے ڈرنا چاہئے جب کہ احکم الحاکمین ان کی صلاحیتوں میں سے ایک ایک کے بارے میں دریافت کرے گا اور یہ پوچھے گا کہ "ہم نے تمہیں جو دولت کا جو یہ خزانہ عطا کیا تھا تم نے اس سے اہل حاجت کی ضرورتیں کس حد تک پوری کیں" کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ خدائے ذوالجلال سے یہ کہیں گے کہ :

ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہماری ان صلاحیتوں میں دوسروں کا بھی حق ہے !!

یہ چند اہم مسائل ہیں جن کی طرف آیت انفاق ہماری رہنمائی کرتی ہے ۔ صحابہ کرام نے جو سوال کیا تھا اس کے قرآنی جواب سے اسلام کے نظریۂ

(باقی ص۱۴ پر)

پروفیسر اسرار احمد سہاوری
(ایم۔ اے)

حصولِ مسرّت

مسرت ہم اس کیفیت کو کہہ سکتے ہیں جو ہمارے دل میں کسی مفید اور لذت بخش چیز کو حاصل کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مفید اور لذت بخش
چیز ہر شخص کے اپنے نقطۂ نظر کے لحاظ سے مختلف اور مخصوص ہو سکتی ہے۔ مثلاً کوئی دولت حاصل کرکے نسبتاً زیادہ خوش ہو سکتا ہے اور کوئی
عزت حاصل کرکے۔ کوئی کسی بے کس کی خدمت کرکے اطمینان حاصل کر سکتا ہے لیکن دوسرا کسی کمزور کا خون چوس کر فرحت محسوس کر سکتا ہے۔ مسرت کی
نوعیت اور کیفیت دراصل زندگی کو دیکھنے کے زاویۂ نظر کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے اگر ہم مسرت کی نوعیت میں یکسانیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے
لئے ضروری ہے کہ ہم زندگی کو دیکھنے کے زاویۂ نظر میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرلیں۔ لیکن زندگی کے زاویہ نظر میں یکسانیت اس وقت پیدا نہیں ہو
سکتی جب تک کہ زندگی کے خیر و شر کے پیمانے یکساں نہ ہوں اور اخلاقی قدروں میں یگانگت نہ پیدا کی جائے۔ نیکی اور بدی کی ایک متفقہ بین الاقوامی
فہرست مرتب ہو اور اس مسئلے کو انسانی سطح پر لاکر دیکھا جائے جیسا کہ اسلام نے دیکھا ہے ان مسلمہ اخلاقی اقدار کو انسانی معاشرے کی بنیاد قرار دیا
جائے۔ بلاشبہ جزوی معاملات میں ہر معاشرے کو اختیار ہو کہ وہ اس خاکے میں اپنا مقامی رنگ بھر سکے لیکن بنیادی اصول ہر جگہ یکساں ہوں۔ اس
اخلاقی انتشار پیدا کرنے والے اصول کو ہرگز نہ ابھرنے دیا جائے کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی ذاتی خواہشات اور رجحانات کی بنا پر وہ جو معیار
خیر و شر چاہے وضع کرلے۔ اصطلاحی طور پر اس اصول کو اخلاقی اضافیت کہتے ہیں اس اصول نے لوگوں کے اخلاق کو بری طرح تباہ کر ڈالا ہے
اخلاق کا فلسفۂ اضافیت اس وجہ سے بھی نامعقول اور ناممکن العمل ہے کہ انسانی معاشرہ ایک اکائی ہے۔ اس اکائی سے کسی فرد اور اس کے
اعمال کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔۔۔ کسی انسان کا کوئی فعل بشرطیکہ وہ انسانوں میں رہتا ہو ایسا نہیں ہو سکتا جس کا عمل اور ردعمل اس
کی اپنی ذات تک ہی محدود رہتا ہو۔ بلکہ اس کا ہر فعل اس کے عزیزوں، دوستوں، پڑوسیوں، ہم وطنوں کو ضرور متاثر کرتا ہے۔ ایسی
صورت میں کوئی شخص یہ دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے یا اس کو دعویٰ کرنے کی کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے افعال کے لئے خود
مختار ہے اسے اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے جس چیز کو چاہے رد کرے۔ جس فعل کو چاہے نیکی شمار کرے اور جس کو چاہے بدی کی فہرست میں
رکھ دے وہ یہ دعویٰ اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ وہ انسانی معاشرے سے بالکل کٹ جائے اور سماج سے کسی قسم کا تعلق باقی نہ رکھے اگر ہر شخص
اپنی مرضی کا مالک ہو جائے اور دوسروں کی پسند و ناپسند کا خیال نہ کرے تو معاشرے کا شیرازہ ہرگز قائم نہیں رہ سکتا اسی طرح بین الاقوامی
نقطۂ نظر سے بہت سی اخلاقی قدریں اس قسم کی نکالی جا سکتی ہیں جن پر تمام دنیا متفق ہو جائے۔ مثلاً کمزوروں کی مدد۔ سچ بولنا، ماں باپ
کی خدمت۔ استاد کا احترام وغیرہ اس کے بعد ہر قوم اور ہر ملت کے اپنے مقامی اصول و ضوابط بھی ہو سکتے ہیں جو اپنی اپنی ضرورت اور روایات
کے لحاظ سے وضع کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ بین الاقوامی اصول سے ٹکرائیں یہ مقامی یا قومی اصول و ضوابط بھی مستقل اور پائیدار ہونے ضروری ہیں
تاکہ قوم کا ہر فرد اپنے لئے علیحدہ اصول مقرر یا اختراع کرکے سوسائٹی کے لئے باعثِ انتشار نہ بن جائے۔

اب مسرت اور اس کے حصول کے ذرائع کی نوعیت کے لحاظ سے بنی نوع انسان کو ہم دوسرے قسم کے دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گروہ اس

لحاظ سے وہ ہے جو کہ خدا ۔ حیات بعد الموت ۔ سزا و جزا وغیرہ کا قائل ہے اس گروہ کے نزدیک خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور اس کو اس پر پوری پوری قدرت حاصل ہے اس نے ہمیں اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے کچھ قوانین دئے ہیں اگر ہم اس کی مرضی کے مطابق ان قوانین پر عمل کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے اور اس کی خوشی ہی ہمارے لئے سب سے بڑی مسرت ہے اور اس ذاتِ واحد کی خوشنودی سے تمام جسمانی اور روحانی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں ۔ اتفاق سے یہ غلط فہمی عام طور پر مغربی ممالک میں پھیلی ہوئی ہے کہ مشرق کا ہر مذہب رہبانیت کی زندگی پر زیادہ زور دیتا ہے اور جو شخص خدا اور مذہب کا دلدادہ ہے وہ زندگی کی تمام مسرتوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیتا ہے لیکن اسلام میں رہبانیت کے خلاف بالکل واضح احکام موجود ہیں ۔ اسلام میں زندگی کا پیش کردہ نقشہ ہی اس قسم کا ہے کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی ۔ ایک جگہ قرآن شریف میں آتا ہے "تم بہترین امت ہو جسے ہم نے یہ فرض سپرد کیا ہے کہ نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے" ایسا آدمی کیا کسی کو نیکی کا حکم دے سکتا ہے اور برائیوں سے روک سکتا ہے جو دنیا کو چھوڑ کر ایک غار میں جا کر بیٹھ گیا ہو ۔ دراصل اسلام کے متعلق یہ خیال کہ اس میں رہبانیت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے چند خانقاہ نشین صوفیوں کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے اول تو یہ اسلام کی صحیح اور مکمل پیروی نہیں ۔ پھر انہیں صوفیاء میں ایسے حضرات بھی ہیں جو کہ پیہم اور متحرک زندگی کا پیغام دیتے ہیں ۔ مثلاً مولانا روم نے مثنوی میں بے عمل زندگی کی انتہائی برائی کی ہے اور فرمایا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ہاتھ ، پیر ، آنکھ وغیرہ اسی لئے دئے کہ ان سے کام لیا جائے ان اعضاء کو معطل کر دینا سخت کفرانِ نعمت ہے اور پیدا کرنے والے کی خواہش اور اس کے احکام سے سرتابی ہے ۔ پھر اکثر صوفیا جو کسی سبب سے خانہ نشین بھی ہو گئے تھے وہ ہرگز جمود و تعطل کی زندگی نہیں گزارتے تھے بلکہ ہر وقت قوم اور حکومت وقت کی اصلاح میں سعی بلیغ کرتے رہتے تھے ۔ مثال کے طور پر ہم حضرت مجدد الف ثانی اور خواجہ اجمیریؒ کے اسمائے گرامی پیش کر سکتے ہیں ۔

مسلمانوں کے خدا نے کہیں انہیں یہ حکم نہیں دیا کہ تم ترکِ دنیا کر دو ۔ کسی نعمت سے فائدہ نہ اٹھاؤ ۔ بلکہ اس نے تو یہ حکم دیا ہے کہ میں نے جو نعمت تم کو بخشی جائے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ ۔ خود کھاؤ دوسروں کو کھلاؤ ۔ خود پہنو دوسروں کو پہناؤ ۔ خزانے کا سانپ بن کر نہ بیٹھو بلکہ غریبوں اور خوش حالی پہنچانے کی کوشش نہ کرو ۔ اپنی آسودہ حالی کی وجہ سے مفلسوں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو بلکہ اپنی سلامتی کے شکرانے میں اپنے غریب بھائیوں کی حتی المقدور مدد کرو ۔ ان کا احترام ملحوظِ خاطر رکھو ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر لذت اندوزی اور مسرت آفرینی کی اس نے ایک حد مقرر کر دی ۔ تاکہ انسان لذتوں میں ایسا نہ ڈوب جائے کہ خدا ہی کو بھلا دے ۔ حلال و حرام میں تمیز نہ کرے ۔ بے خودی میں خدا بننے کی کوشش کرنے لگے اور یہ بالکل واضح بات ہے کہ حدود مقرر نہ ہوں تو بے مہار زندگی سے ایسی ابتری پھیلے کہ ہر شخص کی زندگی وبال ہو کر رہ جائے ۔

اب حصولِ مسرت کے سلسلے میں جو دوسرا گروہ ہے اس کا خیال ہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔ یہ ساری کائنات خود بخود پیدا ہو گئی ہے ۔ ہماری زندگی اسی دنیا میں ختم ہو جاتی ہے اس دنیا کے اعمال کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے ۔ خوشی و غم ۔ راحت و تکلیف ۔ کامرانی و ناکامی اسی دنیا پر منحصر ہے اس لئے ہمیں اسی دنیا کی نعمتوں میں سے زیادہ سے زیادہ حصہ مل جائے ۔ مال و دولت ، عزو جاہ وغیرہ ان کی منزلِ مقصود ہے اس کم قدر تصورِ حیات کی وجہ سے بہت سی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ اس دنیا کی زندگی بڑی مختصر اور ناپائیدار ہے اس لئے ہر وہ شخص جو حیات بعد الموت میں اعتقاد نہیں رکھتا حصولِ نعمت کے معاملے میں بڑا بدحواس ہو جاتا ہے اور انتہائی بے قراری سے یہ کوشش کرتا ہے کہ جو مل سکے جلد از جلد حاصل کرے ۔ اس بدحواسی میں جائز و ناجائز کا بھی خیال نہیں کرتا ۔ جوا ۔ سود خواری ۔ چور بازاری ، عصمت فروشی ، چوری وغیرہ اس کے نزدیک جائز ہو جاتی ہیں وہ صرف مقصد پر نظر رکھتا ہے ذرائع و وسائل کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے ۔ لیکن باوجود اس کے مطمئن اور سیر نہیں ہوتا

اس کی حرص و آز اس کو ہمیشہ بے قرار رکھتی ہے اور وہ کامیاب ہوکر بھی ناکام ہی رہتا ہے قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے متعلق صحیح فرمایا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان حریص لوگوں کو آسیب کا اثر ہوگیا ہو کہ کسی پہلو سکون میسّر نہیں۔ دوسری قباحت اس ضمن میں یہ آپڑتی ہے کہ حصول مسرت کے معاملے انسانی خواہشات کو اعتدال پہ کون رکھے۔ یہاں ہر شخص کا خیر و شر کا پیمانہ اپنا علیحدہ ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی فرد اور کوئی قوم نقطۂ اعتدال پر نہیں ٹھہر سکتی ہر فرد اور ہر قوم اپنی خواہشات کی تکمیل کے درپے ہے اس کے نزدیک دوسرے افراد اور اقوام جہنم میں جائیں بلکہ افراد و اقوام آپس میں ایک دوسرے کا شکار کرتے ہیں اور دوسروں کو اپنی تکمیل خواہش کا آلۂ کار بناتے ہیں۔ ان کو غلام بنا لیتے ہیں۔ ان کی عزت و عصمت کو برباد کر ڈالتے ہیں ان کی دولت اور سرمائے کو غصب کرلینا جائز تصور کرتے ہیں۔ کوئی کسی کی فریاد سننے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ آج کل آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں دولت جمع کرنے، آزاد تجارت کرنے اور دوسرے معاملات میں سابقت کی عام اجازت ہے وہاں آگے بڑھنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے انتہائی شرمناک طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً میں امریکہ کی تجارتی انجمنوں کے متعلق انگریزی اخبار میں ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ تجارتی انجمنیں اپنے ملازمین کی بیویوں کو بھی مجبور کرتی ہیں کہ وہ بڑے بڑے خریداروں کو خوش کرنے کے لئے ان کے ساتھ رقص کریں اور ان کو مستقل گاہک بنانے کے لئے دوسرے ذرائع استعمال کریں۔ یہ تو ایک معمولی سی مثال تھی سینکڑوں اس سے زیادہ شرمناک اور ظالمانہ مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ دوسری طرف جہاں تجارت آزاد نہیں ہے اور ساری تجارت حکومت کے ہاتھ میں ہے وہاں دوسری قسم کے مظالم توڑے جاتے ہیں۔ مثلاً فرد کی آزادی بالکل ختم کردی جاتی ہے۔ تمام ضروریات زندگی حکومت کے قبضے میں آجاتی ہیں پھر کسی کو جرأت نہیں ہوسکتی کہ باوجود انتہائی مظالم کے کوئی حکومت پر اعتراض کرسکے۔

تیسری خرابی اس سلسلے میں یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ ایسے معاشرے سے جہاں حصول مسرّت اور لذت اندوزی پر کسی فطرت مافوق کی کڑی نگرانی نہ ہو اور ہر شخص کے خیر و شر کا پیمانہ الگ ہو اخلاقیات پر تباہی آجاتی ہے۔ بلکہ اخلاق کا تصور ہی سرے سے ختم ہوجاتا ہے چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جیسے جیسے حصول مسرت کے ذ[illegible] آزاد ہو رہے ہیں ویسے ویسے بداخلاقی کی تباہ کاریاں بڑھتی جارہی ہیں اور نہایت تیزی سے دنیا کو لپیٹ میں لے رہی ہیں اس خطرے کو ایمینوئل کانٹ نے صحیح طریقے پر سمجھ لیا تھا۔ اور اس نے اپنی تحریروں میں بارہا یہ لکھا ہے کہ زندگی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اخلاق کا وجود ناگزیر ہے اور اخلاقیات میں پائیداری اور وزن پیدا کرنے کے لئے تصور خدا اور اعتقادات حیات بعد الموت نہایت ضروری چیزیں ہیں اس لئے کہ بغیر ان تصورات کے ہم اپنے اخلاقی قوانین میں استحکام پیدا نہیں کرسکتے۔ کوئی دنیاوی سیاسی اقتدار اعلیٰ اخلاقی قوانین کا نفاذ خاطرخواہ طریقے پر نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے ہمیشہ مافوقی اعتقادات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تصور خدا اور حیات بعد الموت کی گرفت ڈھیلی پڑجانے کی وجہ سے جو اخلاقی تباہی کا سیلاب امنڈ آیا ہے اس کا بیان تحصیل حاصل ہے۔

نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مسرت اسی معاشرے میں صحیح طور پر حاصل کی جاسکتی ہے اور اس سے بدرجہ اتم لطف اٹھایا جاسکتا ہے جہاں اخلاق کا جنازہ نہ نکل گیا ہو اور لوگوں کے اعمال کی نگرانی کسی مافوقی طاقت کا تصور اور اعتقاد کرتا ہو ان کی خواہشات کو اعتدال پر رکھنے کے لئے اس مافوقی طاقت کی طرف سے کچھ اصول و ضوابط مقرر کردئے گئے ہوں۔ لوگوں کو یہ خیال رہے کہ اگر ہم نے اپنے جرائم کو سیاسی اقتدار اعلیٰ اور سماج کی آنکھوں سے چھپا بھی لیا تو ایک ایسی ہمہ بیں اور ہمہ داں طاقت موجود ہے جو ہمیں بہرصورت دیکھ لے گی اور اگر اس دنیا میں ہم تعزیر [illegible] رسوائی سے بچ بھی گئے تو دوسری دنیا میں ہم ضرور اپنے کیفرکردار کو پہونچیں گے، وہاں ہمیں نہ دولت بچا سکے گی نہ طاقت۔ وہاں نہ کوئی سفارش چلے گی اور نہ کوئی ہمدردی کام دے گی۔ وہاں بالکل صحیح صحیح فیصلہ کردیا جائے گا۔ اور حقدار کو اس کا واجبی حق دلادیا جائے گا۔ اس تصور کا

ساتھ ہی انسانی معاشرے میں سکون اور مسرت کا حصول ممکن ہے ورنہ تو یہی ہوگا کہ کسی ایک پہلو میں مسرت حاصل بھی ہوئی تو دس پہلی قباحتیں اور پریشانیوں کے پیدا ہو جائیں گے۔ ہمہ گیر مسرت و سکون۔ زندگی میں توازن۔ معاشرت میں اعتدال یعنی ایک قادر مطلق خدا کے تصور سے ہی وابستہ ہے۔ آئندہ ہم حصولِ مسرت کے کچھ ذرائع اور وسائل سے بحث کریں گے۔

بنیادی طور پر ہم خوشی کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنی روحانی یا ذہنی خوشی اور جسمانی یا دل کی خوشی یا وہ خوشی جو مادی چیزیں حاصل کرکے محسوس ہوتی ہے لیکن یہ دونوں قسم کی مسرتیں اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب کہ انسان نے حصولِ مسرت کے راستے میں کچھ مشکلات کا سامنا کیا ہو۔ پریشانیاں اُٹھائی ہوں اور اس دوران میں کامیابی اور ناکامیابی دونوں مشتبہ رہی ہوں۔ بقول رسل کے غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ کامیابی حاصل کرکے بھی بھرپور مسرت حاصل نہیں کر پاتے جو اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کے اندازے کے بارے میں مبالغہ سے کام لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو شخص اس بارے میں انکسار اور عاجزی کا عادی ہوتا ہے اس کو ہر کامیابی خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو ایک خوشی کا سرچشمہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح خود اعتماد آدمی ذرا سی ناکامی سے گھبرا جاتا ہے اور بہت جلدی مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے لیکن منکسر المزاج اور خاکسار طبیعت کا مالک بڑی سی بڑی ناکامی سے نہیں گھبراتا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ نہ تو آدمی اتنا مغرور اور خود اعتماد ہو کہ بڑی سے بڑی خوشی کا صحیح لطف حاصل نہ ہو سکے اور ذرا سی ناکامی سے مایوس ہو جائے اور نہ اس قدر اپنے آپ کو کم مایہ اور بے قدر خیال کرے کہ کسی بڑے کام کی طرف اقدام ہی نہ کر سکے یہاں بھی رسول کریم کا یہ قول ہی بہترین ثابت ہوتا ہے کہ بہترین راستہ درمیان کا راستہ ہے میانہ روی ہر جگہ کامرانی اور مسرت کی ضامن ہوتی ہے۔

خوشی کی سب سے بڑی قاتل بیکاری ہے ہمارے بہت سے نوجوان اس لئے بھی خوشی سے محروم ہو جاتے ہیں کہ ان کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں مل پاتا۔ ڈاکٹری کے لئے موزوں ہیں تو کلرکی کرنی پڑتی ہے۔ کامیاب وکیل بن سکتے ہیں لیکن کاروبار کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ لوگ بھی کام کرنے کی خوشی سے محروم نہیں اور بیکاری کی بلا سے محفوظ رہتے ہیں۔ آج کل عموماً لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مشین سے کام کرنے میں کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی۔ پہلے زمانے میں لوگ تمام کام ہاتھ سے کیا کرتے تھے تو انہیں اپنے کام میں ایک فنکار کی سی خوشی حاصل ہوتی تھی لیکن رسل اور ایوریٹ دونوں اس کے قائل نہیں ان کا خیال ہے کہ مشین سے کام کرنے والے کو بھی اگر اپنے کام سے شغف ہے تو وہ بھی اپنے کام میں راحتیں اور لطافتیں پیدا کرکے ایک فنکار کی سی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن شرط صرف یہ ہے کہ کوئی ایسا کام اختیار کرنے پر وہ مجبور نہ ہو گیا ہو جس سے اس کی طبیعت کو بالکل مناسبت نہ ہو اور روزی کمانے کی مجبوری سے اس کو وہ کام اختیار کرنا پڑا ہو ان دونوں کا یہ بھی خیال ہے کہ کوشش کرکے کسی کام سے دلچسپی پیدا بھی کی جا سکتی ہے اور بہتر یہی ہے کہ جس کام کے کرنے کے لئے آدمی مجبور ہو گیا ہو اس میں آہستہ آہستہ دلچسپی بھی پیدا کرے اس طرح وہ بہت بڑی حد تک کام کرنے کی اکتاہٹ سے محفوظ ہو جائے گا اور کام کرنے سے تکان بھی محسوس نہیں کرے گا۔ بقول رسل کے تعاون۔ دوستی اور ہم مشربی کی فضا مسرت حاصل کرنے کے لئے بہت ضروری ہے اور تینوں چیزیں ایک فیکٹری میں کام کرنے والے کو بڑی حد تک میسر آ جاتی ہیں اس لئے فیکٹری کی زندگی سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل لوگ دیہات کی تنہائی کی فضا سے گھبرا کر شہر کی پر رونق زندگی کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتے ہیں اور دنیا کی آبادی شہروں میں مرتکز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ شہر میں آکر انسان گوناگوں

The Conquest of Happiness — RUSSELL ؎

مصروفیات اور دل چسپیوں میں کھو جاتا ہے۔

خوشی کی ایک اعلیٰ اور مفید قسم (دین و دنیا دونوں کے لحاظ سے) یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کی خو میں شریک ہونا سیکھے بلکہ خود زیادہ سے زیادہ لوگوں کی مسرت کا باعث بن سکے۔ اپنی ذات سے انتہائی دل چسپی فطرتی طور پر ہر شخص کو ہوتی ہے لیکن دوسرے لوگوں میں دل چسپی پیدا کرنے کے لئے تھوڑی سی کوشش کرنی پڑتی ہے جو شخص دوسرے لوگوں کی زندگی میں دل چسپی لیتا ہے تو طور پر دوسرے لوگ اس کی زندگی میں دل چسپی لینا شروع کر دیتے ہیں اور اس کی خوشی و غم میں برابر کے شریک رہتے ہیں اور یہ ایک انسان کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی خوشی و غم میں شریک ہونے کے لئے تیار رہیں۔ ایسا شخص دنیا میں کبھی تنہا نہیں رہ سکتا خدا کے یہاں اس کو جو اس کا اجر ملے گا وہ اس کے علاوہ ہے ایسے شخص کو ناشکر گزاری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیوں کہ اس نے جس شخص کی بھی خدمت کی ہوگی بے لوث کی ہوگی اس کی اپنی کوئی غرض وابستہ نہیں ہوگی اس بنا پر شکر گزاری اور ناشکر گزاری کا اس کے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ایسے لوگ ناسپاس گزاری کی وجہ سے ضرور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں جو کسی کی کوئی خدمت کسی عوض کے لئے کرتے ہیں۔ اپنی تعریف توصیف کے خواہش مند ہوتے ہیں یا سیاسی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اکثر اپنی خدمات کا صلہ ان کی خواہش اور توقعات کے مطابق نہیں مل پاتا۔ مخلص اور بے لوث آدمی ہمیشہ بہترین ساتھی اور بے مثال دوست ثابت ہوتا ہے وہ دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے کے طور پر خود اس کے خوش رہنے کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حصولِ مسرت کا بڑا راز یہ ہے کہ ہماری دلچسپیاں زیادہ سے زیادہ وسیع ہوں محدود نہ ہوں دوسرے یہ کہ جس شخص سے واسطہ ہو اس کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کریں سرد مہری سے پیش نہ آ

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری مرحوم و مغفور

متحدہ ہندوستان میں خلافت اور کانگریس کی تحریکیں جب زوروں پر تھیں اُس دور میں مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی کا نام بار بار اخباروں میں سے گزرا اس وقت میں انگریزی مڈل اسکول کی پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ پھر ۱۹۲۲ء میں مولانا مرحوم کے ہفتہ وار اخبار "خدام الحرمین" میں میری نظمیں اور مضامین چھپنے لگے۔ میری مضمون نگاری کا آغاز ہی اس اخبار سے ہوا! برسوں کے اس غائبانہ تعارف کے بعد اُن سے پہلی بار ملاقات جبل پور میں ہوئی، یہ غالباً ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔

جبل پور میں مسلم لیگ کی کانفرنس کے ساتھ مشاعرے کا بھی اہتمام تھا مجھے اس میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی، اُن دنوں بلدۂ حیدرآباد میں میرا مستقل طور پر قیام تھا، وہاں سے اٹارسی ہوتا ہوا جبل پور پہونچا، وہ جو کسی نے کہا ہے —— یوں چلے آئے دلّی کو بخارا ہو کر —— تو قریب کے راستہ کو چھوڑ کر اس طویل راہِ سفر اختیار کرنے میں ناواقفیت کے علاوہ میری مسافرانہ بدحواسی بھی شامل تھی۔ جبل پور کی مشہور "محبوب بیڑی مارکہ کمپنی" کے مالک کی کوٹھی میں باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو ٹھیرایا گیا۔ شاندار کوٹھی، وسیع لان، آرام دہ فرنیچر، سیٹھ صاحب کے نوکر مہمانوں کے ادا شناس، اچھے اور لذیذ کھانے، فراوانی کے ساتھ! ہر طرح کا آرام اور امیرانہ انداز کی خاطر مدارات!

مولانا حسرت موہانی (جو انہی دنوں انگلستان کے سفر سے واپس آئے تھے) مولانا صبغۃ اللہ شہید الٰہ آباد کے مولوی ظہور احمد ایڈوکیٹ، پٹنہ کے مشہور بیرسٹر اور بہار مسلم لیگ کے روحِ رواں سید عبدالعزیز جو بعد میں حکومت حیدرآباد دکن میں وزیر عدالت و قانون مقرر ہوئے۔ اور راقم الحروف اس کوٹھی میں مہمان تھے ان بڑے آدمیوں میں ہر اعتبار سے سب سے چھوٹا میں ہی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے میرے ساتھ سب کا برتاؤ عزت و قدرشناسی کا برتاؤ تھا۔ مولانا شہید انصاری مرحوم اس نیازمند سے بڑے تپاک کے ساتھ بغل گیر ہوئے، تین دن اُن کا ساتھ رہا، جلسہ عام میں مرحوم کی پرجوش تقریر بھی سُنی۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جبل پور کی ملاقات کے بعد مولانا شہید انصاری مرحوم سے دوسری بار ملاقات حیدرآباد دکن میں ہوئی! تقسیم ہند کے بعد اُن سے نیاز حاصل ہونے کی کیا توقع ہو سکتی تھی کہاں لکھنؤ اور کہاں کراچی بیچ بیچ بعد المشرقین۔ پھر ویزا وغیرہ کی الجھنیں اور پابندیاں لیکن اللہ تعالیٰ نے مشرقی پاکستان میں اُن سے ملنے کی سبیل پیدا کر دی، مولانا مرحوم جاڑوں میں سال کے سال اپنے صاحبزادے حبیب انصاری اور ان کے بال بچوں سے ملنے کے لئے ڈھاکہ تشریف لایا کرتے تھے، حبیب میاں کی ذات اور اُن کا مکان شعر و ادب کی دلچسپیوں کا مرکز ہے، کئی بار مشاعروں میں شرکت کے لئے ڈھاکہ جانا ہوا اور وہاں مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری مرحوم کے ساتھ ملنا جلنا، کھانا پینا اور اٹھنا بیٹھنا رہا اُن سے آخری ملاقات پچھلے سال ہوئی تھی اور آہ! کہ اب ایک برس بعد ۱۹۶۵ء میں اُن کے نام کے ساتھ "مرحوم" لکھنا پڑ رہا ہے۔ اس عالم

آب وگل اور دنیائے فانی میں جل چلاؤ لگا ہوا ہے سے آج وہ کل ہماری باری ہے!

مولانا مرحوم کئی سال سے بلڈ پریشر کے مریض تھے، ڈھاکہ جاتے ہوئے کلکتہ میں اُن کی طبیعت بگڑی اور ذرا سی دیر میں حالت اتنی نازک ہو گئی کہ ڈھاکہ کا سفر جاری رکھنے کی بجائے کلکتہ کے اسلامیہ ہسپتال میں انہیں پہونچا دیا گیا، وہاں دو دن دو رات مسلسل غشی طاری رہی اور اسی عالم میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے! ۲۵ر دسمبر کو کلکتہ سے میت ریل کے ذریعہ لکھنؤ لائی گئی اور ہزاروں مسلمانوں نے جنازہ کی نماز پڑھی جن میں سُنی علماء کے علاوہ شیعہ علماء اور مجتہدین بھی نمازیوں کی صف میں موجود تھے، سوگواروں اور تعزیت کرنے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل تھے، مغربی بنگال کے گورنر نے بھی تعزیت کا پیام بھیجا۔

مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محل کے مشہور علمی و دینی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، عربی کے عالم، اردو کے شاعر و مضمون نگار اور شعلہ بیان خطیب! عربی کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا، انجمن خدام کعبہ، خلافت کمیٹی، کانگریس، خدام الحرمین، جمعیۃ علما اور مسلم لیگ کے پرجوش کارکن بلکہ لیڈر رہے اور آغاز شباب ہی سے سیاسی، قومی اور دینی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے، علی برادران، مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا حسرت موہانی جیسی مشہور و محترم شخصیتوں کے ساتھ سیاسی اور دینی تحریکوں میں کام کرنے کا شرف حاصل ہوا، تقریر و خطابت اُن کا سب سے زیادہ نمایاں وصف تھا! تقریر کا انداز و اسلوب ہی نہیں لب و لہجہ بھی مخصوص تھا! خاص طور سے سیرت النبیؐ پر بولتے تو سننے والوں کو رُلا رُلا اٹھتے! سرکار دو عالم، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی سے قابل رشک عقیدت و محبت تھی!

مولانا مرحوم بڑے ہنس مکھ، بذلہ سنج اور باغ و بہار آدمی تھے، شاعری تو اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، اچھا شعر سُن کر والہانہ انداز میں داد دیتے۔ افسوس ہے کہ اُن کے داد دینے کے انداز کی نقل اُتارنے والے شوکت تھانوی بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔

"فاران" اور اس کے کم سواد ایڈیٹر کے قدر شناس! فاران کا "توحید نمبر" بڑے شوق سے منگایا اور اُسے پسند کیا! حالانکہ بریلی، بدایوں اور فرنگی محل کے مشائخ و علماء "توحید نمبر" پڑھ کر خوش نہیں ہو سکتے۔ پچھلے سال کئی خط بھی راقم الحروف کو لکھے، خط کی عبارت بہت مختصر ہوتی، بہت سے بہت چار پانچ سطریں بس ضرورت اور کام کی بات! ریڈیو سے میری غزل سُن کر خط لکھا کہ تمہارے اس شعر:-

زِ گرفتارِ محبت پہ خدا رحم کرے
آج اس شخص کی پہلی شب تنہائی ہے

میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "اس شخص" کی جگہ "کم بخت" ہونا چاہئیے میں نے جواب میں عرض کیا کہ "اس شخص" کو نکال دیا گیا تو شعر کا سارا لطف ہی جاتا رہے گا۔

مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری مرحوم اس دنیا سے کیا گئے اپنے ساتھ دین و اخلاق اور شرافت و انسانیت کی بہت سی روایتیں بھی لے گئے، لکھنؤ کا نام آتے ہی اُن کی شخصیت ضرور نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی، اللہ تعالیٰ آخرت میں ابرار و صلحا کی معیت و رفاقت انہیں نصیب فرمائے (آمین)

ظریف دہلوی مرحوم

ماہنامہ "ساقی" (دہلی) میں ظریف دہلوی کے مضامین چھپتے رہتے تھے، اسی واسطہ سے اُن سے غائبانہ تعارف تھا۔ ۱۹۴۰ء میں میرا

دلی آنا ہوا تو میرے بے تکلف دوست صابر دہلوی (مرحوم) نے پہلی ملاقات میں چھوٹتے ہی کہا کہ ماہر! ایک شخص حسن اتفاق سے ہاتھ آگیا ہے، خود شاعر ہے، شاعروں کا قدردان بھی ہے اور مشاعروں میں جانے کا تو اُسے وہ شوق اور چسکا ہے کہ کوئی حد و نہایت نہیں! تم ظریف دہلوی کے نام سے ضرور واقف ہوگے، تمہاری دعوت اُن کے یہاں پکی ہے! اس گفتگو کے دوسرے دن ظریف صاحب سے اندر بازار میں ملنا ہوا دیکھتے ہی لپٹ گئے اور فرمایا کہ میرے یہاں دعوت کھائے بغیر آپ دلی سے جا نہیں سکتے! پھر اُن کے یہاں دعوت ہوئی، کوچہ چیلاں میں آصف علی مرحوم کے مکان سے قریب اُن کا نوتعمیر مکان کیا اچھی خاصی کوٹھی تھی! ایک دو ملاقاتوں ہی میں ہم ایسے بے تکلف ہوگئے، جیسے لنگوٹیا یار ہیں! پھر کچھ دنوں کے بعد کراچی کا مشاعرہ نکل آیا میں نے کہا کہ بھئی! راستہ میں اترتے اور سیر کرتے کراچی چلیں گے!

شاعروں کے اس قافلہ میں تین ساتھی تھے، صابر دہلوی، ظریف دہلوی اور راقم الحروف! پہلے ہم لاہور اترے، دن بھر سیر کی، رات کی ریل گاڑی سے چل کر سکھر پہونچے، وہاں دریائے سندھ کا مشہور "بند" (بیریج) دیکھا، سکھر میں یہ لطیفہ پیش آیا کہ روہڑی ریلوے اسٹیشن سے سکھر بیریج جانے کے لیے تانگہ کیا تو تانگہ والے نے سرکس کے گیٹ پہ جاکر ہمیں اُتار دیا! سکھر سے روانہ ہوکر یہ قافلہ حیدرآباد (سندھ) اُترا اور وہاں سے چل کر کراچی پہونچا کہ یہی منزل مقصود تھی! پیر الٰہی بخش صاحب اُن دنوں وزیر تعلیم تھے انہوں نے اپنی کوٹھی کے قریب ایک دو منزلہ مکان میں شاعروں کے قیام و طعام کا انتظام کیا تھا، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، پیر صاحب کی کوٹھی میں ٹھیرے، مولوی صاحب ہی کے ایما و پہ ہم نے کراچی کا دور دراز سفر اختیار کیا تھا! ہم تین کے علاوہ خمار بارہ بنکوی بھی شاعروں کی اس "چوکڑی" میں شامل ہوگئے، کئی دن خوب لطف رہا، ظریف دہلوی مرحوم عمر میں بہت بڑے تھے مگر ہر لطف و رنگینی میں برابر کے شریک! وہ بوڑھے تھے لیکن دل جوان تھا! طبیعت بڑی ملنسار پائی تھی، پورے سفر میں اُن کی کسی بات سے کسی ساتھی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی!

اس سفر کے بعد بہت سے مشاعروں میں اُن کا ساتھ رہا، ہندوستان تقسیم ہوا تو ظریف دہلوی بھی پاکستان چلے آئے اور کراچی کی کسی کمپنی میں معقول مشاہرہ پہ ملازم ہوگئے، حساب کتاب (ACCOUNTANCY) کا انہیں بڑا تجربہ تھا، انگریزی حکومت کے پنشن یافتہ اکاؤنٹنٹ تھے، بڑھاپے میں جوانوں سے زیادہ کام کرتے ــ، ملازمت کے معاملہ میں بڑے فرض شناس، وقت کے پابند اور دیانت دار! انہوں نے کئی بار نوکری سے چھٹکارا بھی چاہا مگر کمپنی والوں نے انہیں نہ چھوڑا دو سال سے وہ خانہ نشین تھے، عمر اسّی سال سے کیا کم ہوگی، مگر شعر و شاعری کی محفلوں میں اس حالت میں بھی شریک ہوتے کہ کانپتے ہاتھوں میں بیاض ہے اور آواز ہے کہ ناتوانی اور پیرانہ ضعف کے سبب ساز کے ٹوٹے ہوئے تار کی طرح جھنجھنا کے رہ جاتی ہے۔

ظریف مرحوم کثیر الاولاد تھے آخری عمر میں اپنی ایک لڑکی کی، بیوگی کا غم دیکھنا پڑا، دوسرا غم بیٹے کا تھا جس نے بمبئی میں کسی گانے والی سے شادی کرلی اور وہیں کا ہو رہا، بوڑھا باپ جوان بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترس گیا اور مرتے وقت تک ترستا رہا۔

"فاران" بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے، میں نے اُن کے خط محفوظ نہیں رکھے ورنہ انہیں یکجا کردیا جاتا تو راقم الحروف کے مناقب کا ایک کتابچہ تو ضرور بن جاتا! کبھی کبھار زبان و بیان کی غلطی پہ مجھے ٹوک بھی دیتے! دلی کے اُس محلہ کے رہنے والے تھے جو علم و فضل کا مرکز رہا ہے، زبان کی نزاکتوں پہ بڑی گہری نظر تھی، شاعری تو اُن کا اصل رنگ اور سرمایہ حیات ہی تھا مگر نثر نگاری میں بھی بڑے مشاق تھے!

اُردو کے مزاح نگار شاعروں میں ظریف دہلوی ممتاز مقام رکھتے تھے، فکر و خیال میں ندرت و شوخی اور اظہار و بیان میں پختگی! زبان کا رچاؤ سونے پہ سہاگا! نظم و غزل، قطعہ اور رباعی سبھی کچھ کہتے، غالب کی غزلوں پر اُن کی "تضمینیں" بہت خوب تھیں، جس مشاعرے اور

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

شعلہ و شبنم

منظر کلیمی

راہ میں تیری مسافر! کوئی حائل تو نہیں
کیوں یہاں ٹھہر گیا یہ تری منزل تو نہیں

ساتھیو! موڑ لو ہاں، موڑ لو رخ کشتی کا
ڈوب جاؤگے یہ طوفان ہے ساحل تو نہیں

نظارۂ جمال کی حسرت کے ساتھ ساتھ
نظارۂ جمال کا کچھ حوصلہ بھی ہو

تجھ سا کوئی جہان میں دیکھا نہیں گیا
تجھ سا کوئی جہان میں پیدا ہوا بھی ہو

اب ہم ہیں اور کوئے محبت کی ذلتیں
جائیں کدھر غریب کوئی راستا بھی ہو

سوز ککراوی

کہاں کا جام کس کی آرزو کیا مے کشی ساقی
ترستی ہے ابھی تو زندگی کو زندگی ساقی

تم نے جب سے نگاہ پھیری ہے
خیریت پوچھتے ہیں بیگانے

ہو سکے تم سے تو خود کوئی مداوا کر دو
ساری دنیا سے مرا حال پریشاں نہ کہو

یہ تمہاری ہی محبت میں ہوئے ہیں برباد
ان غریبوں کو خراب غم دوراں نہ کہو

میں نے ہر دور میں دیکھی ہے دہکتی ہوئی آگ
تم مرے سامنے روداد بہاراں نہ کہو

خار و خس بھی تو ہیں پروردۂ آغوش بہار
صرف پھولوں کے تصور کو گلستاں نہ کہو

ہم نے تو وقت کو گزارا ہے
وقت کے ساتھ ہم کہاں گزرے

ماھر القادری

میری قسمت سے توجہ پر جو مائل ہوگئیں
وہ نگاہیں اور قاتل اور قاتل ہوگئیں

اس قدر آشفتہ منظر اس پہ یہ رعنائیاں
کیا مری حیرانیاں جلووں میں شامل ہوگئیں

مشکلیں جب تک رہیں ذوقِ سفر تازہ رہا
کیا کروں آسانیاں رستے میں حائل ہوگئیں

آئیے مشقِ خرامِ ناز کا وقت آگیا
حسرتیں پامال ہو جانے کے قابل ہوگئیں

پرسشِ احوال کا اے دوست پھر بھی شکریہ
الجھنیں کچھ اور نازک اور مشکل ہوگئیں

مجھ کو ماہرؔ عشق کی خودداریوں پر ناز ہے
اور اگر یہ بھی شریکِ رنگِ محفل ہوگئیں

ہماری نظر میں

روحِ تصوف

تالیف عربی ـــ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شرح اردو، مفتی مولانا محمد شفیع ضخامت ۱۹۲ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت تین روپے ۵۶ پیسے، ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے صحابہ کرام، تابعین عظام اور صوفیا رکرام کے مختصر حالات اور منتخب اقوال ایک مستقل مجموعہ میں جمع فرمائے تھے، یہ مجموعہ دراصل رسالہ قشیریہ اور طبقات شعرانی کا ایمان افروز انتخاب تھا۔ رسالہ ہذا عربی زبان میں تھا۔ اس لئے اردو جاننے والوں کے استفادہ کی خاطر حضرت حکیم الامت کے ایمائے مفتی محمد شفیع مدظلہ نے اس کا اردو ترجمہ اور شرح کی، مفتی صاحب موصوف نے دیباچہ میں لکھا ہے

"ترجمہ میں بغرض افادہ عوام احقر نے تحت اللفظ ترجمہ کو چھوڑ کر خلاصہ مطلب پر اکتفا کیا ہے ـــ ۲۰ محرم ۱۳۵۵ھ"

اس کتاب میں صوفیائے کرام کے جو اقوال جمع کئے گئے ہیں وہ اخلاق و احسان کی روح اور تزکیہ نفس کی جان ہیں ان کے مطالعہ سے زخارف دنیوی سے بے رغبتی، ہوائے نفس سے بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ اور تعلق باللہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا ہے!

چند اقوال:-

● ـــ وہ آدمی آخرت کی حلاوت نہیں پا سکتا جو اس کا خواہش مند ہو کہ لوگ مجھے پہچانیں (حضرت بشر حافیؒ)

● ـــ حضرت ابوعثمان مغربی (متوفی ۳۷۳ھ) فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے نفس کو امیدیں ہی دلاتا رہے وہ بیکار ہو جاتا ہے اور جو شخص اپنے نفس کو ہمیشہ خوف ہی دلاتا رہے وہ مایوس ہو جاتا ہے اس لئے یوں چاہئے کہ کبھی امید دلائے اور کبھی خوف!

● ـــ اہل طریق کا اس میں اختلاف ہے کہ دعا کرنا افضل ہے یا ساکت اور راضی برضا رہنا، علامہ قشیری نے اس کے متعلق مختلف اقوال نقل فرمائے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک جماعت نے فرمایا بندہ پر یہ واجب ہے کہ زبان سے تو صاحب دعا ہو اور دل سے صاحب رضا تاکہ دعا و رضا کی دونوں فضیلتوں کا جامع ہو جائے۔ (مولانا تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ زبان سے صاحب دعا ہونے کے یہ معنی ہیں کہ زبان اور دل دونوں[1] سے صاحب دعا ہو نہ یہ کہ صرف زبان سے دعا کرے اور قلب اس سے غافل ہو، کیوں کہ غافل دل کے ساتھ دعا کرنے کی حدیث میں مذمت وارد ہوئی ہے۔

● ـــ شریف آدمی جب علم پڑھتا ہے تو متواضع (منکسر مزاج) ہو جاتا ہے اور رذیل علم پڑھ لیتا ہے تو متکبر ہو جاتا ہے (حضرت عبداللہ بن وہب منبہ)

● ـــ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ سے ایک شخص نے کہا کہ میری بیوی آپ کو سلام کہتی ہے فرمایا عورتوں کے سلام ہمیں نہ پہونچایا

---

[1] ترجمہ میں بابا لکھا ہے۔

کدورت ـــــ گو بعض مواقع پر جائز بھی ہو مگر پوری احتیاط یہی ہے)

● ـــــ حضرت محمد بن سعید وراق کے ارشادات میں سے ہے کہ مکارم اخلاق کا تقاضا خطا کی معافی میں یہ ہے کہ جب تم نے اپنے بھائی کا قصور معاف کر دیا تو پھر اس کا کبھی ذکر نہ کرو۔

● ـــــ حضرت ابوالقاسم بن ابراہیم فرماتے تھے کہ تصوف کی اصل یہ ہے کہ قرآن و حدیث کا التزام خواہشات و بدعات سے اجتناب اور بزرگوں کی تعظیم و تکریم کرے اور مخلوق کے اعذار کو درست سمجھے (یعنی جہاں تک شریعت اجازت دیتی ہو ان مباحات پر ملامت نہ کرے اور جہاں عذر کی گنجائش ہو اُن کے عذر کو قبول کرے) اور اوراد و معمولات پر مداومت کرے اور رخصتوں اور تاویلات کے پیچھے پڑنے سے اجتناب کرے (مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ رُخص پر تاویلات کا عطف، عطف تفسیری ہے، یعنی رُخصتوں سے وہ رخصتیں مراد ہیں جو بتاویل نکالی جائیں، کیوں کہ جن امور میں صراحۃً شریعت نے رخصت دی ہے وہ تو مقاصد شرعیہ میں سے ہے)

صوفیاء کرام کے "خاص احوال و واردات" اور صوفیانہ مصطلحات" کی بجائے اگر ان کے اس قسم کے اقوال و ارشادات" پیش کئے جائیں تو اُن کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے (کتاب کے آخر میں "آداب الشیخ والمرید" (شیخ اکبر محی الدین عربیؒ) کا اردو ترجمہ شامل ہے۔

یہ رسالہ (روح تصوف) نفس کے تزکیہ و تہذیب کے لئے بہت مفید اور کارآمد ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو رضاء الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے!

اسلام اور معجزات

از:۔ علامہ شبیر احمد عثمانی، ضخامت ۱۲۸ صفحات (مجلد) قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارہ علوم شرعیہ آفندی منزل، آرام باغ کراچی۔

یہ کتاب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے دو رسالوں ـــــ اسلام اور معجزات ـــــ پر مشتمل ہے جس میں فاضل مصنف نے کلامی اور سائنٹفک انداز میں "اسلام اور معجزات" سے بحث کی ہے اور ایسے نکتے بیان کئے ہیں جو دل و دماغ اور عقل و ضمیر کو اپیل کرتے ہیں! خاص طور سے خارق عادت، تقدیر اور سنت الٰہی کی بحث اگرچہ دقیق ہے مگر عام فہم ہے، حیرت ہے کہ علامہ موصوف انگریزی نہ جاننے کے باوجود بعض مغربی سائنسدانوں اور فلسفیوں کے اقوال و نظریات پر بھی نظر رکھتے تھے ـــــ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نظر سے یہ رسالہ ضرور گزرنا چاہئے کہ اس میں عقلی استدلال کا رنگ غالب ہے اور آج کل ذہن عقلی دلائل کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے!

تعبیر کی غلطی
جماعت اسلامی کا جائزہ

از:۔ وحید الدین خاں۔
ضخامت ۵۲۰ صفحات، قیمت چھ روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ اسلامک پبلشنگ ہاؤس ۹۔ مدرسۃ الاعظم گڑھ (انڈیا)

یہ کتاب ہمارے پاس بہت دنوں سے تبصرہ کے لئے آئی ہوئی رکھی ہے، ایک طرف لکھنے والے کا خلوص اور دردمندی ہے دوسری طرف واقعات و حقائق ہیں۔ ہم متامل رہے کہ اس پر تبصرہ کریں نہ کریں مگر تفکر و تامل کے بعد قلب و ضمیر نے یہی فیصلہ کیا کہ جس غرض و مقصد (تبصرہ) کے لئے کتاب بھیجی گئی ہے اُس کے مدنظر اس پر تبصرہ کیا جائے اور محتاط سے محتاط اور نرم سے نرم لب و لہجہ جو ہمارے امکان میں ہے ملحوظ رکھا جائے!

اس تامل کا سبب یہ تھا کہ ایک شخص ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا مزاج و فکر رکھ کر سیاسیات و معاشیات پر گفتگو کرتا ہے، جہاں تک زخارف دنیوی سے بے تعلقی اور آخرت کی فکر کا تعلق ہے اس معاملہ میں جتنی بھی شدت برتی جاسکتی ہے اُس کی تقدیس، خلوص اور دردمندی پر کون بدنصیب حرف گیری

کرسکتا ہے، مگر یہ گفتگو اگر ایسا رنگ اختیار کر جائے کہ اس کے آئینہ میں خلافتِ راشدہ کے انتظامی امور ـــــ سفارت، نظارت نافعہ، عسکری تنظیم اور بیت المال کے نظام (وغیرہ) ـــــ پر دنیوی رنگ کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں تو پھر ایک فرض شناس اور خدا ترس ناقد بڑی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے کہ لیڈری فکر کا احترام جس قدر ضروری ہے صدیقی، فاروقی، عثمانی اور علوی شئون و احوال کی تائید بلکہ مدافعت و تحسین اُس سے بھی زیادہ ضروری ہے (بلا تشبیہ)

جناب محترم وحید الدین خاں صاحب نے کوئی شک نہیں بڑے اخلاص و دردمندی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے، اُن کے افکار پر فکر لیڈری کا غلبہ ہے جس کا بہرحال احترام ہی کیا جائے گا مگر جہاں تک دین کے تشریعی احکام کی عملاً تنفیذ اور اسے زندگی کے مختلف شعبوں میں برتنے کا تعلق ہے وحید الدین خاں صاحب کے افکار کو محترم و مقدس ہونے کے باوجود کسی "ربذہ" تک محدود کر دینا ہی مناسب ہوگا۔

اس کتاب کی "تمہید" کے دوسرے صفحہ پر یہ عبارت نگاہ سے گزری:ـــــ

"... اس تعبیر کے تحت پیدا شدہ لٹریچر زبانِ حال سے اور اس کی بعض عبارتیں (مثلاً قرآن کی چند بنیادی اصطلاحیں کا دیباچہ) زبانِ قال سے اس بات کا اعلان ہے کہ اسلاف نے دین کو صحیح شکل میں نہیں سمجھا" (ص ۶)

اسی انداز کا اعتراض امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر بھی کیا گیا تھا کہ اُنہوں نے فقہی مسائل کی جس خاص طرز پر تشکیل و تعبیر کی ہے اس میں قیاس و رائے کا غلبہ پایا جاتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ اپنے دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر جو ذہین مفکر اور صاحب بصیرت داعی دین کو "فعال قوت" (ACTIVE ENERGY) کی صورت میں پیش کرے گا اس کے بارے میں بعض ذہنوں میں اسی قسم کے شبہات اُبھریں گے! یہی صورت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کے ساتھ پیش آرہی ہے۔

"... اس طرح یہ تعبیر گویا اپنے پورے وجود کے ساتھ اسلاف کے تصورِ دین کے بارے میں ایک قسم کی بے اعتمادی کا اظہار ہے .... میری یہ کتاب اسلاف کے اوپر وارد ہونے والے اعتراض کی مدافعت ہے۔ میں اپنے عاجزانہ قول وجود کے ساتھ ان کی طرف سے دفاع کرنے کے لئے اٹھا ہوں۔" (ص ۶-۷)

یہ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر پر اعتراض ہے حالانکہ جماعت کے لٹریچر میں علمار متقدمین اور اسلاف کے اقوال اور تحریروں سے جگہ جگہ استدلال کیا گیا ہے جو اُن پر اعتماد کی نمایاں دلیل ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ جماعت کے لٹریچر میں اسلاف کو "مُطاع" کی حیثیت نہیں دی گئی کہ یہ منصب صرف ذاتِ رسالت کے لئے مخصوص ہے جہاں اختلاف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب رہا دین کے پیش کرنے کا انداز تو پھر اسلامی تاریخ کے ہر دور کے مصنف، مفکر اور عالم پر یہی اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلاف کے مقابلہ میں جدید قسم کی فکر پیش کی ہے! مثال کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے افکار اور تحریروں کو دیکھئے انہوں نے معیشت و اقتصاد اور عمرانیات پر جو گفتگو کی ہے وہ انداز، اسلاف کے یہاں کہاں ملتا ہے؟ فقہ، حدیث اور سیاسیات و عمرانیات کی جو فنی بحثیں علمار نے کی ہیں صحابہ کرام کے یہاں یہ انداز نہیں پایا جاتا! طرزِ استدلال اور اندازِ بیان کے اس تنوع پر یہ طنز تو نہیں کی جا سکتی کہ "اسلاف کے تصورِ دین کے بارے میں یہ ایک قسم کی بے اعتمادی کا اظہار ہے"۔ دیکھئے کہ ضربِ کلام ہر دور لکھنے والے کی کوئی فکر ہے فنِ تاریخ میں ابن خلدون کا مقدمہ پڑھ کر کیا تمام اگلے مورخین پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ کہ انہوں نے اس انداز سے فلسفہ تاریخ پر گفتگو نہیں کی؟ اور سامنے کی بات یہ ہے کہ کئی سال سے حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ میں رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں اور اُن میں کشمیر و فلسطین تک کے سیاسی مسائل تک زیرِ بحث آتے ہیں، تو ان کانفرنسوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا یہ کانفرنسیں اسلاف کے طرزِ عمل کی مخالف ہیں؟

اور ان اجتماعات پر اس قسم کی تنقید کیا فراستِ مومن کا اچھا نمونہ سمجھی جائے گی کہ ان کانفرنسوں میں نیم سیاسی تقریریں کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اسے کعبۃ اللہ کے طواف میں صرف کیا جاتا تھا اور یہ کانفرنسیں فریضۂ حج کی اصل روح اور تعلق باللہ کی کیفیت کو دبا دیتی ہیں !

"..... میرے لئے پورا موقع تھا کہ جس طرح جماعت کے دوسرے مقررین اور محررین اس چڑیا خانہ میں اپنی بولیاں بول رہے ہیں، اسی طرح میں بھی اپنی آواز فضا میں نشر کرتا۔" (ص ۸)

جماعت اسلامی پر "چڑیا خانہ" کی طنز خود تحریر و بیان کی شائستگی و سنجیدگی پر طنز ہے !

ص ۹ پر وحید الدین خاں صاحب فرماتے ہیں :—

"دوسری بات یہ ہے کہ رسالہ زندگی کے ذریعہ میں نے اس حلقہ میں چند سال جو کام کیا ہے اس نے مجھے اس نتیجہ تک پہونچایا ہے کہ موجودہ حالت میں محض مثبت طور پر کام کرتے رہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے اس کی وجہ وہ مخصوص نزاکت ہے جو مولانا مودودی کے لٹریچر نے پیدا کر دی ہے اس لٹریچر کی غلطی عام غلطیوں سے مختلف ہے اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ دین، عقیدہ و عمل کے جس مجموعہ کا نام ہے اس میں کوئی کمی بیشی کی ہو، وہ سارے دین کو تسلیم کرتا ہے مگر اس مجموعہ کے مختلف اجزاء کی واقعی حیثیت اس کی تشریح سے بدل گئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس سے متاثر اذہان بظاہر سب کچھ مانتے ہیں مگر اس "سب کچھ" کو اس طرح نہیں مانتے، جس طرح "حقیقۃً" انہیں ماننا چاہئے۔" (ص ۱۰)

فاضل ناقد جب اس بات کو مانتے ہیں کہ مولانا مودودی کے لٹریچر نے دین کے مجموعہ عقیدہ و عمل میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی تو پھر ان کی تشریح پر یہ الزام کہ اس سے دین کے مختلف اجزاء کی واقعی حیثیت بدل گئی ہے ـ خاصہ محل طلب ہے ! اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا فضل ہے اور اس شخص کے حصہ میں کتنی بڑی سعادت آئی ہے کہ وہ ہزاروں صفحوں کا دینی لٹریچر پیش کرتا ہے اور اس قدر شرح و اطناب کے باوجود دین کے مجموعہ عقیدہ و عمل میں اس کا قلم سے کسی قسم کی کمی بیشی کا ارتکاب نہیں ہوتا —— ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ ! اس صورت میں اس شخص (مولانا مودودی) کی تشریح پر یہ الزام کہ اس سے دین کے مختلف اجزاء کی واقعی حیثیت بدل گئی ہے، عجیب الجھا ہوا الزام ہے ! کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ خود ناقد کے ذہن و فکر میں اس قسم کا الجھاؤ ہو کہ جس کے سبب مولانا مودودی کی "تشریح" میں انہیں "مخصوص نزاکت" دکھائی دیتی ہے —— پھر یہ فرمانا :—

"نتیجہ یہ ہے کہ اس سے متاثر اذہان بظاہر سب کچھ مانتے ہیں مگر اس سب "کچھ" کو اس طرح نہیں مانتے جس طرح حقیقۃً انہیں ماننا چاہئے۔"

جماعت اسلامی کے وابستگان و متاثرین کے "یقین و ایمان" پر طنز نہیں براہ راست چوٹ ہے ! یعنی دین کی قدروں اور اجزاء پر ان کا ایمان "بظاہر" جو ہے وہ "بہ باطن" نہیں ہے ! اور وہ شدید قسم کے نفاق اور ظاہر و باطن کی دورنگی میں مبتلا ہیں، راقم الحروف تو ان لفظوں کا یہی مفہوم سمجھتا ہے !—— اور سنئے :—

"مجھے یہ خوش فہمی نہیں ہے کہ اس طرح تنقید ہو جانے کے بعد ایک طرف سے جماعت کے تمام لوگ اپنے خیالات سے توبہ کر کے دوسری فکر کو قبول کریں گے۔" (ص ۱۲)

اصل میں توبہ "گناہ" سے کی جاتی ہے اور عقائد میں ضلالت سے ! تو محترم وحید الدین خاں صاحب جماعت اسلامی سے تعلق و وابستگی رکھنے والوں کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ مولانا مودودی کے لٹریچر نے یا تو انہیں عملاً "گنہگار" بنا دیا ہے یا فکر و عقیدہ کی "ضلالت" میں مبتلا کر

یا ہے، جن سے انہیں توبہ کرنی چاہئے! مگر یہ الزامات کتنے سنگین اور کس قدر اذیت کوش ہیں!

صاحب موصوف کو جماعت سے جو شکایت وا ختلاف ہے اور جس کے سبب وہ برسوں جماعت سے وابستہ ہو کر اس سے علیحدہ ہوئے ہیں۔
ں کا خلاصہ اور لب لباب خود انہیں کے لفظوں میں یہ ہے :—

"قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز خدا سے تعلق پیدا کرنا ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈرنے کا مسئلہ ہے اسی کو ہمیں اپنانا ہے اور اسی کی طرف اہلِ دنیا کو بلانا ہے مگر اس فکر نے آخرت اور تعلق باللہ کی بات کو تربیت کی بات بنا کر رکھ دیا ہے، اس کا تشریح کے خانے میں یہ چیزیں ایسی حیثیت اختیار کر گئی ہیں گویا یہ کارکن تیار کرنے کی تربیتی بنیادیں ہیں نہ کہ یہی اصل بات ہے جس کے لئے ہمیں متحرک ہونا ہے، اصل مسئلہ دنیا میں انقلاب برپا کرنے کا مسئلہ ہے اور آخرت کا خوف اور اس طرح کی چیزیں اس لئے ہیں تاکہ جو لوگ انقلاب عالم کے اس پروگرام کے لئے اٹھیں یا انقلاب کے بعد نظام دنیا کو سنبھالیں ان میں تنقید کی لگن اور کردار پیدا ہو" (ص ۱۰)

ارکان دین (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) کی پابندی اور اسلامی اخلاق کی قدروں کے اخلاقی احترام کے ساتھ کوئی فرد یا جماعت اس کے
ٔ جدوجہد کرتی ہے کہ اللہ اور رسول کے اجتماعی احکام عملاً نافذ ہو کر نظام دین متشکل اور برپا ہو — تو کیا اس جدوجہد اور تصور و فکر کو
ق باللہ اور خوفِ آخرت سے عاری سمجھا جائے گا؟ ایک شخص دینی درسگاہ قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے، کیا اس کی اس کوشش پر یہ طنز
جا سکتی ہے کہ شخص مذکور تعلق باللہ اور خوف آخرت کی بجائے قرطاس و قلم اور کتابوں کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے! حالانکہ حقیقت حال یہ ہے
دینی درسگاہ کے قیام کے تصور میں تعلق باللہ بھی شامل ہے اور خوفِ آخرت بھی! ورنہ وہ شخص کسی آرٹ سرکل اور فلم اسٹوڈیو کے لئے بھی جدوجہد
جہد کر سکتا تھا — ایک شخص آخرت کے خوف کے سبب شراب پینے سے باز رہتا ہے دوسرا آدمی شراب بھی نہیں پیتا اور ساتھ ہی معاشرے
ں ایک ایسے انقلاب کے لئے جدوجہد کرتا ہے کہ قانونی طور پر شراب پینا ممنوع قرار دے دیا جائے — انصاف سے بتائیے کہ اس
جدوجہد کو کیا تعلق باللہ اور خوفِ آخرت سے غیر متعلق سمجھا جائے گا؟

معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا عبارت لکھنے کے بعد فاضل ناقد کے ضمیر نے چٹکی لی ہے، جس کے نتیجہ میں اُن کے قلم سے ذیلی حاشیہ میں یہ عبارت
ِسر آئی :—

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جماعت کے لوگ آخرت کی کامیابی کے بجائے دنیا میں کامیاب ہونے کو اپنا حقیقی مقصد بنائے ہوئے ہیں ان کا حقیقی مقصد تو بلاشبہ آخرت ہی کی کامیابی ہے مگر آخرت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دنیا میں کیا کرنا ہے اس کے متعلق ان کا تصور غلط ہو گیا ہے، ایک شخص اگر یہ نظریہ قائم کرے کہ دنیا کی مادّی قوتوں کی تسخیر آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے یہ سوچ کر وہ اس کے لئے کام کرنا شروع کر دے تو اُس کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ اصل مقصد کی حیثیت سے تو بے شک اس نے آخرت میں خدا کی ہی رضا کو اپنے سامنے رکھا ہے مگر اس رضا کو حاصل کرنے کی کیا صورت ہو دوسرے لفظوں میں، دنیا میں ہم کیا پانے کی کوشش کریں تاکہ آخرت میں ہم خدا کو پا سکیں، اس کے متعلق اس کا تصور بدل گیا ہے" (ص ۱۰)

اس نقد و احتساب کا صحیح ہدف اور مصداق یا تو کفار ہیں کہ جو ایمان و یقین کے بغیر صرف مادّی قوتوں کی تسخیر ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں یا پھر

وہ مسلمان ہیں جو ارکان دین کی پابندی سے بے نیاز ہو کر اور اسلامی اخلاق کو پس پشت ڈال کر مادی قوتوں کی تسخیر کو دین و دنیا کی کامیابی کا ذریعہ سمجھے ہوئے ہیں مگر جو خدا کے بندے ایمان و یقین کی دولت بھی رکھتے ہیں ارکان دین کے بھی پابند ہیں، منکرات و فواحش میں بھی مبتلا نہیں ہیں۔ وہ اگر دین کی خاطر مادی قوتوں کی تسخیر کو بھی آخرت کی کامیابی کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو ان کا یہ مسلک، روش اور خیال دینی اعتبار سے کسی طرح لائق گرفت اور مستحق طنز و اعتساب نہیں ہے! اللہ تعالیٰ نے انسان کو مادی دنیا میں پیدا کیا ہے، جہاں قدم قدم پر مادی اسباب و ذرائع اور مادی قوتوں سے واسطہ پڑتا ہے، اُن کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے، جب کہ مومن کو اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ آخرت کی بھلائی کے ساتھ دنیا کی بھلائی (ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ) کی بھی دعا کرتا رہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر پر غلبہ پانے کے لئے دعا کے ساتھ — مادی قوتوں سے کیا کام نہیں لیا تھا! گھوڑے، اونٹ، تلواریں، نیزے، زرہ بکتر، کھانے کے لئے رسد کی فراہمی کیا یہ سب کے سب مادی اسباب و ذرائع نہیں ہیں ان میں ایک ایک سے حضورؐ نے کام لیا۔ اور فتح و نصرت کے لئے ان کو ذریعہ اور آلۂ کار بنایا۔ ایک مشہور غزوہ میں "خندق" کھودی گئی تاکہ اس مادی تدبیر و ذریعہ سے مسلمانوں کا بچاؤ ہو سکے! آج کی دنیا میں اگر کوئی فرد یا جماعت اللہ اور رسول کا پیغام پہونچانے کے لئے ریڈیو، پریس اور حمل و نقل و مواصلت کے دوسرے ذرائع کے حصول اور ان قوتوں کی تسخیر کے لئے جد و جہد کرتی ہے! تو اس پر کیا اس قسم کا حکم لگانا قرین عدل و صواب ہوگا کہ ایسا کرنے سے خوفِ آخرت کا تقاضا پورا نہیں ہوتا ہے یا تعلق باللہ میں ضعف واقع ہو گیا ہے۔

"مولانا مودودی کے لٹریچر میں دین کی جو تشریح کی گئی ہے اس کے متعلق میرا شدید احساس ہے کہ وہ دین کے صحیح تصور سے ہٹی ہوئی ہے اس تشریح کے اجزاء ترکیبی تو وہی ہیں جو اصلاً خدا کے دین کے ہیں مگر نئی ترکیب میں اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے کہ وہ بجائے خود ایک نئی چیز نظر آنے لگا ہے اور دین کی اصل حیثیت اس میں بری طرح مجروح ہو گئی ہے" (ص ۱۷)

یہ وحید الدین خاں صاحب کا احساس و تصور ہے لیکن عرب و عجم میں ایسے متعدد اہل فکر مسلمان بھی پائے جاتے ہیں جن کا یہ یقین ہے کہ مولانا مودودی نے دین کی جو تشریح کی ہے وہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے دین کے صحیح تصور کے مطابق ہے اور شام کے وزیر معارف جناب زرقا کے لفظوں میں مودودی غزالی اور ابن تیمیہ کی صف کا آدمی ہے!

مولانا مودودی نے نہ تو کوئی ایسی بات کہی جس سے دین کا کوئی بنیادی عقیدہ ذرہ برابر متاثر و مجروح ہوتا ہو نہ انہوں نے ارکان دین میں کسی قسم کے تغیر و تصرف کا ارتکاب کیا نہ انہوں نے معاذ اللہ کسی حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھیرایا۔ غلامی، ارتداد، پوتے کی وراثت، پردہ، سود، اقتصادی مساوات، تعدد ازدواج، ضبط ولادت وغیرہ جیسے مسائل میں بھی اُن کا مسلک جمہور امت کے مسلک کے مطابق ہے حالانکہ ان مسائل میں آن جیسے ذہین مفکر سے تجدد و آزاد خیالی کا ظہور خلافِ توقع نہ ہوتا! ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے مولانا موصوف کی تشریح پر "دین کا حلیہ بگاڑنے" کی طنز محترم خاں صاحب کے ذہن کی اُپج ہے، جو واقعہ کے خلاف ہے! اور اس کو کسی عنوان درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا، غلطی کس مجتہد، محدث، مفسر اور عالم و مفتی سے نہیں ہوئی، مولانا مودودی بھی انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں، اُن کی تحریریں اور کتابیں بھی غلطیوں سے پاک نہیں ہیں، مگر اُن سے حاشا وکلا اس قسم کی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس نے بقول وحید الدین خاں صاحب دین کے حلیہ کو بگاڑ کر رکھ دیا مولانا مودودی کی تشریح نے تو دینی ادب کو بگاڑا نہیں سنوارا ہے! ہندوستان اور پاکستان اور بعض مسلم ممالک میں لاکھوں آدمی ایسے پائے جاتے ہیں جو مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ کر دین سے قریب ہوئے ہیں اور ان کی زندگیوں میں دینی انقلاب آیا ہے! مودودی صاحب کا پیش کیا ہوا لٹریچر

طنز کی بجائے مدح وستائش اور تبریک وتحسین کا مستحق ہے۔

تمہید کے بعد اس کتاب میں ڈیڑھ سو صفحات پر وہ گفتگو اور خط وکتابت پھیلی ہوئی ہے۔ جو وحید الدین خاں صاحب اور جماعت اسلامی کے مقتدر رہنماؤں کے مابین ہوئی ہے! خاں صاحب موصوف کو جماعت والوں کا کوئی مشورہ، گفتگو، تحریر اور دلیل مطمئن نہ کرسکی، اس کے بعد اُن کے نزدیک اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ جماعت اسلامی کے "فتنہ" سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے اعلانِ حق فرمادیں۔ اور مولانا مودودی کی تحریروں کی غلطیوں کی نشان دہی کردیں، یہ کتاب اسی جذبہ کے ساتھ تحت لکھی گئی ہے! اگر ہم اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ کریں تو "فاران" کی پوری ایک اشاعت بھی اس کے لئے کافی نہ ہوگی! اس لئے ہم انتہائی ایجاز واختصار بلکہ اشاریت سے کام لیں گے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر میں ـــــ سیاست، حکومت، اقتدار، ربوبیت، نظام دین وغیرہ کی جو اصطلاحیں آئی ہیں، یہ اصطلاحیں اپنے مفہوم ومعنی اور تشریح کے ساتھ فاضل ناقد کے نزدیک دین کے اصل مزاج (یعنی "روح تعبد") سے پوری طرح مطابقت نہیں کرتیں، وہ لکھتے ہیں! ـــــ

".. اس میں اجزائے دین کی ترتیب کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھتا ہے تو اس میں اسلام بہ حیثیت نظام تربیت ابھرا ہوا نظر آتا ہے، مگر اس میں تعبد کا پہلو کمزور پڑ جاتا ہے اس تصویر میں ایمان، اسلام، تقویٰ، احسان سب کچھ موجود ہے مگر یہ الفاظ اصلاً تعلق باللہ کے مراحل کو ظاہر نہیں کرتے، بلکہ وہ "تحریک اسلامی" کی اخلاقی بنیادیں ہیں وہ تعلق باللہ کے ان مخصوص مظاہر کے پیمانے ہیں جو امامتِ صالحہ اور "نظام حق کے قیام" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے" جو اس تعبیر کے نزدیک دین کا حقیقی مقصود اور دنیا میں مسلمان کی سعی کا منتہا ہے، یہ حقیقت ایمانی کے ظہور کے وہ مراتب ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ آدمی مذکورہ بالا انقلابی جدوجہد کے اعتبار سے کس مقام پر ہے"

جب دین کا یہ تصور ہو جائے تو پھر آپ کو تعجب نہ کرنا چاہئے اگر ایسے افراد کا دینی تعلق ایک مخصوص سیاسی ڈھانچہ کے نفاذ کے بارے میں تو خوب ظاہر ہوتا ہے مگر ذکر وشکر اور اخبات وانابت کی حقیقتیں ان کے یہاں غائب ہوگئی ہوں" (ص ۳۲، ۳۳-۳۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں جاکر اُس کی جھوٹی خدائی اور غیر دینی اقتدار کو جو چیلنج کیا تھا اس وقت حضرت موسیٰ فرعون کے مقابلے میں "اخبات" (فروتنی) دکھاتے تو یہ بات پیمبرانہ حکمت کے خلاف ہوتی، وہ موقعہ شانِ جلالت دکھانے کا تھا۔ فرعون کے دربار میں جو معاملہ پیش آیا اُس کو کسی طرح بھی ذکر وشکر اور اللہ کے دربار میں اخبات وانابت سے عاری قرار نہیں دیا جاسکتا! حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں ارتداد اور منع زکوٰۃ کے جو فتنے ابھرے تھے کیا وہ صرف ذکر وشکر پر مشتمل دعاؤں اور اوراد ووظائف سے دبائے جاسکتے تھے کیا ان فتنوں کے استیصال کے لئے محض نوافل کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے صرف رونا کافی تھا۔ یہ اسلامی حکومت کی برکت اور اُس کی قوتِ قاہرہ تھی جس نے ان فتنوں کا قلع قمع کردیا اور اسلام واخلاق کو غلبہ حاصل ہوا! کیا ان روشن حقائق کی موجودگی میں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر کی اس دینی جدوجہد میں سیاست کے مقابلے میں "تعبد" کا پہلو کمزور تھا اور یہ جدوجہد ذکر وشکر اور اخبات وانابت سے خالی تھی (معاذ اللہ)

اسلام کی سربلندی اور نظام حق کے برپا کرنے کی جدوجہد میں ذکر و شکر، اخبات و انابت، اور خشیت الٰہی اور تعبد و بندگی اس طرح شامل ہیں جیسے شہد میں مٹھاس اور پھول میں خوشبو ہوتی ہے! یہاں تک کہ کوئی پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان کسی ملک کی اسمبلی میں رکن کی حیثیت سے شریک ہو کر اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت و مدافعت کرتا ہے، تو وہ اُس شخص سے زیادہ بڑا عابد ہے جو اسلامی قدروں کی پامالی پر راتوں کو نوافل پڑھ کر اور ذکر و دعا میں اللہ تعالیٰ کے حضور بس گریہ و بکا کر کے رہ جاتا ہے اور اعلانِ حق کی ہمت نہیں رکھتا۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر میں دین کے لئے اسٹیٹ، نظام جامع، نظامِ حق وغیرہ اصطلاحیں جو استعمال کی گئی ہیں ان سے خاصی ناقد کو خاصی وحشت ہوتی ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرزِ فکر سے مسلمان "سیاسی دیندار" بن کر رہ جاتا ہے اور اس میں انابت، اخبات اور خشیت کی تعبد کیفیت پیدا نہیں ہوتی! جماعت کا اس خصوص میں یہ نقطۂ نگاہ اور طرزِ فکر ہے کہ مسلمان کی پوری کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابع ہو جانی چاہئے، زندگی کو عبادت، سیاست و تجارت وغیرہ خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا، اس حقیقت کو ہم ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

ایک محلّہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت تو ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے منکرات اور فواحش میں مبتلا نہیں ہے، اُس جماعت سے جو لوگ متعلق ہیں وہ راتوں کو ذکر و شغل کرتے ہیں، نوافل کی کثرت، انابت و دعا اور انکسار و فروتنی اُن کی امتیازی خصوصیات ہیں محلّہ کے لوگوں کو یہ جماعت نماز، روزہ کی بڑی دلسوزی کے ساتھ تلقین کرتی ہے ان کی تبلیغی جدوجہد کی بدولت کتنے ہی بے نمازی نمازی بن گئے ہیں! اس جماعت کا کوئی دفتر نہیں، ارکان کے رجسٹر نہیں، ان کی سرگرمیوں کی اطلاعیں اخبارات میں نہیں چھپتیں، ان کے بڑے سے بڑے جلسوں کے لئے اشتہار یا پمفلٹ وغیرہ شائع نہیں ہوتے، کوئی استقبالیہ کمیٹی نہیں بنتی! اس للّٰہیت، سوزِ تعبد اور زہد و ورع کے ساتھ وہ محلّہ کے دوسرے معاملات سے بے تعلق ہے، پولیس وہاں کے لوگوں کو ستاتی ہے اس ظلم کے خلاف وہ کوئی احتجاج نہیں کرتے، محلّہ کی نالیوں میں غلاظت کے انبار لگے ہیں، اس کے دور کرنے کی کوئی تدبیر اور سعی ان حضرات کے دینی پروگرام میں سرے سے شامل ہی نہیں ہے اس محلّہ میں شراب کی کئی دکانیں ہیں، اس جماعت کے افراد نے شراب کی بُو بھی نہیں سونگھی وہ اس کو مطلق حرام ہی سمجھتے ہیں مگر شراب کا کاروبار کس طرح بند ہو؟ اس نہج پر وہ نہیں سوچتے! یہی حال دوسرے معاشرتی معاملات کا ہے!

اُسی محلّہ میں

ایک دوسری جماعت بھی ہے جس سے جو لوگ متعلق ہیں وہ بھی دینی ارکان کے پابند ہیں اور منکرات و مناہی میں مبتلا نہیں ہیں، اُن کے عقائد میں بھی متذکرہ بالا جماعت سے متعلق حضرات کے عقائد کی طرح مُشرکانہ رسوم و بدعات کا کوئی فساد نہیں پایا جاتا، یہ جماعت نماز، روزہ وغیرہ دینی ارکان کی پابندی کے باوجود اس پہلی جماعت کا "ذکر و شغل اور ورد و وظائف" میں تو یقیناً مقابلہ نہیں کر سکتی —— مگر اس جماعت کا محلّہ میں ایک دفتر بھی ہے، جس میں سرکاری دفتر کے کلرکوں کی طرح کارکن کام کرتے ہیں، ٹیلی فون ہے، ٹائپ رائٹر ہے، رجسٹر اور فائلیں ہیں! اس جماعت نے محلّہ میں دارالمطالعہ بھی قائم کر رکھا ہے جس میں اخبارات کے علاوہ دینی لٹریچر بھی پڑھنے والوں کو دیا جاتا ہے!
جماعت پولیس کی زیادتیوں کی روک تھام کے لئے بھی جدوجہد کرتی ہے، محلّہ کے جن لوگوں کو پولیس غلط قسم کے مقدمات میں پھانس لیتی ہے یہ جماعت عدالت میں اُن کے مقدموں کی پیروی بھی کرتی ہے اس جماعت نے بیت المال بھی قائم کر رکھا ہے جہاں سے ضرورت مندوں کو قرض حسنہ بھی دیا جاتا ہے اور ناداروں کی امداد بھی کی جاتی ہے، اس بیت المال کے قائم ہونے کا محلہ والوں کو دینی فائدہ بھی پہونچا ہے کہ سود پر قرض لی

ناکارہ بار بہت کچھ مندا پڑ گیا ہے! اس جماعت نے محلہ کی صفائی کے لئے بھی کوشش کی ہے اور سڑکوں اور نالیوں کو صاف کرا دیا ہے اس مقصد کے لئے جماعت مذکور نے میونسپلٹی کی انتظامیہ کمیٹی میں انتخاب کے ذریعہ محلہ کے معتبر اور معاملہ فہم آدمی بھی بھجوائے ہیں تاکہ اُن کی آواز مؤثر ثابت ہو سکے!

اس جماعت نے امتناع شراب کے لئے میونسپل کمیٹی میں امن پسند ارکان کے ذریعہ ایک منظم جدوجہد شروع کر رکھی ہے جس کے لئے اسے بیں کانفرنسیں بھی کرنی پڑتی ہیں اخبارات میں بیان بھی چھپوانے پڑتے ہیں! اس جماعت کے جلسے بڑی تنظیم، سلیقہ اور اہتمام کے ساتھ ہوتے ہیں! ن جماعت کا لٹریچر بھی ہے جس میں اس قسم کی تمام سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کی نشان دہی کر کے بتایا گیا ہے کہ دین کا "نظام جامع" ان پر حاوی ور محیط ہے، نماز، روزہ اور ذکر و انابت کے ساتھ یہ امور سیاست و معاشرت بھی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہی انجام دئے جاتے ہیں اور ان امور کی غرض و غایت بھی آخرت میں فوز و فلاح کا حصول ہی ہوتی ہے!

محترم وحیدالدین خاں صاحب کے مزاج کو پہلی جماعت سے مناسبت ہے، دوسری جماعت کی سرگرمیوں میں انہیں وہ "سیاسی دنیداری" نظر آتی ہے جو تعلق باللہ اور تعبد کے احساس کو کمزور بنا دیتی ہے! یہ دارالمطالعہ، دفتر، رجسٹر، پریس کانفرنسیں، پبلک اجتماعات میں رضاکاروں کے سینوں پر لگے ہوئے بلّے، یہ شعبہ استقبالیہ ہے، یہ شعبہ اطلاعات ہے، یہ ڈسپنسری ہے، یہ ریلیف کمیٹی ہے، اس قسم کے تمام مظاہر میں فاضل ناقد کو سیاست، دنیا داری اور تعلق باللہ کی کمی دکھائی دیتی ہے اور وہ بڑے خلوص و دل سوزی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ کیا انبیاء کرام نے اس طرز پر کوئی نظام" قائم کیا تھا! وہ اس انداز پر سوچتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بستی کے گلی کوچوں کی صفائی کے لئے کیا کوئی کمیٹی بنائی تھی، وہ پوچھتے ہیں یا بادِ جن مقدس ہستیوں کا تعلق باللہ ضرب المثل ہے انہوں نے اس قسم کے سماجی مسائل سے کس قدر واسطہ رکھا تھا؟؟ —— اس کے جواب میں فاضل ناقد کو مطمئن کرنے کے لئے! —

کوئی سمجھاؤ کہ ہم سمجھائیں کیا!

یہ تو افہام و تفہیم کی غرض سے ایک چھوٹی سی مثال دی گئی ہے جو اپنی جگہ جامع نہیں ہے مگر اس ناقص و مختصر مثال سے ہمارا مفہوم سمجھنے میں بہرحال مدد تو ملتی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی —— جو انسانیت کے لئے "آخری و قطعی معیار" ہے اس میں تعبدی امور کے ساتھ تجارت، اقتصادیات، سیاست، جنگ و صلح، معاہدے، سفارت اور تبلیغی کے مظاہر آداب اور تعلیمات و اصول ملتے ہیں، ایک طرف شراب کے پیپے توڑے جا رہے ہیں، دوسری طرف مجرمین پر حد جاری ہو رہی ہے، حضور بازار میں جا کر غلہ کے ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر دیکھتے ہیں کہ بیچنے والے نے کہیں ایسا تو نہیں کیا کہ اوپر تو سوکھے دانے رکھ چھوڑے ہوں اور ڈھیر کا اندرون نم آلود ہو! حرام و حلال کے احکام کی صرف تلاوت ہی پر کفایت نہیں کی جاتی بلکہ حکومت و ریاست کی قوت سے اس نظام کو عملاً نافذ کیا جاتا ہے! —— کوئی جماعت اس "نظام جامع" کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرتی ہے تو وہ دیندار طبقہ کے تعاون و تائید کی مستحق ہے یا علیحدگی و بیزاری اور طنز و استہزاء کی سزاوار ہے!

جناب وحیدالدین خاں صاحب کا برسوں جماعت سے تعلق رہا ہے کیا انہیں ایسی بہت سی مثالیں نہیں ملیں کہ جماعت کا لٹریچر اور خاص طور سے مولانا مودودی کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ کر لوگ الحاد، تشکیک، اشتراکیت، رفض و بدعت سے کنارہ کش ہو کر دین کی طرف آئے غیر اخلاقی اور غیر ذمہ دارانہ زندگیوں میں اخلاقی انقلاب رونما ہوا ہے، جماعت کا مالیاتی نظام کس قدر دیانت دارانہ ہے، جماعت کے ارکان نے رزق حلال کے ذرائع پر ناجائز آمدنی کے کتنے امکانات اور موقعوں کو قربان کر دیا ہے! حقوق اللہ اور حقوق العباد کا کیا توازن اُن کے یہاں پایا جاتا

ہے احکومت یا کوئی سیاسی پارٹی وابستگان جماعت کو خرید نہیں سکتی، اعلانِ حق کے معاملے میں وہ حکومتوں کے احتساب و دار و گیر کی
ی پروا نہیں کرتے، آزمائش کا وقت جب بھی آیا ہے انہوں نے قید و بند کے مصائب اور دوسری قسم کی پریشانیوں کو برداشت کیا ہے مگر جی
نہیں چھوڑا اور ہمت نہیں ہاری! خاں صاحب موصوف کی اس کتاب کو پڑھ کر وہ نوجوان جو جماعت کے لٹریچر کے واسطہ سے دین سے قریب
ہوئے ہیں اگر دین کے بارے میں حیران و متشکک ہو جائیں اور جو دین کے قریب آ سکتے ۔ وہ رُک جائیں تو اس صورت میں اس کتاب پر دینی نقطہ نگاہ
سے کیا حکم لگایا جائے گا؟ اور اس کتاب سے "منبع خیر" کو فائدہ پہونچے گا یا " رفیع شر کو" !

کتاب کے آغاز میں وحیدالدین خاں صاحب نے لکھا ہے ؛ ـــــ

"اس کتاب کی اشاعت میرے اوپر کتنی سخت ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے
کہ اس کے شائع ہونے کے بعد میں کسی ایسی جگہ چھپ جاؤں جہاں کوئی شخص مجھے نہ دیکھے اور اسی حال میں مر جاؤں"

کاش ضمیر کی اس سخت چٹکی پر اُن کو انتباہ ہوتا اور اس کتاب کی عدم اشاعت پر وہ کسی طرح صبر کر لیتے بلکہ جی کڑا کر کے اپنی اس علمی محنت و کاوش
کو برباد کر دیتے !

محترم خاں صاحب کو دراصل جماعت ہی میں رہ کر کام کرنا تھا، اپنے رفقا میں احسان، اخبات و انابت کی کمی محسوس ہوتی تھی تو ان اس
کمی کو دور کرنے کے لیے حکمت کے ساتھ کوشش کر سکتے تھے ان میں اشراق و تہجد ذکر و تسبیح اور گریہ نیم شبی اور آہ صبحگاہی کا ذوق پیدا کرنے کے لئے
انہیں محنت کرنی تھی، تعلق باللہ کی تخم ریزی یا اس فصل کی نشو و نما کے لئے اتنی زرخیز زمین انہیں اور کہیں مشکل ہی سے مل سکے گی! انہیں یہ بھی
سوچنا چاہتے تھا کہ اخلاق و پاکیزگی کے اس دورِ انحطاط میں جماعتِ اسلامی کی کمزوریوں کے باوجود اس کے وجود اور جد و جہد سے مجموعی طور پر
دین و اخلاق اور شرافت و نیکی کو فائدہ پہونچ رہا ہے یا نقصان ؟

تبلیغی جماعت سے بھی بعض لوگ علیحدہ ہوتے ہیں اُن سے ہماری گفتگو ہوئی ہے، ایک دو حضرات نے ہمیں خط بھی بھیجے مگر ہم نے اس گفتگو
اور خط و کتابت کو " فاران " میں نہیں چھاپا، اس لئے کہ ہمارے نزدیک تبلیغی جماعت کے ذریعہ جس دینی خیر کی اشاعت ہو رہی ہے اس کو کسی نہ کسی
درجہ ہی میں سہی اس نقد و احتساب سے نقصان پہونچ جاتا ۔

محترم وحیدالدین خاں صاحب نے جن " سیاسی دینداروں " سے کٹ کر اُن کی روحانی کمزوریوں پر کئی سو صفحوں کی کتاب لکھی ہے اور اب
وہ جس خالص دینداری کے ماحول میں ہیں اگر وہاں انہیں ذوالنون مصریؒ اور سفیان ثوریؒ مل جائیں تو سیاسی دینداروں کو بھی اس کی خبر کر
دیں ۔

اس کتاب پر تنقید کے سلسلہ میں ایک بات جو دل میں کھٹک رہی ہے اس کا اظہار غالباً نامناسب نہ ہوگا ـــــ وہ یہ کہ حضرت مولانا
سید ابوالحسن علی ندوی کے عربی مجلّہ " البعث الاسلامی " میں وحیدالدین خاں صاحب کی جماعت سے علیحدگی سے قبل اُن کے اردو مضامین کا
ترجمہ پڑھ کر مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوتی تھی کہ جماعت کے اہلِ قلم میں خاں صاحب ہی کی تحریروں کو " تعریب " کے لئے کیوں منتخب فرمایا جاتا ہے
مگر خاں صاحب موصوف کی علیحدگی کے بعد حیرت دور ہوئی کہ ؛ ـــــ

؎ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

دینی جماعتوں اور مذہبی لوگوں میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے، اختلاف سے تو صحابہ کرام جیسے نفوس قدسیہ بھی محفوظ نہ رہ سکے مگر جہاں

لے دین کی بنیادی خیر خواہی اور اُس کے تقاضوں کا تعلق ہے اختلافات کے باوجود دینی لوگوں میں اشتراک و تعاون پایا جانا چاہئے ! مولانا
سید ابوالاعلیٰ مودودی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دورِ حاضر کے ذہن کو مولانا مودودی کا طرزِ
استدلال اور اسلوب نگارش جس قدر متاثر کرتا ہے اس کے نمونے دوسروں کے یہاں کم ہی نظر آتے ہیں اس لئے " البعث الاسلامی " میں مولانا مودودی
کی منتخب تحریریں زیادہ سے زیادہ ترجمہ ہو کر شائع ہونے کی مستحق تھیں ، عرب دنیا اُن کے نام اور کام سے متعارف بھی ہے مگر بالقصد ایسا
نہیں ہو رہا ہے ! کاش ! دین کے ہر محاذ پر ہم سب ایک دوسرے کے شریک اور رفیق بن سکتے ! اور ایسی دیوار بن جاتے جس کی ایک اینٹ دوسری
اینٹ کو تھامے رہتی ہے ! او نچے درجے کے لوگوں میں اس جذبہ کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے !

ادب اور اسلامی قدریں

از :- اسرار احمد خاں سہاوری (ایم ۔ اے ، ایل ، ایل بی) ضخامت ۲۹۲ صفحات (مجلد ، گرد پوش کے ساتھ) قیمت دو روپے پچاس پیسے ، ملنے کا پتہ :- ندوہ سنز ۔ فریئر روڈ ، کراچی

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں اور دوسرا ایڈیشن پچھلے سال ۱۹۶۲ء میں چھپا ہے ! کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں کیا ہوگا ؟
جو لوگ جو اسلام کے نام سے چڑتے ہیں ، یا اسلام کے بارے میں ان کا تصور محدود ہے ، انہیں اس نام (اسلامی ادب) میں اجنبیت محسوس ہوگی بلکہ
وحشت ہوگی ! فاضل ناقد نے ادب ، مقصدیت اور اسلامی ادب کے سوتوں و مظاہر اور اُس کی خصوصیات کو جس بالغ نظری ، جامعیت اور
سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے ، اس پر وہ ادبی دنیا کی جانب سے تحسین و تبریک کے مستحق ہیں ! جو بات کہی ہے وزنی ہے ، جس خیال کو پیش کیا ہے
اُس میں سلجھاؤ اور زبان و ادب کا رچاؤ پایا جاتا ہے !

اس کتاب کے دوسرے حصہ میں بائیس شاعروں کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے ، شاعروں کے مختصر سوانح حالات کے ساتھ اُن کی شاعرانہ
حیثیت سے بھی بحث کی ہے ! خواجہ میر درد سے یہ سلسلہ شروع ہو کر افتخار اعظمی پر ختم ہوتا ہے

" شوکت علی خاں فانی یو ۔ پی کے ضلع بدایوں کے رہنے والے تھے " (ص ۱۲۸) " شہر بدایوں کے رہنے والے تھے " لکھنا تھا ۔ ضلع
سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ بدایوں ضلع کے کسی قصبہ یا گاؤں کے باشندے تھے ! ہاں ! یہ ضرور ہے وہ پیدا ضلع بدایوں کے قصبہ بسولی میں ہوئے
تھے جہاں اُن کے والد پولس سب انسپکٹر تھے ــــــ " حیدر آباد کے ایک اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے زندگی گذاری " ــــــ فانی
بدایونی ماسٹر نہیں ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے ، اور اس ملازمت سے بہت سے بہت پانچ سال سے زیادہ اُن کا تعلق نہیں رہا ــــــ یہ
بات بھی درست نہیں ہے کہ فانی حیدر آباد دکن میں ریاستی تعصب کا شکار ہوگئے ۔

فانی کی ایک غزل کا انتخاب صفحہ ۱۳۰ پر نظر آیا ، اُس میں اُن کا شاید سب سے اچھا شعر انتخاب میں آنے سے رہ گیا ۔

بجھ گئے کوئے یار میں کانٹے   کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

اسی طرح اس زمین میں جگر مراد آبادی کی غزل کا جو انتخاب دیا ہے اُس میں یہ بے مثال شعر چھوٹنا نہیں چاہیے تھا ۔

اُس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا   کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

" اسلامی ادب " پر یہ کتاب شعر و ادب سے شغف رکھنے والوں کو ضرور پڑھنی چاہیے ۔ اس کے مطالعہ سے ادب کے بعض نئے
گوشے نگاہوں کے سامنے آتے ہیں ۔

انوارِ بُردہ شرح قصیدۂ بُردہ

از :- پروفیسر فضل احمد عارف ایم۔اے، ضخامت ۲۵۴ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت، تین روپے، ملنے کا پتہ :- علمی کتاب خانہ ، اُردو بازار ، لاہور

ابوعبداللہ ابوعلی محمد بن سعید جو بوصیری (۶۰۸ھ — ۶۹۴ھ) کے نام ولقب سے اسلامی شعر وادب اور نعت ومنقبت کی دنیا میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں ، انہی کے شہرہ آفاق قصیدہ "بردہ شریف" کی یہ اُردو شرح "انوارِ بُردہ" کے نام سے منظر عام پر آئی ہے ۔ اس کتاب پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے پیش لفظ اور مولانا محمد ناظم ندوی نے دیباچہ لکھا ہے ۔

فاضل شارح ومترجم نے امام بُوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات اور اس نعتیہ قصیدہ کی خصوصیات جس تفصیل وتحقیق کے ساتھ عالمانہ انداز میں بیان کی ہیں، اس نے کتاب کی افادیت اور ادبی عظمت کو چار چاند لگا دئے ہیں ! "شارحین بُردہ" کتاب کے جس باب کا عنوان ہے وہ نورٌ علیٰ نور ہے ! اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مختلف زبانوں میں قصیدہ بردہ کی ایک سو بیاسی شرحیں لکھی گئی ہیں ، یہ دلیل ہے اس قصیدہ کی مقبولیت اور عظمت وسعادت کی !

شرح وترجمہ کا ایک نمونہ :—

حتّٰی اذا لم تدع شأواً لمُستبقٍ   من الدّنوِ ولا مرقاً لمستنم

(حتیٰ — یہاں تک کہ — اذا — جب — لم تدع — آپ نے نہیں چھوڑی (دع یدع سے نفی جحد بلم) شأواً سبقت اور بڑھنے کی حد وہمت (مصدر الشأو ہے بمعنی غایت کہا جاتا ہے فلانٌ بعید الشأو یعنی وہ عالی ہمت ہے) — لمستبقٍ ۔ سبقت لے جانے والے کے لئے (مستبق باب افتعال یعنی استباق سے اسم فاعل ہے) من الدّنوِ — قرب سے (دنی یدنو سے) ولا مرقاً — اور نہ کوئی چڑھنے کا ذریعہ (مرقی بمعنی چڑھنا سے اسم آلہ) لمستنم — بلندی پر چڑھنے والے کے لئے ۔ (مستنم — بمعنی کوہان سنگر کے باب افتعال ! یعنی استنام سے اسم فاعل)

ترجمہ :— آپؐ عروج وارتقا کی اس منزل پر پہونچے ہیں کہ اب آپ نے رفعت وسبقت کے کسی خواہش مند کے لئے قرب وارتقار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہنے دی۔

بمقامیکہ رسیدی نرسید ہیچ کسے[۱] (قدسی)

پروفیسر فضل احمد عارف کی یہ کتاب اُن کے لئے دین ودُنیا میں شہرت وکامیابی اور فوز وفلاح کا ذریعہ ثابت ہوگی ! اُردو دان طبقہ کے لئے تو خاص طور سے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے ! پروفیسر صاحب موصوف نے بڑے خلوص وعقیدت کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے اور ریسرچ اسکالروں کے انداز پر کام کیا ہے۔

موسیقی کی شرعی حیثیت

از :- امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ۔ ترجمہ وتہذیب — سید نصیر شاہ اور رفیع اللہ ایم۔اے ضخامت ۱۳۵ صفحات، قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ :- ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور

یہ کتاب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور ومعروف تصنیف "احیاء علوم الدین" کے ایک باب (وجد وسماع) کا ترجمہ ہے

---

[۱] قدسی کے قصیدہ میں "کسے" نہیں "نہ" ہے !

اس کتاب پر مقدمہ فاضل مترجمین نے لکھا ہے، جس میں موسیقی کی حرمت کے دلائل بیان کرکے اُن کا تجزیہ کیا ہے اور پھر موسیقی کے جواز کے دلائل پیش کئے ہیں، اس کے بعد صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور فقہا کے اقوال سے "سماع" کا جواز اور حلت ثابت کی ہے اور ایک باب "موسیقی کے فوائد" پر ہے! کوئی شک نہیں یہ مقدمہ بڑی کاوش و تحقیق سے لکھا گیا ہے۔

مقدمہ کے بعد اصل کتاب کا ترجمہ ہے پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ موسیقی کی حرمت اور حلت کے قائل کون ہیں؟ پھر موسیقی کی اباحت کے دلائل امام غزالی نے بیان فرمائے ہیں دوسرے باب کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

موسیقی کے اثرات و آداب — فصل اول۔ سننا اور سمجھنا — فصل دوم — وجد، فصل سوم۔ موسیقی کے آداب۔

لائق مترجمین نے "دیباچہ" میں لکھا ہے:—

"ہم آخر میں بھی عرض کئے دیتے ہیں کہ ہم فحاشی کے اس طوفان کے سخت مخالف ہیں جو ریڈیو سے سیل ترنم بن کر بہتا ہے، یا فلمی ریکارڈوں سے موسیقی کے بہروپ میں ابھرتا ہے اور معاشرہ میں اخلاقی کوڑھ کے جراثیم بکھیرتا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اس سے فی نفسہٖ موسیقی حرام نہیں ہو جاتی۔" (ص ۳)

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:—

"پانچ عوارض کی بنا پر راگ حرام ہے، اول یہ کہ گانے والی عورت ہو، جسے دیکھنا حلال نہ ہو، اور اُس کا راگ سننے سے فتنہ کا احتمال ہو..... دوم یہ کہ آلاتِ موسیقی ایسے ہوں جو مے خواروں اور مخنثوں کا شعار ہوں جیسے مزامیر، طبل، کوبہ اور تار کے باجے....... تیسری حرمت یہ ہے کہ گیت میں خرابی ہو، یعنی اگر اشعار میں فحاشی، بے حیائی اور ہجو ہو یا ایسی باتیں ہوں جو اللہ، رسولؐ اور صحابہؓ پر افترا ہوں۔ ... چوتھا عارضۂ حرمت یہ ہے...... کہ سننے والے پر اگر شہوت غالب ہو اور وہ عین بہارِ شباب میں ہو تو اس راگ کو سننا حرام ہے...... پانچواں عارضۂ حرمت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرض کرو ایک شخص ہے نہ اس پر شہوت غالب ہے کہ راگ اُس کے حق میں ممنوع ہو، اس شخص کے حق میں سماع اگرچہ مباح ہے، لیکن اگر ایک گنہگار ہمیشہ کے لئے عادت بنائے گا اور اپنا اکثر وقت اس میں صرف کرے گا تو بھی احمق ہے جس کی گواہی مقبول نہ ہوگی، اس لئے کہ لہو و لعب پر مواظبت گناہ ہے، جس طرح گناہ صغیرہ بار بار کے اعادہ سے کبیرہ ہو جاتا ہے، اس طرح مباح بار بار کے اعادہ سے گناہ ہو جاتا ہے..."

اس کتاب کا اختتام ذیل کی عبارت پر ہوتا ہے:—

"گزشتہ تفاصیل و توضیحات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ موسیقی چار قسم کی ہے حرام، مکروہ، مباح، مستحب! حرام اُن لوگوں کے لئے جن پر شہوت غالب ہو اور موسیقی ان میں حیوانیت کے جذبات ہی مشتعل کرتی ہو، مکروہ اُن لوگوں کے لئے جن کو موسیقی سے لطف ملتا ہو وہ اسے بہ حیثیت فن سنتے ہوں اس کے علاوہ انہیں موسیقی سے کسی قسم کی تحریک نہ ہوتی ہو، مستحب اُن لوگوں کے حق میں جن پر اللہ تعالیٰ کی محبت غالب ہو اور موسیقی ان میں صفات محمودہ کے سوا اور کسی چیز کی تحریک نہ کرے۔"

صحیح بات یہ ہے کہ خوش آوازی پسندیدہ شے ہے، اسلام دین کوئی روک ٹوک نہیں کرتا "لحن داؤدی" اخلاق و ادب کی شہرۂ آفاق ہے، تجوید قرآن جو مستحب ہے، اُس میں خوش آوازی بہ قدر غالب شامل ہے! راستہ کی تکان دور کرنے اور نشاط حاصل کرنے کے لئے "حدی خوانی" صحابہ کے نزدیک پسندیدہ شے سمجھی گئی ہے۔ فوجوں اور لشکروں کو "رجز خوانی" کی بھی اجازت ہے، شادی بیاہ اور ... خوش آوازی اور دف کے ساتھ دف و چنگ پر شعر خوانی مباح ہے! اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے نغمگی اور خوش آوازی پر قدغن نہیں لگاتا! مگر آج کل راگ پر شہوت کا غلبہ ہے اور ایسے باجے اور آلاتِ طرب ایجاد کئے گئے ہیں جو انسان کے ہوس ناک جذبات کو بھڑکاتے ہیں، غزلیں، نظمیں اور فلمی گیت فحاشی اور غیر محتاط رنگینی کے ترجمان ہوتے ہیں، اس لئے موجودہ دور کی موسیقی اپنے لوازم و آلات کے ساتھ دینی نقطۂ نگاہ سے ممنوع اور عورت مطرب و موسیقار ہو تو قطعاً حرام اور گناہ ہے!

ادارۂ ثقافت اسلامیہ اس سے قبل مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی کی کتاب "اسلام اور موسیقی" شائع کر چکا ہے، یہ دوسری کتاب آئی ہے، اس قسم کی کتابیں اُن لوگوں کو دلیر بناتی ہیں جو اُس موسیقی کے رسیا ہیں جسے امام غزالی نے بھی حرام کہا ہے، اباحتیں رخصتیں ہوا و ہوس کے مرض کو اُسی طرح غذا پہونچاتی ہیں، جس طرح مٹھاس ذیابیطس کے مرض کے لئے اضافہ کا سبب بن جاتی ہے۔

لمحاتِ غالب

از:- عارف بٹالوی، ضخامت ۱۰۸ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت تین روپے،
ملنے کا پتہ:- ملک سراج الدین اینڈ سنز، لاہور ۔

اس کتاب میں غالب کی زندگی، شاعری اور فلسفۂ کلام کو خود شاعر کے افکار و اشعار کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، یہ بڑی حسین جدت ہے جس کے سبب اس کتاب کو لوگ شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے، غالب کے خطوط کے انتخاب نے "لمحاتِ غالب" کو اور اہم اور قابلِ مطالعہ بنا دیا، عارف بٹالوی اچھے مولف "Compiler" تو ہیں مگر مشاق و پختہ نثر نگار نہیں ہیں، اُن کی تحریر میں جگہ جگہ خامیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔

"ولی دکنی سے لے کر آج تک کوئی ایسا شاعر اس محفلِ ہستی میں نہ آیا، جس نے شاعری میں عقل کو داخل نہ کیا ہو۔ (ص ۴۹) مضحکہ انگیز فکر و خیال اور ناپختہ اندازِ بیان ——— "وقت اپنے حسن نگاہ کے مطابق دلہنِ ادب کو سنوارتا ہے۔" (ص ۴۱) "عروسِ ادب" لکھنا دلہن اُردو اور ادب فارسی ہے، جن کے درمیان اضافت نہیں آتی ——— "تسلیم کہ زمانہ حال کو خط کشیدہ الفاظ بھلے معلوم نہیں دیتے لیکن کیا بعید ہے کہ ماضی انہیں سینہ سے لگا کر رکھتا ہو" (ص ۵۳) ماشاءاللہ! کیا نثر نگاری ہے ——— "لیکن سہرا موجد کے سر پر رہے گا (ص ۵۵) "پر" زائد ہے ——— "لیکن اگر غور سے مرزا صاحب کی ساری زندگی کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو قطعاً بالکل مبرا نظر آئے گی" (ص ۷۰) انشا پردازی کے ساتھ مذاق!

"آج مرزا غالب کے صرفی بلکہ اولیا ہونے میں لوگ کیا ثبوت بہم پہونچاتے ہیں" (ص ۷۵) "ولی" کی جگہ "اولیا" "کا" کی بجائے "میں" لکھا گیا ہے! پھر غالب کو صرفی کون کہتا ہے اور "ولی" تو انہیں کوئی بھی نہیں سمجھتا ——— "معشوق کو سلسلۂ حجاب ختم کرنے پر مائل کرنا اور ساتھ ہی ایک حسین دھمکی سے مرعوب کرنا، کمالِ فن کی دلیل ہے" (ص ۸۷) یہ بھلا کوئی نثر اور انشا پردازی ہے ——— توبہ!

ع بات کہنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

اس کتاب میں کتابت کی بڑی فاحش غلطیاں نظر آئیں! ———

"عین الملک الیوم" (ص ۱۱) "لمن الملک" ہونا چاہیئے ـــــ "ہم مواحد ہیں" (ص ۱۵) صحیح املا "موحد" ہے ـــــ "مولا افضل حق" (ص ۱۶) غالب کے دوست مولانا فضل حق (خیرآبادی) تھے "افضل حق" نہیں تھے ـــــ "اپنے دعوہ میں یہ دلیل پیش کی" (ص ۳۷) "دعوے" کتابت ہونا چاہیئے تھا۔ ـــــ خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم" (ص ۱۱۴) "بردم" کی جگہ "بردم" چھپ گیا ـــــ "زہے روانی عمرے کہ در نظر گزرد" (ص ۱۲۵) اصل مصرعہ یوں ہے ـــــ

زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

"کوئی مسعدی میرا لوکر نہیں" (ص ۱۲۱) "متصدی" کا اس طرح (مسعدی) حلیہ بگاڑا گیا ہے ـــــ "غنچہ ناشگفتنا برگ عافیت معلو (ص ۱۴۶) "غنچہ ناشگفتن ہا ...." ہونا چاہیئے ـــــ "مثل صائب وحکیم واسیر وحزیں .." (ص ۱۵۹) غالب نے اپنے خطوط "حکیم" کا نہیں مشہور شاعر "کلیم" کا ذکر کیا ہے۔

یہ کتاب غالب کی زندگی کے بارے میں معلومات کے لحاظ سے تو کارآمد کتاب ہے مگر زبان وبیان کا پہلو بہت ہی کمزور ہے۔

زمزمہ از:- صفدر آہ، ضخامت ۱۰۲ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) پاکٹ سائز، کتابت وطباعت دیدہ زیب قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:- ماہنامہ گلشن 40/39 لوسیل بازار، کلیان مہاراشٹر (بھارت)

یہ کتاب جناب صفدر آہ کی رباعیات کا مجموعہ ہے، "پیش لفظ" میں جناب واقف رائے بریلوی لکھتے ہیں:- ـــــ

"ایک مفکر اور مجتہد فن کی حیثیت سے صفدر آہ نے رباعی میں فکر وسیاق دونوں کے بڑے حسین تجربے کئے ہیں۔" (ص ۴)

صفدر آہ کی رباعیوں کے عنوانات حسب ذیل ہیں:-

خدائیں، حیات انسان، شیب، عقل، ماضی، عیش کوشی، گناہ، جنت، موت، تنہائی، انقلابیات، سرمایہ دار، اور مزدور، تعلیم، عاشقانہ، رندانہ، متفرق، عقل کی شکست (تمثیل)

صفدر آہ کی رباعیوں میں فکر، پختہ مشقی اور زور بیان ملتا ہے، وہ سامنے کی بات کو بھی فلسفیانہ انداز میں کہتے ہیں، "تفکر" اُن کے اسلوب بیان "پر غالب ہے" چند منتخب رباعیاں:- ـــــ

ہر چند کہ میں نے غل مچایا میں کون ؟
لیکن نہ کسی نے یہ بتایا میں کون ؟
خود اپنی ہی بازگشت آواز سنی
"میں کون" صدا' جواب آیا " میں کون ؟

یہ ظاہر و باطن ہیں سمجھ لو بحرین		ہر فرق پڑا ہے ان کے مابین
ظاہر مرا کونین کا اک ذرہ ہے		باطن ہیں مرے ذرے کی کمتر کونین

اب بھی ہے بہت طویل راہِ وسواس
اور پائے خرد کو ہے تھکن کا احساس
منزل ہے معارف کی ابھی تک ناپید
ٹوٹے ہوئے حوصلے ہیں اُکھڑے انفاس

آنکھوں میں ہیں اشک اور تعب نامعلوم
توجیہ غم و نالۂ شب نامعلوم
ظاہر معلول اور علّت غائب
اک شور تو سنتے ہیں سبب نامعلوم

کچھ دھاریں نکل رہی ہیں اُلٹی سیدھی
کچھ موجیں مچل رہی ہیں اُلٹی سیدھی
اِس وہم کدے کو خاک سمجھے انساں
پرچھائیاں چل رہی ہیں اُلٹی سیدھی

بیگانۂ منزل وطن آوارا ہے
کاندھے پہ مصیبتوں کا پشتارا ہے
ماضی کے کھنڈر ہیں پیچھے تا حدِّ نظر
اور آگے دھندھلا دھندھلا سا اندھیارا ہے

دوسرا رُخ :- آوارہ کی سرگزشت آوارا ہے — ہر کار مری عمر کا ناکارا ہے
کیا اپنی زندگی بتاؤں ہمدم — بس میں نے تمام عمر جھک مارا ہے (ص ۲۳)

دوسرے مصرعہ میں "ہرکار" وجدان کو بھلا نہیں لگتا! مجموعی طور پر پوری رباعی شاعرانہ لطف سے عاری ہے۔

قانونِ ارتقا ہے ساری اب تک — باقی ہے کرب و بے قراری اب تک
پس پس کر میں نے کتنی شکلیں بدلیں — تحلیل کا یہ عمل ہے جاری اب تک

غالباً "تجدد امثال" کو "تحلیل کا یہ عمل" کہا گیا ہے ـــــ مگر اس میں شکلیں کہاں بدلتی ہیں اور بدلتی ہوں تو اُن کا احساس تک نہیں ہوتا، "پس پس کر" سے واقعہ کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی ؛

گھر میرا، محل میرا بجاتا تھا ڈھول — اندر اندر مگر تھا اس ڈھول کے پول
یاروں سے بگاڑ کر گھروندا میرا — فطرت ہنس کر یہ مجھ سے بولی "اب بول" (ص ۲۸)

کمزور انداز بیان، شعریت کا دور دور پتہ نہیں ۔

جو پیڑ اکھڑ چکا ہے بوتے نہ بنے — سردی گرمی کو پھر سموتے نہ بنے
چپ ہو جاتا ہے رو کے غم کا مارا — جب عیش کا مارا روئے روئے نہ بنے (ص ۳۴)

پیڑ لگائے جاتے ہیں " بوتے " نہیں جاتے ! شروع کے دونوں مصرعوں سے آخر کے دو مصرعوں کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا ! رباعی میں کوئی لطف نہیں!

طاعت کی خوئے زشت تاراج ہوئی — انساں کے سر کا سرکشی تاج ہوئی (ص ۳۷)

" طاعت کی خوئے زشت کا تاراج ہونا " یہ کہاں کی زبان ہے ۔

اللہ ہے کس قدر عجوبہ انسان — گاہے یہ فرشتہ ہے تو گاہے شیطان
اس ایک وجود میں یہ اجماع تضاد — حکمت کی کہیں کہیں حماقت کی کان (ص ۳۹)

انسان کے وجود میں کہیں حکمت کی اور کہیں حماقت کی کان ہوتی ہے —— ! یہ انداز بیان اور خیال خاصہ عجیب ہے !

صد رنگِ بلوغ ذہن لایا ہے مرا — اقلیم حیات جگمگایا ہے مرا (ص ۴۴)

پہلے مصرعہ میں خاصہ تکلف پایا جاتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں " اقلیم " کو مذکر نظم کیا گیا ہے، حالانکہ " اقلیم " مونث ہے ۔

اب حُسن کے پھولوں کی وہ بوباس نہیں ہے — سینے پہ وہ تیز تیز انفاس نہیں
اے رات ! اُجڑ چکی ہے محفل تیری — جلتی ہوں شمع ہوں کوئی پاس نہیں (ص ۴۷)

دوسرے مصرعہ نے رباعی کو کمزور بنا دیا۔

کیا ہے یہ کیا ہوا، نہ کچھ جان سکا — یہ میں ہوں ! کسی طرح نہ دل مان سکا
کل آئینہ دیکھا تو یقیناً ہمدم — میں خود کو بہ مشکل کہیں پہچان سکا (ص ۵۰)

شروع کے دونوں مصرعے کتنے رواں اور شگفتہ ہیں مگر آخر کا مصرعہ ان کے جوڑ کا نہیں ہے ۔

؎ مشکل ہی سے اپنے کو میں پہچان سکا

ہوتا تو پوری رباعی میں ایک ہی " آہنگ " قائم رہتا ۔

اک خشک ہی رستے سے گزر لیتا ہوں — بے کیف سہی شغل تو کر لیتا ہوں
جانے سے جوانی کے جو آیا ہے خلا — میں اُس کو عبادتوں سے بھر لیتا ہوں (ص ۵۱)

" اک " کس بُری طرح کھٹکتا ہے !

ناداں کی جہاں میں ضرورت بہ حق — ہوتا نہ حمق اگر، تو ملتے نہ سبق
ممنون ہے جاہل کا حکیم و دانا — عاقل کا معلم معظم احمق (ص ۵۱)

یہ جو کسی یونانی فلسفی کا مشہور مقولہ ہے —— کہ عقل کس سے سیکھی ہے ! جواب ملا بے عقلوں سے ! اس کو کس قدر غیر شاعرانہ انداز میں نظم کیا ہے۔

یہ نرم ہوا اور سہانی یہ بھور — دریائے جمالِ سحری کا یہ زور
دو چار خوشی کی اور سانسیں لے لے — آ پہونچی قضا لئے اندھیرا گھنگھور (ص ۶۰)

"بھور" پڑھ کر ہی وجدان تلملانے لگا، دوسرے مصرعہ کے تکلف نے طبیعت کو اور بدمزہ کر دیا۔

اک سازِ سکوں ہے، لطف پیمائی ہے — عزلت کی بہار مجھ کو راس آئی ہے
دنیا کی محفلوں میں تنہا تھا میں — تنہائی میں کیا انجمن آرائی ہے (ص ۹۴)

آخر کے دونوں مصرعے جتنے اچھے ہیں، پہلا مصرعہ اتنا ہی بے مزہ ہے!

اس طرح وہ دل ربا دل آرا آیا — کرتا ہوا مٹنے کا اشارہ آیا
ماتھے پہ لگا ہوا ستارہ توبہ! — یہ برجِ شرف میں کون تارا آیا (ص ۹۵)

دوسرا مصرعہ بچکانہ ہے! اس طرح کون بولتا اور محسوس کرتا ہے کہ "محبوب مٹنے کا اشارا کرتا ہوا آیا" ——— رباعی کے آخری دو شعر خوب اور چوتھا مصرعہ خاص طور سے خوب تر ہے!

رباعی کے بجائے میں کتاب کے آخر میں جو ڈرامہ (تمثیل ——— عقل کی شکست) شامل ہے، وہ جناب صفدر آہ کی ایجاد ہے! سازِ اردو کے تاروں کو "زمزمہ" نے چھیڑ کر ایک "لے" کا تو بہرحال اضافہ کیا۔

صفحہ کے آگے

محفل میں پڑھ دیتے، سننے والے لوٹ لوٹ جاتے: غالب کی غزل ———

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟

کو تضمین کیا، مہنگائی اور راشن سسٹم پر اس طرح طنز اور چوٹ کی: ———

کونٹروں پر مہر ہے اب آگ سلگائیں گے کیا!

اُن کی سب سے زیادہ کامیاب نظم "پرانی رضائی" تھی، جس کا یہ شعر یاد رہ گیا ہے: ———

اس کے ایک ایک ٹانکے میں جوں ہے
یہ رضائی مصحفیؔ خوں ہے

اسی مہینہ ایک ادبی نشست میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کے بڑھاپے کو دیکھ کر ماتھا ٹھنکا تھا کہ شبستانِ مزاح و ظرافت کی یہ شمع اب اور زیادہ دنوں تک نہ بھڑک سکے گی، چند دن کے بعد روزنامہ "جنگ" میں اُن کے مرنے کی خبر پڑھی اور دل نے بوڑھے دوست کے بچھڑنے کی چبھن کو محسوس کیا! ظریف مرحوم کا نہ کسی انجمن اور ادبی ادارے سے تعلق تھا۔ اور نہ کسی اخبار اور رسالے سے وابستگی تھی، اس لئے اُن کی موت پہ ادب و صحافت کی دنیا میں خاموشی طاری رہی! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ———

لاکھوں کا پسندیدہ
کے ٹو
سگریٹ
K-2
CIGARETTES
تیار کردہ:-
پریمیئر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ

ماہنامہ **فاران** کراچی

ایڈیٹر:- ماہر القادری

جلد ۱۷ | ماہ مارچ ۱۹۶۵ء | شمارہ ۱۲

ترتیب

مقامِ اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

چندہ سالانہ:- سات روپے | پبلشر:- مسرور حسین | قیمت فی پرچہ:- ۶۲ پیسے

خلاف جس خلوص عداوت اور جوشِ عناد کے ساتھ نفرت و ملامت کا طوفان اٹھایا جا رہا ہے، وہ چاہے کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، مگر خلافِ توقع نہیں ہے۔

جمہور امت کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ کوئی عورت "نبی" نہیں ہوئی مگر کا ممتاز علماء اس اجماع کے خلاف اب بھی قائل ہے ہیں کہ عورت کی شخصیت مادرِ نبوت نہیں ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے سارہؑ، اُمِ موسیٰ اور حضرت مریمؑ سے وحی و نبوت کو منسوب کیا ہے، نبوت تو ہر حیثیت سے امارت و حکومت بلکہ خلافتِ راشدہ سے بھی افضل و مقدس ہے جب عورت سے منصبِ نبوت کی نسبت پر ان بزرگوں کو جن میں علامہ ابن حزم کا نام سب سے نمایاں ہے، عرفِ دین اور دم شریعت نہیں ٹھیرایا گیا، تو اضطراری حالت میں عورت کی امارت پر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو اس انداز میں آخر کیوں مطعون کیا جا رہا ہے جیسے انہوں نے دین کے کسی ستون کو گرا دیا ہے!

یہ ناقدین کرام جو اسلاف کی پیروی پر فخر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ سلف صالحین کے ساتھ ان کا حشر ہو، کیا ان کی نگاہ سے فقہ حنفی کے بعض ائمہ کے اقوال نہیں گزرے! جماعت اسلامی پر طنز و طعن اور نفرت و ملامت کی چاند ماری کرنے سے پہلے اس مسئلہ کی تحقیق کرنی تھی ہدایہ فقہ حنفی کی شاید سب سے زیادہ معتبر اور مقبول کتاب ہے اس میں لکھا ہے:—

ویجوز قضاء المرأۃ فی کل شئی الا فی الحدود والقصاص۔	حدود و قصاص کے سوا ہر معاملے میں عورت کا قاضی بنایا جانا جائز ہے!

جہاں تک منصب کا تعلق ہے امارت اور قضاءت میں کسی نہ کسی حد تک خاصی مشابہت پائی جاتی ہے!

علامہ ابن نجیم جن کے سامنے حدیث نبوی (لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ) بھی تھی وہ فتویٰ دیتے ہیں:—

... واما سلطنتھا فصحیحۃ وقد ولی مصر امرأۃ تسمی شجرۃ الدر جاریۃ الملک الصالح ابن ایوب (بحر الرائق)	اور رہی اُس کی سلطنت تو وہ صحیح ہے اور مصر کی بادشاہ ایک عورت بنائی گئی جس کا نام شجرۃ الدر تھا جو الملک الصالح بن ایوب کی لونڈی تھی۔

ناقدین یہ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب ہدایہ ہوں، یا صاحب کنز الدقائق، علامہ ابن نجیم ہوں یا صاحب فتح القدیر یہ حضرات "نبی" نہیں تھے ہم ان کے اقوال اور ان کے فتووں کو نہیں مانتے! اسی طرح اس لہجہ میں جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا مودودی کی رائے سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ جماعت اور مودودی صاحب کو تحریفِ دین اور ہدمِ دین کا مرتکب قرار دیا جا رہا ہے۔

جماعت اسلامی نے اضطرار کی حالت میں اس موقف کو گوارا کیا ہے ورنہ وہ آج بھی اس کی قائل ہے کہ مرد و زن کے حدودِ عمل اور وظائفِ حیات بالکل ایک جیسے نہیں ہیں، عورت کو شمعِ محفل نہیں چراغِ خانہ ہونا چاہئے مثلاً ہسپتالوں میں نرسوں کا مردوں کی تیمارداری کرنا جب کہ مرد بھی اس ڈیوٹی کو انجام دے سکتے ہیں، ہوائی جہازوں میں ایئر ہوسٹسوں کی میزبانی، کالجوں اور اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط، جماعت اسلامی کی نگاہ میں یہ اخلاقی فتنے ہیں!

پاکستان میں عورت کی صدارت کا مسئلہ عجیب کشمکش اور اضطرار کی صورت میں ابھرا، ایک طرف اقتدار کی بے پناہ خواہش تھی، دوسری طرف محترمہ فاطمہ جناح تھیں، جنہوں نے منصب و عہدہ کی کبھی خواہش نہیں کی، اگر وہ کسی دورِ حکومت میں ذرا اشارہ بھی کر دیتیں تو وزارت و سفارت کے عہدے اُن کے قدموں سے لگے ہوئے تھے، اس موقع پر بھی وہ از خود منصبِ صدارت کی طالب اور امیدوار نہیں ہوئیں، اُن کو متحدہ محاذ کے اکابر (جماعت اسلامی کے نمائندوں کو چھوڑتے ہوئے) نے اس کے لئے رضامند کیا، محترمہ نے انتہائی سادگی اور بے نفسی کے ساتھ فرمایا کہ مجھے کب تک اس ذمہ داری سے چھٹکارا مل جائے گا جواب

میں کہا گیا کہ اگر آپ پاکستان کی صدر منتخب ہو گئیں تو بالغ رائے دہی کی اساس پر عام انتخابات ہوں گے، پھر اسمبلیاں وجود میں آئیں گی، اس کے بعد دستور بنے گا یعنی جمہوریت کی مکمل بحالی کے بعد جس کے لئے تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت درکار ہوگی آپ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گی ـــــ صورت حال یہ تھی کہ محترمہ فاطمہ جناح کسی طاقت یا سیاسی چال کے ذریعہ ملک پر مسلط نہیں ہو رہی تھیں، ناگزیر حالات کے تحت انہیں اس ذمہ داری کے لئے آمادہ کیا گیا تھا!

پاکستان کے ایک ہفت روزہ اخبار میں عرب علماء کے فتاویٰ شائع ہوئے ہیں جنہوں نے عورت کی امارت کو ناجائز قرار دیا ہے! اس قسم کے مسائل میں اصل چیز وہ عبارت ہے جس کی بنیاد پر فتویٰ طلب کیا جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص کسی مفتی سے یہ پوچھے کہ: ـــــ

"فلاں شخص نے ایک نامحرم عورت کو پکڑا اور اسے مکان سے اٹھا کر سڑک پر لے گیا . . ."

تو

وہ مفتی اس سوال کے جواب میں کسی تامل کے بغیر یہی فتویٰ دے گا کہ مرد کا یہ فعل شریعت کی رو سے ناجائز اور حرام ہے! اگر مفتی صاحب سے فتویٰ ان لفظوں میں لیا جائے

"ایک مکان میں آگ لگ رہی تھی ایک مرد نے نامحرم عورت کی جان بچانے کے لئے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور مکان سے باہر نکال لایا . . ."

اس صورت میں مفتی شریعت کی رو سے مرد کے اس "فعل" کو جائز بلکہ مستحسن ٹھہرائے گا اکوئی شک نہیں عرب علماء جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے اس موقف پر حیرت کا اظہار کر رہے ہیں مگر ان حضرات کو صحیح صورتِ حال کا پتا نہیں ہے، جس کسی کو حقیقت حال اور نفسِ واقعہ بتا دیا جاتا ہے تو اس کی سمجھ میں اصل بات آجاتی ہے، اگر عرب ممالک کے ان صاحبانِ علم و افتاء کو فتویٰ طلب کرتے وقت یہ بھی بتا دیا جاتا کہ کن دینی مصلحتوں کے ازالہ کے لئے "اہون البلیتین" کے تحت عورت کی صدارت کی قباحت کو گوارا کیا جا رہا ہے، تو گمانِ غالب ہے کہ وہ اباحت و جواز کا فتویٰ دیتے ـــــ پاکستان کے بعض اکابر علماء نے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کی صدارت کا مسئلہ نہ تحریف دین ہے نہ ہدم دین ہے، ورنہ یہ حضرات اتنی بڑی دینی قباحت اور خرابی پر خاموش نہ رہتے جب کہ ایسا کرنے میں اقتدار کی برہمی کی بجائے، اس کی خوشنودی کی سو فی صدی توقع تھی، پاکستان کے اہل حدیث حضرات کا عام طور پر رجحان عورت کی صدارت کے جواز و اباحت ہی کی جانب رہا ہے۔

مولانا سید مہدی حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ اس مسئلہ میں جماعتِ اسلامی کے موقف کا سب سے زیادہ موید اور تقویت دینے والا سمجھا جاتا تھا مگر اس سلسلہ میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب مدیر "الفرقان" (لکھنؤ) نے مولانا سید مہدی حسن صاحب کو اتنا مدلل خط لکھا کہ ان پر حق واضح ہو گیا اور انہوں نے اپنے دیئے ہوئے فتوے سے رجوع کر لیا، مدیر "الفرقان" کے اس کارنامے کی سب سے زیادہ داد بلکہ مبارکباد مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی طرف سے ملے گی کہ جماعتِ اسلامی کے موقف کو ایک تائیدی فتوے اور فقہی دستاویز سے محروم کر دیا گیا ـــــ ان مفتی صاحب کو یہ حادثہ بھی پیش آچکا ہے کہ دیوبند ہی کے ایک بہت بڑے بزرگ کی تحریر پر انہوں نے ضلالت اور عیسائیت و قادیانیت کا فتویٰ دیا اور پھر دارالعلوم دیوبند ہی کے علماء اور مفتیوں نے اس کی تردید میں دوسرا فتویٰ صادر فرما دیا!

مولانا سید مہدی حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کا یہ فتویٰ جس میں عورت کی امارت کو مباح قرار دیا گیا ہے جماعتِ اسلامی کے موقف کی تائید میں جب نقل کیا گیا تھا تو دیوبند سے متوسل اخبارات میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ جماعتِ اسلامی کے اخباروں اور رسالوں نے مفتی صاحب کے فتوے کو کاٹ چھانٹ کر شائع کیا ہے، اس فتوے میں ایک ایسی "شرط" لگا دی گئی ہے جس سے جماعتِ اسلامی کے موقف کی تائید و تصویب نہیں ہوتی، حالاں کہ "شرط" (کامیابی کی شرط)

اضافی تھی! جب مفتی مہدی حسن صاحب کا فتویٰ جماعت اسلامی کے موقف کی تصویب و تائید ہی نہیں کرتا تھا تو مفتی صاحب کو اپنے فتوے سے رجوع کرنے کی کیا ضرورت تھی، یہ کیسے لوگ ہیں جو سیدھی سچی بات کو تاویلوں کے چکر میں ڈال کر حقیقت حال کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں !

مفتی مہدی حسن صاحب نے اپنے دیے ہوئے فتوے سے رجوع کر لیا اچھا کیا، ہم اُن کی نیت اور دیانت کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ مگر اُن کے فتوے کا جو فقہی موقف تھا، وہی موقف اس مسئلہ میں جماعتِ اسلامی کا تھا، تو جماعت اور مولانا مودودی پر تحریف دین اور انہدام دین کی جو فردِ جرم لگائی گئی ہے، وہ کتنی نامنصفانہ اور ظالمانہ ہے !

پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے جماعتِ اسلامی نے اقامتِ دین کی جدوجہد شروع کر دی تھی، یہاں کا دستور کتاب و سنت کی اساس پر ہونا چاہیے اس کے لئے جماعت نے برسوں پورے جوش اور اخلاص و صداقت کے ساتھ باقاعدہ منظم مہم چلائی ہے، اسلامی ریاست کے کیا خصائص اور وظائف ہیں ! اسلامی دستور کیا ہونا چاہیے ! جماعتِ اسلامی کی کتابوں، رسالوں اور اخباروں میں سینکڑوں صفحوں کا لٹریچر اس موضوع پر موجود ہے ! چودھری محمد علی کے دورِ وزارت عظمیٰ میں برسوں کے انتظار اور جدوجہد کے بعد جب خدا خدا کرکے دستور بنا تو اس میں اسلامی اقدار کی جتنی بھی جھلک پائی جاتی تھی، اُس پر جماعت اسلامی کی دستور سازی کی جدوجہد اور اس کے دینی افکار بہت کچھ اثر انداز ہوئے تھے، اس دستور کی ایک دفعہ یہ تھی کہ پاکستان کا صدر مملکت "مرد" ہوگا، مگر فوجی انقلاب کے بعد مرکزِ اقتدار کی سرپرستی میں پاکستان کا جو دستور مرتب ہوا تو اُس میں صدرِ مملکت کے لئے "مرد" ہونے کی شرط کو حذف کر دیا گیا۔ جماعتِ اسلامی آج بھی یہی عقیدہ رکھتی ہے کہ حکومت کا سربراہ "مرد" ہی کو ہونا چاہیے، مگر جو اربابِ حل و عقد حکومت کی سربراہی اور صدارت و امارت کے لئے مرد و عورت میں کوئی فرق و امتیاز ہی نہیں کرتے اور اس اہم ترین ذمہ داری میں مرد و زن کی مساوات کے قائل ہیں —— دراصل نقد و احتساب کے سزاوار یہ حضرات تھے مگر ہمارے ان حامیانِ دینِ مبین اور فقیہانِ شرعِ متین نے ان بڑے آدمیوں سے تو صرفِ نظر کر رکھی ہے اور جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر طنز و طعن اور ملامت و عیب جوئی کے ہتھیاروں سے

یہ مخالفت !!؟

عورت کی صدارت و امارت کے مسئلہ میں تمام ناقدین ایک ہی ذہنیت کے نہیں ہیں، بعض مفکرین اور اہلِ قلم نے سنجیدہ لہجہ میں بھی جماعت اسلامی کے موقف سے اختلاف کیا ہے، مگر یہ بات بھی دیکھنے میں آرہی ہے بلکہ یوں کہئے نئے سرے سے اس کا تجربہ ہوا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات سے جس کو جتنی کد ہے، اُسی اعتبار سے خامہ تنقید نے برہمی کا اظہار کیا ہے، ہندوستان کے بعض اہلِ قلم اور صاحبانِ فکر و نظر اس مسئلہ میں پاکستان کے علماء اور قلم کاروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لے رہے ہیں، حالانکہ اُن کے اپنے مسائل ہی اتنے نازک، شدید الجھے ہوئے اور پریشان کن ہیں کہ انہی میں اپنی توانائی صرف کرتے تو اُن کے لئے بہتر ہوتا، مسئلہ زیرِ بحث میں اصل چیز "اضطرار" اور پاکستان کے حالات کی کشمکش انگیز نوعیت ہے، جس کا اندازہ پاکستان کے لوگ ہی اچھی طرح کر سکتے ہیں، جن سے وہ دوچار ہیں۔ ہندوستان کے دانشوروں میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدقِ جدید اور پاکستان میں حضرت مولانا امین احسن اصلاحی اس مسئلہ میں سب سے زیادہ شدید و سخت گیر نظر آتے ہیں، ان دونوں بزرگوں کے مزاج و ذہن میں اس اعتبار سے ایک طرح کا اشتراک اور ہم رنگی بھی پائی جاتی ہے کہ جمال ناصر جیسے مستبد آمر کی انہوں نے تعریف و توصیف کی ہے، اُس جمال ناصر کی جس کے جور و ستم کی شدت اور تنوع کے آگے حجاج کے ظالمانہ کارنامے گرد ہو کر رہ گئے ہیں! مولانا عبدالماجد دریابادی نے جب جمال ناصر کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا اور اخوان المسلمون پر زبانِ طعن دراز کی تھی تو مولانا سید ابوالحسن ندوی نے لکھا تھا کہ کاش! مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے لکھے ہوئے لفظوں کو میں اپنے خونِ دل سے مٹا سکتا —— اب رہے مولانا امین اصلاحی تو اُن کی اس قسم کی تحریروں کو مٹانے کے لئے بہت سے دلوں کا لہو درکار ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا مزاج یہ ہے کہ جس کی طرف سے اُن کے دل میں گرہ پڑ جاتی اور کد ہو جاتی ہے پھر وہ کسی عنوان کم ہی نہیں ہوتی وہ شدید سے شدید تر ہوتی چلی جاتی ہے اور جس سے طبیعت کو لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے اس کی محبت میں وہ کھلے ہوئے حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، ایک زمانہ وہ بھی گزرا

ہے جب وہ مولانا مودودی کے مداح تھے اور انہیں متکلم اسلام کے خطاب سے نوازا تھا۔ اس کے بعد غالباً سنہ ۱۹۴۰ء سے صاحب موصوف مولانا مودودی سے جو خفا ہوئے ہیں تو آج تک ردٹھے ہوئے ہیں اور برہم و خفا ہیں۔ اُن کی تحریروں کے اقتباسات جن میں مودودی صاحب پر اس مدت میں طنز فرمائی گئی ہے اگر جمع کئے جائیں تو ایک چھوٹی موٹی کتاب بن سکتی ہے! "صدقِ جدید" میں مولانا دریابادی نے مولانا مودودی کی بعض تقریروں اور تحریروں کے ایسے اقتباسات اپنے پرچے میں نمایاں کرکے درج کئے ہیں جو مارشل لا کے زمانے میں مولانا مودودی کو خاصی پریشانی بلکہ مصیبت میں ڈال سکتے تھے!

کسی شخص کو مطعون کرنے کا سب سے زیادہ ہوشیارانہ انداز یہ ہے کہ پہلے اُس کی تعریف کی جائے، تم اتنے بڑے آدمی ہو، تمہاری یہ یہ خدمات و صفات ہیں، پھر اُسی تعریف و توصیف کی نسبت سے اُس کی مذمت کی جائے یعنی انگریزی زبان و اصطلاح میں اسے "condemn" کیا جائے کہ تم نے کیا کیا؟ تم سے ایسا برا فعل سرزد ہوا؟ تم نے اپنی شخصیت اور مسلک کو بٹہ لگالیا، تم سے اس گراوٹ اور بے دانشی کی اُمید نہ تھی ...... عورت کی صدارت کے مسئلہ میں مولانا مودودی کی تحقیر و تضحیک کے لئے مولانا دریابادی نے ٹھیک یہی ٹیک نک اختیار فرمائی ہے، تنقید کا انداز یہ ہے کہ مودودی صاحب کا دینی فہم، اور عزیمت و استقامت میں کوئی جواب ہی نہ تھا عورت کی امارت کو مباح قرار دے کر انہوں نے ایسا شدید و خوفناک گناہ کیا ہے کہ اب ان کی کوئی خوبی اور صفت قابل اعتبار نہیں رہی، اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ابوالاعلیٰ مودودی "مرحوم" ہوچکے، اسلام کی اس لغزش کے سبب ایک ایسا سانحہ بلکہ المیہ وقوع میں آیا ہے کہ اسلامی تاریخ میں شاید اس کی مثال ہی نہیں مل سکتی! مولانا دریابادی نے اپنے جریدہ "صدقِ جدید" میں کئی بار اس موضوع پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اُس کی سمیت اور شدت کا خلاصہ اور ماحصل ہم نے اپنے لفظوں میں ظاہر کردیا ہے۔

دوسری طرف قادیانی فرقہ سے مولانا عبدالماجد دریابادی کو جو دلی ربط پیدا ہوا ہے تو اس معاملہ میں اُن کی ضد کا یہ عالم ہے کہ اپنے پیر و مرشد کی سنتے ہیں نہ جمہور علماء کی بات مانتے ہیں، قادیانیوں کی مدح و توصیف کے وہ حیلے ڈھونڈتے اور موقعے نکالتے رہتے ہیں، اُن کی عبارتوں کو یکجا کیا جائے تو قادیانیوں کی مدح و ثنا میں ایک پوری کتاب مرتب ہوسکتی ہے، تمام عالم اسلام اس فرقہ ضالہ کے کفر و ارتداد پر متفق اور یک زبان ہے مگر مولانا دریابادی کا فلسفہ اور علم کلام اس میں صرف ہو رہا ہے کہ یہ کفر و ارتداد گھٹ کر اور سمٹ سمٹا کر کیسے بھی معتزلہ کی "فکری گمراہی" کی برابر ہو جائے ــــ مسٹر غلام محمد پاکستان کے بدنام گورنر جنرل رہے ہیں، مذہبی عقائد کے اعتبار سے کہاں "دیوہ شریف" اور کہاں "دیوبند"! مگر مولانا عبدالماجد دریابادی کے دل میں اُن کے لئے بھی گنجائش رہی ہے، اور یہ ربط قلم سے بھی "صدقِ جدید" کے صفحات پر ظاہر ہوا ہے۔

پاکستان میں مولانا امین احسن اصلاحی نے عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جو روش اختیار فرمائی ہے، وہ اُن کے مخلص نیازمندوں اور اہل عقیدت کے لئے سخت حیرت انگیز اور شدید اذیت کوش ہے! مولانا موصوف نے ایک خاص طبیعت پائی ہے ذرا سی بات پر بہت جلد اور بہت زیادہ مشتعل و غضب ناک ہو جانا اُن کا مزاج ہے اور اس عالم میں کسی کی مدح ہو یا ذم جس طرف بھی قلم چل پڑے، بس اُس کا حق ادا کر دیتے ہیں! غضب و اشتعال کی بجائے اعتدال کی حالت ہو تو مولانا اصلاحی صاحب کے زبان و قلم سے علم و حکمت کے لعل و گہر کی تراوش ہوتی ہے! جماعت اسلامی سے وہ علیحدہ ہوئے تو جھنجلاہٹ کے عالم میں اسے "گمراہ" ٹھیرایا، حالانکہ جماعت نہ تو کسی دینی عقیدہ کے اعتبار سے گمراہ ہوگئی تھی اور نہ عمل کے لحاظ سے اُس کی کسی حرکت پر "گمراہی" کا حکم لگایا جاسکتا تھا۔ اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینے یا نہ لینے سے گمراہی منسوب نہیں کی جاسکتی اور جماعت کی کسی کمیٹی یا رکن کے خلاف کسی قسم کا انتظامی ایکشن لینا بھی "ضلالت" نہیں ہے، مولانا موصوف نے جماعت سے علیحدہ ہو جانے کے بعد مولانا مودودی کے ساتھ پہلی زیادتی اور ناانصافی یہ کی کہ اُن کے بارے یہ ارشاد فرمایا۔ ـــــ

لافرق بین المودودی و پرویز (مودودی اور پرویز کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے)

پھر مارشل لا کے زمانے میں جماعت اسلامی کے ارکان و وابستگان کو "چوہوں" سے تشبیہ دی، اس کے بعد سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی مولانا اصلاحی صاحب کی جو نگاہِ کرم اور توجہ خاص (؟) رہی ہے اُس کی جھلکیاں "میثاق" میں دیکھی جا سکتی ہیں!

عورت کی صدارت کے مسئلہ میں انہیں اختلاف کرنے کا حق حاصل تھا، مگر انہوں نے جو شدت اختیار فرمائی ہے اُسے بھی کسی طرح گوارا کر لیا جائے لیکن تازہ ترین میثاق میں مولانا اصلاحی صاحب نے صدارتی انتخاب کی کامیابی پر جس والہانہ انداز میں مبارکباد دی ہے، اس الیکشن کو جس جوش مسرت کے ساتھ منصفانہ اور عادلانہ بتایا ہے اور پاکستان کے ارباب اقتدار کی جس طرز پر مدافعت اور قصیدہ خوانی کی ہے اُس نے اُن کے بارے میں عجیب سوالات ذہنوں میں ابھار دئے ہیں کہ مولانا کے اندر اس قسم کا انقلاب کیسے پیدا ہوا، اُن کے قلم سے اس قدر خوشامدانہ جملے کیسے نکلے، اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے، ہم جیسے اُن کے نیازمند یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مولانا اصلاحی صاحب ضد، جھنجلاہٹ اور خاص طور سے جماعت اسلامی کی دشمنی میں اس سطح تک بھی آ سکتے ہیں۔ اُن کا یہ مضمون پڑھنے کے بعد راقم الحروف نے انہیں خط لکھا کہ فروعی اختلافات کے ہوتے ہوئے آپ کی ذات سے جو شدید حسنِ ظن تھا آپ کی تازہ تحریر پڑھ کر اُس حسنِ ظن کا جنازہ لئے بیٹھا ہوں!

مولانا اصلاحی صاحب نے عورت کی صدارت کے مسئلہ پر جو مضامین لکھے تھے اور ان میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو جس سختی کے ساتھ ہدفِ ملامت بنایا تھا، وہ مضامین حکومت نے لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر مفت تقسیم کئے، یہاں تک کہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ انہیں برسایا اور پھیلایا گیا — مولانا صاحب موصوف کا بھولپن تو دیکھئے اس "سرکاری نشر و اشاعت" پر وہ فخر و ناز کے ساتھ اپنے قلم سے یہ لکھتے ہیں کہ اتنی داد تو مجھے آج تک کسی مضمون پر نہیں ملی!! بیشک نہیں ملی، ملتی کیسے حکومت نے پہلی بار آپ کے مضامین کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے، اس چیز کو آپ پبلک کی داد اور مقبولیت عوام سمجھ رہے ہیں آپ کی اس سادگی کو آخر کیا نام دیا جائے! مولانا اصلاحی صاحب عورت کی صدارت و امارت اور حاکمیت کو ناجائز سمجھتے ہیں اور پاکستان کے ارباب اقتدار نے دستورِ پاکستان میں "مرد" کی شرط کو حذف کر دیا ہے، مولانا اصلاحی صاحب کو اُن کے مضامین پر "داد" انہی بڑے لوگوں نے دی ہے، جو اس مسئلہ میں مولانا موصوف کے مخالف ہیں، اور بالکل دوسرا نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں! حکومت کو مولانا موصوف کے مضامین سے جو کام لینا تھا، وہ لے لیا گیا، اس "داد" پر حیرت ہے کہ مولانا شرمانے کی بجائے خوش ہو رہے ہیں اور فخر و ناز فرما رہے ہیں! مولانا نے یہ مضامین لکھ کر دراصل ناانصافی، دھاندلی اور جبر و نیادتی کے ہاتھ میں خوشنودی، کارکردگی اور نیک چلنی کا صداقت نامہ (سارٹیفکٹ) تھما دیا ہے! مولانا موصوف نے اپنی ان تحریروں میں داد و بیداد، صبر و جبر اور ظلم و مظلومیت کے معنی ہی سرے سے بدل دئے ہیں! اس کا خیال تک کبھی کسی کے ذہن میں نہ آ سکتا تھا کہ مولانا اصلاحی صاحب کو یہ فن بھی آتا ہے!

جہاں تک عورت کی حاکمیت اور صدارت کے مسئلہ کا تعلق ہے، جماعتِ اسلامی اور جمہور علماء کا موقف مجموعی طور پر مختلف نہیں ہے، جماعت اسلامی اصولی حیثیت سے آج بھی حاکمیت و امارت کے لئے "مرد" ہی کو موزوں اور اہل سمجھتی ہے "عورتوں کے اقتدار و اختیار اور حاکمیت میں بے شک 'فلاح' نہیں ہے" جماعت نے اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ غیر معمولی حالات میں محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت کی جو حمایت کی گئی تھی وہ آئندہ کے لئے "نظیر" نہیں بن سکتی! بس اختلاف اس بات میں ہے کہ کیا غیر معمولی حالات میں بہ طور اضطرار "اہون البلیتین" کے تحت بھی عورت کی امارت گوارا نہیں کی جا سکتی!! ——— اور یہ بھی کہ پاکستان میں اس طرح کا اضطرار پایا جاتا تھا یا نہیں!

جہدِ مسلسل جماعتِ اسلامی کے سامنے "اقامتِ دین" کی منزل ہے، اس میں کامیابی کے لئے مختلف ذرائع اور مرحلے پیش آ سکتے ہیں، کسی سے وصل، کسی سے فصل! انتخابات میں حصہ بھی لیا جا سکتا ہے اور اُن کا بائیکاٹ بھی ہو سکتا ہے، جماعتِ اسلامی پر لوگ پہلے الزام لگاتے تھے کہ یہ جماعت دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتی، اب کے اس نے سیاسی پارٹیوں سے اتحاد کر کے بھی دکھا دیا، ان پارٹیوں کے اکابر کو اس کا احساس ضرور ہوگا کہ جماعت کس قدر اصول کی پابند ہے اور اس کے نمائندے اور کارکن کتنے فرض شناس، دیانت دار اور معاملہ فہم ہیں! جماعت اسلامی کی کسی پالیسی یا

شخصیت سے دشمنی نہیں ہے، اُس کے اتحاد و اختلاف کی بنیاد دین و اخلاق کی خیر خواہی پر ہے، جہاں نیکی، انسانیت، دین و اخلاق اور فلاح عوام کے امکانات اور گنجائشیں ہوں گی، وہاں جماعت کا تعاون و ہمدردی کا معیہ ہوگا، جس جگہ خود غرضی، نفس پرستی، اخلاق شکنی اور دین کے اصولوں سے تصادم ہوگا، وہاں جماعت سے کسی کو بھی تعاون و تائید کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے!

جماعتِ اسلامی کی لغت میں "مایوسی" جیسا کوئی لفظ سرے سے ہے ہی نہیں، جماعت کا اُس ذات پاک پر ایمان ہے جو حی و قیوم ہے، جس کی قدرت لازوال ہے' اس ایمان و یقین کے بعد "مایوسی" کا خطرہ بھی قلب مومن میں نہ آنا چاہیئے! یہ دنیا دار العمل اور مزرعۂ آخرت ہے' یہاں کے حالات بدلنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ انسان اس کا مکلف ہے، تغیر و انقلاب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' ایک ذرہ بھی اُس کی مشیت و قدرت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا! ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نماز پڑھتے میں نمازیوں پر مسجد کی چھت گر جانے سے بہت سے مسلمان دب کر مر گئے ہیں، مگر مسجد کے قریب ہی جو شراب خانہ واقع ہے اُسے کوئی گزند نہیں پہونچی، اللہ تعالیٰ کا قانونِ مشیت و تکوین ہماری تمناؤں کا پابند نہیں ہے، اسی دنیا میں انبیاء کرام تک قتل ہوئے ہیں اور ان کے قتل کرنے والوں پر آسمان سے فوراً بجلی نہیں گر پڑی، نبیوں اور رسولوں کے بعد حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ — محبوب خدا کے نزدیک اور کون ہو سکتا ہے، مگر......

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاش جگر گوشۂ بتولؓ

اصل چیز اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خلوص و صداقت کے ساتھ امکانی جد و جہد کرنا اور مرتے دم تک اسی کام میں لگے رہنا ہے یہاں تک کہ اسی راہ میں موت آجائے! قیامت کے دن ہم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنے ماحول کو کیوں نہیں بدل دیا تھا، پرسش اس کی ہوگی کہ تم نے حالات کو بدلنے کے لئے کیا کیا؟ بندۂ مومن کی زندگی اسی سوال کا مجسم جواب بن جانی چاہیئے! حق کی راہ پھولوں کی سیج نہیں ہے' یہاں قدم قدم پر مشکلوں اور مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے' مصائب کی اسی آگ میں تپ کر زندگی کندن بنتی ہے' انسانی کوششوں کے جب خلافِ توقع نتائج سامنے آتے ہیں تو طبعاً آدمی کو رنج ہوتا ہے اور دل ٹوٹتا ہے مگر دل کی یہی جراحت و شکستگی تو انسان کی متاع ہے کہ ٹوٹے ہوئے دل ہی تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور محبت کے آشیانے ہوتے ہیں' اللہ تعالیٰ کی راہ کی مظلومیت بھی بڑی پیاری چیز ہے! یہاں چوٹیں کھانے اور زخم سہنے میں بھی مزہ آتا ہے!

جماعتِ اسلامی جس کا مقصود "اقامت دین" ہے اس کی سرگرمی کسی الیکشن یا اسی قسم کے کسی خاص پروگرام کی پابند نہیں ہے! جماعت کے سامنے تو ہر وقت کام ہی کام ہے' اگر پاکستان ہی نہیں ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو بھی جماعت کا کام ختم نہیں ہو سکتا اور اُس کے کارکنوں کو فرصت میسر نہیں آسکتی! یہ قافلہ تو ہمیشہ جادہ پیما ہی رہے گا، اس فضا میں تو سدا بانگ جرس ہی گونجتی رہے گی! کامیابی ہو یا ناکامی فضا سازگار ہو یا ناسازگار لوگ ساتھ دیں یا نہ دیں، دنیا والوں سے داد ملے یا ملامت، پھول برسیں یا انگارے، خوشی کی دھوپ ہو یا اندوہ و مصائب کا دھندلکا ہر حال میں کام کرتے رہنا ہے! یہاں تک کہ "اولٰئک ھم المفلحون" کی بشارت کے مصداق بن جائیں! (آمین)

ماہر القادری
یوم الجمعہ ۔ ۱۹ فروری ۶۵ء

مرزا منور علی بیگ امّن
گیسو دراز پاکستانی

تصاویر
فوٹو کی شرعی حیثیت

تمہید :

دین اسلام میں علم و عمل کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے ذاتی رجحانات کو ثانوی حیثیت دے دے یعنی خدائے تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو اپنی زندگی کا اولین عمل ٹھیرائے اور اس عمل اولیٰ کے مقابلے میں اپنے ذاتی رجحانات کو کتاب و سنت کے تابع کر دے ایسا نہ کرنے والوں پر اعتراض کیا گیا کہ :-

بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا والاخرۃ خیر وابقیٰ　　　آپ لوگ توحیات دنیا کو ترجیح دیتے ہیں حالانکہ آخرت (مسلمان کے لئے) بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔

اس لئے غور و فکر کا انداز، دنیا کے آرام و راحت حاصل کرنے کی بجائے آخرت کے لئے مصائب کو جھیلنے کے رجحان کو ترجیح دینے والا ہونا چاہیئے اگر یہ بات نہ ہو تو عالم کا عمل اور مضمون نگار کا مضمون اُسے خدائے تعالیٰ کے عذاب جہنم کے حوالے کر دیتا ہے اس خیال کی تصدیق میں قرآن مجید کی ایک آیت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

واما من طغیٰ واثر الحیوۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماوٰی۔　　　جس نے سرکشی کی اور حیات دنیا کو ترجیح دی تو (اُس کا اس سبب سے) دوزخ ٹھکانہ ہوگا۔

اس مضمون کو اسی نصب العین کے ساتھ پڑھئے کہ آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے ـــــ حق کو بلند کرنے کے لئے اس کے خلاف حاصل ہونے والے ہر آرام اور ہر مسرت کو ٹھکرا دیں گے۔

علم ہدایت اور علم ضلالت کی پہچان :ـــــ

(۱) ... وان کثیرا لیضلون باھواءھم بغیر علم (انعام ۱۱۹)　　　کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے اُن خواہشات و خیالات کے سبب جن کی تائید علم (وحی) نہیں کرتا گمراہ ہو جاتے ہیں۔

(۲) ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا نصیر (بقرہ ۱۲۰)　　　اے نبیؐ! اگر آپ نے ان انسانوں کے خیالات کی پیروی کی درآنحالیکہ آپ کے پاس (اللہ کے پاس سے) علم آچکا تو خدائے تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لئے نہ آپ کا ولی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔

(۳) فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا ۔ (نساء ۱۳۵) ○ اپنے ذاتی خیالات کی پیروی نہ کرو اگر تم کو عدل پر قائم رہنا ہو ۔

حسب بالا پہلی دو آیات میں علم (وحی) اور ھویٰ کی نشاندہی کی گئی جن میں یہ بتایا گیا کہ خدا تعالیٰ کی جانب سے نبیؐ کے پاس جو کچھ بھیجا گیا ۔ وہی علم ہے "جاءک من العلم" کے یہی معنیٰ ہیں ۔ اور اس کے علاوہ انسان کے پاس خیالات کا جتنا ذخیرہ ہے وہ سب کا سب ھویٰ کہلاتا ہے (خواہ اُس کو انسان اپنے طور پر علم ہی کے نام سے یاد کرلے) ذرا الفاظ بدل کر تشریح میں سہولت کی خاطر علم نبوت کو "علم ہدایت" ـــــ اور ھویٰ یعنی ان اُن خیالات کو جن کا ماخذ علم نبوت نہیں ہوتا "علم ضلالت" کے نام سے یاد کیا جائے گا ۔

علم ضلالت یعنی ھویٰ پر عمل کرنے والوں کو خدائے تعالیٰ نے ذیل کے تحت الفاظ میں تنبیہ دی ہے ۔

ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب (ص ۲۶) جو لوگ اللہ کے راستے سے گمراہ کرنے والے ہیں انہیں سخت ترین عذاب دیا جائے گا اس لئے کہ یہ لوگ یوم حساب کو بھول گئے ہیں ۔

خدائے تعالیٰ کے عذاب دینے کی یہ دھمکی ایک مومن کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ عمل کرنے سے پہلے ، علم ہدایت جس کی تشریح اوپر ہو چکی ہے اور علم ضلالت جسے قرآن مجید "ھویٰ" کے نام سے یاد کرتا ہے دونوں میں تمیز اور دونوں میں شناخت کرے تاکہ حق کا قدم گمراہی پر نہ پڑے بلکہ ہدایت پر چلتا رہے ۔

فقہا کے علمی اجتہادات میں ہمیشہ خطا یا صواب کا امکان موجود رہتا ہے پھر بھی مجتہد کو خطا کے باوجود ایک درجہ ثواب دیا جاتا ہے تاہم اُن پر یہ بھی فریضہ عائد ہے کہ خطا کے ثبوت کے فراہم ہوتے ہی اُس سے رجوع کرلے یعنی اپنی اجتہادی خطا ترک کرکے ، دوسرے کے پیش کردہ صواب کو تسلیم کرلے ۔ چنانچہ ائمہ فقہاء کی زندگی میں اس کا ثبوت موجود ہے وینز انہوں نے عامۃ المسلمین کو مشورہ بھی یہی دیا ہے کہ اگر ان کی رائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم کے کسی فرمان سے ٹکراتی ہو تو ان کی اس رائے کو ٹھکرا دیا جائے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم کے فرمان پر عمل اختیار کرلیا جائے ۔ فقہاء کے اس مشورے کی بنیاد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اجتہادی خطا کا ، اس کے خطا ہونے کے ثبوت کی فراہمی کے بعد ـــــ علم ضلالت پر مبنی ہونا ثابت ہو جاتا ہے اس لئے اس کو ترک کردینا لازمی ہے ۔

اور اُس کے مقابل میں جو صواب پیش کیا جاتا ہے اُس کو قبول کرنا لازمی ہو جاتا ہے ۔

اسی نقطۂ نظر کے ساتھ اس سے پہلے راقم الحروف نے مولانا ابوالکلام آزاد کے جواز تصاویر کے رجحان پر اختلافی تبصرہ کیا جسے ماہنامہ "امام" کراچی نے جولائی ۱۹۶۳ء میں شائع کیا ۔ اب مولوی رفیع اللہ خاں صاحب صدر شعبہ عربی گورنمنٹ کالج گوجرخاں کے مضمون "فوٹو کی شرعی حیثیت" پر بھی تبصرہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے چنانچہ اُسے تصاویر ۲ کے زیر عنوان ضروری تمہید کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے ـــــ فاصلحوا بین اخویکم کی تعمیل میں ایسا کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے ۔

<u>فوٹو کے جواز کے لئے "لیس لہ ظل" (یعنی بے سایہ پن) شرعی علت نہیں ۔</u>

اس ذیل کے سوال کا جواب کیا دیا جائے گا ؟

مولوی رفیع اللہ خاں صاحب کا خیال ، ماہنامہ "فکر و نظر" اپریل ۱۹۶۴ء کے صفحہ ۵۸ پر حسب ذیل الفاظ میں نظر سے گزرا ۔ ۔ ۔ ۔

چونکہ فوٹو کا بھی کوئی سایہ وغیرہ نہیں ہے اس لئے وہ بھی اکثر ائمہ کے نزدیک جائز ہے۔"

راقم الحروف کا اعتراض یہ ہو کہ اگر یہی بات صحیح ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسے بلاسایہ فوٹو کا وجود در واقع دور نبوت ہی سے کیوں مفقود ہے؟ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر ایسے جواز کی شکل میں مسلمان کے گھر میں موجود ہونی چاہیے تھی؟!!

مذکورہ ماہنامے ہی کے صفحہ پر ہے" احادیث اور فقہ سے جن تصاویر کی حرمت کا پتہ چلتا ہے، وہ مجسم یعنی جسم والی تصاویر ہیں مثلاً بت وغیرہ دوسری تصاویر جن کا سایہ نہ ہو تو اکثر ائمہ کے نزدیک یہ جائز ہے۔"

——— آں صدر شعبہ عربی کا یہ خیال حدیث کے خلاف ہے۔ اول تو یہ کہ خود موصوف مذکور نے جن احادیث کو پیش کیا ہے، اُن میں جن علتوں کا ذکر ہے وہ " الا رقما فی ثوب" اور" مرط مرحل من شعر اسود" ہیں، لیکن ان میں بھی علت، سایہ دار تصویر یا غیر سایہ دار تصویر میں بیان کی گئی۔

دیگر جن فقہاء کے حوالے سے حسب بالا خلاف حدیث خیال پیش کیا گیا، انہوں نے " لہ ظل" اور" لیس لہ ظل" کی جو بحث اٹھائی ہے اس کی بنیاد، وہ علم ہدایت نہیں ہے جس کے ذریعہ قرآن مجید نے ——— " الحق من ربک" اور" الذی جاءک من العلم" کہہ کر حق و باطل کی حدبندی کر دی ہے۔

بلکہ ان فقہاء کی اِس قائم کردہ علت کا دار و مدار کل کا کل، وہ، ھویٰ اور ظن (اجتنبوا کثیرا من الظن) ہے جس کے متعلق راقم الحروف نے اوپر یہ ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ اس ھویٰ یا ظن کا ماخذ علم نبوت نہیں ہوتا۔

اب رہا ان فقہاء کے ان آراء کو صرف اجتہادات ہونے کے سبب دین میں کوئی اہم رتبہ عطا کر دینا تو ایسا کرنا صریحاً قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ قرآن و سنت تو صرف اُس مقام پر اجتہادات کو اہمیت دیتے ہیں جہاں صریحاً قرآن و سنت میں کوئی حکم موجود نہ ملتا ہو۔

جب احادیث میں صریحاً " الا رقما فی ثوب" اور" مرط مرحل" کے الفاظ میں علت پیش کر دی گئی ہے تو ——— انما ینھیٰ عما کان لہ ظل ولاباس بالصور التی لیس لہ ظل ——— کی علتیں یا شرطیں حدیث کے کس اشارے سے اخذ کر لی گئیں ہیں؟

لگے ہاتھوں قرآن مجید کی آیت ذیل؟

ویعملون لہ ما یشاء من محاریب وتماثیل — اور جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جیسا بھی وہ چاہتے تھے محاریب و تماثیل بناتے تھے۔

جس کو محترمی رفیع اللہ صاحب نے بھی خود پیش کیا ہے، کی بیان کردہ علت " تماثیل" کو بھی دوسری علتوں کے ساتھ زیر بحث لانی چاہیے۔

تمثال کے معنیٰ:

عربی زبان میں تمثال صرف مجسمے ہی کو نہیں بلکہ ہر شے کے " سایہ" کو بھی کہا گیا ہے خواہ وہ مادی مجسمہ ہو یا کسی اور طریقے پر اصل چیز کی چھاؤں ہو ——— یعنی مجسمہ بھی اپنی اصل کی ایک چھاؤں ہوتا ہے جس کی ساخت مادیات۔ پتھر، مٹی، لکڑی یا کوئی اور شے مثلاً پیتل وغیرہ کے علاوہ قلمی نقوش یا سوئی یا اونی کشیدہ کاری کے ذریعہ بنائی جاتی ہے مثلاً کپڑے پر شہر کا نمونہ یا کاغذ پر طوطے کا نقش یا مٹی کا بنا کر رنگ کیا ہوا آم وغیرہ۔

دھوپ میں کھڑے ہو جائیے تو زمین پر سایہ گرے گا دھوپ میں سے ہٹ جائیے آپ کا سایہ ختم ہو جائے گا لیکن یہ سایہ جب کاغذ پر نقش و عکس کی شکل میں مسخر کر لیا جاتا ہے تو اس کا اصلاحی نام اردو میں تصویر ہے۔ یہی سایہ جب مٹی کے پتلے کی شکل میں آ جاتا ہے تو مجسمہ کہلاتا ہے گویا تصویر و مجسمہ، سایہ اور چھاؤں ہی

لہ ماہنامہ ... [illegible] ... سے جس کو بعد کے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کی ایک ٹیڑھی ہوئی قسم ہے، مجسمے انسانی شکل کے علاوہ حیوانوں کے بھی بنا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف کاریگری سے درخت، تالاب، چاند اور سورج کے مناظر بھی بنائے جاتے ہیں یہ سب کے سب تمثال ہی میں داخل ہیں۔

تماثیل سلیمانی قرآن مجید نے جس زیر بحث آیت میں تمثال کے جواز کی علت بیان کی ہے اُس میں ۔ ما یشاء ۔۔۔ کے الفاظ اضافہ کرکے اس بات کی نفی کر دی ہے کہ تمثال سے مراد ہر قسم کی تمثال نہیں تھی بلکہ صرف وہی تمثال تھی جس کو حضرت سلیمان علیہ السلام مناسب سمجھتے تھے۔ البتہ یہ تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ وہ کون سے کون سے تماثیل تھے، جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوائے تھے؟ محض لفظ تماثیل کے اس آیت میں استعمال ہونے کی وجہ سے بیبات واضح اور صریح نہیں رہتی ہے کہ اس کے معنیٰ ہیں فلاں فلاں قسم کے نقوش و تصاویر آ جاتی ہیں۔

تمثال کا مسئلہ اگر اہم ہوتا کہ اس کو معبود بنا لینے کے سبب ایسا مسئلہ نہ تھا جسے قرآن مجید تفصیل کے ساتھ بیان نہ کرے، تو حضور صلی اللہ علیہ آلہ وبارک وسلم بھی اُس کی تفصیلات بیان نہ فرمائیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس مسئلے میں قرآن مجید اجمال سے کام لیتا ہے وہاں حضور پاک تفصیل بیان فرماتے ہیں اور جہاں قرآن تفصیل بیان کرتا ہے آپؐ وہاں اجمال اختیار فرماتے ہیں۔

زیر بحث مسئلہ وہ تھا کہ اگر آپؐ خاموش ہو جاتے تو امت مسلمہ آپ کا تمثال تیار کئے بغیر نہ رہتی۔ چنانچہ اس کی ممانعت کے بارے میں آپ کے اتنے واضح ارشادات موجود ہیں کہ آیت زیر بحث مذکورہ بالا۔ ما یشاء ۔۔۔ الخ میں کون سے تماثیل مراد ہیں آسانی سے متعین ہو سکتے ہیں ۔۔۔۔ ذرا جذبات سے بالاتر ہو کر تحقیق کرنی چاہیئے۔

محقق کا کام یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی مسئلے کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا کما حقہٗ جائزہ لے۔ اس کے لئے اُس کا یہ طریقہ کار درست نہیں ہوتا کہ محض ایک آدھی آیت اور کچھ احادیث کو پیش کرکے کسی بھی مسئلہ کے متعلق اپنی آخری رائے پیش کر دے جب کہ اس مسئلے کے متعلق رائے پیش کرنے والی دیگر متعدد آیات یا احادیث موجود ہوں۔ اگر محقق دیگر آیات یا احادیث کو نظر انداز کر دیتا ہے حالانکہ علماء سابقین نے ان کو بطور دلیل پیش کیا ہے تو ایسا کرنے والا محقق نہیں بلکہ دین میں خیانت کرنے والا ہے اس لئے کہ یہ اُن علماء کے استدلالات کی خامی کا جیسا کہ ہونا چاہیئے قرآن وسنت میں سے ڈھونڈ کر جواب پیش نہیں کرتا بلکہ بس ایک سطحی پیرایہ اختیار کر لیتا ہے۔

<u>تصاویر حیوانی کے دلیلِ جواز کی کمزوری :-</u>

آیئے ! ماہنامہ فکر و نظر اپریل ۱۹۹۲ء کے صد۲ ، صد۳ پر پیش کی ہوئی بخاری و مسلم کی روایات کے اُس استدلال کو زیر بحث لائیں جس کو زیر بحث لائیں جس کو کپڑے کے منقوش تصاویر حیوانی کے جواز کے لئے دلیل بنائی گئی ہے اُن احادیث کو یہاں نقل کر دیا جاتا ہے۔

عن بسر بن سعید ان زید بن خالد الجهنی حدثه ومع بسر بن سعید عبید الله الخولانی الذی کان فی حجر میمونة رضی الله عنها زوج النبی صلی الله علیه وعلی آله وبارک وسلم حدثهما زید بن خالد ان ابا طلحة حدثه ان النبی صلی الله علیه (وعلی آله وبارک) وسلم قال لا تدخل الملائکة بیتا فیه صورة ۔ قال بسر فمرض زید بن	حضرت بسر بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ زید بن خالد الجہنیؓ نے اُن سے حدیث بیان کی اور بسر بن سعید کے ساتھ عبید اللہ الخولانی بھی تھے جنہوں نے ام المومنین حضرت میمونہ کی گود میں پرورش پائی تھی ان دونوں سے زید بن خالدؓ نے فرمایا " اُس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہوتی ہے بسر نے کہا کہ زید بیمار ہوئے تو ہم نے ان کی عیادت کی ہم نے ان کے مکان میں ایک پردے پر تصاویر

خالد فعدناہ فاذا نحن فی بیتہ بستر فیہ تصاویر فقلت لعبید الخولانی الم یحدثنا فی التصاویر؟ فقال الا رقم فی ثوب الا سمعتہ؟ قلت لا قال بلی قد ذکرہ۔

دیکھیں جس پر میں نے عبید اللہ خولانی سے کہا کہ انہوں نے تصاویر کے بارے میں ہم سے حدیث نہیں بیان کی جس پر عبید نے کہا کیا تو نے الا رقم فی ثوب کے الفاظ (یعنی بجز کپڑے پر کے دھاریوں کے نقش کے) الفاظ نہیں سنے؟ بسر نے کہا میں نے نہیں سنا تب عبید نے کہا ہاں انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

عن عائشۃ رضی اللہ تعالی عنہا قالت خرج النبی صلی اللہ علیہ (وعلیٰ الہ وبارک) وسلم ذات غداۃ وعلیہ مرط مرحل من شعر اسود۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز کالے اون سے منقوش ایک چادر اوڑھے ہوئے باہر نکلے۔

مندرجہ بالا احادیث میں علت ممانعت وجواز تین جملوں پر مشتمل ہے پہلی پیش کردہ حدیث میں نمبر (۱) جملہ " لا تدخل الملائکۃ بیتا فیہ صورۃ " علت ممانعت ہے اور نمبر (۲) جملہ " الا رقم فی ثوب " علت جواز ہے لیکن جیسا کہ خود لفظ اِلّا شہادت پیش کرتا ہے علت جواز ہر قسم کی تصاویر پر حاوی نہیں ہے بلکہ " رقم فی ثوب " کے الفاظ میں استثناء کیا گیا ہے اسی طرح دوسری حدیث میں " مرط مرحل من شعر اسود " جملہ (نمبر ۳) سے بھی جواز ہی کا استدلال لیا گیا ہے حالانکہ اس کو پہلی حدیث کے پیش کردہ جملے نمبر (۱) کے خلاف استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی حدیث میں ایک ہی شے کی ممانعت اور جواز دونوں کا حکم کیسے دے سکتے ہیں؟ اس لئے فاضل مضمون نگار فیع اللہ کا خیال کہ " جس حدیث شریف کو تصویر کی حرمت کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے اس حدیث کو اگر کامل نقل کیا جائے تو اس سے جواز بھی ثابت ہوتا ہے (صلہ فکر و نظر اپریل ۱۹۶۴ء) غلط فہمی پر مبنی ہے کسی بھی حدیث میں یا تو مستقل حکم ممانعت ہوگا یا پھر مستقل حکم جواز زیادہ سے زیادہ ممانعت کے ساتھ کچھ استثناء ہوگا۔ اسی طرح جواز کے ساتھ بھی کچھ استثناء ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک ہی حدیث میں اسی شے کی ممانعت اور جواز دونوں کا حکم ایک دوسرے کے ساتھ متضاد پایا جانا ناممکن ہے، اگر کسی حدیث کے ایسے معنی نکلتے معلوم ہوتے ہیں تو یہ یا وہ متعلم کی کج فہمی ہے اور یا روایت کی خامی کے سبب الفاظ میں اور پیچ پیدا ہوگئی ہے لیکن خدائے تعالیٰ کے فضل سے ایک نقیہ ربانی ان ہر دو کمیوں کو تنقید کے ذریعہ نکال باہر کرسکتا ہے۔

رقم ثوب اور مرط مرحل کے معنی:۔ متذکرہ بالا احادیث میں نقش بیان تو نہیں ہے البتہ تعذر فہم کے سبب اجتہادی خطا ضرور ہوئی ہے جس کی بنیاد لغت عربی کی وسعت اور بلاغت سے صرف نظر کرنے پر ہے۔ ان میں تین الفاظ " صورۃ، رقم، مرحل " کی تشریح اہمیت رکھتی ہے۔

(ل) " صورۃ " عربی میں متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے، صفت، نوع، چہرہ وغیرہ۔

(ب) " رقم الثوب " کے معنی کپڑے پر دھاری لگانا، رقم البعیر = اونٹ کو داغ دینا، رقم الخبز = روٹی کو نقش کرنا، ارض مرقومہ = وہ زمین جس پر تھوڑے سے بیل بوٹے ہوں، الرقمۃ = ندی کا کنارا یا باغ، المرقم = دھاری دار کپڑا۔

(ج) " المرحل من الثیاب " = وہ کپڑا جس کا نقش پالان جیسا بنایا گیا ہو۔ رحل الثوب = کپڑے پر نقش ونگار بنانا — " المرحل من الابل " = وہ اونٹ جس پر پالان چڑھا دیا گیا۔ (یہ جملہ کپڑے کے لئے استعمال نہیں ہوتا)

مندرجہ بالا ہر سہ الفاظ زیر بحث احادیث میں کپڑے کے نقوش کے متعلق استعمال ہوئے ہیں اگرچہ لغت میں ان کے دیگر معنیٰ بھی ہیں جیسے لفظ مرحل اُس اونٹ کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جس پر سفر کے لئے پالان باندھ دیا گیا ہو لیکن یہ لفظ جب کپڑے کے لئے استعمال ہوگا، جیسا کہ "المرحل من الثیاب" کہ کر لغت تشریح کرتی ہے تو اس سے مراد صرف نقش و نگار والا کپڑا مراد ہوگا اسی طرح "رقم البعیر" اونٹ کے داغ دینے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن جب "رقم الثوب" کہا جائے گا۔ تو کپڑے کو دھاری لگانے کے معنیٰ ہوں گے۔ لفظ کے معنیٰ ان کے موقعوں کے اعتبار سے کئے جائیں گے۔

صرف المنجد (عربی لغت) ملاحظہ کر لیجئے۔

"صورۃ" ، الشکل ، النوع ، الوجہ ، رقم الثوب = خططہ
رحل الثوب = وشاہ ، المرحل من الثیاب = ما اشبہت نقوشہ رحال الابل

لکھا ہوا ہے ،

کیا یہ بات موزوں ہوگی ؟ کہ لفظ "صورۃ" کپڑے پر نقش کے بارے میں استعمال ہو رہا ہے اور اُس کے معنیٰ "مجسمہ" کے لئے جائیں ؟ اسی طرح جہاں لفظ "رقم" کپڑے کے بارے میں استعمال ہو رہا ہو، اُس کے معنیٰ "اونٹ کے داغنے" کے لئے جائیں ؟! یا "المرحل (من الثیاب)" کے معنیٰ "کپڑے کے نقوش" کی بجائے، پالان کسا ہوا اونٹ لے لیا جائے ؟ حالانکہ یہ لفظ اپنی عبارت میں کپڑے کے لئے استعمال ہو رہا ہے ؟؟؟ کیا ایسے غیر موزوں معنیٰ، محل استعمال کو نظر انداز کرکے صرف اس بنیاد پر لے لینا کہ یہ الفاظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ دانشمندی ہوگا؟ کوئی بھی ادیب اس بات کو پسند نہیں کرے گا ؟؟!

یہ بات غور کی محتاج نہیں ہے کہ زیر بحث احادیث میں الفاظ "صورۃ، رقم، مرحل" صرف کپڑے کے منقشہ نقوش کے کیفیات ظاہر کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اس لئے ان الفاظ کے معنیٰ اُس ہی حد تک محدود ہوں گے جس حد تک کہ وہ لفظ اُس موقع کے لئے مستعمل ہے۔

پھر پہلی حدیث بسر بن سعیدؓ میں تو الفاظ صورۃ اور رقم دونوں ایک ہی کپڑے کے بارے میں استعمال ہوئے ہیں لیکن بعد کا لفظ "رقم" پہلے استعمال شدہ لفظ "صورۃ" کی نفی و تردید کر رہا ہے یعنی سائل حضرت بسر بن سعیدؓ کی اس غلط فہمی کو دور کر رہا ہے کہ اس کپڑے پر جو نقش ہے اُس کے لئے لفظ "صورۃ" استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُس کو رقم (فی ثوب) کے الفاظ سے تعبیر کیا جائے گا۔

الفاظ "صورۃ" اور "رقم" دونوں کے عربی اور اردو دونوں معنیٰ اوپر پیش کر دئے گئے ہیں، لفظ صورۃ کی اگر تردید ہو رہی ہے تو مستعلم یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ اُس کپڑے پر جس کا ذکر حدیث مذکورہ میں ہے، حیوانی تصاویر نہیں تھیں اس لئے الا رقم فی ثوب کہ کر حیوانی تصاویر کی نفی کی جارہی ہے اور یہی الفاظ یہ بھی رہبری کر رہے ہیں کہ ان نقوش کو لفظ صورۃ یا تصویر (حیوانی) کے نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اُس کو رقم فی ثوب کہا جائے گا۔

چنانچہ لغات میں "رقم الثوب" کے معنی بالترتیب خططہ اور کپڑے پر دھاریاں لگانا لکھے ہیں ایک لغت میں تو "المرقم" کے معنی صرف دھاریدار کپڑا لکھا ہے۔ لغات کی ان تشریحات سے ذرا بھی پتہ نہیں چلتا کہ لفظ "رقم" تصویر ذی روح کے معنی میں استعمال ہونے کا کوئی امکان رکھتا ہو

افسوس! افسوس کہ محترم رفیع اللہ صاحب نے لفظ رقم کو بھی تصویر ذی روح ہی کے معنی میں استعمال کر لیا نیز علامہ شوکانی کے الفاظ جس کو موصوف نے ماہنامہ مذکور صفحہ ۴۵ پر "تلک التصاویر ہی صور الرحال" بتاتے ہوئے لکھا ہے، کے معنی پر غور نہیں فرمایا اس جملے میں صور الرحال

کے الفاظ وضاحت کر رہے ہیں کہ "مرط مرحل سے مراد حیوانی شکلوں یا صورتوں والے کپڑے نہیں ہیں بلکہ ــــ صرف ان کجاووں کے جیسے نقوش مراد ہیں جو اونٹ سے بالکل علیحدہ رکھے ہوتے ہیں یعنی وہ پالان جو ابھی اونٹوں پر لادے نہیں گئے۔ غور اس بات پر کیا جائے کہ "الرحال" کے معنی صرف "پالان" ہیں اس لفظ کے معنی میں اونٹ کے شامل ہونے کا ذکر ہی نہیں یعنی یہ لفظ "اونٹ مع پالان یا پالان بردار اونٹ" کے معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ علامہ شوکانی کے "ہی صور الرحال" لکھنے کے معنی صرف "کجاووں کے نقوش ہیں" اس معنی میں کسی بھی طرح اونٹ کی تصویر شامل نہیں۔ یعنی ان کی رائے میں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس "مرط مرحل" کو استعمال فرمایا تھا اُس پر اونٹ کی صورت یا شکل نہیں تھی بلکہ صرف کجاوے جیسا نقش تھا۔ اور لغت بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

حدیث میں لفظ مرحل کا استعمال :- اگر حدیث میں لفظ "مرحل" بلا اپنے موصوف "مرط" کے استعمال ہوتا تو پھر بھی اشتباہ کا کوئی امکان نہ تھا مگر افسوس کہ بالوضاحت ترکیب توصیفی "مرط مرحل" بھی ایک محقق کے ذہن میں نہ آ سکی جو یہ تخصیص کر رہی تھی کہ یہاں صفت مرحل صرف کپڑے کے متعلق استعمال کی گئی ہے۔ اس میں اونٹ یا اُس کے ساتھ کسی تشبیہ کا کوئی ذکر نہیں۔

واضح رہے کہ "المرحل (من الثیاب)" کے معنی جیسا کہ اوپر المنجد کا حوالہ دیا جا چکا ہے پالان کے نقوش بھی نہیں ہیں بلکہ ایسے نقوش ہیں جن کو دیکھنے سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ پالان جیسا نقش ہے اور شاید اسی اشتباہی مماثلت کے سبب اس نقش کو اس نام سے یاد کیا گیا ہے اور واضح رہے کہ کپڑے کے متعلق جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد صرف نقوش کے ذریعہ کپڑے کی زینت میں اضافہ کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ لغت میں رحل الثوب کے معنی "وشاہ" لکھا ہے۔ اس کے معنی میں لغت میں کسی حیوانی تصویر کا کوئی ذکر نہیں ملے گا۔

اسی طرح لفظ مطیر = بیچھے ہوئے کپڑے اور لفظ مبیل = دھبہ دار کپڑے جس کو چھینٹ بھی کہا جاتا ہے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مسکری رفیع اللہ صاحب نے ان الفاظ کو پرندوں یا گھوڑوں کی تصویر کے تصور کے ساتھ جو پیش کیا ہے لغات ان معنوں کی تصدیق نہیں کرتیں۔

تشریحات و تائید :- حدیث کے جملے ۱ لاتدخل الملائکۃ بیتا فیہ صورۃ، ۲ الا رقما فی ثوب، ۳ مرط مرحل من شعر اسود کے مطالب بالترتیب مندرجہ ذیل ہوں گے۔

۱ اُس مکان میں فرشتہ رحمت داخل نہیں ہوتے جن میں حیوانی اشکال وصورتیں ہوں (اس میں مجسمہ، نقوش اور فلمی حیوانی ڈرائنگ وغیرہ بھی شامل ہیں) اس سے مسئلہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ حیوانی و انسانی صورتیں بنانا اور مزین کرنا حرام ہے۔

۲ اس میں صرف ایسے نقوش کی اجازت ہے جس کا تعلق دھاریوں سے ہو بلکہ اُس میں جھاڑی، پہاڑی، وادی وغیرہ کے ایسے نقوش بھی جن میں انسانی وحیوانی تصاویر شامل نہ ہوں، داخل ہیں۔ اس کی مزید تشریح کے لئے ایک حدیث بھی ذیل میں پیش ہوگی۔

۳ سے ایسا غیر سلا ہوا کپڑا مراد ہے جس پر اُون کے ذریعہ نقوش ابھارے گئے تھے چونکہ جملہ ۱ میں حیوانی و انسانی تصویر کی حرمت کا اعلان ہے اس لئے مرط مرحل سے غیر حیوانی اور غیر انسانی نقوش مراد ہیں۔ جیسا کہ اوپر لغات کی تائید بھی پیش ہو چکی۔

ذی روح اشیا کی تصویر کی حرمت :-

مزید وضاحت اور تائید کے لئے بخاری کی ایک حدیث جو باب بیع التصاویر میں ہے پیش کی جاتی ہے۔

عن سعید بن الحسن قال کنت عند ابن عباس	حضرت سعید بن الحسنؒ بیان فرماتے ہیں کہ وہ حضرت ابن عباسؓ
اذا اتاہ رجل فقال یا عباس انی انسان انما معیشتی	کے پاس تھے ان کے پاس ایک شخص آیا اور کہا اے عباس میں انسان

من صنعة یدی وانی اصنع هذه التصاویر فقال ابن عباس لا احدثك الا ما سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول سمعته یقول من صوّر صورة فان الله معذبه حتی ینفخ فیها الروح ولیس بنافخ فیها ابدا فربا الرجل ربوة شدیدة و اصفر وجهه فقال ویحك ان ابیت الا ان تصنع فعلیك بهذا الشجر وکل شئ لیس فیه الروح

ہوں اور میرے معاش کا انحصار دستکاری پر ہے اور میں یہ تصاویر بناتا ہوں حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی حدیث کے علاوہ کوئی اور بات نہیں سناؤں گا۔ پھر کہا : میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا جو شخص صورت بنائے گا خدائے تعالیٰ اُس کو سخت ترین عذاب اُس میں روح بھر جانے تک دیگا اور کوئی بھی ابدالآباد تک اُس میں روح بھر ہی نہ سکے گا یہ جواب سن کر وہ شخص دہشت زدہ ہوگیا اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا (یہ حالت دیکھ کر) ابن عباسؓ نے اُس سے فرمایا اگر تجھے اس کے بغیر گذارا کرنا آتا ہی نہیں تو تو اس درخت یا اُس شے کی تصویر جس میں روح (کارفرما) نہیں ہوتی ۔

مندرجہ بالا حدیث میں ذکر ہے کہ ایک شخص نے تصویر کشی کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنا لیا تھا یہ مصور انسانی و حیوانی تصاویر بھی بنایا کرتا تھا جب اس نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے اپنی مصوری کا نقشہ پیش کیا تو انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان سنایا کہ جو شخص تصاویر بناتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ اُس کو عذاب دیگا ۔ یہ بات سن کر وہ بہت پریشان ہوگیا جس پر ابن عباس نے فرمایا کہ اگر تمہاری گزران اسی پر ہے تو تم غیر ذی روح اشیا یعنی درخت وغیرہ کی شکلیں بنا سکتے ہو ۔

اس پیش کردہ حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں صور صورة فان الله معذبه حتی ینفخ فیها الروح سے بوضاحت یہ ثبوت ملتا ہے کہ ہر ذی روح شے کی تصویر حرام ہے اس کے مصور، بائع، مشتری اور تزئین کرنے والے پر احتساب و مواخذہ ہوگا ۔

ایک باطل دلیل کا رد ! مکرمی ربیع اللہ صاحب نے عبدالرحمٰن الحریری کے حوالے سے ماہنامہ فکر و نظر ص۵۱ پر حسب ذیل عبارت درج کی ہے

.... اما تصویر الحیوان فان کان علی بساط او وسادة او ثوب مفترش او ورق فانه جائز لان الصورة فی هذه الحالة تکون ممتهنة ولکن الله یجوز اذا کانت الصورة ناقصة عضوا لا یمکن ان تعیش بدونه کالرأس ونحوها !

جاندار اشیاء کی تصاویر، چٹائی، تکیہ، دری یا کاغذ وغیرہ پر ہوں تو جائز ہیں ۔ کیونکہ ان حالتوں میں تصویر کے احترام کی کوئی گنجائش نہیں اسی طرح ایسی تصاویر جن میں کا کوئی عضو نہ ہو جس کے بغیر جاندار زندہ نہ رہ سکتا ہو مثلاً سر وغیرہ تو ایسی تصویر بھی جائز ہے !

لکھ کر تصاویر ذی روح کے جواز کے لئے جو زور دیا ہے تو یہ خیال اوپر کے فقرہ میں پیش کی ہوئی حدیثِ بخاری کے خلاف ہے اس لئے مولوی ربیع اللہ صاحب اور الحریری دونوں کا حسب بالا مسلک جوازِ تصاویر حیوانی و انسانی، حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل اور قابل ترک ہے ۔

جزوی تصویر کی حرمت :- یہاں الحریری کے حسب بالا مسلک کو غلط ثابت کرتے ہوئے ایک بات اور لکھ دینا اہم ہے کہ جب کسی چیز کے

کل کے حرمت کا حکم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دے چکے ہوں تو اسی حکم میں اُس کے جزو کی حرمت کا حکم بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ خیال کہ حیوانی وہ تصاویر جن میں سر وغیرہ نہ ہو جواز کا حکم رکھتی ہے اصابت وصحت نہیں رکھتا ـــــ اگر صرف انگلی ہی کی تصویر بھی ہو تو کیا انگلی ذی روح شے کا جز نہیں ہوتی ؟ کیا انگلی میں روح کارفرما نہیں ہوتی ؟ اس لئے یہ انگلی اور اسی طرح دوسرے اعضاء مثلاً کان، ناک، آنکھ وغیرہ وغیرہ کی جزوی تصاویر یعنی وہ تصویر جس میں صرف انگلی یا کان یا آنکھ وغیرہ اکیلے ہی اتارے گئے ہوں یعنی وہ پورے حیوان کی تصویر نہ ہو بلکہ نامکمل تصویر ہو تو بھی ـــــ وہ حرام ہی ہے[1]

حیوان اور درخت کی جان میں فرق :-

زیر نقد مضمون کے حاشیے میں لکھا گیا ہے کہ" قارئین جانتے ہی ہوں گے کہ درخت غیر جاندار نہیں ہیں اس کا پہلا جواب تو یہ ہو کہ انسان اور حیوان کی جان میں اور درخت دپتھر وغیرہ کی جان میں زمین وآسمان کا فرق ہے انسان یا حیوان جس آزادی سے زمین پر چلتے پھرتے ہیں اور ان کے ذکور واناث میں ملاپ کرتے ہیں ؟ کیا درختوں اور پتھروں میں یہی صورت موجود ہے ؟ شہد کی مکھی، چیونٹی وغیرہ کے متعلق سے قرآن مجید ان جانداروں کی منظم جماعتی زند گی کو بیان کرتا ہے یہی حال انسان کا بھی ہے کیا اس قسم کی جماعتی زندگی درختوں کرتے

انسانوں کے کالج اور ... وں کے پاس بھی موجود ہے ؟ درختوں کی حیات کا یہ عالم ہے

ہیں اور دیمک چاٹ کر اُن کا صفایا کر دیتی ہے۔

کیا کوئی انسان اپنی قربت میں ڈسنے والے سانپ کو زندہ رہنے دیگا ؟ کیا کوئی

ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ کوتاہی اور نقص درخت میں موجود ہے۔

روح انسانی :-

پس انسان وحیوان میں روح سے مراد وہ روح ہے جس کے ذریعہ سے وہ زمین پر چلتا پھرتا، اپنی آپ حفاظت کرتا، درندوں اور دشمنوں کا مقابلہ کرتا اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اختیاری وآزادانہ ہمدردی کرتا ہے برخلاف اس کے درخت بالکل بے بس ہے اس میں ایسی جان نہیں ہے۔

حدیث میں لفظ روح :-

پس حرمت تصاویر کی احادیث میں جس روح کا ذکر ہے وہ انسانی اور حیوانی روح ہے جس کے ذریعہ انسان وحیوان آزادی کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتا رہتا ہے یہی سبب ہے کہ حدیث کو سنانے کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے مصور کے سامنے ـــــ فعلیك بهذا الشجر وكل شئ ليس فيه روح کہ کر درختوں کے غیر ذی روح ہونے کا ذکر کردیا۔

مسئلے میں اجتہادی خطا کا سبب :-

محترم صدر شعبہ عربی اگر بخاری کی ان احادیث کو بھی زیر بحث لے آتے جو ـــــ باب اذا قال احدكم امين الخ میں حدیث بسر بن سعیدؓ کے اوپر موجود ہے تو ان سے یہ اجتہادی خطا نہ ہوتی چنانچہ اُن میں کی ایک حدیث ذیل میں ملاحظہ ہو !

عن عائشۃ حشوت للنبي صلى الله عليه وسلم　　　حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] فاضل مضمون نگار کی یہ رائے محل غور ہے ! اس لئے کہ انسان کے جسم سے جب کوئی عضو جدا کرلیا جائیگا تو بے روح ہو جائیگا اور بے روح شے کی تصویر لی جاسکتی ہے۔ (م-ق م)

وسادۃ فیھا تماثیل کانھا نمرقۃ فجاء فقام
بین البابین وجعل یتغیر وجھہ فقلت ما لنا
یا رسول اللہ قال ما بال ھذہ الوسادۃ
جعلتھا لک لتضطجع علیھا قال اما علمت
ان الملائکۃ لا تدخل بیتا فیہ صورۃ وان
من صنع الصور یعذب یوم القیامۃ فیقول
احیوا ما خلقتم (بخاری)

کے لئے ایک تکیہ تیار فرمایا جس میں تماثیل تھے وہ تکیہ ٹیک
لینے کا تھا حضور دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے اور حضور
کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم کو
کیا ہو گیا ہے؟ حضور نے جواب دیا اس تکیہ کا کیا حال ہے؟
حضرت عائشہؓ نے جواب دیا میں نے آپ کے ٹیک لینے کے لئے بنایا
ہے۔ حضورؐ نے جواب دیا کیا تمہارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ
فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر (حیوانی)
ہوتی ہے اور جو شخص ان تصاویر کو بنائے گا قیامت کے دن
عذاب دیا جائے گا خدائے تعالیٰ کہے گا جس کو تم نے پیدا کیا
اس کو زندہ کرو۔

اس حدیث میں لفظ تماثیل بھی استعمال ہوا ہے لیکن مجسمہ کے معنوں میں نہیں بلکہ اس تصویر کے لئے استعمال ہوا ہے جو تکیہ کے غلاف پر کشیدہ تھی اور ان تماثیل کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضی کا اظہار اس وجہ سے کیا کہ یہ حیوانی تماثیل تھے چنانچہ اس بارے میں اس حدیث میں بھی حضورؐ کا یہ ارشاد ذیل غور ہو!

"جس گھر میں (حیوانی) تصاویر ہوں گے اس میں فرشتے داخل نہ ہوں گے اور جو لوگ یہ تصاویر بنائیں گے قیامت میں عذاب دئے جائیں گے۔ خدائے تعالیٰ کہے گا جن چیزوں کو تم نے پیدا کیا ہے ان کو زندہ کرو۔"

اس بالا حدیث "وسادۃ" اور ایک اور بحث شدہ حدیث "مرط مرحل" میں معنوی تضاد نہیں ہے۔ "مرط مرحل" کے الفاظ صرف بے روح اشیاء کے نقوش کا ذکر کرتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے اس ترکیب توصیفی کو صرف غیر ذی روح اشیاء کا نقش ہونے کے سبب استعمال کیا ہے حدیث "وسادۃ" میں حضورؐ کی ناراضی کا اظہار ذی روح اشیاء کی تصاویر کے سبب ہے اور اس کے خلاف حضورؐ ہی نے مرط مرحل کو صرف غیر ذی روح شے کے نقش کے سبب استعمال فرمایا یعنی اپنے اوپر اوڑھا ہے۔ آپ کے یہ دونوں عمل غیر ذی روح اشیاء کے عدم جواز کے شاہد ہیں افسوس کہ بعض حضرات نے اس نکتے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔

مسئلے میں دوسری خطا "حدیث سے ٹکراؤ" کی نظر اندازی :-

آں موصوف نے بعض کتب کے حوالے سے بعض ایسے اجتہادات کو دلائل کے طور پر پیش کیا ہے جن کے خلافِ حدیث ہونے کے پہلو کو (سہواً) نظر انداز کر دیا ہے اس کے علاوہ اقتباسات پیش کرتے ہوئے بعض متعلقہ عبارات کو پوری کی پوری بھی نقل نہیں کیا گیا جس کے سبب مغالطہ لازمی طور پر ہونا چاہئے تھا اور ہوا۔ مثلاً نیل الاوطار (ج ۲ ص ۱۰۵) کی ان کی پیش کی ہوئی عبارت :-

وقال بعض السلف انما ینھی عما کان لہ ظل ولا
باس بالصور التی لیس لہ ظل۔

(ترجمہ) بعض سلف صالحین فرماتے ہیں کہ صرف وہی تصویر ممنوع
ہے جس کا سایہ ہو اور جس تصویر کا سایہ وغیرہ نہ ہو تو اس میں
کوئی حرج نہیں۔

کو تو پیش کر دیا گیا ہے لیکن اس کے بعد کی وہ عبارت ترک کر دی گئی ہے جو درج ذیل ہے :

وھذا مذھب باطل فان الستر الذی انکر النبی صلی اللہ علیہ (وعلی الہ وبارک وسلم) الصورفیہ لایشک احد انہ مذموم ولیس لصورۃ ظل مع باقی الاحادیث المطلقۃ فی کل صورۃ۔	لیکن یہ اجتہاد باطل ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس پردے پر نکیر فرمائی تھی وہ با تصویر تھا اس بارے میں کوئی بھی شک نہیں کرتا۔ در اصل وہ مذموم ہے اور اس تصویر کا سایہ بھی نہیں ہے حتیٰ کہ باقی دوسری احادیث میں بھی جن میں تصویر کا ذکر ہے (ان کا سایہ نہیں ہے)

محترمی رفیع اللہ صاحب کے پیش کردہ خیال کی تردید خود بخود نیل الاوطار کی ان سے ترک کی ہوئی عبارت بالا کے الفاظ " وھذا مذھب باطل " سے ہو جاتی ہے پھر ساتھ ہی صاحب نیل الاوطار محمد بن علی شوکانی نے اس خیال کی تردید کہ ـــــــ غیر سایہ دار فوٹو جائز ہے، حدیث ستر کے حوالے سے کر دی ہے چنانچہ مندرجہ بالا عبارت میں اُ... کا ذکر موجود ہے جس میں اس نکتے کو نمایاں کیا گیا ہے کہ پردوں کی جن تصاویر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضی کا اظہار فرمایا ہے اور جنہیں آپ نے اکھڑوا دیا اور جن کے ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں وہ تصاویر [illegible] ظل " یعنی غیر سایہ دار تھے !

پس سایہ دار اور غیر سایہ دار دونوں قسم کے تصاویر جو کپڑے اور کاغذ پر ہوں یا کسی

فلمی تصاویر :-

بعض فقہا کے بعض خام استدلالات کو پیش کر کے حالانکہ اکثر فقہا ان استدلالات کے اجتہادی ہے لیکن افسوس کہ جواز پیش کرتے ہوئے اس جواز کی تائید کرنے والی کوئی حدیث پیش نہیں کی گئی۔

ایک متفق علیہ حدیث میں یہ ذکر ہے کہ تصاویر دار پردے کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کے سبب پھاڑ دیا گیا اور اس کے ٹکڑوں کو تکیوں کے غلاف کے لئے استعمال کیا گیا جس پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سہارا لیا کرتے تھے۔ اس بارے میں ایک راوی نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ان میں ایک تکیہ ایسا بھی تھا جس پر صورت نظر آتی تھی لیکن یہ بات ناقابل فہم ہے کہ تصاویر کے استعمال کی ممانعت کا حکم دیا جانے کے بعد بھی کسی کپڑے پر تصویر اپنی اصلی شکل میں باقی رہ گئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ راوی کا مقصد نقش و نگار کی ہوئی یعنی مسخ شدہ تصویر ہو۔

سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جن فقہا نے نامکمل تصاویر کی روح کے جواز کا فتویٰ غلط فہمی سے دیا ہے اُس کی بنیاد و مدار کر [illegible] کا یہی بیان ہو سکتا ہے جس پر غور نہیں کیا گیا۔

ویسے بھی ہم نے حضرت عائشہؓ ہی کی ایک روایت اوپر پیش کی ہے جس میں تکیے کے غلاف کی تصویر کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی ظاہر فرمائی کہ اُس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے جن میں تصاویر کی روح ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ کہ بخاری ہی میں ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں اُس وقت تک داخل نہیں ہوتے تھے تا آنکہ تصویر کے مٹا دیئے جانے کا حکم نہ دیتے پھر وہ تصویر مٹا دی جاتی۔ لہٰذا کس طرح اس بات کو تسلیم کر لیا جا سکتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسے تکیہ پر ٹیک لگائے ہوں جس پر تصویر اپنی اصلی شکل میں موجود تھی، پس اس روایت میں راوی کے بیان میں کچھ خامی ہے۔

استنباط جواز کی خامی :-

ان احادیث سے سندا خذ کر لے میں ان حضرات سے غلطی یہ ہوئی کہ اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا کہ آنحضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے ممانعت کا حکم ایک ایسے تصویردار کپڑے کے لئے دیا جو اس حکم ممانعت سے پہلے استعمال کے لئے جائز سمجھا جاتا تھا اور حضرت عائشہؓ نے اُس کے ممانعت کا حکم معلوم نہ ہونے ہی کے سبب اُسے کام میں لیا۔

دوسرے الفاظ میں کہئے کہ جس وقت تصویردار کپڑے کے استعمال کی ممانعت کا حکم نہ تھا حضرت عائشہؓ نے تصویردار کپڑے کو پردے کے لئے استعمال کیا جب اس کی ممانعت کا حکم رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا دیا تو پھر ان تصاویر کی شکل کو مسخ کرکے اُس کپڑے کو غلاف کے لئے استعمال کر لیا گیا ہو سکتا ہے کہ مسخ کرنے کے بعد بھی کوئی تصویر کثرت تصاویر اور بھول چوک کے سبب مسخ ہونے سے بچ گئی ہو اور اس پر غور نہ کیا گیا ہو، لیکن احادیث کے مجموعے پر فکر و غور اس بات کا بھی ثبوت فراہم کر دیتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے تکیہ پر بھی اعتراض فرمایا ہے جس پر تماثیل تھے، ہو سکتا ہے کہ یہ وہی تکیہ تھا جو پردے کو ٹکڑے کر دینے کے بعد بنایا گیا ہو اور جس پر تصاویر مسخ ہونے بغیر بھول سے رہ گئی ہوں۔

پھر جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر پاک اُس پر بعد میں پڑی تو آپ نے اُس پر اعتراض کیا ہو تب کل تماثیل مسخ کر دئے گئے ہوں لیکن راوی نے ان تمام تفصیلات کا ذکر ایک ہی روایت میں نہ کیا ہو جیسا کہ بالعموم ایک ہی واقعہ کے متعلق ہر حدیث میں ہر تفصیل نہیں ہوا کرتی۔ مثال کے طور پر اُس حدیث عائشہ رضؓ کو لیجئے جس میں آپ ذکر فرماتی ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وسادہ کے تصاویر کو دیکھ کر خفگی ظاہر فرمائی (جس کو آپ ہی کے اضطجاع کے لئے بنایا گیا تھا) مزید برآں آپ نے (خفگی کے ساتھ ساتھ) اُن تصاویر کے استعمال کرنے کی ممانعت کا حکم بھی سنا دیا ———؟

لیکن اس روایت میں (جسے اوپر ایک مقام پر بخاری کے حوالے سے پیش بھی کر دیا گیا ہے) یہ ذکر ہی نہیں کیا گیا کہ اُس تکیہ کے غلاف کو حکم سننے کے بعد کیا گیا؟ لیکن احادیث کا طرز بیان خود اشارہ کرتا ہے کہ اُن تصاویر کو مسخ کر دیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کر دینے کے بعد کوئی ایسی شے اپنی اصل شکل میں قائم نہیں رکھی جاتی تھی چونکہ راوی کا اصل منشاء صرف حکم بیان کر دینا تھا اس لئے اُس نے دوسرے تفصیلات بیان کرنے سے احتراز کیا۔

اس لئے اُس روایت کو جس کے معنی یہ ہوئے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذی روح تصویر کے رہ جانے کے باوجود تکیہ پر ٹیکہ لگائے تھے ممانعت کی ان متعدد احادیث جن کے راوی خود حضرت عائشہؓ، ابن عباس، ابسرین سعید وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں اور جن میں واضح الفاظ میں ——— حکم ممانعت تصاویر مخلوق ذی روح ——— موجود ہے، کے سبب منسوخ مانی جائے گی۔

یہ خیال کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس تصویر والے تکیہ پر ٹیکہ لگایا تھا سرے سے پہلے راوی کی غلط فہمی ہے اس لئے کہ اوپر پیش کی ہوئی حضرت عائشہ سے مروی بخاری کی حدیث میں، روایت میں "فقام بین الباب" کے الفاظ موجود ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازے میں داخل ہوتے ہی یا اُس کے قریب ہی میں کھڑے ہو کر تصاویر پر ناخوشی کا اظہار فرمایا اور حکم ممانعت تصاویر سنا دیا ——— فصلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم فانہ اتانا بالحق۔

کاغذی تصویر کی حرمت :-

چنانچہ اصل مسئلہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ کپڑے یا کسی اور شے پر تصاویر ذی روح کا استعمال اسلام میں منع ہے اس لئے یہ اجتہاد کہ کاغذ کا قیاس کپڑے پر کیا جائے کاغذ کے فوٹو کو جائز تسلیم کرنا چاہئے، خطا پر مبنی ہے اور اس کے ترک نہ کرنے والے پر عذاب ہے۔

شراب کی حرمت کی مدد سے قیاس :-

اوپر ہم نے لکھا ہے کہ ذی روح مخلوق کے جزوی اعضاء میں بھی روح کا سفر جاری رہتی ہے اس لئے ان جزوی اعضاء کی بھی ان کے ذی روح ہونے کے سبب تصاویر نہیں بنانی چاہئے یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسا کہ شراب کی حرمت میں زیادہ شراب اور ایک قطرہ شراب، دونوں مقدار میں حرام ہیں یہ کہتے ہوئے کہ

ایک قطرہ شراب نشہ نہیں پیدا کرتا اُس قطرۂ شراب کی حلت کا مسئلہ اخذ نہیں کیا جاتا!

—— اسی طرح انسانی اور حیوانی جزوی اعضاء (مثلاً صرف سر جو بغیر دھڑ کے ہو یا ہاتھ جو بغیر دوسرے اعضاء کے ہو) کی تصاویر و تماثیل (خواہ کسی شکل و ہیئت یا کسی چیز پر بھی ہوں) ممانعت ہی کا حکم رکھتی ہیں —— اس لئے فقہاء کی خطاؤں کو پیش کرتے ہوئے مضمون زیر تنقید میں —— جواز فوٹو کا مسئلہ جو پیش کیا گیا ہے وہ نادرست ہے۔

جوازِ فلم کی تردید:— اور جب بالا استدلال ہی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ "ماہنامہ مذکور کے صفحہ ۵ پر کی تحریر جو بطور دلیل پیش کی گئی ہے وہ بھی نادرست ہے اس تحریر میں فلم کے جواز کو غلط فہمی میں پیش کر دیا گیا ہے جس کی حدیثی تردید بھی آگے آ رہی ہے۔ تحریر مذکور کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

وعلی هذا الاصل جواز الفلم علی خیال المطلق اذا لم یشتمل علی محرم اخر لانها صورة ناقصة

اس اصول کے تحت فلم کا دیکھنا بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں کوئی حرام چیز نہ ہو کیونکہ پردہ پر ناقص صورت ہی پڑتی ہے۔

کل کی حرمت جزء پر حاوی ہے:— جب یہ کہا جاتا ہے ... یہ نتیجہ نکالا گیا ہے دراصل اس بات کی بھول کے سبب ہے کہ جب حرمت کا حکم کل پر لگ جاتا ہے تو وہ جزء پر بھی حاوی ہوتا ہے جب حیوانی صورت پورے طور سے بنانے کے لئے حرام قرار دی گئی ہے تو اس کا ... کیسے سکتا ہے؟

فلم دیکھنے کی ممانعت کا حدیثی ثبوت:— چونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآ... اُس کے استعمال کی ممانعت فرمائی بلکہ ان اشکال کو مسخ بھی کر دیا ... ثابت ہوتا ہے کہ تصاویر ہر مسلمان کے لئے پردۂ فلم پر تصاویر کو دیکھنا نہ صرف منع ہے بلکہ مسلمان پولیس کو جائز سمجھتے ہوئے منع نہ کرنا بھی قابل مواخذہ ہے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم جہاں کہیں ذی روح تصاویر ملاحظہ فرماتے ... آپ نے اپنے ہاتھ سے بھی بعض تصاویر مٹائی ہیں جن کا ثبوت ذخیرۂ احادیث میں موجود ہے۔

بچوں کی حیوانی گڑیا کا عدم جواز:—

اسی طرح یہ آراء کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے حیوانی گڑیاں مستثنیٰ ہیں درست نہیں ہیں اس قسم کے استثناء کا دعویٰ کرتے ہوئے کوئی حدیث پیش نہیں کی گئی اگر یہ بات تعلیم و تربیت ہی کے نقطۂ نظر سے درست ہوتی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وبارک وسلم حضرت عائشہؓ کے لاعلمی میں تیار کئے ہوئے تماثیل والے تکیہ پر اعتراض نہ فرماتے یا پھر کم از کم بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایسا کرنے کا استثنائی حکم ارشاد فرما دیتے جیسا کہ آپؐ نے مکہ مکرمہ کے جنگلات کے کاٹنے کو منع فرما دیا لیکن اذخر کے کاٹنے کی اجازت بعد میں استثناء کر کے دے دی۔

چونکہ لعب بنات وغیرہ کے لئے ذی روح تصاویر کے جواز کا کوئی استثنائی حکم نہیں ملتا اس لئے اس قسم کے جواز کا مسئلہ خطاء پر مبنی ہے جسے ترک کر دینا چاہئے۔

حضرت عائشہ کے بچپن میں یہ حکم نازل نہ ہوا تھا:—

ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ کے بچپن کا ذکر ہے کہ ان کی گڑیوں میں ایک پردار گھوڑا تھا جس کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وبارک وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ گھوڑوں کے پر نہیں ہوتے۔ جس پر حضرت عائشہؓ نے جواب دیا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کے پر تھے۔

اس واقعہ سے صرف یہ ثبوت ملتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت عائشہؓ گڑیاں کھیلا کرتی تھیں اُس زمانے میں ممانعت تصاویر ذی روح کا حکم نازل

نہیں ہوا تھا لیکن بعد کے زمانے میں جب کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زوجۂ مطہرہ کی حیثیت سے تھیں بالخصوص اُس وقت جب کہ آپ نے تماثیل دار وسادۃ (تکیہ) تیار کیا تھا، ذی روح تماثیل کی حرمت کا حکم آگیا۔ چنانچہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وعلی الہ وبارک وسلم نے ممانعت فرمادی۔ اگر تربیت ہی کے لئے کوئی بات مستثنیٰ کی جاسکتی تھی تو میرے خیال میں تکئے کے غلاف کے ان تماثیل ذی روح کے خلاف کوئی حکم ہی نہیں دیا جاتا۔ اس لئے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے تکیہ کے غلاف وغیرہ پر کام کرنا بہت سہولت بخش ہے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے تصاویر ذی روح کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ یہ تربیت غیر ذی روح اشیاء کے تماثیل کے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً اچھے اچھے اشعار نقش کرنا، آم، سیب، انگور وغیرہ کے نقوش بنانا یا ان غیر ذی روح اشیاء کے مادی مجسمے بھی بنائے جاسکتے ہیں تاکہ کھیل میں استعمال کئے جائیں وغیرہ۔

کھیل کے لئے استثنار کیوں ؟ :-

پھر، کھیل کے لئے "غیر ذی روح" اشیاء کا جب اتنا بڑا میدان موجود ہے تو ان کے ہوتے تماثیل ذی روح کے استعمال کا حکم استثنار کس لئے روا رکھا جائے ؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضور صلی اللہ علیہ وعلی الہ وبارک وسلم تو تماثیل ذی روح کو توڑ دیں اور ہم یہ جواز رکھ لینے کی کوشش کریں کہ بچوں کے کھیل یا تعلیم و تربیت کے لئے تماثیل و تصاویر ذی روح کا بنانا یا کسی اور مقصد سے فلم دیکھنا جائز ہے تو یہ صریحاً ظلم ہے۔

عذاب آخرت سے بچئے :-

دوبارہ غور کیا جائے کہ مکرمی رفیع اللہ صاحب نے جو استدلالات پیش کئے ہیں وہ فقہی کے وہ آراء ہیں، جن میں غلطی ہے اور جن کے خلاف حدیث ہونے کا ثبوت اس مضمون میں فراہم کردیا گیا ہے۔

فقہی آراء جب حدیث کے خلاف ہوتے ہیں تو ان کو ترک کرنا لازمی ہو جاتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو گمراہی ہے۔

اس لئے تصاویر ذی روح یا اُن کے جزوی اعضاء، کا بنانا، خریدنا، فروخت کرنا، یا اُن کا فلم تیار کرنا یا کسی اور طریقے پر کسی بھی غرض سے اُن کی نمائش کرنا سب کے سب حرام ہیں ؛

جو حضرات اس بات کے علم میں آجانے کے بعد بھی اس کو ترک نہ کریں گے تو اُن حضرات کو ——— آنحضور صلی اللہ علیہ وعلی الہ وبارک وسلم کی نافرمانی کے سبب آخرت میں عذاب دیا جائے گا۔ اوپر احادیث میں اس عذاب آخرت کا حوالہ موجود ہے

والسلام علی من اتبع الہدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

دین و شریعت کے تمام مسائل ایک ہی نوعیت کے نہیں ہوتے، ایک تو وہ مسائل ہیں جن کا کسی اختلافِ رائے اور تاویل کے بغیر کفر و اسلام
باطل اور حق و ضلالت سے تعلق ہے۔ مثلاً پانچوں وقت کی نمازوں کی فرضیت کا "اقرار" اسلام "ہے اور ان میں سے کسی ایک وقت کی نماز کی فرضیت
"کفر" ہے اور اس بارے میں کسی تاویل اور اضطرار کو قبول نہیں کیا جا سکتا، پنج وقتہ نماز کی فرضیت کے بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں!
یہ "حق" ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر نبوت ختم کر دی گئی اور یہ باطل ہے کہ حضور کے بعد کوئی نبی آ سکتا ہے، ختم نبوت کا
ہمارے ایمان کا جزو لاینفک ہے ——— عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ اجسام میں
سود خواری، قمار بازی اس قسم کے دوسرے اعمال "فسق" ہیں ان کا مرتکب فاسق
کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے فروعی اور جزئی مسائل ہیں جو بعض فقہا ... تعبیر بعض
رکھتے ہیں، اسی طرح کراہت یا اباحت کے مدارج ہیں اور ان میں اختلاف ... پایا جا
بعض حقائق و واقعات اور معتقدات و مسائل کی یہ نوعیت ہے کہ جمہور کے مسلک سے اختلاف ...
لگایا جا... مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "جسمانی معراج" پر جمہور امت کا اتفاق ہے، لیکن جو چند لوگ معراج روحانی کے قائل ہیں ان کے ا
سے کفر ... اس بارے میں منسوب نہیں کی جاتی، اگرچہ یہ مسلک "نفس" واقعہ کے مطابق نہیں ہے!
جمہور امت کا یہ عقیدہ ہے اور قرآن و حدیث سے بھی یہی ثابت اور ظاہر و واضح ہوتا ہے کہ جنت و دوزخ کا واقعی حسی اور مکانی وجود
اجسام (مع الروح) عذاب و راحت سے متاثر ہوں گے مگر بعض لوگ" اجسام کے وجود کو منفی کر کے صرف "روحانی عذاب و راحت" کا عقیدہ رکھتے
کوئی شک نہیں سراسر غلط ہے مگر ان لوگوں پر اس انداز میں نکیر نہیں کی گئی کہ اس عقیدہ نے دین کی بنیادوں کو ڈھا دیا اور ان متجددین نے اسلام کو تباہ
زکوٰۃ اسلام کا رکن ہے، جس کا منکر کافر ہے اور جو مسلمان زکوٰۃ دینے کی استطاعت رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو اس کا یہ فعل
گناہ بھی کبیرہ! زکوٰۃ کی فرضیت کے تمام ائمہ اور مجتہدین قائل ہیں اور اس باب میں ذرہ برابر اختلاف نہیں پایا جاتا لیکن بعض "اشیاء" کی زکوٰۃ کے
ملتا ہے۔ مثلاً فقہ حنفی میں زیور پر زکوٰۃ دینی چاہیے مگر شافعی فقہ میں "زیور" پر زکوٰۃ نہیں ہے۔
"ربوا" سب کے نزدیک حرام قطعی ہے اور اس کی اباحت کا عقیدہ کفر ہے، اگر مصر کے چند مشاہیر علماء "ربوا" اور "بنک" کے منافع میں فرق کرتے ہیں
انہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، ان کا یہ فتویٰ صحیح نہیں ہے مگر چونکہ اس میں "تاویل" کا پہلو نکلتا ہے اس لئے ان علماء کے اس ضلالت آمیز
سے کفر و الحاد، ہدم دین اور اسلام و ایمان کی بربادی کو ... کیا گیا، اس گزارش کا مقصود یہ ہے کہ دینی مسائل پر نکیر و احتساب اسی نوعیت
کرنا چاہیے جس نوعیت و درجے کے وہ مسائل اپنی ذات سے واقع ہوئے ہیں!

حالات کی نوعیت کے اعتبار سے وقتی طور پر فقہی مسائل میں تخصیص و تعیین کی ضرورت بھی پیش آتی ہے، مثلاً قحط کے زمانے میں حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ "سارق" پر "قطع ید" کی حد کا اجرا ضروری نہیں سمجھتے تھے، اُن کے اس اجتہاد پر کسی صحابی نے نکیر نہیں کی! خالص دنیوی ضرورتوں کے لئے بھی بعض دینی قباحتوں کو ناگزیر اور گوارا کرنا پڑتا ہے مثلاً موجودہ دور میں پاسپورٹ کے لئے فوٹو کی قید لازمی ہے اور پاسپورٹ کے بغیر دوسرے ملکوں میں آنا جانا نہیں ہو سکتا، اس لئے بڑے بڑے دیندار و متقی لوگوں تک کو "فوٹو" کی قباحت بادل ناخواستہ گوارا کرنی پڑتی ہے! دوسری مثال بنکوں کے معاملات کی ہے جہاں سُود پر کاروبار چلتا ہے، اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے تاجر پائے جاتے ہیں جو بنک کے سود کو جائز نہیں سمجھتے اور اپنی جمع شدہ رقموں پر سُود نہیں لیتے مگر اس تمام ناگواری کے باوجود اگر وہ بنکوں سے معاملت نہ کریں تو ان کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا!

ان مقدمات کو ذہن میں رکھ کر اس صورتِ حال کا جائزہ لیجئے کہ پاکستان میں اسلام اور جمہوریت کو برسوں سے اُبھرنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ بیس برس آرڈیننسوں کے ذریعہ حکومت ہو رہی ہے اور یہاں ایک ایسا دستور نافذ ہے جس کی بدولت ایک فرد کی ذات تمام اختیار و اقتدار کا مرکز بن گئی ہے، یا اگر جمہوریت ہے تو اس جمہوریت کو آخر کیا نام دیا جائے کہ جس نے قومی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو بے اثر کرکے رکھ دیا ہے، عائلی قوانین "مداخلت فی الدین" اور شریعت حقہ میں تصرف بے جا کی کھلی ہوئی مثال ہے جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے! پاکستان میں نظام اسلام برپا کرنے کی راہیں اُسی وقت کھل سکتی ہیں جب کہ یہاں جمہوریت کے لئے فضا سازگار ہو اور شخصی اقتدار کی جگہ عوام کے ہاتھوں میں زمام اختیار آجائے، ابھی تک تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاکستان کے ایسے حالات ہیں کہ یہاں کے عوام مسلمان اسلام ہی کو حکومت اور معاشرے پر غالب اور مسلط دیکھنا چاہتے ہیں، اس لئے جمہوری آزادی کے ساتھ ساتھ اس کی توقع ہے کہ اسلامی قدروں کو بھی برسرِ کار آنے کا موقع مل سکے گا! جمہوریت کے احیاء کے لئے یہاں متحدہ محاذ قائم ہوا جس میں جماعت اسلامی دوسری پارٹیوں کے ساتھ شامل ہو گئی! متحدہ محاذ میں شریک ہو کر جماعت اسلامی کی اپنی تنظیم اس اتحاد میں ضم نہیں ہوئی، اُس کی انفرادیت اپنی جگہ بدستور باقی اور علیٰ حالہٖ قائم رہی اور انشاء اللہ العزیز قائم رہے گی۔ اسلام کی تاریخ میں یہودیوں، عیسائیوں، کافروں اور مشرکوں تک سے صلح و معاہدہ کی مثالیں تک ملتی ہیں، جماعتِ اسلامی کا یہ اتحاد بھی دینی نقطۂ نگاہ سے "بدعت" قرار نہیں دیا جا سکتا! اس کے بعد پاکستان کے منصب صدارت کے سلسلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت کا معرکہ آرا مسئلہ اچانک سامنے آگیا، جماعت اسلامی کے لئے بڑا ہی سخت، نازک اور مشکل مرحلہ تھا، ایک طرف دین و شریعت کے تقاضے تھے جن کی رُو سے عورت کی امارت ناپسندیدہ سمجھی گئی ہے بلکہ عام حالات میں ممنوع ہے۔ دوسری طرف ملک کے نازک حالات تھے، مطلق العنان اقتدار اور جمہوریت کی کشمکش تھی، ان مشکلوں اور نزاکتوں کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ جماعت کے اکابر جیل خانوں میں بند تھے، متحدہ محاذ کے اس فیصلہ کے بعد کئی دن تک جماعت نے اس مسئلہ میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا، نہ تائید نہ تردید! اُس کے ارکان نے علمی و دینی انداز میں اس مسئلہ کی تحقیق شروع کی، فقہ کی کتابوں میں عورت کی قضاءت وغیرہ کے بارے میں کچھ اقوال ملے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریروں نے اس دھندلکے کو اور زیادہ روشن کر دیا، پھر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع اور بعض دوسرے عُلماء کی مشورت و ہدایت کے بعد جماعتِ اسلامی نے متحدہ محاذ کے اس فیصلہ کی تائید کا اعلان کر دیا اس اعلان میں یہ ذہنی کیفیت پوری طرح نمایاں رہی کہ ناگزیر صورتِ حال اور شریعت کے اصول "اہون البلیتین" کے تحت بدرجہ مجبوری یہ صورت اختیار کی گئی ہے، شریعت کا اصول اپنی جگہ ثابت و قائم ہے کہ عورت کو امارت و حکومت نہیں سونپنی چاہئے، پھر اس اعلان میں جماعت نے اس کا بھی اظہار کر دیا کہ یہ واقعہ آئندہ کیلئے "نظیر" نہیں بن سکتا، دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم مولانا سید مہدی حسن کے فتوے نے جماعت اسلامی کے موقف کو اور زیادہ تقویت پہنچائی اور تذبذب و تامل کے اس رہے سہے غبار کو بھی دُور کر دیا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیل سے رہا کر باہر آئے تو انہوں نے جماعت کے اس فیصلہ کی تائید بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بعض علماء کرام کے اس فتوے کی تصویب کر دی۔

کیا کوئی شخص بہ ثباتِ ہوش و حواس یہ بات کہہ سکتا ہے کہ جس طرح نماز میں ایک کافر کی امامت قطعاً ناجائز اور حرام ہے اور چاہے کیسے ہی نازک اور ناگزیر حالات کیوں پیدا نہ ہو جائیں یہ حرمت اباحت سے نہیں بدل سکتی، ہرگز ہرگز نہیں بدل سکتی ــــــ تو کیا عورت کے امارت کے مسئلہ کی ٹھیک یہی نوعیت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اپنی جگہ ہوتی ہمہ دی حق ہے کہ عورت کی امارت میں "فلاح" نہیں ہے مگر اللہ کے دین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہی کی قدروں کو پامالی سے بچانے کے لئے ناگزیر حالات میں عورت کی امارت کو گوارا کر لیا جائے تو شریعت کا اصول "اہون البلیتین" کیا اس موقف کی تائید نہیں کرتا! پھر جس مسئلہ میں دیانت دار علماء کے مابین اختلاف واقع ہو گیا ہو کیا وہ مسئلہ حق و باطل کا مسئلہ ہو سکتا ہے اور اس مسئلہ کی تائید کرنے والوں پر کیا ان الفاظ میں نکیر کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے دین کی بیخ کنی کی ہے اور شریعت کو پامال و رسوا کیا ہے اور اس ایک مسئلہ نے دین کی توہین و تحقیر کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے اس کے بعد پاکستان سے دین کا وقار ہی رخصت ہو گیا اور دین کی ساکھ ہی جاتی رہی! اس انداز پر نقد و احتساب گیا اُن لوگوں کو زیب دیتا ہے جو ... ... کرام مسیم کی حقیقت کا عرفان رکھتے ہیں! یہ کیا کہ کسی نے ذرا سی سوئی چبھوئی ہو مگر اُس کے اس فعل کو "قتل و غارت گری" اور خون ... سے تعبیر کیا جائے، دین کی حرمت کوئی شک نہیں غایت رنگ لعمت ہے مگر اس حمیت کو نا العمانی اور بے جا غلو و تشدد کا رنگ تو اختیار نہ کرنا چاہئے جس کا بس ... درجہ گناہ، خطا، لغزش، تسامح، غفلت ... سرزنش، احتساب اور گرفت کرنی چاہئے!

عورت کی حاکمیت کے مسئلہ کی تائید میں صرف جماعت اسلامی ہی منفرد نہیں ہے ... اسلامی کے موقف کی تائید فرمائی ہے ان علماء میں بعض تو وہ ہیں جو تقریباً نصف صدی سے ... علماء میں اہل حدیث بھی ہیں، دیوبندی اور ندوی بھی ہیں، صوفی مشرب بزرگ بھی ہیں، ان سب ... بنانے پر کیا اس شبہ اور قیاس و رائے کے قرائن موجود نہیں ہیں کہ تمام ناقدین کا اصل مقصود "اعلان حق" کی آڑ میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو مطعون و مجروح کرنا ہے! کاش! یہ حضرات اپنے دلوں کو ٹٹول سکتے! اس قاضی اور مجسٹریٹ کو کیا کہا جائے جو ایک ہی جرم کا ارتکاب کرنے والوں میں سب کو بری کر کے صرف ایک ہی شخص کو سزا دینے کے لئے چن لیتا ہے۔ اگر ناقدین میں حق گوئی کی جرأت ہے تو وہ سب سے پہلے حضرت مولانا تھانوی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریروں کی دلائل سے تردید کریں، اس مسئلہ میں عقیدہ و نوشتوں کے تمام زہر آلود تیر کیا غریب مودودی ہی کے سینہ کے لئے وقف کر دئے گئے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے، یہ کیسی حق پرستی ہے۔

پاکستان میں خلافت راشدہ اور دینی ... ... ہو رہی تھی جس کے لئے "عورت" کے انتخاب کی تائید کی گئی تھی، یہ جمہوری صدارت کا مسئلہ تھا جس سے یہ توقع قائم کی جاتی تھی کہ مطلق العنان مرد کے ... جمہوریت پسند عورت اچھے مرد مشیروں کے ساتھ مل کر جمہوریت کی قدروں کو ابھار سکے گی، جن کے ساتھ اسلام کو بھی نمایاں ہونے کا موقع ملے گا جو ... (۹) نکات متحدہ محاذ کے منشور میں شامل ہیں، اگر صرف انہیں کو منشکل اور نافذ ہونے کا موقع مل جاتا تو پاکستان میں جمہوریت کے ساتھ ساتھ اسلامی ... کے پروان چڑھنے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں، دلوں کا حال کوئی نہیں جانتا کہ کون جماعت اور شخص واقعی کیا چاہتا ہے لوگوں کے وعدوں ہی پر اعتبار کر کے معاہدے کئے جاتے ہیں ــــــــــــ! اگر کوئی پارٹی یا فرد خدانخواستہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرے گا یا یہ محسوس کیا جائے گا کہ اس اتحاد سے دین کو نقصان پہونچ رہا ہے تو جماعت اسلامی وصل کے مقابلہ میں فصل کو ترجیح دے گی! جماعتِ اسلامی کے اتحاد و اختلاف کا معیار و بنیاد ــــــ اور یہاں اللہ تعالیٰ کے دین کی خیر خواہی اور اُس کی رضا کا حصول ہے!

دینی مسائل میں علماء کے ... ... اختلاف بھی واقع ہو جایا کرتا ہے، اختلاف کے واقع ہوتے ہی نقد و احتساب کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں اور طعن و طنز کی بھی نوبت آ جاتی ہے مگر صرف تنقید کے بھی اخلاقی حدود ہیں، زبان اور لہجہ کو بہر حال شائستہ ہونا چاہئے، اس مسئلہ میں بعض حضرات نے

نقد و احتساب مہذب لہجہ میں بھی کیا ہے لیکن دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ مولانا مودودی کی ذات سے جس عالم اور اہل قلم کو جتنی کد اور بیر بھی ہے اُسی شدت کے ساتھ دہن خامہ سے بغض و عداوت کے جھاگ نکلے ہیں ــــــ کوئی شک نہیں، بغض و عداوت کے جھاگ اور اس قبیل کے دوسرے الفاظ سخت ہیں جن کو لکھتے ہوئے، خود ہم دل گرفتگی محسوس کر رہے ہیں مگر اس پر ہمارا ضمیر مطمئن ہے کہ ہم نے یہ الفاظ لکھ کر کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی !

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو بہ سوئے سے جس انداز میں نشانۂ ملامت بنایا جاتا رہا ہے وہ حق پسندوں کا تو شیوہ نہیں ہوسکتا۔ سب سے پہلے "جماعت اسلامی" کی لفظی ترکیب ہی پر اعتراض وارد کیا گیا کہ اس جماعت کے علاوہ اور دوسری جماعتیں اور ادارے کیا غیر اسلامی ہیں ؟ جواب دیا گیا کہ یہ جو ہمارے ملک میں "اسلامیہ اسکول" "اسلامیہ کالج" "انجمن اسلامی" وغیرہ نام پائے جاتے ہیں کیا ان ناموں سے یہ مطلب لیا جاسکتا ہے اور کسی نے بھی ان ناموں پر اس طرح گرفت کی ہے کہ یہ ادارے اپنے علاوہ اور دوسرے اداروں اور انجمنوں کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں ــــــ مولانا مودودی کے نام (ابوالاعلیٰ) پر اعتراض کہ اس میں خودستائی اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہے، جواب میں عرض کیا گیا کہ جس طرح مولانا آزاد کا نام تو محی الدین تھا مگر انہوں نے اپنی کنیت "ابوالکلام" تجویز کی اور اسی کنیت سے وہ دنیا میں مشہور ہوئے، مولانا مودودی کے نام کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ یہ نام اُن کے والد کا رکھا ہوا ہے، مولانا موصوف کی اپنی رکھی ہوئی "کنیت" نہیں ہے، مولانا کے بڑے بھائیوں کے نام اسی انداز پر اُن کے والد نے ابو محمد اور ابوالخیر رکھے تھے ــــ۔ مولانا مودودی کو مطعون کرنے کے لئے یہ پیش گوئی کہ مودودی صاحب عنقریب اپنے مجدد ہونے کا اعلان کرنے والے ہیں ! اس کے جواب میں جب یہ کہا گیا کہ مولانا مودودی نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا، خود مولانا نے بھی اس کی تردید کی، یہ رنگ دیکھ کر کہ طعن و الزام کا یہ وار بھی ناکام رہا ــــــ تو اس وقت یوں پینترا بدلا گیا کہ مولانا مودودی چاہے دعویٰ کریں یا نہ کریں اُن کے مرنے کے بعد اُن کے معتقدین تو اُن کو "مجدد" ہی سمجھیں گے !

جماعت اسلامی کے منشور کی اس دفعہ پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت "معیار حق نہیں ہے" یہ اعتراض وارد فرمایا گیا کہ اس سے صحابہ کرام کی تنقیص ہوتی ہے، اس غلط خود ساختہ بلکہ مفسدانہ "استنباط" اور "اخذ مفہوم" کی خوب اشاعت کی گئی ــــــ پھر یہ تہمت جوڑی گئی کہ جماعت اسلامی والے اپنے سوا کسی دوسرے کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے، اس کی تردید تو خود مسلمانوں کے دل و دماغ اور اُن کی آنکھوں نے کر دی کہ جماعت اسلامی کے ارکان عام مسلمانوں کے ساتھ مسجدوں میں نماز پڑھتے ہیں اور اُن کی امامت میں پڑھتے ہیں، یہ حربہ بے کار گیا تو پھر یہ الزام تراشا گیا یہ خوارج کی جماعت ہے جو گناہ کبیرہ کو کفر سمجھتی ہے، اس کی بھی تردید کر دی گئی کہ "گناہ کبیرہ" موجب کفر نہیں ہے، فاسق مسلمان کتنا ہی خراب سہی مگر بہرحال وہ "مسلمان" ہی ہوتا ہے، ان تہمتوں کے ہجوم میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تکفیر و تضحیک کے لئے "کشف و کرامت" کا سہارا لیا گیا اور "اشراق باطن" کو اس فیصلہ کا مدار ٹھیرایا گیا اور اس بات کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ مولانا مودودی کے معاملہ میں ملاء اعلیٰ سے اسی قسم کا اشارہ اور ایماء ہوا ہے ــ یہ "لے" بڑھتے بڑھتے اس ناانصافی اور ظلم و زیادتی کی حد تک پہونچ گئی کہ مودودی صاحب کو غلام احمد پرویز اور غلام احمد قادیانی سے مشابہت دی گئی۔ بعض مولوی صاحبان نے عام جلسوں میں ڈنکے کی چوٹ اس "اعلان حق" کی "سعادت" حاصل کی کہ مولانا مودودی "امریکی اسلام" دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، اس لئے ان کی لکھی ہوئی کتابیں "بحق سرکار" ضبط ہونی چاہئیں، یہاں تک کہ امریکی نومسلم خاتون محترمہ مریم جمیلہ (اللہم کثر امثالہا) کی نسبت سے مودودی صاحب کے بارے میں پاکستان کے ایک مولوی صاحب نے اپنی سفید ریش دراز کو ہلا ہلا کر جلسہ عام میں ایسی ایسی رکیک باتیں کہیں، جو اُس شخص کی زبان سے جس کا اللہ آخرت کے مواخذہ پر ایمان رکھتا ہے نکل ہی نہیں سکتیں ــ

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر نقد و احتساب، طعن و طنز تہمتوں اور الزام تراشیوں کا جب یہ رنگ رہا ہو، تو عورت کی امارت کے مسئلہ میں اُن کے

محمد منصور علی

عائلی زندگی کا مقدس منشور

عورت زمانہ جاہلیت میں بہت زیادہ پست رہی ہے اس کی حیثیت جائداد کی طرح ہوا کرتی تھی جو باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو منتقل ہوتی رہتی تھی چنانچہ سوتیلے بیٹے سوتیلی ماں کو بیوی بنالیا کرتے تھے اور اس لحاظ سے اس کا معاشرہ میں کوئی مقام نہیں تھا پھر جوں جوں تہذیبیں وجود میں آتی گئیں عورت بھی ماحول کا ایک جزو بنتی گئی اور رفتہ رفتہ اس نے سماج میں ایک خاص مقام حاصل کرلیا۔ لیکن لاتعداد نفسیاتی پیچیدگیوں کی بناپر مفکرین کچھ اچھے خیال قائم نہ کرسکے چنانچہ یونان کے مشہور مفکر سقراط کا قول تھا کہ عورت سے زیادہ فساد اور فتنہ کی چیز دنیا میں ہے ہی نہیں لیکن پر بیٹھنے والی چڑیا کے لئے موت کا پیغام دیتا ہے۔ اس قسم کے اور اس سے ملتے جلتے خیالات تقریباً ... پر تحقیقاتی کام کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ عورت میں فطری طور پر کچھ حاسہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ خوبیاں اسمتھ کے خیال کے مطابق :—

"کانٹوں بھری شاخ کو پھول خوبصورت بنا دیتا ہے اور غریب سے غریب گھر کو نیک ...

رینالڈ نے کہا :—

"دنیا میں کوئی محل، کوئی ہیرا اتنا قابل قدر نہیں ہوتا جتنی ایک پاکباز اور عفت مآب عورت بالخصوص جبکہ وہ حسین بھی ہو"

گوئٹے کا قول ہے :—

"ہر بلند مرتبہ مرد کی رہنمائی عورت کے شیریں الفاظ کرتے ہیں" اور سینڈل کے قول کے مطابق :—
"جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ مصیبت میں عورت گھبرا جاتی ہے وہ عورت کی فطرت سے لاعلم ہے۔ طوفان آجائیں، مصائب کی گھٹا چھا جائے دولت چلی جائے، صحت رخصت ہوجائے چاروں طرف تکلیفیں اور آفتیں ہوں یہ سب دیکھ کر مرد گھبرا جاتا ہے عورت نہیں گھبراتی"

لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے ان تضاد بیانیوں سے علیحدہ ہوکر عورت کو نہ صرف ایک معزز بلکہ ایک مقدس مقام عطا کیا ہے اور یہ اعزاز صرف اسلام ہی کو حاصل ہے جس نے عرب جیسی جاہل قوم کے دماغ سے عورت کے متعلق فرسودہ خیالات کا قلع قمع کیا۔ اسلام اور عورت اور مرد کو برابر کا درجہ دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں عورت کی قدر و منزلت نے خاص توجہ فرمائی۔ آپ کی ازواج مطہرات کی کثرت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ امت پر بعض نازک اور باریک مسائل بھی واضح ہوجائیں۔ احادیث شریف میں عورت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر ارشادات ہیں جو نہ صرف عام انسانوں کے لئے بلکہ مفکرین کے لئے بھی شمع ہدایت ہیں۔ یہاں ہم ان میں چند خاص خاص ارشادات نقل کئے دیتے ہیں جو عملی زندگی میں ہر دو اصناف کے لئے قابل غور و فکر ہیں اور عملی نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

● ——— حضرت ابوشریح سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تو گواہ رہ کہ میں لوگوں کو بتا چکا ہوں اور اچھی

طرح ڈرا چکا ہوں کہ دو کمزوروں یعنی یتیم اور عورت کے حقوق ضائع کرنا سخت گناہ ہے۔ (بخاری)

● — حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو! میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ بیویوں کے ساتھ نیک سلوک کیا کرو، یاد رکھو کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور سب سے بڑی پسلی ہی سب سے زیادہ ٹیڑھی پسلی ہے، اگر تو عورت کو بالکل سیدھا کرنا چاہے گا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ ہاں ٹیڑھا رکھ کر ہی کام لے سکتے ہو، لوگوں میں پھر کہتا ہوں کہ بیویوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ (بخاری)

● — حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مرد کو نہ چاہئے کہ بیوی کا کوئی نقص دیکھ کر اس سے نفرت کرنے لگے بلکہ وہ یوں دیکھے کہ اگر اس میں نقص ہے تو کوئی نہ کوئی خوبی بھی ہے پس اس خوبی کو مد نظر رکھے اور دل میں نفرت نہ بٹھائے (مسلم)

● — حضرت عمروؓ بن احوص سے روایت ہے کہ میں نے خود سنا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا خطبہ پڑھا اس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و حمد بیان کی۔ پھر لوگوں کو بہت سی باتوں کی نصیحت کی پھر فرمایا لوگو! یاد رکھو کہ میں تم کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کرتا ہوں۔ دیکھو خدا نے تمہارے ماتحت ان کو کیا تم ان کے مالک ہو ہاں اگر کوئی عورت بے حیائی کے کام اختیار کرے تو بے شک تنبیہ کر سکتے ہو اس طرح کہ پہلے ان کو نصیحت کرو اگر اثر نہ ہو تو بطور اظہار ناراضگی ان کے ساتھ ایک کمرہ میں سونا چھوڑ دو پھر بھی نہ مانیں تو ان کو مار دو مگر ضرب خفیف پھر اگر وہ درست ہو جائیں تو پھر کوئی تکلیف ان کو نہ پہنچاؤ لوگو! یاد رکھو تمہاری بیوی کے ذمہ تمہارے حقوق ہیں پس تمہارا حق تو یہ ہے کہ جس کو ناپسند کرتے ہو ان سے وہ ملیں جلیں نہیں اور تمہاری اجازت کے بغیر وہ کسی کو گھر میں نہ آنے دیں اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان سے سلوک کرو کپڑے اور کھانے میں۔ (ترمذی)

● — حضرت معاویہ بن حیدہ سے روایت ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ میری بیوی کا مجھ پر کیا حق ہے۔ آپ نے فرمایا اپنی حیثیت کے مطابق اسے کھلا پلا اور کپڑے پہنا۔ دیکھو اس کے منہ پر تھپڑ نہ مارنا، برا بھلا نہ کہنا اس کی اصلاح کے لئے تنبیہ کرنی ہو تو اسے گھر سے نہ نکالنا مگر خود کچھ مدت کے لئے گھر سے علیحدہ ہو جانا۔ (بخاری)

● — حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان میں سب سے زیادہ وہ شخص کامل ہوتا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں بہتر وہ شخص ہے جو بیوی کے حق میں بہتر ہو۔ (ترمذی)

● — عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کا سب سامان عارضی اور فانی ہے مگر اس عارضی اور فانی سامان میں سب سے بہتر سامان نیک بیوی ہے۔

● — حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو! تم سب کے سب کسی نہ کسی کے سرپرست ہو اور تم سب سے پوچھا جائے گا اس کے متعلق جس کا وہ سرپرست تھا بادشاہ سے اپنی رعایا کے متعلق بازپرس ہوگی ہر مرد سے اس کے گھرانے کے متعلق ہر عورت سے اس کے خاوند اور بچوں کے متعلق۔ پس تم سب کے سب سرپرست ہو اور سب سے ان کی رعایا کے متعلق بازپرس ہوگی۔ (بخاری)

● — حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو تم بھی تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے خرچ کرے اس کا ثواب تجھ کو ملے گا حتیٰ کہ جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے اس کا ثواب بھی تجھے دیا جائے گا۔ (بخاری)

● — حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے مسلمان عورتو! ایک ہمسائی دوسری ہمسائی کو

چھوٹی سے چھوٹی نیکی سے دریغ نہ کرے مثلاً پائے پکا کرہی بھیج دے۔ (بخاری)

● حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورت سے نکاح کیا جاتا ہے کبھی اس کے مال کی خاطر کبھی اس کے خاندان کی وجہ سے کبھی اس کی خوب صورتی کے سبب اور کبھی اس کی دینداری کی وجہ سے۔ پس تجھے اللہ سمجھ دے تو نکاح کیجیو عورت سے اس کی دینداری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ (بخاری)

● حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی کو نہیں مارا۔ نہ کسی بیوی کو نہ کسی نوکر چاکر کو۔ (مسلم)

● حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ ایک قریشی عورت نے چوری کی جب پکڑی گئی تو قریش کو بطور سزا اس کا ہاتھ کاٹنے میں بڑی بدنامی معلوم ہوئی انہوں نے آپس میں کہا کہ اس کے بارے میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں کس کو بھیجیں۔ پھر خود ہی کہا کہ زید کے بیٹے اُسامہ کے سوا کسی کو جرأت نہیں کہ آپ سے اس کے بارے میں کچھ عرض کر سکے اس پر انہوں نے اُسامہ کو بھیجا حضرت اُسامہ نے حضور سے عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا اے اُسامہ اللہ
بارے میں سفارش کرتا ہے پھر آپ کھڑے ہوئے اور لوگوں میں ایک خطبہ پڑھا اور فرمایا
ہلاک کیا کہ جب ان میں کوئی خاندانی آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب کمزور
دیتے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کر

● حضرت ابوسعید سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص
سے صحبت کرتا ہے پھر صبح کو دوستوں اور آشناؤں پر اس کی پردہ کی باتیں ظاہر کرتا ہے۔ (مسلم)

● حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہم کچھ عورتوں کے پاس سے گزرے تو آپ نے ہم کو سلام کیا۔ (ابوداؤد)

● حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہرگز ہرگز کوئی مرد کسی عورت سے بغیر اس کے محرم رشتہ دار کی موجودگی میں نہ ملے اور نہ کوئی عورت سفر کرے بغیر محرم رشتہ دار کے ہمراہ ہونے کے۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری بیوی حج کے لئے جا رہی ہے اور میرا نام فلاں لڑائی میں جانے کے لئے لکھا گیا ہے آپ نے فرمایا تو جا اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کر۔ (بخاری)

● حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو! تم میں جب کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے یوں کہے میں اللہ کا نام لے کر یہ فعل شروع کرتا ہوں۔ اے اللہ ہم کو شیطان سے بچا اور جو بچہ ہم کو ملنے والا ہے اس سے شیطان کو دور رکھیو۔ تو ضرور اللہ تعالیٰ حمل ٹھہرنے کی صورت میں اس بچہ کو شیطانی تحریکوں سے محفوظ فرمائے گا۔ (بخاری)

● حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ صفیہؓ آپ کی بی بی ٹھنگنی (پستہ قد) ہے۔ آپ نے فرمایا عائشہ تو نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر وہ ایک بھرے ہوئے دریا میں ڈال دی جائے تو سب کو کڑوا کردے۔ (ابوداؤد)

● حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رحم کرے ایسے مرد پر جو رات کو نماز پڑھنے کے لئے اٹھتا ہے اور اپنی بیوی کو جگاتا ہے اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالتا ہے۔ رحم کرے اللہ تعالیٰ

اس عورت پر جو نماز کے لئے اٹھتی ہے اور اپنے خاوند کو جگاتی ہے اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالتی ہے۔ (ابوداؤد)

- حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی عورت اپنے خاوند کے سامنے کسی دوسری عورت کے حسن و جمال کا نقشہ نہ کھینچے۔ (بخاری)
- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کے لئے جائز نہیں کہ بغیر اپنے خاوند کی اجازت کے کسی کو گھر میں آنے کی اجازت دے۔ (بخاری)
- حضرت عمرانؓ ابن حصین کا بیان ہے کہ حضور انور نے فرمایا۔ میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا اکثر لوگوں کو فقرا میں سے پایا اس کے بعد دوزخ میں دیکھا وہاں اکثر رہنے والی عورتیں دیکھیں۔ (بخاری)
- رسول اکرمؐ نے فرمایا مجھے کشف میں دوزخ دکھائی گئی اس میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو اپنے کفر کی وجہ سے دوزخ میں ڈالی گئی تھیں۔ صحابہ نے عرض کیا وہ اللہ تعالیٰ کا زیادہ کفر کرتی ہیں فرمایا۔ وہ خاوند اور احسان کی ناقدری کرتی ہیں جو کفران نعمت ہے۔ خواہ تم ایک عرصہ دراز تک ایک عورت سے نیک سلوک کرتے رہو لیکن جب اسے تمہاری ایک بات بھی اپنی مرضی کے خلاف نظر آئے گی تو فوراً کہہ اٹھے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔ (بخاری)
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مومن عورت اس حالت میں مری کہ اس کا خاوند اس سے خوش اور راضی ہے وہ خدا کے فضل سے جنت میں داخل ہوگی۔ (مسلم)
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مباح چیزوں میں جو سب سے مبغوض چیز ہے وہ اللہ کی نگاہ میں طلاق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بات اتنا خوش نہیں کرتی جتنا غلاموں کو آزاد کرنا اور کوئی بات اتنا ناراض نہیں کرتی جتنا طلاق دینا۔
- حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت کے مطابق حضرت محمدؐ کا ارشاد ہے کہ ایک عورت دوسری سے گھل مل کر اپنے شوہر سے اس کے حالات یوں بیان نہ کرے کہ گویا وہ مرد اس عورت کو اپنی نظر کے سامنے دیکھ رہا ہے۔
- ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں کسی غیر اللہ کے سجدہ کو جائز سمجھتا تو عورت کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کرے۔ (ترمذی)

عائلی زندگی کا یہ وہ مقدس منشور ہے، جو اہلی زندگی کو مطمئن، خوش حال اور بابرکت بناتا ہے، مغربی تہذیب کے بقول آج مغرب کے گھرانے جہنم بنے ہوئے ہیں! عائلی زندگی ہو یا سیاسی زندگی، انفرادیت ہو یا اجتماعیت، حکومت ہو یا تجارت نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لائے ہوئے دین اور ضوابط حیات کی اتباع کے بغیر دنیا فوز و فلاح نہیں پا سکتی، کاش! آج کے دانش ور اس حقیقت کو پا سکتے ہیں!
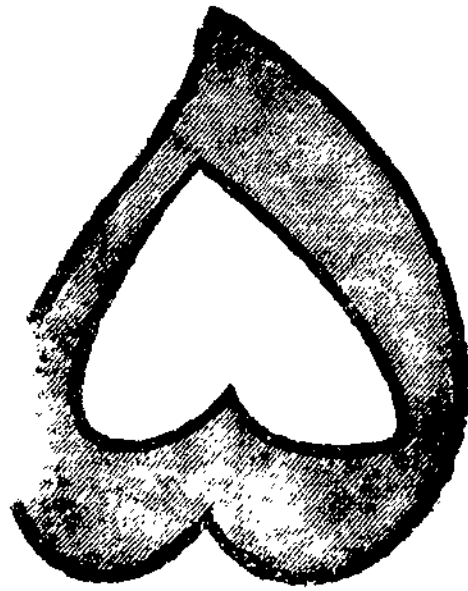
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Sporik
01/65

مولانا حبیب الرحمٰن
(خطیب مسجد ہاشمیہ پیر کالونی)

آفت و عذاب — عبرت کے چند ورق

بلاشبہ برے اعمال ہمیشہ آفت لاتے ہیں۔ حق تعالیٰ بغیر تنبیہ کئے نہیں پکڑتا۔ اسی باعث انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا گیا تاکہ لوگ بے خبر اور غافل نہ رہیں اور انہیں خیر و شر سے پوری طرح آگاہ کر دیا جائے۔

چونکہ عذاب الٰہی بغیر اتمام حجت کے نہیں آتے تو انبیائے کرام کی موجودگی میں ان کے ذریعے اتمام حجت کیا جاتا ہے اور ان کی غیر موجودگی میں ان کے نائبین کے ذریعے۔

فطرت انسانی ہے کہ جب وہ اول اول کسی معصیت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے چھپ چھپ کر کرتا ہے تاکہ کوئی روک ٹوک نہ کر سکے۔ گویا دل میں ایک احساس شرمندگی ہے جو اسے گناہ سے روک رہا ہے۔

لیکن جب شیطان کے پھندے میں پھنس کر یہ معصیت کر گزرتا ہے تو یہ احساس شرمندگی ختم ہو جاتا ہے۔ اب صرف ایک حجاب باقی رہ جاتا ہے لیکن وہ بھی رفتہ رفتہ دور ہو جاتا ہے۔

اس کے نتیجہ میں انسان بے باک اور بے خوف ہو جاتا ہے اور علانیہ اس معصیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ اسے دیکھ کر اس کو شعار اختیار کرتے ہیں اور یہ شے عمومی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

جہاں یہ صورت ظاہر ہوتی ہے تو اس کا ردعمل بھی شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں لوگ اس پر سختی سے نکیر کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کی شدت کم ہوتی جاتی ہے کیونکہ شر بہ نسبت خیر کے جلد اثر پذیر ہوتا ہے۔ پھر ایک دور آتا ہے کہ نکیر کرنے والوں کی تعداد بہت محدود ہو جاتی ہے۔ معصیت عام ہو جاتی ہے اور اس کی برائی دلوں سے مٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور دور آتا ہے جب کہ معصیت عاصی کی نگاہ میں خیر بن جاتی ہے اور جو اس پر نکیر کرتا ہے یہ اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ یہ سیاہ قلبی کی آخری منزل ہے۔ اس منزل پر پہونچنے کے بعد کوئی دعوت اور سرزنش کارگر نہیں ہوتی گویا اس قوم کا مردود و معذب ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ جب کوئی قوم اس نازک منزل میں پہونچ جاتی ہے تو اس پر رحمت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں تاکہ وہ نعمتیں جو یہ قوم اپنی غربت و افلاس کی بنا پر انجام نہ دے سکی تھی انہیں بھی پورا کرلے۔

یہ بے وقوف اسی تصور میں منہمک ہوتے ہیں کہ اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو یہ رحمتیں کیوں نازل ہوتیں۔ نتیجۃً جو کمی باقی تھی وہ بھی پوری ہو جاتی ہے یہ اسی غفلت میں مدہوش ہوتے ہیں کہ اچانک عذاب الٰہی انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر یہ امر واضح فرمایا ہے ایک مقام پر ارشاد ہے۔

فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیہم ابواب کل شیٔ ط حتیٰ اذا فرحوا بما اوتوا اخذنٰھم بغتۃ فاذا ھم

جب لوگ ان احکام کو بھلا دیتے ہیں جن کا انہیں حکم دیا گیا ہے تو ہم ان پر ہر شے کے دروازے کھول دیتے جب وہ ہاتھ

سنہ ۲۸۰ھ ۔ مصر میں آسمان پر ایک زبردست سرخی ظاہر ہوئی جو رات تک چھائی رہی ۔ جس میں ہر شے سرخ نظر آتی تھی حتیٰ کہ ان کے ہاتھ پاؤں بھی [illegible] لوگ خوف خداوندی سے دعاؤں میں مشغول ہو گئے ۔

سنہ ۲۸۵ھ ۔ بصرہ میں زرد رنگ کی آندھی آئی جو بعد میں سبز ہو گئی اور آخر میں سیاہ پڑ گئی ۔ اس کے بعد متعدد شہروں پر چھا گئی ۔ اس آندھی کے بعد ژالہ باری ہوئی اولوں کا وزن ڈیڑھ سو درہم تھا ۔ اس آندھی سے بصرہ میں پانسو درخت گرے ۔۔۔۔۔۔ ایک گاؤں پر سیاہ و سپید پتھر آسمان سے برسے جس سے یہ گاؤں تباہ ہو گیا

سنہ ۲۸۶ھ ۔ بغداد میں ایک زبردست زلزلہ آیا جو متواتر کئی روز تک جاری رہا ۔ اسی سال بصرہ میں ایک زبردست آندھی آئی اس سے قبل [illegible] بھی دیکھنے آئی تھی اور نہ سننے میں ۔ جس سے بصرہ کے عام درخت گر گئے ۔

سنہ ۲۹۲ھ ۔ دریائے دجلہ میں سیلاب آیا ، اور اکیس ہاتھ پانی چڑھ گیا ایسا سیلاب دجلہ میں کبھی نہ آیا تھا ۔ اس سیلاب نے پورے بغداد کو تباہ و برباد کر دیا

سنہ ۳۰۰ھ ۔ دینور میں ایک پہاڑ زمین کے اندر دھنس گیا اور اس کی جگہ سے پانی ابلنے لگا جس سے بہت گاؤں غرق ہو گئے اسی سال ایک خچر پیدا ہوا [illegible] پیدائش کے وقت اتنا بڑا تھا جیسے بچھیرا ہو ۔

سنہ ۳۱۲ھ ۔ موصل کے مقام پر دریائے دجلہ جم گیا حتیٰ کہ اس پر جانور اور گاڑیاں چلنے لگیں حالانکہ [illegible] اس کا پانی [illegible]

سنہ ۳۱۶ھ ۔ ابوطاہر قرمطی [illegible] نے ایک شہر تعمیر کیا جس کا نام [illegible] رکھا اور [illegible] شروع کر دی [illegible] اس نے وہ زور باندھا کہ خلیفہ وقت بھی اس سے گھبرانے لگا لشکر خلافت [illegible] شکست کا سامنا ہوا [illegible] بھاگ گئے اور سینکڑوں حاجیوں کے قافلے تہہ تیغ کئے گئے ۔ ہزاروں بچے [illegible] گئے اور [illegible] سال تک حج [illegible]

سنہ ۳۱۷ھ حجاج منصور دیلمی کے ساتھ حج کو گئے اور مکہ معظمہ [illegible] پہنچ گئے لیکن دوران حج ابوطاہر قرمطی نے [illegible] طواف کعبہ کر رہے تھے شہید کر دئے گئے ۔ خانہ کعبہ میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں [illegible] حجر اسود کو توڑ کر اکھاڑ لیا اور اپنے ساتھ لے گیا [illegible] اس خبیث کے پاس [illegible] لیکن اس نے انکار کر دیا اکیس روز تک مکہ میں قتل عام [illegible]

امام محمد بن الربیع بن سلیمان فرماتے ہیں کہ [illegible] وقت یہ حادثہ پیش آیا میں [illegible] موجود تھا [illegible] توڑنے کے لئے [illegible] میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھا کر کہا اے میرے [illegible] زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ وہ آدمی نیچے گرا اور اس کا دماغ پھٹ گیا [illegible] چپک گیا پھر نیچے گرا اور اس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ۔

سنہ ۳۲۳ھ جمادی الاولیٰ میں بغداد میں زبردست آندھی چلی جس سے بالکل سیاہی چھا گئی ۔

ذی قعدہ میں تمام رات بے پناہ تارے ٹوٹتے رہے ۔

سنہ ۳۲۸ھ دریائے دجلہ میں سیلاب آیا اور انیس ہاتھ پانی چڑھ گیا جس سے اکثر بغداد غرق ہو گیا ۔

سنہ ۳۰۸ھ بغداد میں سخت قحط پڑا اور خوب لوٹ مار ہوئی ۔

سنہ ۳۳۰ھ ۔ بغداد میں قحط پڑا اور ایک کر گندم تین سو سولہ دینار میں فروخت ہوا لوگوں نے مردار تک کھائے ۔ بغداد میں اس سے قبل ایسا قحط کبھی رونما نہ ہوا تھا ۔

سنہ ۴۸۴ھ۔ بغداد میں سیاہ آندھی آئی۔ سخت کڑک اور بجلیاں گریں۔ ریت اور مٹی بارش کی طرح برسی۔ لوگ قیامت کا گمان کرنے لگے اور یہ عذاب تین گھنٹے جاری رہا۔

سنہ ۴۸۹ھ سبعہ سیارہ برج زحل کے برج حوت میں جمع ہوئے نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ طوفان نوح سے بھی زبردست طوفان آئے گا لیکن صرف دارالمناقب میں سیلاب آیا جس سے حاجیوں کا ایک قافلہ غرق ہو گیا۔

سنہ ۴۹۸ھ بغداد میں چیچک کی وبا پھیلی جس میں حد و شمار سے زیادہ بچے مرے۔ اس کے بعد ایک اور زبردست وبا پھیلی جس میں ہزاروں افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

سنہ ۵۰۲ھ مصر میں ایک سیاہ آندھی چلی جس میں ہاتھ تک نظر نہ آتا تھا۔ لوگوں کو تباہی کا یقین ہو گیا کچھ دیر بعد وہ زرد پڑ گئی اور یہ عصر سے مغرب کے بعد تک جاری رہی۔

سنہ ۵۱۱ھ سنجار میں ایک سیلاب آیا جس نے اس کی فصیل کو غرق کر دیا۔ پانی نے فصیل کا دروازہ تین میل پرے پھینک دیا جو کئی سال بعد مٹی کے نیچے سے ظاہر ہوا اس سیلاب میں سنجار کا کوئی بھی باشندہ نہ بچا صرف ایک دودھ پیتا بچہ بچا جو تخت پر پڑا ہوا تھا پانی اس تخت کو بہا کر زیتونہ لے گیا یہ بچہ بڑھاپے تک زندہ رہا۔

سنہ ۵۲۴ھ موصل میں ایک بادل اٹھا جس نے سارے شہر کو گھیر لیا اور اس سے آگ برسنی شروع ہو گئی جس سے اکثر شہر خاکستر ہو گیا۔ اسی سال بغداد میں بچھو پیدا ہوئے جو اڑتے تھے اور جن کے دو ڈنک تھے لوگ ان کے خوف سے کانپنے لگے ان بچھوؤں نے بہت سے بچوں کو ہلاک کر دیا۔

سنہ ۵۳۳ھ جزیرہ میں زبردست زلزلہ آیا جس کے اثرات تین میل تک تھے۔ جزیرہ کی اکثر آبادی ہلاک ہو گئی اس کے بعد جزیرہ زمین میں اتر گیا اور اس جگہ سیاہ پانی ابلنے لگا۔

سنہ ۵۴۴ھ ایک زبردست زلزلہ آیا جس سے بغداد دس بار ہلا اور حلوان میں ایک پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔

سنہ ۵۴۵ھ یمن میں خون کی بارش ہوئی جس سے تمام زمین سرخ ہو گئی اور لوگوں کے کپڑے تک خون میں سرخ ہو گئے۔

سنہ ۵۶۹ھ سواد اور قح مصر میں نارنگی کے برابر اولے پڑے جس سے بہت سے مکانات گرے اور بہت سے جانور مرے۔ دریائے دجلہ میں زبردست سیلاب آیا جس سے بغداد غرق ہو گیا۔ جمعہ کی نماز فصیل سے باہر ادا ہوئی تمام ذخائر ختم ہو گئے بہت سے گاؤں اور مزارع غرق ہوئے اور لوگ اللہ کے سامنے گڑگڑائے

سنہ ۵۷۴ھ بغداد میں آدھی رات کے قریب زبردست آندھی چلی اور آسمان کے کناروں پر آگ کے ستون نظر آئے لوگ استغفار میں مشغول ہو گئے اور صبح تک یہی کیفیت طاری رہی۔

سنہ ۵۹۲ھ مکہ میں سیاہ آندھی آئی جو کچھ دیر بعد تمام دنیا پر چھا گئی۔ لوگوں پر سرخ ریت برستا رہا اور رکن یمانی کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر گیا۔

سنہ ۵۹۳ھ ایک بڑا تارا ٹوٹا جس کے ٹوٹنے سے ایک زبردست آواز پیدا ہوئی۔ جس سے تمام در و دیوار ہلنے لگے۔ لوگ خوف و دہشت سے استغفار میں مشغول ہو گئے اور یہ خیال کرنے لگے کہ قیامت آگئی۔

سنہ ۵۹۶ھ دریائے نیل تقریباً خشک ہو گیا اور تیرہ ہاتھ پانی بھی نہ رہا جس کے باعث پورے مصر میں قحط پڑ گیا حتیٰ کہ آدمیوں نے مردار اور انسان تک کھا لئے۔ سنہ ۵۹۷ھ مصر و شام اور جزیرہ میں زبردست زلزلہ آیا جس نے اکثر شہر اور قلعہ جات تباہ کر دئے اور بصرہ میں ایک گاؤں زمین میں دھنس گیا۔

سنہ ۵۹۹ھ محرم کی ابتدائی تاریخوں میں تارے ٹوٹنے شروع ہوئے اور اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اڑ رہے تھے جیسے ٹڈی دل چھا گیا ہو لوگ گھبرا کر دعا و استغفار

میں مشغول ہوگئے۔

۶۵۲ھ مصر میں عدن میں ایک آگ ظاہر ہوئی۔ رات کو اس کے شرارے سمندر کی جانب جاتے اور دن میں زبردست دھواں اٹھتا۔

۶۵۴ھ۔ ۳ جمادی الآخر بروز چہارشنبہ مدینہ منورہ میں ایک زبردست زلزلہ پیدا ہوئی اس کے بعد زبردست زلزلہ آیا اور پانچ دن تک اس زلزلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ایک زبردست آگ [illegible] سے شروع ہوتی تھی اس آگ کا ایک سیلاب وادی شطا کی جانب بڑھا یہ آگ بالکل اس طرح بہتی تھی جیسے پانی کا سیلاب [illegible] ایک ایک حصہ مینار کے برابر ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ مکہ معظمہ سے اس کی روشنی نظر آتی تھی۔ اور بصرہ میں [illegible] چلتے ہوئے اونٹوں کی گردنیں [illegible] میں نظر آتی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آگ کی پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس وقت تک قیامت نہ آئے گی جب تک [illegible] جس سے بصرے کے اونٹوں کی گردنیں نظر آنے لگیں یہ آگ پتھروں کو جلاتی تھی۔ لیکن درخت اور لکڑی پر کوئی اثر نہ کرتی تھی۔ [illegible] عرض میں چار میل اور لطف یہ کہ آدمی قریب جانے کے بعد اس میں کوئی تپش محسوس نہ کرتا تھا۔ یہ آگ تین ماہ تک باقی رہی اور تین ماہ تک سورج اور چاند [illegible] گہن رہے۔

۶۶۲ھ قاہرہ میں بہت سے مقامات پر آگ لگی۔ جگہ جگہ [illegible] آئے جن میں گندھک

۷۰۲ھ مصر وشام میں زبردست زلزلے آئے اور لاکھوں آدمی مکانات کے نیچے دب کر مر گئے

۷۱۷ھ دریائے نیل میں طغیانی آئی جس نے بہت سے شہروں کو تباہ کر دیا اور مصر کی ایک کثیر آبادی

۷۴۴ھ مصر میں زبردست اولے پڑے اور بجلیاں گریں۔

۷۴۹ھ زبردست طاعون پھیلا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

۸۲۱ھ بلبیس میں ایک بھینس پیدا ہوئی جس کے دو سر دو گردنیں، دو دمیں۔ چار ہاتھ دو پاؤں اور ایک کمر تھی۔

۸۲۴ھ دریائے نیل میں طغیانی آئی جس نے تمام ساحلی علاقے کو برباد کر دیا۔

۸۲۵ھ امام جلال الدین بلقینی کے یہاں نواسہ پیدا ہوا جس میں مردانہ اور زنانہ ہر دو علامتیں پائی جاتی تھیں دو ہاتھ زائد تھے جو ہتھیلیوں میں جڑے ہوئے تھے، سر پر دو سینگ تھے۔ یہ بچہ کچھ دیر بعد مر گیا۔

۸۸۶ھ ۱۱ محرم کو پوری دنیا میں زلزلے آئے۔

اس تمام فہرست پر نظر ڈالئے، اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچئے کہ کیا ہم ان عذابات کے مستحق نہیں اور نہ معلوم کس وقت ہم پر خدا کا قہر نازل ہو اور توبہ واستغفار کی بھی مہلت میسر نہ ہو۔

اب صادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ان عذابوں کی آمد کا وقت بھی سن لیجئے۔

عن ابی قتادۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الآیات بعد المائتین۔	ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عذابات کا نزول دو سو سال بعد ہوگا۔

ابن ماجہ ۔ مشکوٰۃ ص ۴۷۲

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عذابات کی مختلف وجوہات بھی بیان فرمائی ہیں اور عذابوں کی اقسام بھی بیان فرمائیں ارشاد ہے۔

یکون فی آخر ہذہ الامۃ خسف ومسخ وقذف	اس امت کے آخر میں لوگوں کو زمین میں بھی دھنسا دیا جائے گا۔

قالت عائشہ قلت یارسول اللہ انہلک و فینا الصالحون قال نعم اذا ظھر الخبث ۔

ترمذی ص۱۲۱

صورتیں بھی بگاڑی جائیں گی اور آسمان سے پتھر بھی برسائے جائیں گے حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا نیک لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم ہلاک ہو جائیں گے فرمایا ہاں جب برائی عام ہو جائے گی ۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا۔

فی ھذہ الامۃ خسف ومسخ وقذف فقال رجل من المسلمین یارسول اللہ ومتی ذلک قال اذا ظھرت القیان والمعازف وشربت الخمور ۔

اس امت کو زمین میں بھی دھنسایا جائے گا ۔ صورتیں بھی بگاڑی جائیں گی اور آسمان سے پتھر بھی برسیں گے ۔ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ یہ کب ہوگا ۔ فرمایا جب گانے والی اور باجے عام ہو جائیں گے اور شرابیں پی جانے لگیں گی ۔

ایک حدیث میں ان گناہوں کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے جن کی بنا پر امت پر عذابات الٰہی نازل ہوں گے ارشاد ہے ۔

اذا اتخذ الفئ دولا والامانۃ مغنما والزکوۃ مغرما وتعلم لغیر الدین واطاع الرجل امرأتہ وعق امہ وادنی صدیقہ واقصیٰ اباہ وظھرت الاصوات فی المساجد وساد القبیلۃ فاسقھم وکان زعیم القوم ارذلھم واکرم الرجل مخافۃ شرہ وظھرت القینات والمعازف وشربت الخمور ولعن آخر ھذہ الامۃ اولھا فلیرتقبوا عند ذلک ریحا حمراء وزلزلۃ وخسفا ومسخا وقذفا وآیات تتابع کنظام بال قطع سلکہ فتتابع ۔

جب مال غنیمت کو دولت ، امانت کو غنیمت اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جانے لگے گا ۔ دین کے علاوہ تعلیم حاصل کی جانے لگے گی آدمی بیوی کی فرمانبرداری کرے گا ۔ ماں کی نافرمانی کرے گا ۔ دوست کو قریب کرے گا باپ کو دور کر دے گا ۔ مساجد میں لوگ چلانے لگیں گے ۔ قبیلے کا سردار فاسق و فاجر ہوگا ۔ قوم کا رہنما سب سے زیادہ ذلیل ہوگا ۔ آدمی دوسرے سے اپنی عزت بچانے کے لئے اس کی عزت کرے گا ۔ گانے والیاں اور باجے عام ہو جائیں گے شرابیں پی جانے لگیں گی امت کا آخری حصہ پہلوں پر لعنت کرے گا تو ایسے وقت سرخ آندھی ، زلزلہ ، زمین میں دھنسنے ، صورتیں بگڑنے آسمان سے پتھر برسنے اور دیگر نشانیوں کا انتظار کرو جو یکے بعد دیگرے اسی طرح آئیں گے جیسا کہ موتی کی لڑی ٹوٹ کر موتی گرتے ہیں ۔

حضرت علیؓ کی روایت میں ریشم پہننے کا بھی ذکر ہے ۔

ایک اور حدیث میں یہ بھی تشریح فرما دی ہے کہ امت کا وہ کون سا طبقہ ہے جو زمین میں دھنسایا جائے گا ۔ ارشاد ہے ۔

لیشربن ناس من امتی الخمر یسمونھا بغیر اسمھا یعزف علی رؤسھم بالمعازف والمغنیات یخسف اللہ بھم الارض ویجعل منھم

میری امت کے کچھ لوگ شراب پئیں گے لیکن شراب کا نام تبدیل کر دیں گے ۔ ان کے سروں پر ساز بجیں گے اور گانے والیاں گائیں گی اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے گا اور بعض کو ان میں سے

مُلّا واحدی

تاثرات

نشانِ مردِ مومن —— چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے :- ان الذین قالوا ربنا اللہ ، (جنہوں نے مان لیا اور تسلیم کرلیا اور صاف صاف بر ملا کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے (ہم خود بخود نہیں ٹپک پڑے ہیں، ہمیں اللہ تعالیٰ نے وجود بخشا ہے اور وہی ہمیں پالتا پوستا ، نشو و نما دیتا اور جب تک چاہتا ہے زندہ رکھتا ہے) ثم استقاموا ، (پھر اس پر جمے رہے، ڈھل مل نہیں ہوتے۔ گرگٹ کے سے رنگ نہیں بدلے۔ شک و شبہ کے ڈبکیاں نہیں کھائے گئے اور اپنے ایمان کا اپنے عمل سے ثبوت دیا ، ایمان کے مطابق عمل کرکے دکھایا۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکے نہیں کسی کو اس کے سوا عبادت اور اطاعت کا مستحق نہیں گردانا ، اللہ کے عائد کردہ فرض اور حقوق ادا کیے ، تتنزلُ علیھم الملٰئکۃ الّا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ، (اُن کے مرنے، یعنی دنیا سے واپس جانے کے وقت ؟ اُن کے پاس فرشتے آتے ہیں (اور اطمینان دلاتے ہیں) کہ تم ڈرو نہیں اور غمگین مت ہو، (بلکہ یوں سمجھو کہ ڈر اور غم کا دور ختم ہوا ؟ اب تو اُس جنت کی خوشیاں مناؤ جس جنت کا تم سے وعدہ تھا۔ (تمہیں حرفِ غلط کی طرح مٹایا نہیں جا رہا) نحن اولیٰؤکم فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ، ہم (اللہ کی طرف سے اور اللہ کے حکم سے) دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے مددگار تھے اور آخرت میں بھی (مددگار ہوں گے ، تمہیں شیطان سے بچاتے تھے ، آخرت میں تمہارے اعزاز و اکرام کا اہتمام کریں گے) ولکم فیھا ما تشتھیٓ انفسکم ولکم فیھا ما تدّعون ۔ وہاں تمہارے لئے ہر وہ شے مہیا ہے، جس کو تمہارا دل مانگے ، وہاں تم جو مانگو گے اُسے پاؤ گے (اللہ کے ہاں کس شے کی کمی ہوسکتی ہے) نُزُلاً من غفور الرحیم (معمولی بات تھوڑا ہی ہے۔ جنت میں تم خدا کے مہمان ہو گے) یہ (جنت کی زندگی) خدائے غفور و رحیم کی جانب سے (تمہاری) مہمان داری ہے ۔ (سورہ ۴۱ — آیات ۳۰ تا ۳۲)

دوسری جگہ ہے :- یٰٓاَیَّتُھَا النفس المُطْمَئِنَّۃُ ، اے وہ روح ! جس نے (مجھ سے لو لگائی اور میری یاد اور میری طاعت میں) سکون محسوس کی ، اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ، (آ) تو اپنے رب (کے سایۂ رحمت کی سمت چلی آ ، اس شان سے کہ تو رب سے راضی ، اور رب تجھ سے راضی ۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۙ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۔ اور پھر میرے (مقبول) بندوں میں جا مل اور میری جنت میں داخل ہو جا ۔ (سورہ ۸۹ - آیات ۲۷ تا ۳۰)

مولانا جلال الدین رومیؒ نے موت کو بادل اور درخت سے تشبیہ دی ہے جیسے پانی اوپر سے آتا ہے اور بھاپ اور بادل کی شکل میں دوبارہ اُوپر جاتا ہے ، یا طلعہ اوپر سے زمین کے اندر پہونچتا ہے اور پھر درخت بن کر اوپر نکلتا اور اُبھرتا ہے ، ایسے ہی روح مٹی کے جسم میں چند دن رہتی ہے اور بالآخر جسم سے نکلتی اور اوپر چڑھتی ہے۔ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مولانا رومی کے بیان کی شرح میں فرماتے ہیں :- بارش کا پانی

ہم آپ سب دیکھتے ہیں کہ آسمان سے زمین یعنی اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے زمین پر بہتا ہے، پھیلتا ہے، ندی نالے، دریا سمندر کا جلوہ بنتا ہے۔ زمین میں جذب ہوتا ہے، اور زمین پر اپنی زندگی کی میعاد پوری کرنے، یہ بھی ہم سب جانتے ہیں کہ وہی پانی لطیف تر صورت اختیار کرکے اور ایک طرح کی ہوا بن کر بادل بننے کے لئے پھر آسمان کی سمت میں اُڑ جاتا ہے۔

نیز یہ بھی ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ گیہوں کے دانے اوپر ہی سے زمین میں بکھیرے جاتے ہیں اوپر سے نیچے زمین پر گرتے ہیں، زمین میں بہتے ہیں سڑ سے جاتے ہیں اور پیوست ہو جاتے ہیں لیکن پھر ایک مدّت معینہ کے بعد زمین سے سر نکالتے ہیں اور اُبھرتے ہیں۔

یہ روزمرہ کے مشاہدے جسمانیات سے متعلق ہیں، بے جان ہستیوں کے ہیں۔ روح اور پھر انسانی روح تو ہر جسم سے لطیف تر اور حیات کی ساری صورتوں سے شریف تر ہے اس کا مستقر اور ٹھکانا یہ خاک کثیف کیوں کر ہو سکتی ہے، یہ تو اس کی صرف ایک منزل راہ اور سفر و سیاحت کا ایک وقتی پڑاؤ ہے۔ اس کی آمد اور ورود کی جو غرض و غایت ہے اُسے پورا کر کے اسے تو بہر حال اپنے مستقر اصلی کی طرف واپس جانا ہے اور رفعت افلاک کی جانب رجوع کرنا ہے۔ نہ وہ جنت سے انجان اور ناآشنا اور نہ جنت اُس کے لئے اجنبی اور عنصری خاکدان ہے اور وہ دن اُس کے لئے ماتم و شیون کا نہیں، فرح و سرور کا ہوگا۔ جب وہ اپنے ہر محبوب سے زیادہ محبوب آقا اور ہر شفیق سے زیادہ شفیق مالک کے حضور جا کھڑی ہوگی یا صدائے جاں فزا سنتی ہوگی۔ ہاں جو اپنے کو خود ہی مریض و معذور، سوختہ و مفلوج بنالیں

علمی ذوق کا فقدان

کہتے ہیں، انگریزی زبان کے پاس بڑا علمی ذخیرہ ہے۔ آج کوئی زبان اس اعتبار سے اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انگریزی زبان میں ناول، ڈرامے اور افسانے ہی نہیں ہیں، انگریزی زبان علمی کارناموں سے بھری پڑی ہے ۱۹۱۰ء کی بات ہے، علامہ اقبال نے مجھے نصیحت کی تھی کہ انگریزی زبان کی کتابیں بھی پڑھا کیجئے۔ پڑھنے کے بعد محسوس ہوگا کہ پہلے کیوں نہیں پڑھا۔ میں نے منشی ذکاء اللہ جیسے ماہر علوم مشرقی اور مولانا ابوالکلام جیسے عالم دین کو انگریزی کا اعلیٰ لٹریچر مطالعہ کرتے دیکھا ہے یہ حضرات انگریزی بول نہیں سکتے تھے اور لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن انگریزی اتنی جانتے تھے کہ ٹھوس علمی کتابیں پڑھ لیتے تھے اور سمجھ لیتے تھے، انگریزی کی اہمیت اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا، غور طلب امر صرف یہ ہے کہ انگریزی علوم تک ہماری دسترس کس قدر ہے۔ اقبال کی طرح کتنے مسلمان اور ہندو ہیں، جنہوں نے انگریزی علوم حاصل کئے ہیں اور جنہیں انگریزی علوم نہ جاننے والوں، منشی ذکاء اللہ، مولانا ابوالکلام، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے برابر علمی مرتبہ ملا ہے اور اقبال بھی کیا اقبال ہو سکتے تھے، اگر وہ مشرقی اور اسلامی علوم سے بہرہ ور نہ ہوتے۔

انگریزوں کے دوسرے محکوم ممالک کا ذکر چھوڑیئے، ہندوستان میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی یہ رہی کہ تھوڑے سے ہندوستانیوں کو لکھنے پڑھنے کی صنعت سکھا دی جائے اور انہیں انگریزی حکومت کی مشین کا پُرزہ بنالیا جائے۔ بس تھوڑے سے ہندوستانیوں کو ان پڑھ نہ رکھا جائے۔ ہندوستان میں

انگریزی تعلیم کا نصاب ایسا مقرر کیا گیا جس سے فراغت پاکر دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں شخص فلاں علم کا ماہر ہوگیا، مثلاً کالجوں کے نصاب میں فلسفہ اور منطق ہے قطعی، لیکن میں قدیم طرز کے بہت سے فلسفیوں اور منطقیوں کو جانتا ہوں، جن کے سامنے بھارت اور پاکستان کی یونیورسٹیوں کے منتہی فلسفی اور منطقی زبان نہیں کھول سکتے۔

نصاب عربی مدارس کا بھی فرسودہ اور قابل اصلاح ہے چنانچہ ندوۃ العلماء قائم کرکے اصلاح کا قدم اٹھایا جاچکا ہے۔ آئندہ اور قدم اٹھیں گے، مگر انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کی اصلاح کی طرف کم از کم پاکستان میں قدم نہیں اٹھا۔ یہاں علمی ذوق بالکل مفقود ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں علمی ذوق والے کچھ پیدا ہو جاتے تھے، اب مطلق نہیں ہو رہے ہیں۔ مولانا محمود الحسن اور مولوی اشرف علی، مولانا شبلی اور سید سلیمان کے جانشین کسی درجے میں نظر آتے ہیں، اقبال کا جانشین کسی درجے میں نظر نہیں آتا، ضرورت ہے کہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کی طرف فوراً توجہ کی جائے اور علمی ذوق کو اور زیادہ نہ بگڑنے دیا جائے۔ پاکستان میں علم کا ویسا ہی چرچا ہونا چاہیے جیسا عہد مامون الرشید عباسی اور ہارون الرشید عباسی کے بغداد اور عہد عبدالرحمٰن ثالث اموی اور عہد حکم ثانی اموی کے قرطبہ میں تھا۔

اسلام نے دوسرے علوم کے حصول سے روکا نہیں ہے، بلکہ حصول کا شوق دلایا ہے۔ ایک حدیث ہے "عرب سے چین بھی جانا پڑے، تو علم سیکھنے کی خاطر لمبا سفر اختیار کرو"۔ ایک اور حدیث ہے "حکمت مومن کی گم شدہ میراث ہے، حکمت جہاں دکھائی دے، اُسے لے لو"۔ ظاہر ہے کہ علم دین سیکھنے تو عرب سے چین کون جاتا، عرب سے باہر تو دوسرے علوم ہی سیکھے جاسکتے ہیں خود کلام اللہ میں ہے "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ اور سکھائے اللہ نے آدم کو سب اشیاء کے نام۔ (سورہ ۲۔ آیت ۳۱) اشیاء کے نام سے مراد اشیا کی حقیقت اور خاصیت اور نفع اور نقصان سب ہے اور سکھا دینے سے مراد ہے کہ حصول علم کی انسان میں صلاحیت رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس صلاحیت کو انسان کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ اسی صلاحیت کے باعث انسان اشرف المخلوقات ہے اور دنیا میں اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے اور جو یہ صلاحیت کھودے وہ چوپائے کی مانند ہے، بلکہ اُس سے بھی بدتر۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ (سورہ ۷۔ آیت ۱۷۹)

اقتدار کی محبت

عمر بن عبدالعزیز پر اللہ کی رحمت ہو، مسلمانوں میں جہاں عمر بن عبدالعزیز سے ملتے جلتے، بے نفس بادشاہ گزرے ہیں، وہاں مسلمانوں میں تہ کے بھوکوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اپنے چند روزہ اقتدار کے لیے وہ لوگ، جو اللہ اور روز قیامت کے قائل نہیں ہیں، کچھ بھی کیا کریں، تعجب کے لائق مسلمان ہیں، مسلمانوں کو اقتدار کے پیچھے عاقبت خراب کرتے دیکھا جاتا ہے تو واقعی تعجب ہوتا ہے مسلمانوں نے غیروں سے اتنا نقصان نہیں اٹھایا جتنا اپنوں سے اُٹھایا ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

جس ملک میں مسلمانوں کو زوال آیا، آپس کی کھینچا تانی، نا اتفاقی اور خانہ جنگی کی وجہ سے آیا۔ اقتدار کے شیدائیوں نے مسلمانوں سے مسلمانوں کا خون بہوا دیا۔ دراصل اقتدار کی محبت مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہے جو مسلمان اللہ کی منشا کے مطابق حکومت

مکانات، آرام دہ ریل گاڑیاں، بسیں، ہوائی جہاز، روزگار کی سہولتیں، تعلیم کے مواقع اور حق رائے دہی کی آزادی فراہم تو کر لی ہے لیکن اس کو یہ نہیں کہ وہ یہ سب کچھ پا کر خدا کے باغی و نافرمان بن جائیں ـــــ بلکہ اور زیادہ اُس کے مطیع و فرماں بردار بنیں۔ اس کی گوناگوں نعمتوں کے شکر گزار ہوں اور ہر آن ان کی پیشانیاں اس کے حضور سرنگوں رہیں[1]۔ یعنی یہ مادی اسباب و ذرائع اسلامی مملکت میں عین مقصود نہیں بلکہ ایک آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے عوام کو ان نعمت کا صحیح شعور دینی اور نیابت خداوندی کا صحیح عرفان بخشتی اور انہیں فلاح و کامرانی کی حقیقی راہ پر ڈالتی ہے اور قرآن کی زبان میں ـــــ واولئک ھم المفلحون۔

---

[1] قارئین کرام کو میرا یہ طرزِ تحریر کچھ عجیب سا محسوس ہوگا کہ دنیا کی کسی اسلامی حکومت میں بھی ان جدید مادی وسائل کو مندرجہ بالا مقصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن میں ایسے ایک امر واقعہ کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ یہ تعجب درست ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ نام نہاد اسلامیت کی بجائے جب خالص اسلامی نظریہ کی بنیاد پر کوئی حکومت استوار ہوگی اور اس کے چلانے والے [illegible] تو کام کا خاکہ بلا اختلاف کے یہی ہوگا۔ جس کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ قرآن کا [illegible] ارشاد ہے "[illegible] کو زمین میں حکومت و فرماں روائی دیں تو وہ اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کا نظام قائم [illegible] ہیں / قائم کریں گے اور ان کی ساری طاقتیں بھلائی کو پھیلانے اور برائی کے مٹانے میں صرف

اسرار احمد خان سہارنپوری
ایم اے - ایل ایل بی

روحِ انتخاب

ب کیا ہے -

ادب دراصل صورتِ احساس کی نقش گری کا نام ہے یعنی جذبات و احساسات کو موزوں اور دلآویز الفاظ میں بیان کر دینا ادب ہے
ہ تقریر و خطابت کی صورت میں نمودار ہو سکتا ہے، شعر و شاعری کے لباس میں جلوہ نمائی کر سکتا ہے۔ ادب نثر نگاری کے مختلف پیرایوں میں نیرنگیاں
اسکتا ہے ادیب اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے، زندگی کی قدروں کے متعین کرنے میں یہ کارفرما ہوتا ہے جمالیاتی شعور کو اجاگر کرنا اس میں
ن ۔ توافق ۔ ہم آہنگی اور معیاری لطافت پیدا کرنا اس کا کام ہے، شعورِ اخلاقی کو بیدار کرنا اس کی تربیت کرنا ادب کے ذمے ہے۔ ضمیر کو نفس امّارہ پر
بق صالح کرنا ۔ مذاقِ سلیم کی جلا کرنا اس کا فرضِ منصبی ہے۔ ادب ہمارے تہذیب و تمدن کے معیار کو بلند کرتا ہے ۔ ہمارے شعور ۔ تحت الشعور اور لاشعور
یل نفسی کر کے ہمارے کردار کی کمزوریوں کی آئینہ داری کرتا ہے ادب ہماری زندگی کے ایک ایک گوشے میں جھانکتا ہے یہ ہماری خوشی کا بھی ساتھی ہے
م کا بھی شریک ہے ۔ غریب کے جھونپڑے میں بھی پہونچتا ہے اور بادشاہوں کے محلوں کی بھی سیر کرتا ہے ادب دراصل ہمارے دلوں کی دھڑکن کی آواز ہے
موزوں الفاظ کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے آتی ہے اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ادب ایک ہمہ گیر تا فون ہے جو کہ ایک تہذیب کا ناگزیر حصہ
۔ ادب نہ تو محض اندرونی وارداتِ قلبی کا نام ہے نہ محض بیرونی افعال انسانی کا ۔ ادب معمارِ تمدن بھی ہے اور تعمیرِ تمدن بھی ۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے
اشرت کا اثر ادب پر پڑتا ہے اور ادب کا معاشرت پر ۔ معاشرتی نظام ۔ طبقاتی تقسیم ۔ معیشتی اصول ۔ سیاسی تنظیم ۔ تعلیمی نظام ۔ بنیادی مسلمات
رہن جذباتی لب و لہجہ ۔ ماضی کی یاد ۔ مستقبل کی توقعات ۔ یہ تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر مستقل طریقے سے ہمارے ادب کو خاموشی سے متاثر کرتی رہتی
۔ ادب کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات کی عمیق ترین بنیادوں کو ہماری نظروں کے سامنے لاکر پیش کر دے ۔

ب اور مقصدیت

ادب برائے ادب پر ہمارے پریس میں بہت کچھ گفتگو ہو چکی ہے اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ بات بالکل مہمل سی تھی جس کو ترقی پسندوں
نے کچھ سیاسی مقاصد کے لئے ہوا دی ورنہ بے مقصد ادب کا دنیا میں کبھی وجود نہیں تھا ۔ نہ آئندہ ہوگا ۔ ہر زمانے کے ادب کا کچھ نہ کچھ مقصد رہا
راہ لذت ہو یا مسرت ۔ وعظ ہو یا نصیحت ۔ سیاسی پروپیگنڈہ ہو یا مذہبی تلقین ۔ اصلاح ہو یا فسادِ معاشرہ غرضکہ بھلا یا بُرا ادب کا مقصد ضرور
ہے دیکھنے کی بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ مقصد بھلا ہے یا برا اور یہ کہ مقصد کو کس ڈھنگ سے ادب میں سمویا گیا ہے ادب کی لطافت تو مقصد کی
بار سے مجروح نہیں ہوتی اگر لطافت و دلپذیری قائم ہے تو ادب کی ادبیت کا یا شعریت کا حق پورا پورا ادا ہو گیا ۔

ہماری نظر میں

الرسائل القشیریہ تالیف :- ابی القاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری - ترجمہ :- ڈاکٹر محمد حسن التعریب و تلخیص :- عبدالرحمن طاہر سورتی ، ضخامت ۸۲ صفحات (پائیدار جلد رنگین سرورق ، دیدہ زیب ٹائپ) قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ :- انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ ، پوسٹ بکس ۳۵ ، حیدر علی روڈ ، کراچی ۵

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۴۶۵ھ) کی شخصیت تصوف کی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہے ... ہمارے سامنے ہے ، کتاب کا آغاز عربی مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں امام قشیری کے حالاتِ زندگی یکجا کئے مولد و منشاء ، تعلیم ، بیعت ، شیوخ و تلامذہ اور تالیفات کی تفصیل دی ہے یہاں تک کہ اُن کی ...

امام قشیری کے یہ رسائل ——— شکایت اهل السنہ بحکایۃ ما نالہم ——— اور ترتیب السلوک ——— پر مشتمل ہیں ، جن میں اخلاق و تصوف اور تزکیہ نفس کے علاوہ امام قشیری قدس سرہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضور اپنی قبر میں زندہ ہیں ... دلیلیں پیش کی ہیں۔

تصوف کیا ہے ؟ اس کی حقیقت امام موصوف کی زبان سے سنئے :-

"وہ تصوف جس کے ساتھ پاکیزگی اور پارسائی نہیں ہے وہ فریب ہے ، تکلف ہے ، اگر تصوف نہیں ہے اور ہر وہ باطن جس کا ظاہر مخالف ہو باطل ہے ، باطن نہیں ہے ، ہر وہ فقر جس کو صبر و قناعت کے ساتھ مضبوط نہ کیا گیا ہو بدبختی اور محرومیت ہے فقر نہیں ! اور ہر وہ علم جس کی تصدیق عمل سے نہیں ہوتی ہے جہل و ظلم ہے علم نہیں ہے اور ہر وہ توحید جسے کتاب و سنت صحیح تسلیم نہ کریں الحاد ہے نہ توحید اور ہر وہ معرفت جس کے ساتھ ورع اور استقامت نہ پائی جائے فریب ہے ، معرفت نہیں ہے ..... اور ہر وہ اشارہ جو صحیح معرفت اور سچی پرہیزگاری سے پہلے کیا گیا ہو خسارہ ہے ، اشارہ نہیں ..... "

تصوف کی یہ تعلیمات اخلاق و تزکیہ نفس اور اخلاص و عبدیت کی روح ہیں کوئی ہوشمند اور معقول انسان اس کی افادیت اور عظمت و تقدیس پر حرف گیری نہیں کر سکتا۔

——— مگر ———

تصوف کا جہاں یہ رنگ ہے ، وہاں خلجان پیدا ہوتا ہے ، امام صاحب موصوف فرماتے ہیں :-

"اس انتہائی مقام تک پہونچنے سے پہلے ان احوال کے دوران اسے تمام کائنات اس کے نور سے روشن دکھائی دیتی ہے یہاں تک کہ کائنات کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہوتی، چنانچہ وہ تمام کائنات کو خواہ آسمان ہو خواہ زمین اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے"۔ (ص ۶۰)

اس قسم کا دعویٰ تو کسی صحابی نے بھی نہیں کیا کہ تمام کائنات مجھ پر روشن ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز میری نگاہوں کے سامنے ہے! پھر امام قشیری یہ بھی فرماتے ہیں :—

"اور یہ کیفیت "جمع الجمع" کی کیفیت ہوتی ہے، اس وجہ سے تو کہنے والا یوں کہہ گیا —— "انا الحق" [illegible] نے کہا "سبحانی" —— یہ الفاظ خود حق تعالیٰ نے فرمائے تھے، کیوں کہ حق تعالیٰ شخصیتوں کو [illegible]" (ص ۶۰)

کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے اس قسم کے وجد و جذب کے دعووں کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی، اس لئے ان شطحیات [illegible] اجتناب کرنا چاہئے۔ غیرت توحید "انا الحق" کو بھلا کس طرح برداشت کر سکتی ہے: "عبد روحانی ترقی کر کے چاہے کہیں پہونچ جائے [illegible] امتیاز باقی رہتا ہے"

اردو ترجمہ عام فہم ہے، [illegible] ہے، صفحہ [illegible] پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی، بعض دوسرے مقامات [illegible] انہوں نے کھٹک محسوس کی [illegible] کی بجائے "محرومیت" لکھا گیا ہے! کوئی شک نہیں اس کتاب کو یورپ کے علمی اور تحقیقی انداز پر ایڈٹ کیا گیا ہے۔ [illegible] ظاہری [illegible] بھی حسین ہے۔

حیات امام حسن رضؓ

از :- پیام شاہجہاں پوری، ضخامت [illegible] صفحات (مجلد) [illegible]

ملنے کا پتہ :- ملک دین محمد اینڈ سنز [illegible]

جناب پیام شاہجہاں پوری کی دو کتابیں —— سنی دوران کی خلافت —— اور [illegible] حامی مقبول ہو چکی [illegible] تیسری کتاب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی سیرت پر آئی ہے! یہ کتاب حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے :—

خدیجۃ بنت خویلد —— فاطمۃ بنت محمد —— علیؓ ابن ابی طالب —— حسنؓ بن علیؓ —— حسنؓ اور معاویہؓ کی کشمکش [illegible] —— معاویہ بن ابوسفیان، خلافت سے دست برداری —— سیرت و کردار۔

فاضل مصنف حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی ذات گرامی اور ان کی اولاد سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں یہ کتاب اسی عقیدت کا مظہر ہے۔ عقیدت کی اس عینک سے جب ان کی نگاہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار پر پڑتی ہے تو انہیں طرح طرح کے داغ دھبے نظر آتے ہیں۔ موصوف امیر معاویہ [illegible] اجتہادی غلطی کو "غلطی اور لغزش" مانتے ہیں! کوئی شک نہیں [illegible] اور حضرت علی کی نزاع میں حق حضرت علی کے ساتھ تھا مگر امیر معاویہ کے بارے [illegible] جو طعن آمیز الفاظ اس کتاب میں استعمال کئے گئے ہیں، وہ [illegible] شیعی نقطۂ نگاہ سے قریب ہیں! کتاب کی فہرست میں جہاں ابوطالب کا نام آیا ہے اس پر رضی اللہ عنہ کا مخفف "رضؓ" نظر آیا مگر ابوسفیان کا نام اس علامت (رضؓ) سے خالی ہے، حالانکہ حضرت ابوسفیان کا ایمان [illegible] مسلّم ہے اور یہ کوئی نزاعی مسئلہ نہیں ہے، ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ تمام پچھلی خطائیں معاف فرما دیتا ہے!

لائق مصنف حضرت امیر معاویہ کے شرف صحابیت اور سیاسی، انتظامی اور عسکری قابلیت کے قائل ہیں، مدان کو صاحب تدبیر و سیاست فاتح و قائد بھی سمجھتے ہیں اس اعتراف کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں :—

"امیر معاویہ کی سیاست کا دوسرا افسوسناک پہلو سیاسی سودا بازی کا ہے، وہ ہر اس شخص سے گٹھ جوڑ کر لیتے تھے

جو اُن کے مطالب براری کے لئے مفید ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ اندازِ تنقید محتاط مسلم مورخین کے نزدیک پسندیدہ نہیں سمجھا جائے گا! فکان صحابیاً تائب!

حضرت امام حسنؓ نے امیر معاویہ سے صلح کرکے حکومت ان کے حوالے کردی تھی۔ حضرت امام کے اس فعل کو عام طور پر سراہا گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو خانہ جنگی اور خون ریزی سے بچا لیا مگر اس کتاب کے مصنف کی اس بارے میں یہ رائے ہے :۔

"بہرحال حضرت امام حسنؓ کا یہ ذاتی خیال اور اجتہاد تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت عارضی طور پر تو یہ خونریزی بند ہوگئی، لیکن اس کے بعد اسی مسئلہ پر جو شاید خونریزی شروع ہوئی تو صدیوں تک جاری رہی اور ہزاروں نہیں لاکھوں جانیں ضائع ہوگئیں، بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اگر امام حسنؓ خلافت سے دست بردار نہ ہوتے تو شاید کربلا کا حادثہ فاجعہ بھی پیش نہ آتا، اسی لئے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اگر خلافت کی بقاء و قیام کے لئے ستر ہزار نہیں ستر لاکھ جانیں بھی ضائع ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں تھا کیوں کہ خلافت البتہ ہر چیز پر مقدم تھی چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں خلافت کی نعمت اُٹھ گئی اور انہیں ملوکیت کے استبداد کی چکی میں بُری طرح پسنا پڑا" (ص ۲۷)

یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی موت "زہر دینے" سے ہوا، متہم کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ مشہور مورخ ابن اثیر اور صاحب اسد الغابہ تک یہ لکھتے ہیں مگر فاضل مصنف نے دلائل کے ساتھ اس الزام اور واقعہ کی تردید کی ہے اُن کی رائے یہ ہے:

"جس طرح لوگ بیمار ہو جاتے ہیں، اسی طرح حضرت امام حسنؓ بھی بیمار ہوئے۔ یہاں تک کہ مولائے حقیقی سے جا ملے ۔۔"

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ آپ بیاہ شادی کے معاملہ میں بڑے حریص واقع ہوئے تھے آپ نے نوے (۹۰) سے بھی زیادہ شادیاں کیں اور اتنی طلاقیں دیں کہ آپ کی مُطلقہ بیویوں سے ایک محلہ آباد ہو گیا مگر اس کتاب کے مصنف نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام حسن کی شادیوں کی تعداد دس (۱۰) سے زیادہ نہ تھی ——— اس تحقیق پر اللہ تعالیٰ مصنف کو اجر عطا فرمائے گا۔

اس کتاب میں نہج البلاغہ (الجزو الثانی) سے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا جو وصیت نامہ بنام امام حسنؓ نقل کیا گیا ہے اُس کے بعض اجزاء کھٹکے، مثلاً یہ :———

"خواہ میں بقیدِ حیات رہوں یا وفات پا جاؤں، میرے اور تیرے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، تو میری روح تھا ہے، اگر تجھ پر کوئی مصیبت پڑے تو پہلے مجھ پر نازل ہوگی، تیری موت تیری موت نہیں، میری موت ہوگی" (ص ۹۸)

یہ شاعرانہ اور خطیبانہ اندازِ بیان ہے ورنہ جب کوئی آدمی مرجاتا ہے تو اُس کے کسی زندہ عزیز پر کوئی مصیبت نازل ہونے سے پہلے مرے ہوئے شخص پر کس طرح نازل ہو سکتی ہے، اور پھر زندہ عزیز کی موت کو فوت شدہ آدمی کی اپنی "موت" کہنا عجیب سی بات ہے۔

"اپنے آباء و اجداد اور خاندان کے بزرگوں کا طریق کار اختیار کر" (ص ۱۰۳)

حضرت امام حسن عسکری تو اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کر سکتے تھے (اپنے آباء و اجداد کا طریق اختیار کر) مگر حضرت علی ایسی نصیحت اُس وقت فرما سکتے تھے جب کہ عبدالمطلب، ہاشم، عبدالدار، عبد مناف اور قصی، مرہ، لوی ۔ ۔ ۔ وغیرہ سب کو مومن تسلیم کیا جاتے!

اس قسم کے مضامین، افکار و عقائد، زبان اور طرز بیان پر غور و فکر کرنے کے بعد ارباب تحقیق کی یہ رائے ہے کہ "نہج البلاغہ" میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اقوال کے ساتھ الحاقات بھی پائے جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر "حیات امام حسن" معلومات آفریں کتاب ہے، جناب پیام شاہ جہاں پوری نے اس کی تالیف و تدوین میں بڑی محنت کی ہے!

قرآن وحدیث از :- مولانا قاری محمد طیب، ضخامت ۴۱۲ صفحات (مجلد) قیمت دو روپے پچیس پیسے

ملنے کا پتہ :- ادارۂ علوم شرعیہ، کراچی

حدیث نبوی کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جو منظرِ عام پر آئی ہے! فاضل مصنف مدظلہ نے عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ "حدیث" قرآن کریم کی شرح و تفصیل ہے اس کا اور قرآن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ امت "حدیث" سے بے نیاز ہو کر قرآن پر بھی عمل نہیں کر سکتی احادیث کی اقسام بہ حیثیت رواۃ و اسناد کیا ہیں؟ اس کی تفصیل عام فہم انداز میں کی گئی ہے۔ صرف ایک اقتباس سے کتاب کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

"..... اگر آیت و روایت کا بعینہٖ ایک ہی مضمون ہے تو حدیث کو بیان تاکید کہا جائے گا اگر آیت کے مختلف محملات میں سے کسی ایک احتمال کو حدیث نے متعین کیا ہے تو بیان تعیین کہا جائے گا، اگر آیت کا پیش کردہ حکم مقدار کے لحاظ سے مبہم ہے، جسے حدیث نے مشخص کیا ہے تو بیان تقریر کہا جائے گا، اگر آیت کے کسی اجمال کو حدیث نے کھولا اور پھیلایا ہے تو بیان تفصیل ہوگا، اگر آیت کے کسی چھوڑے ہوئے مضمون مثلاً کسی قصہ کے ٹکڑے کو یا دلیل کے کسی مقدمہ کو حدیث نے اس کے ساتھ ملا دیا ہے تو بیان الحاق کہا جائے گا اگر آیت کے حکم کی وجہ حدیث نے ظاہر کی ہے تو بیان توجیہ کہا جائے گا، اگر آیت کے کسی کلیہ کا کوئی جزئیہ حدیث نے ذکر کر دیا ہے تو بیان تمثیل ہوگا۔ اگر حکم آیت کی علت حدیث نے واضح کی ہے تو بیان تعلیل کہا جائے گا، اگر کسی حکم قرآنی کے خواص و آثار حدیث نے کھولے ہیں تو بیان تاثیر کہا جائے گا اگر کسی عام کا کوئی فرد مشخص کر دیا ہو تو بیان تخصیص کہا جائے گا، اگر کسی آیت کے کسی جزئیہ کے مشابہ کوئی جزئیہ کسی مشترک علت کی بنا پر حدیث نے پیش کیا ہو تو بیان قیاس کہا جائے گا، اگر آیت کے کسی اصول کلی سے حدیث نے کوئی کلیہ اخذ کر کے نمایاں کیا ہو، تو بیان استخراج کہا جائے گا..... غرض حدیث نبوی قرآن کا بیان ہے اور بیان کی مختلف انواع ہیں جو نوعیت مضامین کے لحاظ سے مشخص ہوتی ہیں....."

حدیث کی اقسام، حدیث کا شریعت کی حجت مستقلہ ہونا، حدیث کا قرآن اور فقہ سے ربط وغیرہ عنوانات پر فاضل مصنف نے حکیمانہ اور عالمانہ انداز میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت خوب ہے، قابل قدر اور مستحق تحسین و ستائش ہے[1]

---

[1] شیخ الہند سیدنا و مرشدنا مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ محدث دیوبندی نے اس ترجمہ کے بارے میں اپنے استاد حضرت قاسم العلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کا مقولہ نقل فرمایا ہے ــــ کہ قرآن اردو میں نازل ہوتا تو اس کی عبارت بھی یا اس کے قریب قریب ہوتی جو حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی ہے (ص ۲ ۱۳۲) یہ ناپسندیدہ بیجا مبالغہ ہے، شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن اپنے زمانہ کے اعتبار سے بہت خوب ہے مگر ہمارے زمانے میں وہ زبان کتنے ہی مقامات پر اجنبی اور غیر مانوس لگتی ہے! اسلاف کے بارے میں مبالغہ آمیز ان حضرات کا خاص مزاج ہے مولانا قاری محمد طیب صاحب کو اپنے

طب یونانی کی سرگذشت

از :- پروفیسر حکیم نیر واسطی ، ضخامت ۴۳ صفحات ، قیمت آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ :- مجلس بو علی سینا لاہور

جناب حکیم نیر واسطی عالم ہیں، شاعر ہیں، [illegible] حاذق طبیب ہیں ، وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے :—

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

تو ان تمام خوبیوں کے ساتھ وہ عالمی سیاح بھی ہیں ، صاحب موصوف نے اس کتابچہ میں یونانی طب کی تاریخ بیان کی ہے اور سچ تو یہ ہے اتنی قدیم تاریخ کو چند صفحوں میں سمیٹ کر سچ مچ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے ۔ طب کی ابتدا ، کس طرح ہوئی ؟ بابل ، مصر ، چین ، یونان ، ایران ، روم اور ہندوستان میں طب کا آغاز کیوں کر ہوا ؟ مسلمانوں نے طب یونانی کو کس طرح محفوظ کیا ؟ بقراط و جالینوس کے طبی کارنامے ، عہد مغلیہ کے شفاخانے —— ان سب کی تفصیل اس کتابچہ میں ملتی ہے ۔ فاضل مصنف کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں :—

" حاصل کلام یہ کہ یونانی یا عربی طب کا کارواں آج بھی گرم سفر ہے اور وہ چراغ جسے [illegible] نے آٹھ ہزار سال قبل بابل میں روشن کیا تھا ، مصر اور عراق کے بعد یونان کو روشنی عطا کی آج بھی مختلف شکلوں [illegible] "

معنوی خوبیوں کے ساتھ کتاب کی ظاہری صورت [illegible] بھی حسین [illegible]

خدائے سخن میر تقی میر

از :- [illegible] صدیقی [illegible] ، ضخامت ۲۰۴ صفحات [illegible]
ملنے کا پتہ :- مکتبہ عزم [illegible] [illegible] الٰہی بخش [illegible]

[illegible] میر پر متعدد کتابیں ، بے شمار مضامین اور مقالے آ چکے ہیں مگر اس کتاب کو پڑھ کر کی [illegible] گلدستہ اور جامع تصنیف کی کمی رہ جاتی ۔ فاضل مصنف شعر کی پرکھ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی سخن [illegible] دیتے ہیں —— اس کتاب کے چند منتخب اقتباسات :—

● —— سودا کی زندہ دلی نے انہیں احساس محرومی سے محفوظ رکھا ، ان کی شاعری میں جینے کا حوصلہ ہے ، اُن کی آواز میں مردانگی اور تقویت ہے لیکن غزل کا فن جذبہ کی آنچ کے بغیر پختہ اور اثر آفریں نہیں بنتا ، یہی وجہ ہے کہ غزل میں میر صاحب کا نام سرفہرست رہا ، سودا کی جولانئ طبع تنگنائے غزل تک کہاں محدود رہ سکتی ہے ، انہوں نے قصیدہ ، مثنوی ، شہر آشوب اور خصوصاً ہجو میں بڑے بڑے معرکے سر کئے ، غزل کا فن جس وفاداری بشرط استواری کا تقاضا کرتا ہے وہ اُسے سودا سے نہ ملی ورنہ شاید یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ میر بڑا غزل گو ہے یا سودا ؟

● —— غالب ایک دنیا دار معاملہ فہم ، دور اندیش اور مصلحت پسند انسان تھے ، میر کی زندگی اور شخصیت میں جس قدر یک رنگی ہے غالب کے یہاں اتنی ہی نیرنگیاں ہیں وہ زندگی کو کسی بلند تر مقام سے دیکھتا ہے ، اور ہر گوشہ اُس کے سامنے ہے دنیا اس کی نظر میں بازیچہ اطفال ہے ، اس تماشے کو وہ بڑی دلچسپی سے دیکھتا ہے ، زمانے کا انقلاب دونوں شاعروں نے دیکھا ہے لیکن دونوں کے نقطہ نظر میں بڑا فرق ہے ، غالب ایک حکیم فرزانہ ہے [illegible] کا اور میر شاعر کا ہے ، میر کو زندگی نے شکست دے دی لیکن غالب اس کی گرفت سے باہر رہے ۔"

● —— غالب ایک عہد آفریں شاعر ہے اس نے آنے والی [illegible] کو بہت متاثر کیا اور اس عالم گیر اثر اندازی میں اقبال کے سوا کوئی بھی اس کا حریف نہیں ، لیکن یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ انفرادیت پسندی کے باوجود غالب نے خود بھی بہت سی شخصیتوں کا شعوری

یا غیر شعوری اثر قبول کیا ہے، پہلے وہ طرز بیدل میں ریختہ لکھتے رہے اور نازک خیالی پر جان دیتے رہے اُن کی خیال آفرینی بیان تک بڑھی کہ لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو گئی اور مرزا صاحب "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"* کی کشمکش میں پڑ گئے قلعہ معلّی سے تعلق ہوا اور وہاں استاد ذوق کی ٹکسالی زبان کی واہ واہ دیکھی تو سادگی پر مائل ہوئے اور اسدو شاعری کو چند لازوال غزلیں دیں، شیفتہ اور مولوی فضل حق خیرآبادی کے مشورے سے اپنے کلام کا انتخاب کیا، مکاتیب میں بھی کہیں سادگی، کہیں بے تکلفی کہیں حسن بیان و آرائش زبان کا اظہار کیا، میر کا معاملہ اس سے مختلف ہے اُن کے کلام کی تاثیر بھی ہمہ گیر ہے اور بہت سے شاعروں پر میر کا سایہ پڑا ہے لیکن وہ خود کسی کے سائے میں نہیں رہے بچپن میں باپ اور چچا کی تعلیم و صحبت کا ان پر اثر ضرور پڑا لیکن سنِ شعور[1] پہونچنے کے بعد کوئی شخصیت ان پر اثر انداز نہ ہو سکی۔

"زندگی میں انہوں نے بادل ہی بادل دیکھے تھے، قوس قزح نہیں دیکھی، یہ ابر آلود موسم اُن کے مزاج کو راس آگیا تھا اور اسی میں وہ کھوئے رہتے تھے۔

ع اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

"میر صاحب زندگی میں ایک دروازے سے داخل ہوئے اور دوسرے سے نکل گئے، اس کے برعکس نجم الدولہ نواب مرزا غالب عرف کوشہ کو زندگی میں داخل ہونے کے لئے کئی راستے معلوم تھے شاید چور دروازہ بھی ان کے دائرہ علم سے باہر نہیں تھا ...... یہ کردار جو حددرجہ دلچسپ اور دلکش بھی ہے، زمانہ سازی سے خالی نہیں ہے، غالب تو جانتے تھے کہ "واقعہ سخت ہے اور جان عزیز" وہ جھکنے کے قائل تھے، ٹوٹ جانا انہیں پسند نہ تھا، میر صاحب ٹوٹ سکتے تھے جھکنا اُن کی سرشت کے خلاف تھا، اس طرح دونوں کے درمیان ذہنی طور پر طویل فاصلے ہیں اور صرف غم دل کے مرکز ہی پر اُن سے ملاقات ہو سکتی ہے۔"

شاعرانہ شخصیت و کردار کا یہ تجزیہ لائق مصنف کی نفسیات شناسی اور بلوغ فکر و نظر کی دلیل ہے۔

جناب ادریس صدیقی میر تقی میر کے عقیدت مند اور مداح ہیں، لیکن اس عقیدت کے باوجود میر کے کلام کے "حسن" اور "قبح" دونوں رخوں پر نظر رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:—

"بہر حال انتہائی عقیدت کے باوجود میر کے ہر شعر کے لئے ہمارے دل میں جگہ نہیں نکل سکتی، انہیں پستی کے عالم میں دیکھ کر ہماری طبیعت خوش نہیں ہوتی۔"

کتاب کے آخر میں میر کے کلام کا انتخاب ملتا ہے، جس سے ہم نے چند اچھے شعر چھانٹ کر اس عطر کی روح کھینچ لی ہے:—

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان! پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

---

[1] "کو" لکھا تھا۔ (م۔ق)

دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھے بہانے کے

کہتے تو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی

وجہ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا — عشق نے زور آزمائی کی

ہوش جب [illegible] نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

[illegible] کے معنی میں [illegible] کے" لیتے ہیں:—

[illegible] دیکھنے کب تھا

[illegible] کے یہاں بھی یہ لفظ [illegible] ———

[illegible] دیکھئے [illegible]

[illegible]

[illegible]

کوئی شک نہیں، [illegible] کتاب [illegible] اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ [illegible] ہے، [illegible] سلجھی ہوئی [illegible]

اور مستحق [illegible] کی وہ [illegible] افزائی ہے۔

تنقید و تجزیہ

[illegible] ابو محمد سحر [illegible] ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد رنگین گردپوش) قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ:- کتابستان ۱۷ کملا نہرو روڈ، الٰہ آباد۔

یہ کتاب جناب ابو محمد سحر کے مندرجہ ذیل تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے:—

تنقید اور اصولِ تنقید ——— "نوادرِ خاطر" کا تنقیدی مطالعہ ——— ناسخ ——— مصحفی اور میر ——— اقبال کے تصورات اور عہدِ پستی ——— حالی بہ حیثیت غزل گو ——— عزیز لکھنوی کی غزل گوئی ——— غالب اور فلسفہ ——— آزادی کے بعد اردو شاعری ——— میر کی قصیدہ نگاری ——— دبستانِ لکھنؤ کا تاریخی پس منظر اور تعیش پسندی۔

ہر مضمون اپنی جگہ قابلِ مطالعہ ہے، فاضل ناقد کی تنقیدی نگاہ میں بڑا عمق پایا جاتا ہے، شعر و ادب کے تجزیہ میں کوئی شک نہیں انہوں نے خاصی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے مگر جہاں شرح و بیان اور گفتگو کا یہ رنگ ہے، وہاں وجدان الجھن محسوس کرتا ہے۔—

"ادبی تنقید میں ادبی معیاروں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ ادب اور غیر ادب کی تفریق کا کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا ادب کے معیار ادب کی ماہیت اور عشوہ طرازیوں کے تابع ہوتے ہیں۔" (ص ۱۱)

آخر بات کیا ہوئی؟ ادب کے معیار ادب کی ماہیت کیا ہوتی ہے، پھر اس ماہیت کی عشوہ طرازیاں اس پر مستزاد!

حیرت ہے کہ جوش ملیح آبادی کے مشہور قطعہ کو جو چار مصرعوں (یعنی دو شعروں) پر مشتمل ہے تنقید نگار نے ایک شعر سمجھا ہے اور اسے یوں درج کیا ہے ———

"لیکن جب جوش ملیح آبادی کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے :-

شعرائے بستگانِ زلفِ گیتی ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے" (ص ۱۴۱)

جناب ابو محمد سحر کی تنقید میں ادبیت کے ساتھ عالمانہ فکر و بصیرت بھی پائی جاتی ہے، انہوں نے بڑے سلیقہ کے ساتھ خاصی نازک باتیں کہی ہیں اُردو ادب اُن سے اسی نوع کی بلند پایہ تحریروں کی توقع رکھتا ہے۔

نقوشِ شہاب

از:- شہاب دہلوی، ضخامت ۲۰۹ صفحات، قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ (مجلد، رنگین گرد پوش)
ملنے کا پتہ :- مکتبہ الہام، بہاول پور

جناب سید مسعود حسن شہاب دہلوی، خیام الہند حضرت حیدر دہلوی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں، موصوف نے آغاز شباب میں ایسے اچھے شعر کہے ہیں کہ بعض لوگوں کو دھوکا ہوا کہ یہ اُن کے کہے ہوئے نہیں ہیں اُستاد کا "عطیہ" ہیں ——— یہ دلیل ہے شہاب صاحب کی ذہانت اور جودت کی! شہاب دہلوی نے خود دار طبیعت پائی ہے۔ ریاست میں رہ کر بھی وہ توڑ جوڑ سے ہمیشہ دُور رہے، مزاج کی یہ خودداری اور شخصیت کا وقار اُن کی شاعری پر کسی نہ کسی عنوان سے جھلکتا ہے۔

اپنے مجموعۂ کلام پر انہوں نے "میں اور میری شاعری" کے عنوان سے جو آپ بیتی لکھی ہے، وہ نہایت دلچسپ ہے اور ساتھ ہی صداقت سے لبریز! علم و ادب کا ذوق اُنہیں اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے، شرافتِ نفس شہاب صاحب کا سب سے بڑا جوہر ہے۔

"اس پر حیدر صاحب نے اپنے شاگردوں کو کہا کہ پہلے آپ لوگ اپنا کلام سنائیں (ص ۱۹) ——— "میں بہاول پور سے دہلی جا رہا تھا تو یہاں کے دوستوں کو کہہ گیا تھا کہ اب میں کبھی بہاول پور نہ آؤں گا" (ص ۲۵) دونوں جملوں میں "کو کہہ گیا تھا" کی بجائے "سے کہہ گیا تھا" لکھنا چاہئے تھا۔

"نواب صاحب نے یہ اندازہ کر کے کہ میں شاعری سے دلچسپی رکھتا ہوں مجھے بھی شعر سنانے کو کہا میں نے ایک غزل سنائی جب اس شعر پر پہونچا۔

اب چارہ سازی کام نہ آئے گی چارہ گر

معلوم ہے حقیقتِ دردِ جگر مجھے

تو نواب صاحب نے فوراً ٹوکا "صاحب زادے! "چارہ جوئی" پڑھو، میں نے اس اصلاح پر نواب صاحب کو جھک کر آداب کیا" (ص ۱۷-۱۸) کوئی شک نہیں مرزا غالب نے چارہ گری و چارہ سازی کے معنی میں "چارہ جوئی" استعمال کیا ہے، مگر اب اُردو زبان میں یہ لفظ نالش اور استغاثہ وغیرہ کے معنی میں بولا جاتا ہے؛ یہ عدالت کی اصطلاح ہے اس کا استعمال یوں ہوتا ہے۔

"کرایہ دار مکان کا کرایہ ہی نہیں دیتا مجبوراً مجھے اس کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کرنی پڑی"

دکھ درد کا مداوا، علاج و تدبیر اور چارہ گری (کرنے) کے معنی میں "چارہ جوئی" اہل زبان اب نہیں بولتے۔

اس کتاب پر مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے، جس کا آغاز ہی اس عجیب جملہ سے ہوتا ہے ——

"شہاب بنیادی طور پر غزل گو ہیں" (ص ۳۲)

یہ "ڈاکٹر صاحبان" انگریزی میں سوچتے اور اُردو میں اُس کا اظہار کرتے ہیں!

"بہاول پور میں مدتوں رہائش کرنے کی وجہ سے ان مقامی اثرات سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں" (ص ۳۳)

جو شخص "رہائش کرنے کی وجہ" بولتا اور لکھتا ہے، وہ کسی شاعر کے مجموعہ کلام پر تقریظ لکھنے کی جرأت کس طرح کرتا ہے — اور سُنئے :—

"ان کی غزلوں کی جذباتی بافت (EMOTIONAL TEXTURE) بہت کم تغزل سے دست کش ہوتی ہے" (ص ۳۵)

آخر یہ بات کیا ہوئی! اس قدر ابہام آمیز تکلف، پورا جملہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے!

"اگر لکھنے والے کا اسلوب نثر سے پہلو مارتا ہو" (ص ۴۴)

زبان و ادب کے ساتھ یہ دردناک مذاق! توبہ!

"نقوشِ شہاب" کے منتخب اشعار —

ہزار بار نیا تجربہ سفر کا ہوا — ہزار بار منازل کے بیچ و خم گزرے
ہمارا رُخ تھا کسی آفتاب کی جانب — گزر رہے تھے ستارے جہاں سے ہم گزرے
دست کش ہوا ہوں میں کارواں کے احساں سے — آج بے ہوں میں تنہا میری جستجو تنہا
اس خود غرض کی دنیا میں حسن ساتھ کیا دیتا — عشق نے اٹھایا ہے
یاد ماضی ہے شگفتہ سی محفل کی طرح — گردشِ وقت
گیسوئے وقت اُلجھتے ہی چلے جاتے ہیں — آپ خاموش ہیں
محو ہونا ہی نہیں اُن کا خیال — دھوپ وہ
جانے کیا بات لب پہ آ جائے — اُن کی محفل
بڑھ گئی اور دل کی بے تابی — اس توجہ سے بے رُخی ہی ہی
اس انجمن میں جرأتِ طلب نہیں تو کچھ نہیں — یہ کیا کہ تو مجسم التماس ہو کے رہ گیا
پھول افسردہ ہیں گل ہیں مہ و انجم کے چراغ — یہ مرے غم کی کہانی ہے جہاں تک پہونچے
میں ہوں اور بزم ہے نگاروں کی — چھاؤں میں سو رہا ہوں تاروں کی
میری ہی نگاہوں میں سما جائے تو اچھا — وہ خاص تجلی جو ابھی عام نہیں ہے
تنہا نہ چھوڑا تم کو ہمارے خیال نے — ہم بھی تمہارے ساتھ گئے تم جدھر گئے
دیکھنے والے اُنہیں اُن کی توجہ پہ نہ جا — دوسرا رُخ ہے تغافل بھی اسی تصویر کا
تم صبح سے کہاں ہو، کہاں دیر ہو گئی — دنیا مری نگاہ میں اندھیر ہو گئی
کھینچ کر اک آہ اُن کے سامنے خاموش ہوں — ابتدا سے انتہا تک کہہ دیا افسانہ کیا
اس طرح خشمگیں ہے تری چشمِ مست آج — جیسے چھلک گیا ہو پیالہ شراب کا
وہ صبح شبِ وصل چھپتے ہوئے — یہ اندھیرا سورج نکلتے ہوئے
لے آئی کس مقام پہ اے جستجوئے دوست — اب اپنے روبرو ہیں کہ ہم روبروئے دوست

دوسرا رخ : —

ہوگیا سورج ڈانوا ڈول		سونے والے آنکھ تو کھول[1] (ص ۳۹)

"سورج کا ڈانوا ڈول ہونا" زبان و روزمرہ، واقعہ اور اندازِ بیان کسی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے۔

یہ حال ہے تو گلستاں پنپ نہیں سکتا		بہار پھول کی دشمن، غمِ بہار بھی روگ (ص ۴۱)

بہار پھول کی دشمن ہوتی ہے ـــــــ آخر اس کا ثبوت ؟ "غمِ بہار بھی روگ" یہ ٹکڑا اس شعر میں کتنا اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے۔

دے کوئی ثبوت اور ذرا زندہ دلی کا		اے گردشِ حالات کوئی سینہ سپر ہے (ص ۴۵)

مصرعہ ثانی میں الفاظ کے دروبست کے لحاظ سے "ذرا" کھٹکتا ہے، پھر گردشِ حالات سے تلخی، بدمزگی اور جفا کوشی کی جو تمنا کی گئی ہے اُس کے لئے یہ پیرایہ بیان :ـــ

؎ دے کوئی ثبوت اور ذرا زندہ دلی کا

مناسب نہیں ہے :

اے واہمہ شوق ضیا پاش ہیں ذرات		اے تیرہ نظر وادیٔ مہتاب کدھر ہے

الفاظ حسین و جمیل مگر مفہوم کا دور دور پتہ نہیں ! واہمہ شوق کا ذروں کی ضیا پاشی سے آخر کیا تعلق ہے ! تیرہ نظر سے وادیٔ مہتاب کا پتہ کیوں پوچھا جارہا ہے !

ہر ذرے میں تحریکِ اثر دیکھ رہا ہوں		ہوں کاشفِ حالات نظر آئینہ گر ہے

"تحریکِ اثر" کس بلا کا نام ہے ! پھر کشفِ حالات کا ذروں کی اثر پذیری سے آخر کیا ربط ہے ؟

دامن گل کا ٹھیک ہے گل کی قبا درست		تم آگئے تو گردشِ آب و ہوا درست (ص ۴۹)

"گردشِ آب و ہوا درست" یہ ٹکڑا زبان و بیان کے اعتبار سے محلِ غور ہے ! آب و ہوا کی تبدیلی کو "گردش" کون کہتا ہے ! پھر محبوب کے آنے سے گل کا دامن اور گل کی قبا کس طرح درست ہوگئی ! بات کہنے کا ایک قرینہ ہوتا ہے، جو اس شعر میں نہیں ملتا۔

تحریکِ واقعات کا عالم نہ پوچھئے		انجام کار یہ کہ نہیں انتہا درست

شعر نہیں ہے لفظوں کو جوڑ کر کلام موزوں کردیا ہے۔

روشنی کی مظہر ہے تیرگی کی قربانی		جل گیا چراغوں میں رات کا لہو تنہا (ص ۵۲)

علامہ اقبال کے اس بے مثال مصرعہ کو :ـــ

---

[1] اس زمین میں راقم الحروف نے سب سے پہلے غزل کہی تھی، چند شعر :ـــ

پہلی نظر تھی دل کا مول		اب آنسو کے موتی رول
آنکھیں کچھ گھبرائی سی		دل کی حالت ڈانوا ڈول
ظلم کا بدلہ پیار سے دے		کنکر دے کر ہیرے تول
سورج سر پہ آ پہونچا		سونے والے آنکھیں کھول

(م ـ ق)

سو کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

کے ہوتے ہوئے، اس خیال کو اس قدر عجیب انداز میں دہرانے کی آخر کیا ضرورت لاحق ہو گئی تھی ؟

یاس کی انگڑائیاں موقوف اک دل پر نہیں شاخِ گل کے سائے میں دیکھے ہیں ویرانے بہت (ص ۵۳)

اہمال ہی اہمال، پھر اس اہمال پر "یاس کی انگڑائیاں" ۔ ۔ ۔ ۔ توبہ !

یہ بھی اک اُن کی نگاہِ کرم کی تحریک ہے شمع کی لو پر مرے جاتے ہیں پروانے بہت

شعر میں بے لطفی کے علاوہ "ردیف" (بہت) بھی بے کار جا رہی ہے ۔

بہاروں کی گردش تو دیکھو شہابؔ خزاں بن گئی حاصلِ دورِ لبس (ص ۶۰)

اس قسم کے شعر مجموعہ کلام سے انتخاب میں خارج کر دینے چاہیے تھے ۔

ہر قدم ہے جنوں کا پیمانہ ناپئے عرض و طول جنگل میں (ص ۶۳)

آخر شاعر کیا کہنا چاہتا ہے ؟

اب نگاہوں پہ ہے مدارِ کلام گفتگو کا ہر اک سہارا چپ ہے (ص ۶۵)

مصرعہ ثانی کو تکلف نے بے مزہ بنا دیا ۔

چھری انفاس کی چلتی ہی نہیں جان کمبخت نکلتی ہی نہیں (ص ۶۹)

مصرعہ اولیٰ مہمل ہے ! معاملہ تو اس کے برعکس ہے سانس کی چھری تو ہر وقت چلتی رہتی ہے ! یہ جس دن نہ چلے گی موت واقع ہو جائے گی ۔

زلزلے یاس کے مضطر ہیں مچلنے کے لئے دیکھتا ہوں یہ امیدوں کے محلات سے کیا (ص ۷۵)

کمزور شعر ! اس سے پہلے "یاس کی انگڑائی" کہا تھا، اس شعر میں ۔ ۔ کے زلزلے "نظم فرما دیا، اس کا احساس تک نہیں کہ یہ لفظ (یاس) کس کیفیت کا اظہار کن لفظوں میں چاہتا ہے ۔

آج کس درجہ باشعور ہیں لوگ بے رُخی سامنے ہے دور ہیں لوگ (ص ۷۷)

شعر میں اہمال کے سوا اور کیا دھرا ہے !

سائے پھیلے جو تری زلفوں کے چاند سورج کے گہن یاد آئے (ص ۸۱)

زلفوں کے پھیلے ہوئے سایوں کو دیکھ کر چاند اور سورج کے "گہن" کا یاد آنا ہی اول تو بڑی تکلف آمیز بات ہے پھر "گہن" کی تشبیہ تو محبوب کے حسن کی تابناکی پہ ایک طرح کی طنز ہے ! "گہن" آنکھوں کو بھلا کب لگتا ہے ۔

غم رسائی سے وہ تا عمر گریزاں بھی نہ ہوں میں سکوں ضابطۂ شوق میں لا بھی نہ سکوں (ص ۸۵)

ابہام ہی نہیں اہمال بھی اس شعر کی خصوصیت ہے ۔

ضد ہر اک حال میں رکھیے یوں ہی ضد کی خاطر آپ پنہاں ہیں تو پھر مجھ کو نمایاں کیجئے (ص ۹۱)

مصرعہ اولیٰ نے شعر کے مفہوم کو کاواک بنا دیا ۔

اب گل کسی چمن کو نہ ہو گا کبھی نصیب وہ بہار بھی تری محفل میں پھنس گیا (ص ۹۲)

اشعر میں محبوب کی محفل پر کس قدر مذموم طنز ہے کہ اس محفل میں وہ بہار کے بھانپ جانے کے سبب اب کسی چمن میں بھی کوئی پھول نہ کھلنے پائے گا، ہر باغ منتِ گل سے محروم ہو گیا، اس صورت میں محبوب کی بزم "دنیا کے حق میں "بہار کش" ثابت ہوتی ہے، حالانکہ اُسے بہار آفریں ہونا چاہیئے۔

جب کوئی رد سوال ہوتا ہے　　　دل کو کتنا ملال ہوتا ہے　(ص ۹۵)

بگانہ اندازِ بیان۔

مدعی سب ہیں بزمِ ہستی میں　　　آدمی خال خال ہوتا ہے

ب لوگ کس بات کے مدعی ہیں ؟ غالباً "آدمی ہونے کے" ! مگر شعر میں کتنا بڑا خلا پایا جاتا ہے ! مصرعۂ ثانی بھی بس یوں ہی سا ہے۔

سیکھ ذروں سے دوڑ، ہو چکا ڈھنگ　　　دیکھ منزل رسی غباروں کی　(ص ۱۰۰)

مگر یہ تک نہیں معلوم کہ "غبار" (DUST) کی اُردو میں جمع نہیں آتی، ہاں "غبارہ" (Balloon) کی جمع "غباروں" بے شک آتی ہے!

ترحم سے ہی .س کو ساز ہوگا　　　مرے انجام سے آغاز ہوگا　(ص ۱۰۳)

سرود سخن کے ساتھ مذاق ! !

معمورِ تجلی دلِ ناکام نہیں ہے　　　سچ ہے کہ جہاں تم ہو وہاں شام نہیں ہے　(ص ۱۰۵)

کیا یہ کتابت کی غلطی ہے کہ "محروم" کی بجائے "معمور" چھپ گیا ! "معمور" کے ساتھ تو شعر مہمل ہوا جاتا ہے۔

کی عرضِ وفا ان سے تصور میں سرِ عرش　　　یہ سامنے کی بات بہت دور ہوتی ہے　(ص ۱۱۵)

بٹ کی کل کی طرح اس شعر کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں۔

جلوۂ حسن سے معمور جوانی ہو جائے　　　تم جو آجاؤ تو یہ رات سہانی ہو جائے　(ص ۱۱۸)

ں کی جوانی ؟ غالباً عاشق کی جوانی ــــــ مگر "جوانی" کا جلوۂ حسن سے معمور ہو جانا ہی عجیب سی بات ہے۔

جو لوگ بے کسی میں جہاں سے گزر گئے　　　گہرائیوں میں عشق و وفا کی اتر گئے　(ص ۱۱۹)

اکہتر، بہتر، تہتر، چوہتر کے انداز کا کلام موزوں !

گھبرائیں گے ہم آپ کی زلفِ دوتا سے کیا　　　مانوس ہر بلا سے ہیں ہم اک بلا سے کیا　(ص ۱۲۱)

بوب کی زلفوں کو دیکھ کر "گھبرا جانا" عجیب احساس و مشاہدہ اور تجربہ ہے !

نہیں ہے قدر تو تیری جفا کی دنیا میں　　　وفا تو اب بھی مروّج کہیں کہیں ہوگی　(ص ۱۲۲)

ماورہ نہیں تو یہ تک بندی !

وہ بے نقاب رہیں یا چھپے چھپے سرِ عرش　ــ　پر اچھی شکل جہاں ہوگی دلنشیں ہوگی

شعر مجاز میں نہیں "حقیقت" میں ہے، اللہ تعالیٰ کو "اچھی شکل" کہنا کتنی چھوٹی اور گھٹیا بات ہے (سبحان اللہ عما یصفون)

انگڑائیوں نے تیری زبردستیاں وہ کیں　　　میں کیا تمام خلقِ خدا زیر ہو گئی　(ص ۱۲۵)

حیرت ہے کہ جوش اس قدر بلند شعر ـــ

وہ صبحِ شبِ وصل چلتے ہوئے　　　یہ اندھیرے سورج نکلتے ہوئے

کہہ سکتا ہے ۔ اُس کے یہاں اس قدر ناپختہ، پست اور ناہموار اشعار بھی ملتے ہیں! ایسی بلندی! ایسی پستی!

یہ حال ہوگیا ہے تری راہِ شوق میں ۔۔۔ سنبھلی ابھی طبیعت ابھی ڈھیر ہوگئی (ص ۱۲۵)

"طبیعت ڈھیر ہوگئی" اس ٹکڑے نے شعر کو "کچھ" بھی نہ بننے دیا ۔

ہم اور آپ سے بالا ہے تیری ذات وحید ۔۔۔ کیا ہے سب نے تجھے انتخاب تو کے لئے (ص ۱۲۶)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رسمی القاب و آداب مخاطبت (آپ اور جناب) سے بالاتر ہے، اس لئے سب لوگ اللہ تعالیٰ کو "تو" کہتے ہیں! مگر اس خیال کو ادا کن لفظوں میں کیا گیا ہے! پھر "ہم" تو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے جابجا قرآن میں استعمال فرمایا ہے (انعمنا ۔۔۔ کتبنا ۔۔۔ جعلنا ۔۔۔ اوحینا ۔۔۔) ! "ہم" شعر میں لانے کی آخر کیا تک تھی ۔

میں گرد آسماں کی سر آنکھوں پہ کیوں نہ لوں ۔۔۔ راہِ طلب میں مجھ کو ضرورت نشاں کی ہے (ص ۱۲۸)

یعنی و مفہوم ؟! آسماں کی گرد کیا ہوتی ہے ؟ آسماں کی گرد سر آنکھوں پر لینے سے راہِ طلب کا نشان کس طرح مل جائے گا ۔

لاکھوں ریاضِ خلد بنا کر بگاڑ دے ۔۔۔ جھکی میں جس کی خاک ترے آستاں کی ہے

کہنا یوں چاہیئے تھا کہ جس کی جھکی میں آستانِ دوست کی خاک ہے وہ چاہے تو ذروں کو لعل و گہر اور لوہے اور تانبے کو سونا بنا دے ۔ مگر فرمایا یوں گیا ہے !

ــــہ لاکھوں ریاضِ خُلد بنا کر بگاڑ دے

اس مصرعہ میں آستانِ دوست کی خاک کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے ۔

اپنا نشاں نصیب نہ تیرا نشاں مجھے ۔۔۔ پہونچا دیا جنونِ طلب نے کہاں مجھے (ص ۱۳۲)

مصرعہ ثانی کاش یوں ہوتا ــــہ اپنا پتہ ملا نہ تمہارا نشاں مجھے

وہ عام از زماں سے بالا مرتبہ استاں کی ہے ۔۔۔ کہ ہر فقرے پہ کرتا ہے جہاں کوئی جبیں کوئی (ص ۱۳۳)

غیر شاعرانہ اندازِ بیان !

بہت برا ہے گلہ اُن کی سرد مہری کا ۔۔۔ مجھی کو راس نہ آئی فضا زمانے کی (ص ۱۳۶)

"بہت برا ہے" کا یہاں کیا محل تھا، مصرعہ اولیٰ یوں ہوسکتا تھا ۔۔۔

میں شکوہ سنج نہیں اُن کی سرد مہری کا (یا کم نگاہی کا)

شباب حسن شگفتہ سے وہ اُٹ کے نقاب ۔۔۔ ادا سکھا گئے غنچوں کو مسکرانے کی (ص ۱۳۷)

"روئے روشن یا رُخِ زیبا" کہنا چاہیئے تھا مگر کہا گیا ہے "حُسنِ شگفتہ" !

بارائے دید چھین لیا دل پہ چھا گئے ۔۔۔ دہن کا ذکر خیر تھا وہ خود بھی آگئے (ص ۱۴۱)

مصرعہ اولیٰ جتنا جاندار اور شگفتہ ہے، مصرعہ ثانی اتنا ہی پھس پھسا اور کمزور ہے ۔

شاقی ہوئی صد بہار دو عالم ۔۔۔ شاقی ہوئی ہر محن آ رہی ہے (ص ۱۴۲)

"محن" کو اس شعر میں بصورتِ واحد نظم کیا گیا ہے، حالانکہ "محن" محنت کی جمع ہے ! "محنت" تکلیف اٹھانے اور مشقت گوارا کر

ہیں ۔

تونے ہر رُخ پر کمندِ جہد یکسر پھینک دی ۔۔۔ تونے جب جانا با طِل ہر الٹ کر پھینک دی (ص ۱۸۸)

ِ جہد" کیا ہوتی ہے، پھر اُس کا "ہر رخ پر پھینکنا" عجیب تر!

ملک گیری کا نشہ جن دشمنوں کے سر میں ہے ۔۔۔ بدرقہ اُن کا تری شمشیرِ صد پیکر میں ہے (ص ۱۸۹)

ی صفت کہ وہ "دیو پیکر" اور فیل پیکر" ہوتا ہے سُنی اور کتابوں میں پڑھی تو ہے مگر شمشیر کی یہ تعریف کہ وہ "صد پیکر" ہوتی ہے پہلی بار نگاہ

ندگی اپھر "بدرقہ" کا استعمال اس شعر میں کس قدر بے محل اور غیر متعلق ہے ۔

لیکن اتنا جبر بھی اہلِ صحافت پر نہ ہو ۔۔۔ دیدۂ انصاف ٹھکرانے لگے جس جبر کو (ص ۱۹۰)

ی جبر" اس قسم کا بھی ہے، بے پیروں سے نہیں "دیدۂ انصاف" سے ٹھکرایا جاتا ہے!

عادتِ ہمدردی یک طرفہ کھونی چاہئے ۔۔۔ حکم تازہ پر نظر دوبارہ ہونی چاہئے (ص ۱۹۱)

متقدلیف "پٹواریوں" اور تحصیل کے "چپراسیوں" کی زبان اور اندازِ گفتگو ہے!

اس کتاب میں غزلوں کے علاوہ چند نظمیں بھی ہیں، جناب شہاب دہلوی کے منتخب اشعار ہم شروع میں درج کر چکے ہیں۔ جن سے اُن

وی کے روشن رُخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے! بعض شعروں میں تو "تغزل" اس طرح سمویا ہوا ہے جیسے گلاب میں رنگت اور خوشبو! کاش!

ا مجموعہ کلام، نظرِ ثانی اور انتخاب کے بعد چھپواتے تو اتنے بہت سے جھاڑ جھنکار اس گل کدے میں شاید نہ رہنے پاتے!

پاکستان ملز لمیٹڈ
حیدرآباد سندھ
جس میں
مضبوط دھاگہ اور پائیدار خوشنما کپڑا تیار
ہوتا ہے
آپ پاکستان کو اسی وقت خوش حال بنا سکتے ہیں
جب کہ آپ
پاکستان کی بنی ہوئی چیزیں خریدیں

تجربہ پر اعتبار
پر اعتبار

سائنس

بلب اور پائپ

ماہنامہ
فاران

جلد ۱۷ | ماہ مئی ۱۹۶۵ء | شمارہ ۲

ترتیب

چندہ سالانہ سات روپے

مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

پبلشر:- مسرور حسین

طابع:- انٹرنیشنل پریس کراچی

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

"اقامتِ دین" ایک جامع کلمہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت و خیر خواہی اور اُسے عملاً برپا کرنے کی ہر کوشش اور جد وجہد شامل ہے۔ دل سے، زبان سے، ہاتھ سے اور جان و مال کے ایثار سے ہر امکانی سعی اور تگ و تاز اس کا موضوع ہے! "اقامتِ دین" کی جد وجہد میں اللہ تعالیٰ کی خشیت، اُس کی رضا کے حصول کا جذبہ اور آخرت کی نجات و فلاح کا تصور و عقیدہ اس طرح شامل —— اور گھلا ملا ہوا ہے، جیسے پھول میں خوشبو، چاندنی میں اُجالا اور شہد میں مٹھاس! اقامتِ دین کی جد وجہد میں دین و دنیا کے مسائل اور جسم و روح کے تقاضوں کا وہ صحیح امتزاج پایا جاتا ہے جو دین میں مطلوب ہے۔

اقامتِ دین کی تحریک کسی خلا، قبرستان یا ویرانے میں نہیں انسانوں کی آبادیوں میں چلا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس وسیع زمین پر ملکوں، خطوں، آبادیوں اور ریاستوں کے مختلف حالات اور شئون و مظاہر ہوتے ہیں، اس جد وجہد میں حالات کی نزاکتوں، مصلحتوں اور ساتھ ہی دینی تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اس مقصد کے حصول کے ذرائع حالات کے اعتبار سے بدل سکتے ہیں دنیا کے ہر ملک اور ہر خطہ میں ایک ہی منہاج اور کسی خاص لگے بندھے انداز پر اس تحریک کو نہیں چلایا جاتا۔ اقامتِ دین کے علمبرداروں کو مسجد و مدرسہ اور خانقاہوں ہی سے نہیں ایوان ہائے تجارت، مزدوروں کی یونینوں، صنعت گاہوں، پارلیمنٹوں، حکومت کے اداروں اور سیاسی جماعتوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے، اس لئے بعض اوقات اس راہ میں ایسے پیچیدہ موڑ بھی آتے ہیں کہ دین ہی کی خیر خواہی کے لئے کبھی کبھار با دلِ ناخواستہ "اھون البلیتین" کو "بہ سبیل تنزل" گوارا کرنا پڑ جاتا ہے، ایسے موقعوں پر وہ لوگ جو ساحل ہی سے طوفان کا تماشا کرتے ہوتے ہیں، چیخنے چلّانے اور شور مچانے لگتے ہیں کہ اقامتِ دین کی یہ دعوت دینے والے تو اپنے موقف سے ہٹ گئے، یہ جماعت تو گمراہ ہوگئی، ان لوگوں نے تو دین و شریعت کو رسوا کر دیا ...... وہلم جرّا!

کوئی شک نہیں کہ دین کے ارکان و احکام اور شریعت کی قدروں اور معمولی سے معمولی جزئیہ کی حفاظت و احترام کے لئے وہ عزیمت، جوش و ولولہ اور دینی غیرت درکار ہے جس کا مظاہرہ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے ساتھ کیا تھا! مگر ایسا موقعہ اگر کبھی پیش آجائے کہ ایک طرف مسجد کے ڈھانے کا سوال ہو اور دوسری طرف مسجد سے ملحق فوٹو گرافر کی دوکان بحال رکھنے کی شرط، تو ایسی صورت میں اس شرط کو نظر انداز کر کے مسجد کا ڈھایا جانا کون ہوشمند مسلمان گوارا کر سکتا ہے! اس شرط کو با دلِ ناخواستہ عارضی طور پر گوارا کر کے اس کی جد وجہد کی جائے گی کہ فوٹو گرافری کی دوکان کسی طرح وہاں سے ہٹ جائے اور مسجد کو منہدم ہونے سے بچا لیا جائے، حضرت سیدنا عمر فاروقؓ رضی اللہ عنہ کے احتساب کا ایک تو وہ عالم تھا کہ حضرت عیاض بن غنمؓ کو گورنری سے معزول کر کے صوف کے کپڑے پہنا کر بکریاں چرانے کے لئے جنگل میں بھیجا گیا اور دوسری طرف حضرت امیر معاویہؓ کے ترفہ اور امیرانہ زندگی کو گوارا کیا گیا، کیا کوئی مسلمان اس انداز پہ سوچ کر اپنی عاقبت خراب کر سکتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے یہاں عمل و احتساب کا تضاد پایا جاتا ہے اور وہ معاذ اللہ اپنے موقف سے کبھی ہٹ بھی جایا کرتے تھے، حالانکہ یہ تو

متعدد بہت کو کمتر نہیں پائی جاتی، مگر عام اصول یہ ہے کہ خیر و شر اور صواب و ناصواب میں جس چیز کی کمیت و کیفیت غالب ہوتی ہے اُسی کا حکم لگایا جاتا ہے، مثلاً فتاویٰ عالمگیری میں قرآن کے منظوم ترجمہ کو "کفر" بتایا گیا ہے، یہ فتویٰ اپنی جگہ درست نہیں ہے مگر یہ اور اس قسم کی اور کمزوریوں کے ہوتے ہوئے فتاویٰ عالمگیری قابلِ قدر کتاب ہے، اسی طرح ہمارے زمانے کے بعض علمار نے اس افراط کے مقابلہ میں یہ تفریط اختیار کی کہ قرآن کریم کے منظوم ترجمہ پر تحسین آمیز پیش لفظ اور دیباچے لکھے، عجیب تضاد ہے کہ فتاویٰ عالمگیری میں جس فعل کو "کفر" کہا گیا ہے، اُس فعل کی یہ علمار کرام اور مفتیان عظام تحسین فرماتے ہیں، اس قسم کے تسامحات اور غلطیوں کے باوجود ان علمار کا احترام کیا جاتا ہے۔

متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جمہور علماء نے تحریک آزادی میں حصہ لیا خاص طور سے دیوبند کے اکابر علماء نے اس تحریک کی قیادت کی مگر حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ تحریک مذکور سے بے تعلق اور الگ تھلگ ہے دوسری طرف بعض علمار نے شردھانند جیسے معاند اسلام کو انگریز دشمنی کے جذبہ اور آزادی کے جوش میں جامع مسجد دہلی کے منبر پر تقریر کرنے کے لئے بٹھا دیا! اس افراط و تفریط کے باوجود دینی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کو گمراہ اور ہادم دین و شریعت نہیں ٹھیرایا گیا، متحدہ ہندوستان کے علمار کی غالب اکثریت نے انگریزوں سے موالات کو ناجائز اور حرام قرار دیا، پھر چند برس کے بعد ملک کی آزادی کی خاطر جن قانون ساز اداروں اور حکومت کی ملازمتوں کا بائیکاٹ کیا گیا تھا، اُن سے تعاون واشتراکِ عمل کیا گیا، مگر ہماری نگاہ سے آج تک اس قسم کی تنقید نہیں گزری کہ ان علمار کرام نے اپنے قول و فعل سے تضاد اور دو رنگی کا ثبوت دیا جو چیز اُن کے نزدیک ایک زمانے میں شرعاً ناجائز اور حرام تھی وہ کچھ دنوں کے بعد جائز کیسے ہو گئی؟ انگریزوں سے ترکِ موالات (NON COOPERATION) کے بعد یہ "موالات" (COOPERATION) کیوں؟؟ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بعض تحریروں سے جو لوگ "تضاد" ثابت کرتے ہیں اور سیاسی حالات اور اُس کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں، کاش! وہ انگریزوں سے ترکِ موالات اور پھر موالات کے بارے میں جو علمار کا موقف رہا ہے، اس پر غور فرمائیں تو اُن کے ذہن کی بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں!

انگریز کے دور میں ہندوستان کے بعض علمار نے جن میں علمار دیوبند کے نام سرِ فہرست نظر آتے ہیں ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر اس کا فتویٰ دیا کہ یہاں کے مسلمان ہجرت کر کے کسی دارالسلام میں چلے جائیں، اس فتوے کے جو پریشان کن نتائج برآمد ہوئے، اس کا حال ظفر حسن (ایم۔ اے) سے سنئے، جو اپنی دینداری، فکر و عمل اور انگریزوں کے خلاف عملاً باغیانہ جدوجہد میں خاصی شہرت رکھتے ہیں:-

"نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے، افغانستان پر مالی بوجھ پڑا، ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے، اگر کسی نے اس سے فائدہ اُٹھایا تو وہ انگریز تھے۔" (الفرقان ماہ ذی الحجہ ١٣٨٣ھ)

سیاسی کشمکش اور سیاست و حکومت کے مسائل و معاملات میں بعض اندازے بھی غلط نکلتے ہیں، سیاسی احوال و کوائف کو دین و شریعت کے تقاضوں سے تطبیق دینے میں پیچ اور خم بھی ہو جاتی ہے فلاں چیز "اضطرار" کی حالت تک واقعی پہونچی ہے یا نہیں، اس بارے میں بھی علمار کے درمیان اختلاف واقع ہو جاتا ہے مگر ان تمام تسامحات اور کمزوریوں کے باوجود علمار کرام سے دین و شریعت کا انہدام منسوب نہیں کیا نہ اُن کے بارے میں عوام کو ایسا تاثر دیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں سے "خیر" کی توقع ہی نہیں رہی، یہ تو دین و ملت کے لئے "فتنہ" بن گئے ہیں۔

آج جو اہلِ قلم اور ارباب علم و فکر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو دین و ملت کے لئے "فتنہ" قرار دے رہے ہیں!

علماء دینی اداروں اور جماعتوں کے ساتھ یہ سلوک روا نہیں رکھا۔ وہاں ان حضرات نے ان کی کمزوریوں پر نہیں خوبیوں پر نگاہ تیز کا حکم لگایا ہے، مگر جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی صرف کمزوریوں پر نگاہ پڑتی ہے اور ان کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے نصافی کے ظہور میں آنے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو جماعت اور مودودی صاحب کے معاملہ میں ان حضرات کی نگاہیں صرف "عیب بیں" ہو گئی ہیں اور ان میں محاسن دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی یا پھر جان بوجھ کر ایسا کیا جاتا ہے کہ ان کے تسامحات اور کمزوریوں کو تو خوب لیتے ہیں مگر اُن کے محاسن اور خوبیوں کا ذکر تک نہیں کرتے، حالانکہ ہندوستان اور پاکستان کے اکثر و بیشتر شہروں اور قصبوں میں ایسے ن ملیں گے، جو جماعت اسلامی سے قرب و تعلق کی بدولت دین سے قریب ہوئے ہیں اور کتنے ملحدوں اور کمیونسٹوں کو توفیق و ایمان کی نصیب ہوئی ہے، پھر خود جماعت کے ارکان کی زندگیاں ہیں، جن میں خشیت، دین کی محبت، ارکانِ اسلام کی پابندی، صدقِ اور اکلِ حلال ملتا ہے، وابستگانِ جماعت میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اللہ اور رسول کی خاطر نہ صرف نا جائز بلکہ آمدنی کے مشتبہ ذرائع کو چھوڑا ہے! انہوں نے حق کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں بھی اُٹھائی ہیں! خدا کے لئے انصاف سے بتایئے کہ اس دورِ انحطاط میں تقویٰ اور شرافتِ نفس کے یہ نمونے قدر و ستائش کے قابل ہیں یا نفرت و مذمت کے مستحق ہیں، یہ شخصیتیں اور کردار دین و ملت کے فتنہ ہیں یا "رحمت" ہیں!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک جامع شخصیت کے حامل ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، دستور...... ان تمام موضوعات پر انہوں نے مقالے اور کتابیں لکھی ہیں، اُن کی تحریریں ہزارہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، اُن کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بعض کتابیں ایک لاکھ سے بھی زاید تعداد میں چھپی ہیں، مولانا موصوف کی متعدد کتابوں کے ترجمے مختلف پندرہ سولہ زبانوں میں ہوئے ہیں، خاص طور سے عرب دنیا نے اُن کی کتابوں کو قدر و ستائش کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور شام، الجزائر، عراق اور نجد و حجاز کے چوٹی کے اہلِ قلم اور علماء نے مولانا مودودی کی تحریروں کو سراہا ہے اور اُن کی دینی فکر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے، دین و شریعت کے خلاف آج جتنے علمی محاذ پائے جاتے ہیں، ہر محاذ پر مولانا موصوف نبرد آزما نظر آتے ہیں، اس دور تشکیک اور عہد آزاد خیالی میں اُن کے قلم نے اللہ تعالیٰ کے دین کی جس جرأت و حوصلہ مندی، یقین و خود اعتمادی اور فراست و ذہانت کے ساتھ مدافعت کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے، خاص طور سے اُن کی قوت استدلال کا جواب نہیں، اسلوبِ نگارش اور افہام و تفہیم کا انداز اس قدر دل نشین ہے کہ بڑے سے بڑے ملحد اور زندیق کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ؎

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مولانا مودودی کی تحریروں نے زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، وہ اس دور کے صاحبِ دعوت مفکر اور عالم دین ہیں۔ انہوں نے دین اور سچائی کی خاطر برسوں قید و بند کی مصیبتیں برداشت کی ہیں یہاں تک کہ پھانسی کا حکم سن کر بھی اُن کی پیشانی پر بل نہیں آیا، اس طرح انہوں نے ایثار و قربانی کے سلسلۃ الذہب کو استوار کر دیا ہے اور کڑی سے کڑی ملا دی ہے، غلطیاں کس مصنف، عالم اور اہلِ قلم سے سرزد نہیں ہوتیں، مولانا مودودی بھی انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں وہ بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں ہیں، مگر کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مجموعی طور پر ان کی کتابیں اصابتِ فکر کی ترجمان اور خیر و فلاح کا مظہر ہیں!

——— لیکن ———

اُن کے معاملہ میں لے اُن کی تحقیر کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا، جس طرح وکیلوں کے محررِ، کچہریوں کے عرائض نویس، پرائمری اسکولوں کے ہیڈ یا زمینداروں کے کارندے ہوتے ہیں، اُنہی کی سطح پر لاکر مولانا مودودی کو "منشی مودودی" لکھا جاتا ہے! ان لوگوں کے اندر یہ احساس کمتری پایا جاتا ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت جیسے اُن کے اکابر کی حریف بنی ہوئی ہے، لہٰذا شخصیت کے اس بت کو توڑنا ہی دینی خدمت اور اکابر کی عقیدت مندی کا عملی ثبوت ہے۔ حالانکہ دین کے معاملہ میں شخصیتوں کے ٹکراؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس قسم کی رقابتیں اور حریفانہ چشمکیں وہاں رونما ہوتی ہیں جہاں تحزب، گروہ بندی اور اکابر کی عقیدت مندی کا غلو پایا جاتا ہے، یہ باتیں ہم کسی خیالی مفروضے کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں، ان حضرات کے مدرسوں سے طلباء اور اساتذہ جماعت اسلامی سے وابستگی رکھنے کے سبب نکالے گئے ہیں اور اس صریح ظلم کے بعد بھی ان کے علم و تقویٰ، شرافتِ نفس اور دینی اخوت پر ذرہ برابر آنچ نہیں آئی، یہ بزرگ مطمئن ہیں، بلکہ ؎

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جماعت اسلامی پر ان حضرات نے جس انداز میں تنقید کی ہے، اس کی حق شناس دل و دماغ سے کسی عنوان توقع نہیں ہو سکتی، کتنے علماء ہیں جو اس مسئلہ میں جماعت کا موقف رکھتے تھے مگر ان سب کو چھوڑ کر صرف جماعت کو مطعون کیا گیا، پاکستان کے حالات کا پس منظر، اہون البلیتین کی فقہی حیثیت، پھر جماعت کا یہ اعلان کہ عورت کی امارت بے شک دین میں ممنوع ہے یہ اصول اپنی جگہ درست ہے، جس چیز کو وقتی طور پر اضطراری حالت میں گوارا کیا گیا ہے وہ آئندہ کے لئے نظیر بھی نہیں بن سکتی ان میں سے کسی توجیہ اور تاویل کو ان لوگوں نے قبول نہیں کیا، جماعت کے موقف کی کوئی تشریح ان کو مطمئن نہ کر سکی، اس مسئلہ میں ان حضرات کو اختلاف کرنے کا حق حاصل تھا، مگر اس اختلاف کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ جماعت نے اس مسئلہ میں "غلطی" نہیں کی بلکہ دین کے ستون کو گرا دیا ہے اور شریعت کو بے آبرو کر دیا ہے۔

اس نامنصفانہ اور جارحانہ تنقید کے بعد ہی جماعت اسلامی سے جناب کوثر نیازی کی علیحدگی کا سانحہ پیش آ گیا جس کا ان حضرات نے جس مسرت و شادمانی اور انشراح قلب کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے وہ جماعت سے ان کی دشمنی کا کھلا ہوا مظاہرہ ہے، دلوں میں اب تک جو چھپا ہوا تھا وہ باہر آ گیا ہے، حالانکہ جماعتوں میں لوگ داخل ہوتے اور نکلتے بھی رہتے ہیں، ارکان کو کچھ شکایتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں آپس کی گفتگوئیں، تنقیدیں، بدگمانیاں بھی افتراق کا سبب بن جاتی ہیں! اس اختلاف کی بھنک پا کر اگر سرگودھا، لائل پور اور تدبرِ قرآن کے ایوان واقع رحمٰن پورہ لاہور کی طنابیں کھینچ کر حرکت میں نہ آ جائیں، تو مولانا کوثر نیازی خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جاتے مگر خط و کتابت غالباً پریس میں نہ آتی، اس نوبت پر ہم اس سے زیادہ کچھ عرض کرنا مناسب نہیں سمجھتے!

ہندوستان کے جرائد میں لکھنؤ کا "قومی آواز" ہو، دیوبند کا "میثاق" ہو یا لکھنؤ کا "الفرقان" ان سب نے اس سانحہ سے جماعت اسلامی کو مجروح و مطعون کرنے کا فائدہ اٹھایا ہے اور ماہنامہ "الفرقان" تو اس حد تک پہنچ گیا ہے ؎

"…… مولانا مودودی اور اُن کی جماعت کے خلاف ہمارا جوش و خروش صرف اس لئے ہے کہ اس برصغیر میں ہم انہیں ادھر چند برس کی ان کی مسلسل روش کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم فتنہ سمجھتے ہیں۔"

(ماہ شوال ۸۴ھ)

یہ وہ حضرات ہیں جو "اکرام مسلم" کا دنیا کو درس دیتے رہتے ہیں اور خشیت و تقویٰ جن کے فکر و نظر کا موضوع ہے! مسلمانوں کی ایک جم

سلام کے لئے "فتنۂ عظیم" قرار دے دینا اس سے بڑی تحقیر مسلم اور دل آزاری اور کیا ہو سکتی ہے! ان کے قلم کی پہونچائی ہوئی ان
چوٹوں پر کچھ احتجاج آمیز خطوط ان کے پاس آجاتے ہیں اور جماعت سے متعلقہ اخبارات و رسائل مدافعت میں کچھ لکھتے ہیں، تو یہ حضرات مظلوم
ر شور مچانے لگتے ہیں کہ جماعت والوں نے ہمیں نرغہ میں لے لیا ہے! ظلم کا یہ عجیب طریقہ ہے جو ان واعیان "اکرام مسلم" نے ایجاد کیا ہے
ی اس منطق کا تو کوئی جواب ہی نہیں کہ جماعت اسلامی سے جب تک کوئی وابستہ رہتا ہے اس کی دیانت، اخلاص، دردمندی غرض کوئی خوبی
کی نگاہ میں معتبر نہیں ہوتی، یہ اس سے بدگمان ہی رہتے ہیں مگر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو جانے کے بعد وہی شخص ان حضرات کو سراپا اخلاص
سم صداقت نظر آتا ہے! اور اسے اس طرح سینہ سے لگاتے ہیں جیسے برسوں کا بچھڑا ہوا کوئی رفیق ان کو مل گیا ۔

؎ آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

"الفرقان" میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر "نوازش" کا سلسلہ بہت دنوں سے جاری ہے، یہ سلسلہ ٹوٹتا اور جڑتا رہتا ہے یعنی
کے بعد ملا، اور فترت کے بعد کرم فرمائیوں کی تمہید! اب کی بار مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے فارسی کی ایک مشہور مثل ۔۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

پیدا کر دکھایا، اور جماعت اسلامی کے خلاف جو شدید عناد اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے اُسے ظاہر کر دیا!

جماعت اسلامی کا وجود اور مولانا مودودی کی ذات دین اور مسلمانوں کے لئے آخر کس بنا پر معمولی فتنہ نہیں "فتنۂ عظیم" ہے، کوئی دلیل؟
ن ثبوت؟ کیا جماعت اور مودودی صاحب کے بنیادی عقائد میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے، توحید، رسالت، کتاب و سنت، انبیاء و ملائکہ
آخرت، تقدیر ۔۔۔ وغیرہ دینی عقائد میں انہوں نے خواہ مخواستہ کتر بیونت کر دی ہے، ارکان اسلام میں سے کسی رکن کا انہوں نے انکار
ہے، کسی منصوص شے کی حلت اور حرمت کو بدل دیا ہے، کوئی ایسا اجتہاد کیا ہے جس سے دین کی بنیاد مجروح ہو گئی ہے، یہ لوگ کسی فسق میں مبتلا
گئے ہیں، کسی حکومت کے ہاتھ بک گئے ہیں، مسلمانوں کے اموال کی امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کی صحبت میں رہ کر لوگ دین سے
نفر ہو گئے ہیں، آخر وہ کون سا جرم عظیم ان سے سرزد ہوا ہے جس کی بنا پر ان پر دین کے لئے "فتنۂ عظیم" کی فرد جرم لگائی گئی ہے!

اسمبلیوں کے انتخابات کے لئے جد و جہد اور اُن کے لئے امیدواری کی درخواست، غلافِ کعبہ کی نمائش، عورت کی صدارت کا
سئلہ، یا جماعت سے بعض ارکان کا اختلاف و علیحدگی سیاسی پارٹیوں سے اتحاد یہ مسائل اتنے شدید تو نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر ایک دینی
اعت کو "فتنۂ عظیم" قرار دے دیا جائے، فرض کر لیجئے کہ ان تمام مسائل و معاملات میں جماعت کا موقف درست نہیں ہے، مگر ان فروعی
ئل کے سبب جماعت اسلامی پر "فتنۂ عظیم" کا حکم لگانا کیا قرین عدل و صواب ہے؟ اس انداز پر اگر احتساب کیا جائے تو مسلمانوں کا کوئی فقہی
ہب اور دینی مکتبہ فکر یا ادارہ "فتنۂ عظیم" کی سزا سے نہیں بچ سکتا! دیوبند کی مثال سب کے سامنے ہے کہ آپس کے اختلافات کے سبب
ا بعین میں دوسرا دارالعلوم قائم کرنا پڑا، دیوبند کے بعض اکابر کے درمیان اُن دنوں کلام سلام تک موقوف ہو گیا تھا مگر کسی ناقد نے دارالعلوم
ندوۃ العلماء میں کے کسی گروہ کو مسلمانوں کے لئے فتنہ قرار نہیں دیا۔ جماعتوں میں ایسی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں کہ نزاع کا آغاز شخصی نکتہ چینی
ے ہوتا ہے، پھر کچھ انتظامی امور وجہ اختلاف بن جاتے ہیں اور معاملہ یہاں تک پہونچ جاتا ہے کہ اختلاف شخصی اور انتظامی نہیں ہے بلکہ "حق
ناحق" کا اختلاف ہے، جو حضرات بھی جماعت سے علیحدہ ہوئے ہیں ان کو جماعت میں دینی کوتاہیاں نظر آئی ہیں، قرآن کے اس مشاہدہ
صاس و تجربہ کی ہم تردید نہیں کرتے کہ انہوں نے واقعی ایسا ہی محسوس کیا ہوگا، مگر یہ جو ہزاروں لوگ جماعت کی تنظیم سے وابستہ ہیں

اُن کی یہ وابستگی بھی تو آخر کوئی وزن رکھتی ہے، اُن کے بارے میں ہم یہ حسنِ ظن کیوں نہ رکھیں کہ جماعت میں دینی رنگ کا غلبہ دیکھ کر ہی یہ حضرات جماعت سے وابستہ ہیں!

اے مدعیانِ خشیت و تقویٰ، داعیانِ "تعلق باللہ" اور اے تجربہ کارانِ کشف و اشراق! خدا کی قسم جماعتِ اسلامی کے درپے آزار بن کر تم کوئی نیک کام نہیں کر رہے ہو، اس "فتنۂ عظیم" کو مٹا کر تم دین کی بہت بڑی قوت کو فنا کر دو گے، خدا کرے کہ تمہاری یہ تمنا کبھی پوری نہ ہو! ہم گنہگاروں کا تو یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جماعت اسلامی ملت کے لئے "رحمت" ہے! دنیا کے پردے پر تنہا یہی وہ جماعت ہے جو اللہ تعالیٰ کے پورے کے پورے دین کو برپا کرنے کا عزم لے کر اُٹھی ہے جس نے اس دور میں ہر نظام باطل کو چیلنج کیا ہے اور اسلامی حقیقتوں کو کسی معذرت کے بغیر فاتحانہ جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے، فراست و عزیمت کا اس قدر خوشگوار اجتماع، کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس جماعت کو قائم و فعال رکھے اور ظلم کرنے والوں کے جور و ستم کے تحمل کی توفیق اور امتحان و آزمائش کی راہ میں استقامت کا حوصلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

ماہر القادری
۲۶ / مارچ / ۱۹۶۵ء

مولانا محمد تقی عثمانی
(مدرس دارالعلوم کراچی ۱۴)

تقلید کیا ہے؟

ہمارے لئے یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ جس چیز کو ہم آج "تقلید" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس کے لئے سب سے پہلے کس عالم نے "تقلید" کا لفظ استعمال کیا؟ لیکن اتنی بات ہم یقین کے ساتھ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس لفظ کی وجہ سے بعض جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں اگر اس کا علم پہلے سے ہو جاتا تو حضرات اس کا نام تقلید ہرگز نہ رکھتے۔

جن حضرات کو تقلید کے معاملہ میں نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ شبہات پیدا ہوئے ہیں، ہمارا خیال یہ ہے کہ ان کا اصل سبب "تقلید" کا لفظ ہے جس کے معنی کسی کی غلامی کا قلادہ پہن لینے کے ہیں، اگر صرف اس کے لغوی معنی پر نظر کی جائے تو بلاشبہ کسی مجتہد و فقیہ کی تقلید ایک غلط سا نقشہ پیش کرتی ہے۔

لیکن کسی معاملہ میں غور کرنے کے لئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ بسا اوقات ایک لفظ کے لغوی اور عرفی معنی میں بڑا تفاوت ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ لغت میں جو معنی کسی لفظ کے لکھے ہوئے ہیں، عرف و اصطلاح میں بھی وہی مراد لئے جاتے ہوں۔ شاید یہی وہ نکتہ ہے جس کے پیش نظر نہ ہونے سے تقلید کے معاملہ میں غلط فہمیوں نے راہ پائی۔ بعض حضرات نے اسے شرک تک کی حدود میں داخل کر دیا، اور اس طرح رائی کا ایک پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا۔

محترم مدیر فاران کے ارشاد پر ہم یہ مضمون ان حضرات کی خدمت میں بصد خلوص پیش کر رہے ہیں جن کے ذہن میں تقلید کے مسئلے پر کچھ شبہات ہیں، جس سے مقصود تقلید کی حقیقت اور اس کی حدود کو واضح کرنا ہے۔

چونکہ اس مضمون سے ہمارا مقصد روایتی انداز کا بحث و مناظرہ یا نزاع و جدال ہرگز نہیں ہے اور ہم اس زمانے میں ان موضوعات پر نزاع و جدال کو دین کے بلند پایہ مقاصد کے لئے انتہائی مضر سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہماری عاجزانہ درخواست ہے کہ اسے پورے غور کے ساتھ مفاہمت کے ماحول میں ٹھنڈے دل سے پڑھا جائے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ہماری نظر میں تقلید کے بارے میں جو شبہات دلوں میں ابھرے ہیں وہ اس کی حقیقت پر پوری طرح غور نہ کرنے کا نتیجہ ہیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے تقلید کی حقیقت واضح کریں۔

اس بات سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ دین کی اصل دعوت یہ ہے کہ صرف اللہ کی اطاعت کی جائے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی اس لئے واجب ہے کہ آپ نے اپنے قول و فعل سے احکام الٰہی کی ترجمانی فرمائی ہے کہ کون سی چیز حلال ہے کون سی حرام؟ کیا جائز ہے کیا ناجائز؟ ان تمام معاملات میں اطاعت خالصتاً اللہ اور رسول کی کرنی ہے اور جو شخص اللہ اور رسول کے بجائے کسی اور کی اطاعت کرنے کا قائل ہو، اور اس کو مستقل بالذات مطاع سمجھتا ہو وہ یقیناً دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام کی اطاعت کرے۔

لیکن قرآن و سنت میں بعض احکام تو وہ ہیں جنہیں ہر معمولی لکھا پڑھا آدمی سمجھ سکتا ہے، ان میں کوئی اجمال، ابہام یا تعارض نہیں، جو شخص

بھی انہیں دیکھے گا سمجھ لے گا، اور اسے کوئی الجھن پیش نہیں آئے گی، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد:

لا یغتب بعضکم بعضا — تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔

جو شخص بھی معمولی عربی جانتا ہے وہ اس ارشاد کے معنی سمجھ جائے گا اور چونکہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے اور نہ کوئی دوسری شرعی دلیل اس سے ٹکراتی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی الجھن باقی نہ رہے گی، یا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

لا فضل لعربی علی عجمی — کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں

یہ ارشاد بالکل واضح ہے، اس میں کوئی پیچیدگی اور اشتباہ نہیں، ہر عربی داں بلا تکلف اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔

اس کے برعکس قرآن و سنت میں بہت سے احکام وہ ہیں جن کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، بہت سے وہ ہیں جن میں کوئی ابہام یا اجمال ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو قرآن کی کسی دوسری آیت یا کسی دوسری حدیث سے متعارض ہیں ہر ایک کی مثال ملاحظہ فرمائیے:—

(۱) قرآن کریم کا ارشاد:

والمطلقٰت یتربصن بأنفسهن ثلٰثة قروء — اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ تین "قروء" گذرنے تک انتظار کریں گی۔

اس میں مطلقہ عورت کی عدت بیان کی گئی ہے اور اس کے لئے "تین قروء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ "قرء" کا لفظ عربی زبان میں "حیض" کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور "طہر" کے لئے بھی، اگر پہلے معنی لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مطلقہ کی عدت تین ایام ماہواری ہیں اور اگر دوسرے معنی لئے جائیں تو تین طہر عدت قرار پاتے ہیں اس موقع پر ہمارے لئے یہ الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم ان دو معنوں میں سے کس پر عمل کریں؟

(۲) ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من لم یترک المخابرة فلیؤذن بحرب من اللّٰه ورسوله (ابوداؤد) — جو شخص بٹائی کا کاروبار نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لے۔

اس میں بٹائی کی ممانعت کی گئی ہے۔ لیکن بٹائی کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں، حدیث اس باب میں خاموش ہے کہ یہاں بٹائی کی کون سی صورت مراد ہے؟ کیا بٹائی کی ہر صورت ناجائز ہوگی؟ یا بعض صورتیں جائز قرار پائیں گی اور بعض ناجائز؟ حدیث میں ایک قسم کا اجمال پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمارے لئے پیچیدگی پیدا ہوتی ہے کہ بٹائی کو علی الاطلاق ناجائز کہہ دیں یا اس میں کوئی تقسیم ہے؟

(۳) ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

من کان له إمام فقراءة الإمام له قراءة (ابن ماجہ) — جس کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس کے لئے بھی قرأت بن جائے گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں جب امام قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو خاموش کھڑا رہنا چاہئے، دوسری طرف آپ ہی کا ارشاد ہے کہ:

لا صلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب۔ (بخاری) — جس شخص نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی ہو اس کی نماز نہیں ہوگی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لئے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے، ان دونوں حدیثوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے [illegible]

کو قرار دے کر یوں کہا جائے کہ دوسری حدیث میں صرف امام اور منفرد کو خطاب کیا گیا ہے اور مقتدی اس سے مستثنیٰ ہے۔ یا دوسری حدیث کو اصل قرار دے کر یوں کہا جائے کہ پہلی حدیث میں قرأت سے مراد فاتحہ کے سوا کوئی دوسری سورت ہے اور سورۂ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن و حدیث سے احکام کے مستنبط کرنے میں اس قسم کی بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی فہم و بصیرت پر اعتماد کرکے اس قسم کے معاملات میں خود کوئی فیصلہ کرلیں اور اس پر عمل کریں اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے ہم یہ دیکھیں کہ قرآن و سنت کے ان ارشادات سے ہمارے جلیل القدر اسلاف نے کیا سمجھا ہے؟ قرونِ اولیٰ کے جن بزرگ کو ہم علوم قرآن و سنت کا زیادہ ماہر دیکھیں ان کی فہم و بصیرت پر اعتماد کریں اور انہوں نے جو کچھ سمجھا ہے اس کے مطابق عمل کریں۔

اگر انصاف اور حق پسندی سے کام لیا جائے تو ہمارے خیال میں اس بات میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت خاصی مخدوش ہے اور دوسری صورت بہت محتاط، یہ بات صرف تواضع اور کسرنفسی ہی نہیں، ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ علم و فہم، ذکاوت و حافظہ، دین و دیانت تقویٰ اور پرہیزگاری ہر اعتبار سے ہم اس قدر تہی دست ہیں کہ قرونِ اولیٰ کے علماء سے ہماری کوئی نسبت نہیں، پھر جس مبارک ماحول میں قرآن کریم نازل ہوا تھا، قرونِ اولیٰ کے علماء اس سے بھی قریب ہیں اور اس قرب کی بناء پر ان کے لئے قرآن و سنت کی مراد کو سمجھنا زیادہ آسان ہے اس کے برخلاف ہم طبعی حالات سے اتنی دور جا پڑے ہیں کہ ہمارے لئے اس زمانے کے طرزِ معاشرت اور طرزِ گفتگو کا ہو بہو اور بعینہٖ تصور بڑا مشکل ہے۔ حالانکہ کسی شخص کی بات کو صحیح سمجھنے کے لئے اس کے پورے پس منظر کا سامنا ہونا بے حد ضروری ہے۔

ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اگر ہم اپنے فہم پر اعتماد کرنے کی بجائے مختلف التعبیر پیچیدہ معاملات میں اس مطلب کو درست قرار دیں جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے تو کہا جائے گا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے۔

یہ ہے "تقلید" کی حقیقت! اگر میں اپنی بات کو صحیح سمجھا سکا ہوں تو یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ کسی امام یا مجتہد کی تقلید صرف اس موقعہ پر کی جاتی ہے جہاں قرآن و سنّت سے کسی حکم کے سمجھنے میں اجمال و ابہام یا تعارض کی وجہ سے کوئی الجھن یا دشواری ہو اور قرآن و سنت کے جن احکام میں کوئی اجمال و ابہام تعارض یا اسی قسم کی کوئی اور الجھن نہ ہو وہاں کسی امام و مجتہد کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں۔[1]

پھر مذکورہ بالا گذارشات سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ کسی امام و مجتہد کی تقلید کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کے حکم کو شارع کی حیثیت سے مانا لیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اتباع تو قرآن و سنّت ہی کی مقصود ہے، صرف قرآن و سنت کی مراد سمجھنے کے لئے بحیثیت شارح قانون ان کی تشریح و تعبیر پر اعتماد لیا گیا ہے۔

اب آپ بنظرِ انصاف غور فرمائیے کہ اس عمل میں کون سی بات ایسی ہے جسے "گناہ" یا "شرک" کہا جاسکے اگر کوئی شخص کسی امام کو شارع کا درجہ دے کر اسے واجب الاتباع قرار دیتا ہو تو بلاشبہ اسے شرک کہا جاسکتا ہے لیکن کسی کو شارح قانون قرار دے کر اپنے مقابلے میں اس کی فہم و بصیرت پر اعتماد کرنا تو افلاسِ علم کے اس دور میں اس قدر ناگزیر ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں۔

تقلید کی دو صورتیں پھر اس تقلید کی بھی دو صورتیں ہوجاتی ہیں، ایک تو یہ کہ تقلید کے لئے کسی خاص امام و مجتہد کو معین نہ کیا جائے، بلکہ اگر ایک مسئلے میں ایک عالم کا قول اختیار کیا گیا ہے تو دوسرے مسئلے میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کرلی جائے، اسے "تقلید

مطلق" کہا جاتا ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد عالم کو معین کر لیا جائے، اور ہر ایک مسئلہ میں اسی کی رائے اختیار کی جائے، قرآن و سنت میں جہاں بھی مذکورہ الجھنوں میں سے کوئی الجھن پیش آئے وہاں اسی کی رائے کی طرف رجوع کیا جائے، اسے "تقلید شخصی" کہتے ہیں۔

تقلید کی ان دونوں قسموں کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک شخص براہ راست قرآن و سنت سے احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا تو وہ جسے قرآن و سنت کے علوم کا ماہر سمجھتا ہے اس کے فہم و بصیرت اور تقویٰ پر اعتماد اور اس کی تشریحات کے مطابق عمل کرتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا جواز بلکہ وجوب قرآن و سنت کے بہت سے دلائل سے ثابت ہے ان میں سے چند ملاحظہ ہوں:

(۱) قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ولو ردوہ الی الرسول والی اُولی الامر منہم لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم

(اور اگر یہ لوگ اس امر کو رسول کے اور اولی الامر کے حوالہ کرتے تو جو لوگ استنباط کے اہل ہیں وہ اسے جانتے اور انہیں بتلا دیتے)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ خود استنباط کی اہلیت نہیں رکھتے انہیں چاہیے کہ وہ ان لوگوں کی تقلید کریں جو اجتہاد و استنباط کے اہل ہیں[1]

(۲) ایک اور جگہ ارشاد ہے:

فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین ولینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم لعلہم یحذرون۔

(ان کے ہر فرقے میں سے ایک چھوٹی جماعت اس مقصد کے لئے کیوں نہ نکلے کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے اور واپس آ کر اپنی قوم کو بیدار کرے تاکہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں)

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی قوم میں واپس پہونچ کر انہیں دین و شریعت کے احکام بتا اور ان کی قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کے بتائے ہوئے مسائل پر اعتماد کر کے ان پر عمل کریں اسی کا نام تقلید ہے۔

(۳) ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اتبع سبیل من اناب الی

(اس شخص کے راستے کی پیروی کرو جو میری طرف رجوع کئے ہوئے ہو)

اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ "میرے راستے کی پیروی کرو" کیونکہ اللہ کی اطاعت کے راستہ کو ٹھیک اسی طرح سمجھنا ـــــ جس طرح وہ راستہ واقع ہوا ہر شخص کے بس کا کام نہیں، اس لئے اس کا یہ طریقہ بتلا دیا گیا کہ جو شخص اللہ کی طرف بہ دل و جان راغب ہے، اور اللہ کی پسند و ناپسند کو سمجھنے کے لئے زندگی اس نے وقف کر رکھی ہے اس کی اتباع کرنے سے اللہ کی اطاعت ہو جائے گی

(۴) قرآن کریم کی طرح بہت سی احادیث سے بھی تقلید کا جواز ثابت ہوتا ہے، اختصار کے پیش نظر ہم صرف ایک حدیث پیش کرتے ہیں:

عن حذیفۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے

---

[1] تفصیل کے لئے امام رازیؒ کی تفسیر کبیر اور جصاص کی احکام القرآن ملاحظہ ہوں۔

اني لا ادري ما بقائي فيكم فاقتدوا بالذين من بعدي ابي بكرؓ و عمرؓ۔

(مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

معلوم نہیں میں کب تک تم لوگوں میں زندہ رہوں گا لہٰذا میرے بعد ان دو شخصوں کی اقتداء کرنا، ایک ابوبکرؓ، دوسرے عمر رضی اللہ عنہما۔

حدیث میں "اقتداء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو انتظامی امور میں اطاعت کرنے کے معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوتا، اس کا مفہوم بعینہٖ وہ ہے جو ہم تقلید کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔

چنانچہ تقلید کی دو قسمیں (مطلق اور شخصی) ہم نے بیان کی ہیں، عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں ان دونوں پر عمل ہوتا رہا ہے جس کی بہت سی نظیریں حدیث اور تاریخ کے ذخیروں میں ملتی ہیں۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

عہدِ صحابہؓ میں تقلیدِ مطلق

عہدِ صحابہؓ میں تقلیدِ مطلق کی مثالیں اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ صحابۂ کرامؓ اور تابعین میں سے جو حضرات فقیہ نہ تھے وہ فقہاء صحابہؓ سے پوچھ پوچھ کر عمل کیا کرتے تھے اور کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہ ہو جس میں انہوں نے مسئلہ کی دلیل پوچھی ہو۔ اسی کو تقلیدِ مطلق کہتے ہیں، چونکہ کتبِ حدیث سے ذرا مناسبت رکھنے والا ہر شخص اس قسم کے واقعات سے واقف ہے اس لئے ہم یہاں نمونہ کے طور پر صرف ایک واقعہ نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں:

عن حبيب بن ابي صالح قال بعت برا من اهل دار نخلة الى اجل فاردت الخروج الى الكوفة فعرضوا على ان اضع لهم وينقدوني فسألت زيد بن ثابت فقال لا آمرك ان تفعله ولا ان تأكل هذا او توكله۔

(موطا امام مالکؒ)

حبیب بن ابی صالح کہتے ہیں کہ میں نے دار نخلہ والوں کے ہاتھ کچھ گیہوں فروخت کئے اور قیمت کے لئے ایک میعاد دے دی۔ پھر میں نے کوفہ جانا چاہا تو ان لوگوں نے مجھ سے اس بات کی درخواست کی کہ میں ان کو کچھ دام چھوڑ دوں اور وہ لوگ مجھے نقد قیمت ادا کر دیں میں نے حضرت زید بن ثابتؓ سے سوال کیا، انہوں نے فرمایا کہ نہ میں اس فعل کی تم کو اجازت دیتا ہوں نہ کھانے کی، نہ کھلانے کی۔

عہدِ صحابہؓ میں تقلیدِ شخصی

تقلیدِ مطلق کے ساتھ عہدِ صحابہؓ بلکہ عہدِ رسالت میں بھی تقلیدِ شخصی کی مثالیں ملتی ہیں:

(۱) صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

ان اهل المدينة سألوا ابن عباس عن امرأة طافت ثم حاضت قال لهم تنفر قالوا لا ناخذ بقولك وندع قول زيدؓ۔

(صحیح بخاری کتاب الحج باب اذا حاضت المرأة بعدما افاضت)

اہلِ مدینہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس عورت کے بارے میں سوال کیا جو طوافِ فرض کے بعد حائضہ ہو گئی ہو (کہ وہ طوافِ وداع کے لئے پاک ہونے تک انتظار کرے یا اس سے طواف ساقط ہو جائے گا اور بغیر طواف کئے واپس ہونا جائز ہوگا) ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ جا سکتی ہے! اہلِ مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کے قول پر زید بن ثابتؓ کے قول کے خلاف عمل نہیں کریں گے۔

فتح الباری میں بحوالہ ثقفی اسی واقعہ پر اہلِ مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :-

افتنا اولم تفتنا زید بن ثابت یقول لا تنفر	آپ فتویٰ دیں یا نہ دیں، حضرت زید بن ثابتؓ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت (بغیر طواف) واپس نہیں جا سکتی۔

فتح الباری ہی میں مسند ابو داؤد طیالسی کے حوالہ سے بروایت قتادہؒ اس واقعہ میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں :

فقالت الانصار لا نتابعك یا ابن عباسؓ و انت تخالف زیدا؟ فقال سلوا صاحبتکم ام سلیم (فتح الباری ص ۴۶۳ ج ۳)	انصار نے کہا کہ ہم زید بن ثابتؓ کے خلاف قول میں آپ کی اتباع نہ کریں گے، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ لوگ ام سلیم سے دریافت کریں کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے۔

اس واقعہ میں اہلِ مدینہ اور حضرت ابن عباسؓ کی گفتگو سے دو چیزیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں، ایک یہ کہ اہلِ مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کیا کرتے تھے اور ان کے قول کے مخالف کسی قول پر عمل نہیں کرتے تھے، مذکورہ واقعہ میں ان حضرات نے حضرت ابن عباسؓ کے فتوے پر عمل نہ کرنے کی اس کے سوا کوئی وجہ بیان نہیں کی کہ وہ حضرت زیدؓ کے فتوے کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ان حضرات پر یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ تم تقلید کے لئے ایک شخص کو متعین کرکے "گناہ" یا "شرک" کے مرتکب ہو رہے ہو، بلکہ انہیں حضرت ام سلیمؓ سے مسئلہ کی تحقیق کرکے حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف دوبارہ مراجعت کرنے کی ہدایت فرمائی۔

چنانچہ فتح الباری ہی میں ہے کہ یہ حضرات مدینہ طیبہ پہونچے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشاد کے مطابق حضرت ام سلیمؓ سے واقعہ کی تحقیق کرکے دوبارہ حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف مراجعت کی جس کے نتیجے میں حضرت زیدؓ نے مکرر حدیث کی تحقیق فرما کر اپنے سابقہ فتوے سے رجوع فرما لیا۔ (فتح الباری ص ۴۶۳ ج ۳)

(۲) صحیح بخاری، ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت ہزیل بن شرحبیل سے ایک طویل واقعہ مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ سے کچھ لوگوں نے ایک مسئلہ پوچھا، پھر وہی مسئلہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا اور ان سے اس مسئلہ میں حضرت ابو موسیٰؓ کی رائے بھی ذکر کر دی گئی، حضرت عبداللہ نے جو فتویٰ دیا وہ فتویٰ حضرت ابو موسیٰؓ کے فتوے کے خلاف تھا، لوگوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتویٰ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا :

لا تسألونی ما دام هذا الحبر فیکم۔ (تیسیر بحوالہ بخاری وغیرہ ص ۳۰۹)	جب تک یہ متبحر عالم (یعنی حضرت ابن مسعودؓ) تم میں موجود ہیں، تم مجھ سے مت پوچھا کرو۔

حضرت ابو موسیٰؓ کے اس ارشاد سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے ہر مسئلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور یہی تقلید شخصی ہے کہ ہر مسئلے میں کسی ایک ہی عالم سے رجوع کیا جائے۔

(۳) جامع ترمذی اور سنن ابو داؤد میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک روایت نقل کی ہے،

عن معاذ بن جبلؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لك قضاء؟ قال اقضی بکتاب اللہ، قال فان لم تجد	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آ جائے تو کس طرح فیصلہ کروگے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق

فی کتاب اللہ، قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال أجتہد برأیی ولا آلو، قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہ وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ ۔

فیصلہ کروں گا، فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟ تو عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا اگر اس میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا کہ میں اس وقت اجتہاد و استنباط کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا اور تلاش حق میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا، (معاذؓ فرماتے ہیں کہ) آپ نے اس پر (فرط مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے ۔

یہ واقعہ تقلید و اجتہاد کے مسئلہ میں ایک ایسی صحیح ہدایت ہے کہ اس پر جتنا غور کیجئے اس مسئلے کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یہاں ہمیں اس واقعہ کے ایک پہلو پر توجہ دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ آپ نے اہل یمن کے لئے اپنے فقہاء صحابہؓ میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا اور انہیں حاکم و معلم اور مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کر دیا کہ وہ ان کی اتباع کریں۔ انہیں صرف قرآن و سنت ہی نہیں، بلکہ قیاس و اجتہاد کے مطابق فتوے صادر کرنے کی اجازت فرمائی، اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی اجازت دی، بلکہ اس کو ان کے ذمہ لازم فرما دیا۔

غرض مندرجہ بالا روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں قسموں پر صحابۂ کرامؓ کے عہد مبارک میں عمل ہوتا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن و سنت سے براہ راست احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اصل کے اعتبار سے اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز تھیں ۔

لیکن خدا رحمتوں کا مینہ برسائے ہمارے بعد کے فقہاء و مجتہدین پر جو اپنے زمانے کے نبض شناس تھے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر نگاہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، انہوں نے بعد میں ایک زبردست انتظامی مصلحت سے تقلید مطلق کا دروازہ بند کر دیا ۔

وہ زبردست انتظامی مصلحت کیا تھی؟ اس سوال کے جواب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھئے کہ "خواہش پرستی" وہ زبردست گمراہی ہے جو بسا اوقات انسان کو کفر تک پہونچا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم قدم قدم پر ہوشیار کرتا ہے کہ کہیں یہ روگ تم میں پیدا نہ ہو جائے آیات و احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جو خواہش پرستی کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اس سے دامن بچانے کی جگہ جگہ تلقین کرتا ہے ۔

پھر خواہش پرستی بھی ایک تو یہ ہے کہ انسان ایک برے کام کو برا اور گناہ کو گناہ سمجھتا ہے مگر اپنے نفس کی خواہشات کے آگے مجبور ہو کر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ صورت ایک بہت بڑا جرم ہونے کے باوجود اتنی سنگین نہیں ہے کہ اس کے برعکس خواہش پرستی کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہوا اس حد تک پہونچ جائے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر ڈالے اور دین و شریعت کو ایک کھلونا بنا دے ——— ظاہر ہے کہ خواہش پرستی کی یہ دوسری صورت پہلی سے زیادہ سنگین، خطرناک اور تباہ کن ہے اور انسانوں کا جو عمل بھی اسے خواہش پرستی کی اس راہ پر ڈال سکتا ہو اس سے بچنا ضروری ہے۔

فقہاء کرام نے محسوس فرمایا کہ دیانت کا معیار روز بروز گھٹتا رہا ہے، احتیاط اور تقویٰ اٹھتے جا رہے ہیں ایسی صورت میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ

اور فتح الباری میں بحوالہ ثقفی اسی واقعہ میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :-

افتنا اولم تفتنا زید بن ثابتؓ یقول لا تنفر

آپ فتویٰ دیں یا نہ دیں، حضرت زید بن ثابتؓ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت (بغیر طواف) واپس نہیں جاسکتی ۔

نیز فتح الباری ہی میں مسند ابوداؤد طیالسی کے حوالہ سے بروایت قتادہؓ اس واقعہ میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں :

فقالت الانصار لا نتابعك یا ابن عباسؓ و انت تخالف زیدا؟ فقال سلوا عما اجبتکم ام سلیم (فتح الباری ص ۴۶۳ ج ۳)

انصار نے کہا کہ ہم زید بن ثابتؓ کے خلاف قول میں آپ کی اتباع نہ کریں گے، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ لوگ ام سلیم سے دریافت کریں کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے،

اس واقعہ میں اہل مدینہ اور حضرت ابن عباسؓ کی گفتگو سے دو چیزیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ اہل مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کیا کرتے تھے اور ان کے قول کے مخالف کسی قول پر عمل نہیں کرتے تھے، مذکورہ واقعہ میں ان حضرات نے حضرت ابن عباسؓ کے فتوے پر عمل نہ کرنے کی اس کے سوا کوئی وجہ بیان نہیں کی کہ وہ حضرت زیدؓ کے فتوے کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ان حضرات پر یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ تم تقلید کے لئے ایک شخص کو متعین کرکے "گناہ" یا "شرک" کے مرتکب ہو رہے ہو، بلکہ انہیں حضرت ام سلیمؓ سے مسئلہ کی تحقیق کرکے حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف دوبارہ مراجعت کرنے کی ہدایت فرمائی ۔

چنانچہ فتح الباری ہی میں ہے کہ یہ حضرات مدینہ طیبہ پہونچے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشاد کے مطابق حضرت ام سلیمؓ سے واقعہ کی تحقیق کرکے دوبارہ حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف مراجعت کی جس کے نتیجے میں حضرت زیدؓ نے مکرر حدیث کی تحقیق فرماکر اپنے سابقہ فتوے سے رجوع فرما لیا ۔ (فتح الباری ص ۴۶۴ ج ۳)

(۲) صحیح بخاری، ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت ھزیل بن شرجیل سے ایک طویل واقعہ مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰؓ سے کچھ لوگوں نے ایک مسئلہ پوچھا، پھر وہی مسئلہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا اور ان سے اس مسئلہ میں حضرت ابوموسیٰؓ کی رائے بھی ذکر کردی گئی، حضرت عبداللہ نے جو فتویٰ دیا وہ فتویٰ حضرت ابوموسیٰؓ کے فتوے کے خلاف تھا، لوگوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتویٰ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا :

لا تسألونی ما دام ھذا الحبر فیکم۔ (تیسیر بحوالہ بخاری وغیرہ ص ۳۷۹)

جب تک یہ متبحر عالم (یعنی حضرت ابن مسعودؓ) تم میں موجود ہیں، تم مجھ سے مت پوچھا کرو۔

حضرت ابوموسیٰؓ کے اس ارشاد سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے ہر مسئلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور یہی تقلید شخصی ہے کہ ہر مسئلے میں کسی ایک ہی عالم سے رجوع کیا جائے ۔

(۳) جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک روایت نقل کی ہے :

عن معاذ بن جبلؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آجائے تو کس طرح فیصلہ کروگے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق

فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتھد برائی ولا آلو، قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہٗ وقال الحمد للہ وفق رسول رسول اللہ لما یرضیٰ بہ رسول اللہ ۔

فیصلہ کروں گا، فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہو؟ تو عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا اگر اس میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا کہ میں اس وقت اجتہاد و استنباط کرکے اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا اور تلاش حق میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا، (معاذؓ فرماتے ہیں کہ) آپ نے اس پر (فرط مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے ۔

یہ واقعہ تقلید و اجتہاد کے مسئلہ میں ایک ایسی شمع ہدایت ہے کہ اس پر جتنا غور کیجئے اس مسئلے کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یہاں ہمیں اس واقعہ کے صرف ایک پہلو پر توجہ دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ آپ نے اہل یمن کے لئے اپنے فقہاء و صحابہؓ میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا اور انہیں حاکم و قاضی، معلم اور مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کردیا کہ وہ ان کی اتباع کریں۔ انہیں صرف قرآن و سنت ہی نہیں، بلکہ قیاس و اجتہاد کے مطابق فتوے صادر کرنے کی اجازت فرمائی، اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی اجازت دی، بلکہ اس کو ان کے ذمہ لازم فرما دیا۔

غرض مندرجہ بالا روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں قسموں پر صحابۂ کرامؓ کے عہد مبارک میں عمل ہوتا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن و سنت سے براہ راست احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اصل کے اعتبار سے اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز تھیں ۔

لیکن خدا رحمتوں کا مینہ برسائے ہمارے بعد کے فقہاء و مجتہدین پر جو اپنے زمانے کے نبض شناس تھے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر نگاہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، انہوں نے بعد میں ایک زبردست انتظامی مصلحت سے تقلید مطلق کا دروازہ بند کردیا ۔

وہ زبردست انتظامی مصلحت کیا تھی؟ اس سوال کے جواب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھئے کہ "خواہش پرستی" وہ زبردست گمراہی ہے جو بسا اوقات انسان کو کفر تک پہونچا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم قدم قدم پر ہوشیار کرتا ہے کہ کہیں یہ روگ تم میں پیدا نہ ہو جائے آیات و احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جو خواہش پرستی کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اس سے دامن بچانے کی جگہ جگہ تلقین کرتا ہے ۔

پھر خواہش پرستی بھی ایک تو یہ ہے کہ انسان ایک برے کام کو برا اور گناہ کو گناہ سمجھتا ہے مگر اپنے نفس کی خواہشات کے آگے مجبور ہو کر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ صورت ایک بہت بڑا جرم ہونے کے باوجود اتنی سنگین نہیں ہے کہ اس کے برعکس خواہش پرستی کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہوا اس حد تک پہونچ جائے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر ڈالے اور دین و شریعت کو ایک کھلونا بنا دے ـــــ ظاہر ہے کہ خواہش پرستی کی یہ دوسری صورت پہلے سے زیادہ سنگین، خطرناک اور تباہ کن ہے اور انسانوں کا جو عمل بھی اسے خواہش پرستی کی اس راہ پر ڈال سکتا ہو اس سے بچنا ضروری ہے ۔

فقہائے کرام نے محسوس فرمایا کہ دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے، احتیاط اور تقویٰ اٹھتے جارہے ہیں ایسی صورت میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ

ے کھول دیا گیا تو بہت سے لوگ جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے، مثلاً ایک شخص کے سردی کے موسم میں خون یا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹا، وہ اپنی تن آسانی کی وجہ سے اس وقت امام شافعیؒ کی تقلید کر کے و نماز پڑھ لے گا، پھر اس کے تھوڑی دیر بعد اگر اس نے کسی عورت کو چھو لیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ اس کی تن آسانی اس موقع پر اسے امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کرنے کا سبق دے گی اور پھر وہ بلا وضو نماز کے لئے کھڑا ہو جائے گا ـــــ غرض اس طرح قول میں اسے فائدہ نظر آئے گا اسے اختیار کرے گا اور جس میں کوئی مضرت کا پہلو ہوگا اسے چھوڑ دے گا اور ایسا بھی ہوگا کہ اس کا نفس اسکو اسی قول کی ت کی دلیلیں سمجھائے گا جو اس کے لئے زیادہ آسان ہے اور وہ بالکل غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہوگا، ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں کا حاصل یہ ہوگا کہ احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کا ایک کھلونا بن کر رہ جائیں گے اور یہ وہ چیز ہے جس کے حرام قطعی ہونے میں آج تک کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہوا، مہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اسی چیز کی شناعت کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

فی وقت یقلدون من یفسدہ وفی وقت یقلدون من یصححہ ومثل ھذا لا یجوز باتفاق الامۃ

یہ لوگ ایک وقت اس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے اور دوسرے وقت میں اس کی جو اسے درست قرار دیتا ہے اور اس طرح کا عمل باتفاق امت ناجائز ہے۔

پھر چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

ونظیر ھذا ان یعتقد الرجل ثبوت شفعۃ الجوار اذا کان طالبا لھا وعدم ثبوتھا اذا کان مشتریا، فان ھذا لا یجوز بالاجماع وکذا من بنی صحۃ ولایۃ الفاسق فی حال نکاحہ وبنی علی فساد ولایتہ حال طلاقہ لم یجز ذلک باجماع المسلمین ولو قال المستفتی المعین انا لم اکن اعرف ذلک وانا الیوم التزم ذلک لم یکن من ذلک لان ذلک یفتح باب التلاعب بالدین ویفتح ذریعۃ الی ان یکون التحریم والتحلیل بحسب الاھواء۔

(فتاوی ابن تیمیہ ص ۲۰۴ و ۲۲۰ ج ۲)

اور اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی آدمی جس وقت کسی حق شفعہ کا خود طالب ہو تو (مذہب امام ابو حنیفہؒ کے مطابق) پڑوسی کے لئے حق شفعہ کا اعتقاد رکھے اور اگر خود مشتری ہو تو (امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق) اس کے ثابت نہ ہونے کا معتقد بن جائے، ایسے ہی وہ شخص جو بحالت قیام نکاح فاسق کی ولایت کے درست ہونے کا قائل اور اس کی بناء پر منافع نکاح سے فائدہ اٹھاتا ہے مگر جب طلاق ثلثہ دے دے تو حرمت مغلظہ سے بچنے کیلئے فاسق کی ولایت کو کالعدم اور اس کے ماتحت منعقد شدہ نکاح کو فاسد قرار دے کہ یہ باجماع مسلمین جائز نہیں ہے اور اگر کوئی مستفتی یہ کہے کہ پہلے مجھے اس مذہب کی خبر نہ تھی اور اب میں اس کا معتقد اور پابند ہوں تب بھی اس اس کا قول قابل تسلیم نہیں کیونکہ یہ دین کو ایک کھلونا بنانے کا دروازہ کھولنا ہے اور اس بات کا سبب بنتا ہے کہ حرام وحلال کا مدار محض خواہشات پر ہو کر رہ جائے۔

اس سلسلے میں علماء امت کی تصریحات بے شمار ہیں ہم نے صرف حافظ ابن تیمیہؒ کے کلام کو نقل کرنے پر اس لئے اکتفا کیا کہ جو حضرات تقلید کے قائل

یں ہیں، ان کے نزدیک بھی ان کا علمی پایۂ بلند مسلّم ہے اور وہ بہت سے معاملات میں ان کی اتباع فرماتے ہیں۔

صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں دیانت عام تھی جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ان کی نفسانیت اس مغلوب تھی کہ خصوصاً شریعت کے احکام میں انہیں اتباع ہویٰ کا خطرہ نہیں تھا اس لئے تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں ان حضرات کے دور میں عمل ہوتا تھا دور میں جب یہ زبردست خطرہ سامنے آیا تو تقلید کو تقلید شخصی ہی میں محصور کر دیا گیا، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو احکام شریعت کے معاملے میں جو رافری برپا ہوتی اس کا تصور اس وقت ہم مشکل ہی سے کر سکتے ہیں، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:-

اعلم ان الناس کانوا فی المائۃ الاولیٰ والثانیہ غیر مجتمعین علی التقلید بمذھب معین وبعد المائتین ظھر فیھم التمذھب وقل من کان لا یعتمد علی مذھب مجتھد بعینہ وکان ھذا ھو الواجب فی ذلک الزمان۔

یاد رکھئے کہ پہلی اور دوسری صدی میں تقلید شخصی کا رواج نہ تھا پھر دوسری صدی کے بعد تقلید شخصی پر عمل شروع ہوا اور اس وقت بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو کسی معین مجتہد کے مذہب پر اعتماد نہ کرتے ہوں اور اس زمانے میں یہی چیز واجب تھی۔

اس پر بعض حضرات کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک چیز عہد صحابہؓ و تابعین میں تو ضروری نہ ہو پھر بعد میں اسے ضروری قرار دے دیا جائے؟ اس اعتراض کا تسلی بخش جواب دیتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کتنی اچھی بات تحریر فرماتے ہیں:-

قلت الواجب الاصلی تقلید من یعرف الاحکام الفرعیۃ عن ادلتھا التفصیلیۃ اجمع علی ذلک اھل الحق فاذا کان للواجب طرق متعددۃ وجب تحصیل طریق من الطرق من غیر تعیین واذا کان طریق واحد تعین ذلک الطریق بخصوصہ کما کان السلف لا یکتبون الحدیث ثم صار فی یومنا ھذا الکتابۃ الحدیث واجبۃ لان روایۃ الحدیث لا سبیل لھا الا معرفۃ ھذہ الکتاب وکان السلف لا یشتغلون بالنحو والصرف واللغۃ لان لسانھم کانت عربیۃ ثم صار فی یومنا ھذا معرفتھا واجبۃ، فاذا کان انسان جاھل فی بلاد الھند وما وراء النھر ولیس ھناک شافعی ولا مالکی ولا حنبلی ولا کتب ھذہ المذاھب وجب علیہ ان یقلد بمذھب ابی حنیفۃ ویحرم علیہ ان یخرج من مذھب

اس اعتراض کے جواب میں میری گذارش یہ ہے کہ اصل میں تو اس شخص کی تقلید کرنا ضروری ہے جو فرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جانتا ہو، اس بات پر تمام اہل حق کا اجماع ہے، پھر اگر واجب کو ادا کرنے کے کئی راستے ہوں، تب تو انسان ان میں سے کوئی بھی اختیار کرے واجب ادا ہو جائے گا، ان راستوں میں سے کسی ایک کو معین کرنا واجب ہوگا لیکن واجب ادا کرنے کا صرف ایک راستہ ہو تو وہی راستہ واجب ہو جائے گا، مثال کے طور پر ہمارے اسلاف حدیثوں کو لکھتے نہیں تھے، مگر ہمارے زمانے میں حدیث کا لکھنا واجب ہو گیا اس لئے کہ اب روایت حدیث کی اس کے سوا کوئی اور سبیل نہیں رہی کہ انہی کتابوں کی طرف مراجعت کی جائے، اسی طرح ہمارے اسلاف صرف، نحو اور لغت کے علوم حاصل کرنے میں مشغول نہیں ہوتے تھے، اس لئے کہ ان کی مادری زبان عربی تھی، لیکن ہمارے زمانے میں ان علوم کی تحصیل واجب ہو گئی ہے۔

بخلاف ما اذا كان في الحرمين لانه يتيسر هناك معرفة جميع المذاهب

(الانصاف ص ۵۹)

لہٰذا اگر کوئی جاہل انسان ہندوستان یا ماوراء النہر کے کسی ایسے علاقے میں ہو جہاں نہ تو کوئی شافعی، مالکی، حنبلی عالم ہے اور نہ ان مذاہب کی کتابیں پائی جاتی ہیں، تو اس کے لئے امام ابوحنیفہؒ کی تقلید ہی واجب ہو جائے گی اور ان کے مذہب سے خروج اس کے لئے حرام ہوگا (کیونکہ دوسرے مذاہب کے احکام معلوم کرنے کی اس کے پاس کوئی شکل نہیں ہے) اس کے برخلاف اگر کوئی شخص حرمین میں ہو تو ان مذاہب میں سے کسی کی تقلید کر لینا کافی ہوگا۔ کیونکہ وہاں ہر مذہب کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ ایک اور جگہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وهذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة على جواز تقليدها الى يومنا هذا وفي ذلك من المصالح ما لا يخفى لا سيما في هذه الايام التي قصرت الهمم جدا واشربت النفوس الهوى واعجب كل ذي راي برايه ، وما ذهب ابن حزم من ان التقليد حرام غلط

یہ چار مذاہب جو مدوّن ہو کر تحریری شکل میں موجود ہیں۔ ان کی تقلید کے جائز ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں رہ سکتیں بالخصوص اس زمانے میں جب کہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں۔ خواہش پرستی لوگوں کی گھٹی میں پڑ گئی ہے اور ہر ایک صاحب رائے کو اپنی رائے پر گھمنڈ ہونے لگا ہے اور ابن حزمؒ کی یہ بات غلط ہے کہ تقلید حرام ہے۔

تقلید پر کچھ شبہات اور انکے جواب

مندرجہ بالا بحث سے تقلید شخصی کی حقیقت، اس کے جواز اور ضرورت کے دلائل معلوم کرنے کے بعد ہم خیال ہے کہ ہر انصاف پسند ذہن سے غلط فہمیاں بڑی حد تک کم ہوئی ہوں گی۔ اب ہم چاہتے ہیں مختصراً ان شبہات کو زیر بحث لائیں جو عام طور سے تقلید پر وارد کئے جاتے ہیں:۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں تقلید کی مذمت کی ہے:

واذا قيل لهم اتبعوا ما انزل الله قالوا بل نتبع ما وجدنا عليه آباءنا اولو كان آباؤهم لا يعقلون شيئا ولا يهتدون .

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) بھلا اگر ان کے باپ دادے عقل و ہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی؟

لیکن جو گذارشات ہم نے پچھلے صفحات میں پیش کی ہیں اگر ان کی روشنی میں بنظر انصاف غور کیا جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہو سکتا ہے، دیکھئے اللہ تعالیٰ ۔

، داداؤں کی تقلید پر مذمت کے دو سبب بھی ساتھ بیان فرما دیئے ہیں، ایک یہ کہ وہ لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کو یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے انہیں ماننے
سے انکار کرتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ ہم اس کے بجائے اپنے باپ دادوں کی بات مانیں گے۔ دوسرے یہ کہ ان کے وہ بزرگ عقل و ہدایت سے کورے تھے۔
ہم جس تقلید سے گفتگو کر رہے ہیں اس میں یہ دونوں سبب مفقود ہیں کوئی تقلید کرنے والا خدا و رسول کے احکام کو رد کر کے کسی بزرگ کی بات نہیں
بلکہ وہ اپنے بزرگ کو شارح قرآن و سنت سمجھتا ہے اور دوسرا سبب بھی ظاہر ہے کہ یہاں نہیں پایا جاتا، کیوں کہ اس سے کوئی اہل حق انکار نہیں کر سکتا۔
، آئمہ مجتہدین کی تقلید کی جاتی ہے ان سے کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو، مگر ہر اعتبار سے ان کی جلالتِ قدر ہر ایک کو مسلم ہے اس لئے اس
کو کافروں کی تقلید پر منطبق کرنا بڑے ظلم کی بات ہے۔

(۲) بعض حضرات تقلید پر اس آیت کو چسپاں فرماتے ہیں :

اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ۔ | انہوں نے اپنے علما اور تارک الدنیا زاہدوں کو اللہ کے بجائے اپنا پروردگار بنا رکھا ہے۔

لیکن ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ کسی مجتہد کی تقلید اسے شارع یا قانون ساز (LEGISLATURE) سمجھ کر نہیں کی جاتی بلکہ اُسے
شارح قانون قرار دے کر کی جاتی ہے اسے اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الاتباع قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ ان کی بیان کردہ تشریحات پر اعتماد کیا جاتا ہے،
لئے اس تقلید کو کافروں کی تقلید سے کوئی نسبت نہیں۔

(۳) بعض حضرات کے ذہن میں یہ خلش رہتی ہے کہ آئمہ مجتہدین نے خود فرمایا ہے کہ ہمارے قول پر اس وقت تک عمل نہ کرو جب تک کہ اس کی دلیل
معلوم نہ ہو جائے۔

لیکن ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ مجتہدین کے اس ارشاد کے مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو صلاحیت اجتہاد سے محروم ہیں، ورنہ ان
ارشاد خود ان کے دوسرے اقوال و افعال سے معارض ہوگا، اس لئے کہ ان کی سوانح حیات اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں کہ لوگ ان سے
پوچھتے تھے اور وہ بغیر دلیل بیان کئے جواب دے دیتے تھے، اگر یہ چیز ان کے نزدیک جائز نہ ہوتی تو وہ خود ان کا سبب کیوں بنتے؟ اور خود ان کے متعدد
اقوال ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مجتہد کے لئے تقلید ہی کو ضروری قرار دیتے ہیں مثلاً امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

علی العامی الاقتداء بالفقہاء لعدم الاھتداء فی حقہ الی معرفۃ الاحادیث۔ (ہدایہ ص ۲۴۶) | عام شخص پر واجب ہے کہ وہ فقہا کی اقتدا کریں، اس لئے کہ وہ خود احادیث کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھا سکتے ہیں۔

(۴) بعض حضرات کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں تقلید کا رواج نہ تھا
اس لئے تقلید بدعت ہے۔

لیکن ہم گذشتہ صفحات میں ثابت کر چکے ہیں کہ تقلید کی دونوں قسمیں عہد صحابہ میں پائی جاتی تھیں اور قرآن و حدیث دونوں سے اس کا
جواز بلکہ وجوب معلوم ہوتا ہے۔ رہا یہ کہ تقلید شخصی ان زمانوں میں ضروری نہ تھی، اب کیسے ضروری ہو گئی؟ سو اس سوال کا جواب حضرت شاہ ولی اللہ محدث
دہلوی کے الفاظ میں بیان کیا جا چکا ہے۔

(۵) بعض حضرات تقلید کی ضرورت کا انکار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن و حدیث بہت آسان ہیں اس لئے ان سے احکام سمجھنے میں کسی کے واسطے
کی ضرورت نہیں، قرآن کریم خود فرماتا ہے :-

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر (قمر)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان بنایا ہے تو کیا کوئی نصیحت کرنے والا ہے؟

لیکن خود اس آیت کے الفاظ پر غور فرمایئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کریم کی وہ آیات آسان ہیں جو وعظ و تذکیر اور نصیحت و عبرت کے مضامین پر مشتمل ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "للذکر" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یعنی قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کیا گیا ہے۔ رہیں وہ آیات جو احکام و حکم پر مشتمل ہیں، سو اُن کا دقیق ہونا بالکل ظاہر ہے چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انزل القرآن علی سبعۃ أحرف لکل آیۃ منھا ظھر وبطن ولکل حد مطلع۔ (مشکوٰۃ بحوالہ شرح السنۃ ص ۳۷)

قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی۔ اور ہر حد کے لئے اطلاع کا طریقہ جداگانہ ہے۔ (یعنی ظاہری کے لئے عربی زبان اور باطنی کے لئے قوت فہم)

تقلید میں جمود

لیکن جہاں تقلید کا انکار ہماری نظر میں درست نہیں وہاں تقلید کو حدِ اعتدال سے بڑھا دینا بھی غلط اور خطرناک ہے اگر تقلید کرتے ہوئے کوئی شخص اس حد تک پہونچ جائے کہ فقہاء مجتہدین کو خدا کی طرح واجب الاتباع سمجھنے لگے اور "مارا ابوحنیفہ باید، قول رسول کافی نیست" کا قائل ہو تو وہ بھی انتہائی قابل مذمت ہے اور خطرہ ہے کہ یہ چیز شرک سے نہ مل جائے۔

یا اگر کسی متبحر عالم کو جو قرآن و سنت پر گہری نظر رکھتا ہو اور اس سے متعلق تمام علوم کا ماہر ہو اپنے امام مجتہد کا قول واضح طور سے کسی صحیح کے خلاف نظر آئے وہ صحیح حدیث واضح بھی ہو اور اس کے معارض کوئی حدیث نہ ہو تو اسے چاہیے کہ امام مجتہد کا قول ترک کرکے حدیث صحیح پر عمل کرے لیکن مجتہد کی شان میں گستاخی نہ کرے بلکہ اسے یا تو یوں سمجھے کہ یہ حدیث انہیں پہونچی نہ ہوگی، یا اسے خطائے اجتہادی پر محمول کرے۔

اس کے بجائے اگر کوئی شخص قول مجتہد کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو تو وہ تقلید کے معاملہ میں حد سے گذر رہا ہے اس کا یہ عمل ہر لحاظ سے غلط ہے۔

چنانچہ فقہ حنفی میں کئی مسائل ایسے ہیں جن پر متبحر علماء نے حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے فتویٰ نہیں دیا، مثلاً بٹائی کے بارے میں امام ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ اس کی ہر صورت ناجائز ہے۔ مگر چونکہ یہ بات صحیح احادیث کے خلاف تھی اس لئے تمام علماء حنفیہ نے بالاتفاق اس کے بجائے صاحبین کا قول اختیار کیا جو احادیث کے مطابق تھا۔

خود ائمہ مجتہدین کا ارشاد ہے کہ اگر ہمارا کوئی قول حدیث کے خلاف نظر آئے تو اسے دیوار پر دے مارو اور حدیث پر عمل کرو۔

تقلید کے بارے میں "حق" درحقیقت ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے کہ نہ اسے شرک، گناہ اور بے کار چیز سمجھا جائے اور نہ اس حد تک غلو اور جمود اختیار کیا جائے کہ وہ واقعی شرک کی سرحدوں کو چھونے لگے۔

---

[1] لیکن حدیث کے مخالف ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے چار باتوں کا پایا جانا ضروری ہے ایک تو یہ کہ فیصلہ کرنے والا متبحر عالم ہو اور قرآن و سنت کے علوم سے پوری واقفیت ہو، دوسرے یہ کہ جو حدیث اس کے مخالف پڑ رہی ہے وہ واضح الدلالت ہو۔ چوتھے یہ کہ اس حدیث کے معارض کوئی مقبول حدیث نہ ہو۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو نہ حدیث کی مخالفت کا فیصلہ درست ہوگا اور نہ اس کی بنا پر امام کے قول کو چھوڑنا۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد از مولانا تھانوی ص ۴۳ مطبوعہ کراچی)

فقہ خود ساختہ قانون ہے؟

تقلید و اجتہاد کی بحث میں ایک انتہائی تکلیف دہ مرحلہ یہ ہے کہ بعض حضرات تقلید کی مخالفت میں ان پاک نفس فقہاء کو برا بھلا کہنے سے بھی نہیں چوکتے جن کی زندگی کا ہر سانس خدمت دین کے لئے وقف [تھا، ان حض]رات نے فقہِ اسلامی کا جو بیش بہا ذخیرہ ہمارے لئے چھوڑا ہے بجائے اس کے کہ اس پر ان کے ممنون ہوں وہ اس ذخیرے کو "خود ساختہ" اور "گھڑا [ہوا" جیس]ے مذموم ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

جب بات اس حد تک پہونچ جائے تو اس کا کوئی علمی جواب دل پر پتھر رکھ کر ہی دیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس مضمون سے ہمارا مقصد نزاع و جدال [نہیں بلکہ] افہام و تفہیم ہے۔ اس لئے ہم چند ان مسائل کی دلیلیں ذیل میں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جن پر "خود ساختہ" ہونے کا الزام عام طور سے لگایا جاتا ہے۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ فقہِ حنفی میں مردوں کو بحالتِ نماز ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی تائید کسی روایت سے نہیں ہوتی — [حالانکہ س]نن ابو داؤدؒ میں حضرت علیؓ کا ارشاد منقول ہے:

ان من[۱] السنة وضع اليمين على الشمال تحت السرة۔	یہ بات سنت ہے کہ (نماز میں) داہنا ہاتھ ناف کے نیچے بائیں ہاتھ پر رکھا جائے۔

(باب وضع اليمنى على اليسرى ص ۱۱۷)

اگرچہ اس روایت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے لیکن جس روایت سے ہاتھوں کو سینے پر باندھنا معلوم ہوتا ہے وہ بھی ضعیف ہے۔ ایسی صورت میں [امام ابو ح]نیفہؒ اور امام احمدؒ نے حضرت علیؓ کے مذکورہ بالا ارشاد پر عمل کرنا اس لئے مناسب سمجھا ہے کہ وہ قرینِ قیاس بھی ہے اس لئے کہ اس میں ادب و تعظیم کا [پہلو زی]ادہ ہے۔

پھر اسی پر بہت سے صحابۂ کرامؓ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت انسؓ اور کبار تابعین مثلاً حضرت ابراہیم نخعیؒ و حضرت ابو مجلزؒ وغیرہ کے فتاویٰ ہیں — (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الجوہر النقی لابن الترکمانیؒ ص ۱۲۶ ج ۱) اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۴۹) اس کے علاوہ بھی بعض مرفوع احادیث [ایسی] منقول ہیں جو ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو مسنون قرار دیتی ہیں، بلکہ علامہ ابن قیمؒ نے تو سینے پر ہاتھ باندھنے کو مکروہ قرار دیا ہے — (بدائع الفوائد ص ۹۱ ج ۳)

ان آثار کے ہوتے ہوئے اس مسئلہ پر "خود ساختہ" ہونے کا الزام سراسر زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟

(۲) کہا جاتا ہے کہ احناف جو نماز میں رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھنے کے وقت ہاتھ نہیں اٹھاتے اس کا روایات سے ثبوت نہیں ہے، حالانکہ اس مسئلے کی دلیل میں ایک دو نہیں، سات آٹھ روایتیں موجود ہیں ان میں سے دو ملاحظہ فرمائیے:

(الف) عن جابر بن سمرةؓ قال خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال مالى اراكم رافعي ايديكم	حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں اس طرح

---

[۱] اگرچہ حضرت علیؓ کا ہے، لیکن حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی صحابی سنت کا لفظ استعمال کریں تو اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ [وسلم کی سن]ت ہوتی ہے اور ایسی حدیث مرفوع کے حکم میں قرار دی جائے گی (دیکھئے نصب الرایہ ص ۲۴۴ ج اول۔

کانھا اذناب خیل شمس، اسکنوا فی الصلوٰۃ
(صحیح مسلم ص ۱۸۱)

اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھتا ہوں؟ گویا کہ وہ شریر گھوڑوں کی دُمیں ہیں، نماز میں سکون اختیار کیا کرو۔

(ب) عن علقمۃ قال قال ابن مسعودؓ الا اصلی بکم صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی فلم یرفع یدیہ الا فی اول مرۃ، رواہ ابوداؤد والنسائی واحمد والترمذی وقال حدیث حسن۔
(جامع ترمذی ص ۳۵ ج ۱)

علقمہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کیا میں تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز نہ پڑھاؤں، چنانچہ آپ نے نماز پڑھائی اور پہلی مرتبہ کے سوا پھر اپنے ہاتھ نہیں اٹھائے، اس حدیث کو ابوداؤدؒ، نسائیؒ، احمدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور ترمذیؒ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

(۳) حنفیہ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ سے اٹھ کر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جلسہ استراحت نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ سیدھا کھڑا ہو جانا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔

حالانکہ صحیح بخاریؒ اور جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان ینھض فی الصلوٰۃ علی صدور قدمیہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ (بخاری ص ۱۱۴ و ترمذی ص ۱۲۹)

اس سے اکثر علماء امت نے یہی سمجھا ہے کہ جلسہ استراحت کے بغیر کھڑے ہونا بہتر ہے اور بے شمار صحابہؓ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت عمرؓ، ابوسعید خدریؓ، حضرت ابن عباسؓ کا یہی معمول تھا (دیکھئے نصب الرایہ ص ۳۸۹ ج اول)

(۴) حنفیہ کی نماز کے "فاسد" ہونے کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ آخری قعدہ میں بھی بائیں پاؤں پر اسی طرح بیٹھتے ہیں جس طرح قعدہ میں، حالانکہ انہیں آخری قعدہ میں عورت کی طرح تورک کرکے بیٹھنا چاہیے۔

لیکن حنفیہ کے اس عمل کی دلیل میں مندرجہ ذیل روایت موجود ہے:

عن عائشۃؓ فی حدیث طویل کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی کل رکعتین التحیۃ وکان یفترش رجلہ الیسریٰ وینصب رجلہ الیمنیٰ۔
(صحیح مسلم ص ۱۹۴ ج ۱)

ایک لمبی حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں رکعتوں میں التحیات پڑھتے تھے اور اپنا بایاں پاؤں بچھاتے تھے اور داہنا کھڑا کرتے تھے۔

(۵) حنفیہ پر غیظ و غضب کا اظہار اس وجہ سے بھی کیا جاتا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتے، حالانکہ ان کا یہ عمل بہت سی آیات

لہ اس سے مراد سلام پھیرتے وقت ہاتھ کا اٹھانا اس لئے نہیں ہو سکتا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد "اسکنوا فی الصلوٰۃ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رفع یدین کے بارے میں ہے جو نماز کے اندر تھا اور ظاہر ہے کہ سلام کی حالت کو نماز کی حالت نہیں کہا جا سکتا ــــ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نصب الرایہ ص ۳۹۳ ج اول مع حاشیہ۔

، ثابت ہے ، ان میں سے ایک ملاحظہ ہو :

عن ابی نعیم وھب بن کیسان انہ سمع جابر بن عبد اللہ یقول من صلی رکعۃ لم یقرا فیھا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام

ھذا حدیث حسن صحیح (ترمذی ص ۴۱ ج ۱)

ابو نعیم وہب بن کیسان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے کوئی رکعت اس طرح ادا کی کہ اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی ، لیکن امام کے پیچھے ، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(۶) حنفیہ کی نماز پر چھٹا اعتراض یہ ہے کہ وہ فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں صرف خاموش کھڑا رہنا کافی سمجھتے ہیں ، ان میں قرأت کو فرض قرار نہیں دیتے ، ان کے اس عمل کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اس کے جواب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ بلاشبہ ایسی کوئی صریح روایت موجود نہیں ہے جو قرأت کو صرف دو رکعتوں کے ساتھ مخصوص کرتی ہو امام ابو حنیفہ نے یہ حکم فاقرءوا ما تیسر من القرآن کی دلالت اور قیاس سے نکالا ہے ، لیکن جس طرح اس بات پر کوئی صریح روایت نہیں ہے اس سے ہر رکعت میں قرأت کی فرضیت ثابت ہوتی ہو ، امام شافعیؒ نے بھی یہ حکم قیاس ہی سے مستنبط فرمایا ہے ، اب یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک قیاس جائز بلکہ واجب قرار دیا جائے اور دوسرے کو شرک و کفر، تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ۔

(۷) کہا جاتا ہے کہ حنفیہ نے نماز کی نیت زبان سے کرنے کی اجازت دی ہے - اور یہ بدعت ہے۔

یہاں بھی ہماری گذارش یہ ہے کہ زبان سے نیت کرنا کسی صریح حدیث سے ثابت نہیں ہے ، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسے مسنون یا واجب سمجھ کر کرے تو اس کا یہ فعل بدعات میں شمار ہوگا ، ——— لیکن حنفیہ نے اسے مسنون یا واجب کب کہا ہے ؟ ان کے کہنے کا مقصد تو صرف اتنا ہے اس زمانے میں جبکہ انسانوں کا ذہن ہزار طرح کے دھندوں میں الجھا رہتا ہے ، اگر وہ زبان سے نیت کر کے استحضار پیدا کرلیں تو جائز یا زیادہ سے زیادہ بہتر ہے اور اگر کسی شخص کو اس کے بغیر استحضار حاصل ہو جاتا ہے تو اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ، (ملاحظہ ہو مراقی الفلاح) ——— اور ظاہر ہے کہ نیت میں استحضار پیدا کرنا وہ چیز ہے جس کی احادیث میں ترغیب دی گئی ہے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

حافظوا علی نیاتکم فی الصلوٰۃ — نماز میں اپنی نیتوں کی حفاظت کرو۔

(مجمع الزوائد ص ۱۸۱ ج ۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کسی زمانے میں زبان سے نیت کرنے کو مسنون یا ضروری سمجھا جانے لگا ہوگا ، جس کی وجہ سے علامہ ابن قیمؒ نے اسے بدعت قرار دیا ہے۔

(۸) شہریوں کے لئے نماز عید سے پہلے قربانی کرنا ازروئے حدیث جائز نہیں ہے ، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گاؤں والے اس سے مستثنیٰ ہیں ، وہ طلوع فجر کے متصل بعد بھی قربانی کرسکتے ہیں ، کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا یہ استثناء "خود ساختہ" ہے اور اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔

اس کے جواب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ جس حدیث میں نماز سے پہلے قربانی کرنے کو جائز قرار نہیں دیا گیا ، وہ صحیح مسلمؒ کی مندرجہ ذیل حدیث ہے

من ضحی قبل الصلوٰۃ فانما ذبح لنفسہ ومن ذبح بعد الصلوٰۃ فقد تم نسکہ ۔

جس شخص نے نماز سے پہلے قربانی کی تو اس نے خود اپنے لئے ذبح کیا ، اور جس نے نماز کے بعد قربانی کی تو اسکی قربانی پوری ہوگئی۔

روایت کے الفاظ پڑھ کر ہر معمولی سوجھ بوجھ کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ حکم لوگوں کو دیا جا رہا ہے جن کو نماز عید پڑھنی ہے ——
کے برخلاف گاؤں والے لوگوں پر نماز عید ہے ہی نہیں تو ان کے لئے "نماز سے پہلے" اور نماز کے بعد کی تفصیل کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ ان
ق میں تو حکم اپنی اصل پر ہی باقی رہے گا کہ اگر وہ طلوع فجر کے فوراً بعد قربانی کر لیں تو ان کی قربانی درست ہو جائے گی۔

(۹) کہا جاتا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مفقود ہو جائے تو اس کے بارے میں حنفیہ نے بہت سخت حکم لگا دیا ہے کہ وہ موت کی خبر آنے تک انتظار کرے
پھر جب شوہر کی عمر ستر سال کی ہو جائے تب وہ دوسرا نکاح کر سکے گی۔[1]

اس کے جواب میں عرض ہے کہ یہ دونوں باتیں خود حدیث سے ثابت ہیں سنن دار قطنی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مفقود
بیوی کے بارے میں ارشاد فرمایا :-

ھی امراتہ حتی یاتیھا البیان — وہ اسی کی بیوی ہے یہاں تک کہ کوئی خبر آ جائے۔

(درایہ علی الہدایہ ص ۲۲ / ۶)

حضرت علیؓ سے اس کی تشریح مصنف عبدالرزاقؓ میں بالفاظ ذیل منقول ہے :-

ھی امراۃ ابتلیت فلتصبر حتی یستبین موت او طلاق (ایضاً) — یہ عورت آزمائش میں پڑ گئی ہے اس لئے اسے چاہیئے کہ اس وقت تک صبر کرے جب تک کہ شوہر کی موت یا طلاق کی خبر نہ آئے

رہا یہ کہ ستر سال کی عمر ہو جانے پر کس دلیل سے موت کا حکم لگایا گیا ہے ؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

اعمار امتی مابین الستین الی السبعین۔ (فتح القدیر) — میری امت کی عمریں (اوسطاً) ساٹھ اور ستر کے درمیان رہیں گی۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو ستر سال انتظار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ مقصد یہ ہے کہ شوہر کی عمر
کے ستر سال ہونے کا انتظار کیا جائے، خواہ یہ اس کے گم ہونے کے ایک ہی سال بعد ہو جائے۔

بہرکیف ! یہ چند نمونے تھے ان مسائل کے جن پر خود ساختہ ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے ان سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ ہر فقہی حکم کی
بنیاد کوئی آیت قرآنی، کوئی حدیث، کوئی اثر صحابہ ہوتا ہے۔ اور یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات خاص اس جزئیہ کا ذکر قرآن وسنت میں نہ ہو لیکن ظاہر
ہے کہ قرآن وسنت نے تو ہمیں اصول عطا فرماتے ہیں ان اصول کی روشنی میں فقہاء مجتہدین نے اپنی اپنی فہم وبصیرت کے مطابق جزئیات مستنبط فرمائے
ہیں، کسی شخص کو ان جزئیات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا کہ انہیں اپنی طرف سے گھڑ لیا گیا ہے ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہنے لگے
کہ بلنڈی، وہسکی، بیئر، تجارتی سود، سینما بینی، فوٹوگرافی کی حرمت کا حکم تم نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، قرآن وسنت میں ان میں سے کسی کے حرام ہونے
کا ذکر نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص یہ بات کہنے لگے تو اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ قرآن وسنت نے عام اور اصولی احکام دئے ہیں ان کے ضمن میں یہ سب چیزیں

---

[1] یہاں یہ واضح رہے کہ احناف کے علماء متاخرین نے خود زمانے میں حضرت عمرؓ کے ایک فیصلے کی بنیاد پر چار سال انتظار کرنے کے بعد دوسری شادی کرنے کی اجازت پر فتویٰ دیا ہے جس کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ از مولانا تھانویؒ ۔ ایک ایک مسئلے کی دلیل معلوم کرنا ہو تو مصنف ابن ابی شیبہ، الجوہر النقی، نصب الرایہ، فتح القدیر، اور اعلاء السنن کا مطالعہ فرمایا جائے ۱۲ تقی

خود بخود آجاتی ہیں اس لئے ان کی حرمت کو قرآن و سنت ہی سے ثابت کیا جائے گا۔

ہماری گذارش یہ ہے کہ بعینہٖ یہ بات فقہاء کرام کے اجتہادات کے بارے میں کیوں نہیں کی جاتی؟ انہوں نے بھی قرآن و سنت کے عام اور اصولی احکام کو پیش نظر رکھ کر فقہی مسائل مرتب کئے ہیں اور پوری احتیاط، تدین و تقویٰ کے ساتھ کئے ہیں پھر ان کے مرتب کردہ فقہ کو "خود ساختہ" کہنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ وہ کتنے بڑے ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ہم آخر میں ایک بار پھر اپنی اس بات کو دہراتے ہیں کہ حاشا وکلا! اس مضمون سے ہمارا مقصود بحث برائے بحث، مناظرہ و جدال ہرگز نہیں ہے۔ اگر نادانستہ طور پر کوئی لفظ ہمارے قلم سے ایسا نکل گیا ہو جس سے کسی صاحب کے دل کو ٹھیس لگتی ہے تو ہم اس کی پورے خلوص کے ساتھ معافی چاہتے ہیں ان صفحات کو تحریر کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے امکانات پیدا ہوں، اس دور میں جب کہ اسلام اور مسلمانوں پر ہر طرف سے فتنوں کی یورش اور مصائب کی یلغار ہے، ہمارے لئے اس سے زیادہ تباہ کن چیز کوئی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ان فروعی مسائل پر دست گریباں ہوں اور ذرا ذرا سی باتوں پر ایک دوسرے کو کافر و مشرک قرار دیں، تاریخ کے صفحات پر بکھری ہوئی بے شمار داستانیں ہمیں یہ سبق دینے کے لئے کافی ہیں کہ ہماری شوکت و عظمت کے پرچم کسی دشمن نے سرنگوں نہیں کئے ہم نے خود آپس کی خانہ جنگیوں کے ذریعہ انہیں ایک ایک کر کے زیر کیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی مسلمانوں میں فروعی مسائل پر معرکے گرم ہوئے ہیں، ہمیشہ ان سے اسلام کے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

کاش کہ دردمندی و دلسوزی سے نکلے ہوئے یہ چند کلمات کسی حساس اور دھڑکتے ہوئے دل کو متاثر کر سکیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

فاران:— ماہ جون ۱۹۶۴ء کے "فاران" میں "تلاش حق" نام کی ایک کتاب پر تبصرہ کیا گیا تھا ہم نے اس میں لکھا تھا:—

"یہ ایک تحریری مناظرہ ہے —— سید مسعود احمد صاحب اور نواب محی الدین صاحب کے درمیان تقلید شخصی اور دوسرے اختلافی مسائل پر خط و کتابت ہوتی ہے یہاں تک کہ نواب صاحب موصوف، سید مسعود صاحب کے دلائل سے متاثر اور مطمئن ہو کر، حنفی مذہب چھوڑ کر اپنے اہل حدیث ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں"۔

۔ بعض متشدد احناف اس خبر کو سن کر چیں بہ چیں بلکہ برہم ہوں گے مگر ہمارے نزدیک نواب محی الدین صاحب حنفی تھے تو بھی وہ مسلمان تھے اور اب اہل حدیث مسلک اختیار کرنے کے بعد بھی اسی طرح مسلمان ہیں ان کے ایمان و اسلام کو نہ تو حنفیت نے کوئی نقصان پہونچایا ہے اور نہ مسلک اہل حدیث نے! — مگر اس کتاب میں بعض باتیں بہت زیادہ قابل اعتراض اس قسم کی باتوں سے حق پسند جماعتوں کے درمیان منافرت پیدا ہوتی ہے اور ایک مستقل نزاع اور کشمکش برپا ہو جاتی ہے نواب محی الدین لکھتے ہیں۔

" اللہ تعالیٰ نے محترم مسعود صاحب کے ذریعہ کس طرح مجھ پر حق واضح فرمایا اور مجھے صراط مستقیم دکھائی —— میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بھولے ہوئے کو سیدھی راہ دکھلا دیں"۔

۔ صراط مستقیم تو دراصل اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا دین (اسلام) ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، فقہی مذاہب اور مسلک اہل حدیث اسی صراط مستقیم (دین حق) کے درمیان کی منزلیں اور کاسوال سرائے ہیں یا زیادہ سے زیادہ یوں کہ لیجئے کہ پگ ڈنڈیاں ہیں جو اسی صراط مستقیم سے نکلی ہیں اور پھر اسی میں مل گئی ہیں ان میں سے کوئی مسلک راہ ضلالت نہیں ہے نواب محی الدین کو اپنے اس خیال و عقیدہ کی تصحیح کر لی چاہئے انہیں یوں کہنا اور سمجھنا چاہئے کہ وہ حنفی مسلک کو ترک کر کے اس مسلک (اہل حدیث) کی جانب آئے ہیں جو حنفی مذہب کے مقابلے میں ان کی تحقیق کی حد تک اقرب الی الصواب ہے"۔

اس تبصرے میں ہم نے غرباتے اہل حدیث کے امام مولانا عبدالستار دہلوی کے اس فتوے پر بھی گرفت کی تھی، جس میں انہوں نے حنفی مذہب کو نیچریت زنائیت اور چکڑالویت کی طرح مذہب باطل ٹھیرایا تھا۔

ہمارے اس تبصرے پر غربائے اہل حدیث کے آرگن "صحیفہ اہل حدیث" میں شدید احتساب کیا گیا اور اس کے بعد مولوی عبدالسلام خاں صاحب بریلوی ناظم نشر و اشاعت جماعت اہل حدیث کراچی نے ایک طویل خط ارسال فرمایا اس خط کو ہم نے مولانا محمد تقی صاحب استاذ دارالعلوم کراچی کی خدمت میں بھیج دیا، مولانا موصوف نے ہماری درخواست پر علمی اور تدریسی مصروفیات کے باوجود ایک مفصل مقالہ تحریر فرمادیا اس مقالہ میں خط مذکور کے اہم سوالات کے جوابات آگئے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے ہر بات کا جواب دلائل سے دیا ہے، کتاب و سنت اور آثار صحابہ کے حوالوں کے ساتھ! منقولات کیساتھ عقلی دلائل بھی دل نشین ہیں اہل ذہن و فکر کو مطمئن کرنے والے! "تقلید" اور خاص طور سے حنفی فقہ کے مسائل کے بارے میں بعض ذہنوں میں جو غلط فہمیاں پائے جاتے ہیں اُن کو اس مضمون میں رفع کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

جتنے فقہی مذاہب اور مسلک اہل حدیث ہے اُن کے فقہی اختلافات اصل میں نہیں فروع میں ہیں اور معاملہ حق و باطل کا نہیں راجح و مرجوح کا ہے جو کوئی فقہ حنفی کو "گمراہ مذہب" یا "خود ساختہ مسلک" سمجھتا ہے اُسے اپنے تشدد اور عصبیت کی اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہی کرنی ہوگی، اور کیا عجب ہے کہ اس "تہمت تراشی" کی سزا بھی بھگتنی پڑے! فقہ حنفی کی اساس کتاب و سنت اور آثار صحابہ پر ہے! حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ احناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع اور فرماں بردار تھے (خاک بدہن گستاخ، معاندانہ اور مخالف نہ تھے (اس تصور سے کردگار اللہ تعالیٰ کی پناہ) جو متشدد اہل حدیث چھوٹتے ہی احناف کو جہنم کی وعید سناتے اور ان کے دوزخی ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں وہ یا تو پاگل ہیں یا پھر پرلے درجہ کے جاہل اور سفیہ ہیں۔

احناف کو قادیانیوں کا مماثل ٹھیرانا —— یہ وہ "کفر" ہے جو خود کہنے والے پر پلٹ کر آتا ہے جو کوئی احناف اور قادیانیوں کو ایک ہی جیسا سمجھتا ہے وہ خود فساد عقیدہ میں مبتلا ہے اور اس کی یہ بات سو فیصدی غلط بلکہ ضلالت آمیز ہے اگر وہ اپنے اس گمراہ عقیدہ سے توبہ نہ کرے گا تو مرتے وقت سوء ایمان کا خطرہ ہے۔

فقہ کے فروعی مسائل کی نزاع اور معرکہ آرائی اس زمانے میں جب کہ لوگ ایمان و یقین اور ارکان دین ہی سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں کوئی نیکی کی بات نہیں ہے، ضرورت اس کی ہے کہ کفر و بے دینی، تہذیب و مغرب زدگی کے خلاف مسلمانوں کے تمام فرقے متحد ہو جائیں اور بنیان مرصوص بن جائیں نماز میں جو کوئی رفع یدین کرتا ہے اور جو نہیں کرتا، خدا کی قسم نماز دونوں کی ہو جاتی ہے، یہی نوعیت دوسرے فروعی مسائل و اجتہادات کی ہے! فقہی مسائل میں اختلافات کی حدود ہیں، ان حدود کا احترام کرنا چاہئے! اللہ تعالیٰ ہمارے تمام مسلمانوں کو آپس میں متحد، متفق اور یک دل و یک جان ہونے کی توفیق عطا فرمائے!

(آمین)

اس سلسلہ میں صفحہ (۴۲) پر علامہ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم و مغفور کا مسلک کیا ہے اسے اس مضمون کے ساتھ ہی ضرور پڑھ لینا چاہیئے۔
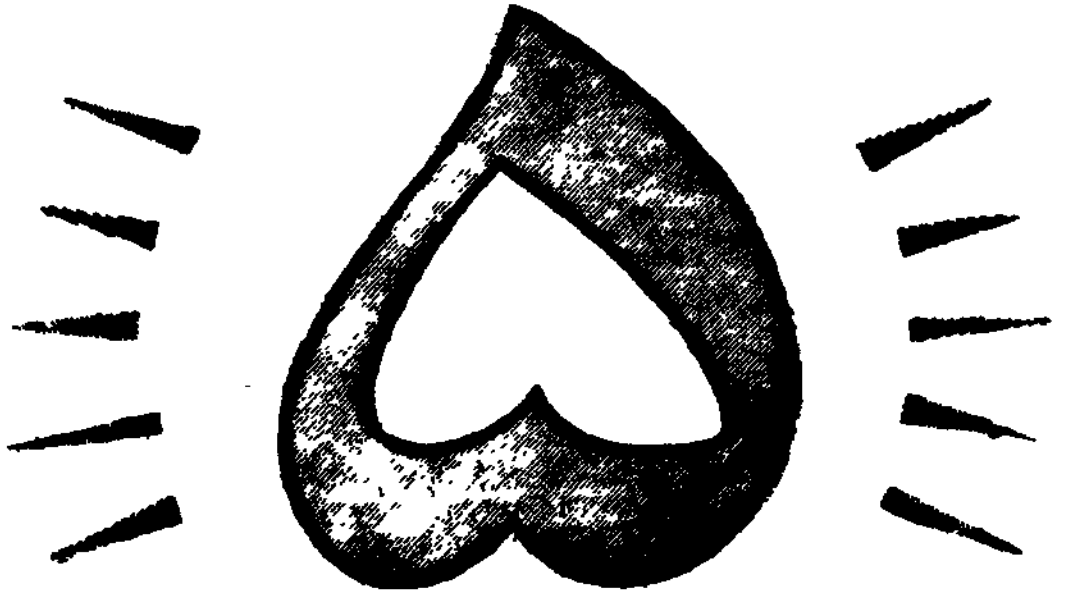
- - - - - - - - - -

آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spectit
01/63

ملا واحدی

کل کیا ہوگا!

ہر شخص کو کل کی فکر ہے۔ غریب سے لے کر امیر تک اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک، سب اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ کل کیا ہوگا۔ کل نہ سہی، بعد کی کل سہی اور بعد کی کل سہی۔ کل کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے اور بالآخر ایک ایسی "کل" آتی ہے کہ پھر فکر کرنے والے کے واسطے "کل" ہوتی۔ اس آخری "کل" کی بہت کم لوگوں کو فکر ہے اور جنہیں فکر ہے وہ بھی اس کی فکر سے اتنے سراسیمہ نہیں ہیں جتنے دنیاوی کل سے ہیں۔ یعلمون ظاہرا من الحیٰوۃ الدنیا ج وھم عن الاخرۃ ھم غفلون۔ وہ دنیا کی زندگی کے ظاہر (مقاصد) کو تو سمجھتے ہیں، اور وہ (نادان) آخرت (مہیا کر) سے غافل ہیں (بھولے ہوتے ہیں کہ ایک دن مرنا ہے اور اللہ کے دربار میں جانا ہے) (مفہوم سورہ ۳۰ - آیت ۷)

یہاں جو دنیاوی کل کی فکر نہیں کرتے، انہیں بھی غافل ہی کہنا چاہئے۔ غفلت کا پردہ اُن کی عقل پر بھی پڑا رہتا ہے۔ ایسے لوگ تک جنہ کے اوپر کامل بھروسہ اور توکل ہے، کل کا انتظام اور کل کی تدبیر ضرور کرتے ہیں۔ ہمارے ہادی کا ارشاد ہے کہ اونٹ کو کھلا نہ چھوڑ دو، درخت سے باندھو اور درخت سے باندھ کر امید رکھو کہ اللہ تعالیٰ اسے رسی تڑا کر بھاگنے نہ دے گا۔ دولت و اقتدار کے نشے میں دین سے غافل ہو جانا اور جہالت میں "دنیاوی کل" سے غافل ہو جانا، دونوں برابر ہیں اور دونوں بُرے ہیں، البتہ کل کا انتظام اور کل کی تدبیر کر دینے کے بعد پریشان رہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے صحیح انتظام کیا ہے اور صحیح تدبیر کی ہے تو اللہ سے اچھی امید لگانی چاہئے اور دماغ کو خراب نہیں کرنا چاہئے۔ جناب حیرت شملوی کا شعر ہے ؎

آج اس سوچ میں بیٹھا ہوں کہ کل کیا ہوگا
اس سے بڑھ کر بھی کسی سر میں خلل کیا ہوگا

لیکن جس کل کی طرف میں توجہ دلانی چاہتا ہوں، اُس کی سوچ میں بیٹھنا خللِ دماغ نہیں ہے بلکہ صحتِ دماغ ہے۔ میں اور آپ اس سوچ میں بیٹھیں تو یہ اللہ کا بڑا فضل ہوگا۔ اس سوچ سے دنیا اور عقبیٰ دونوں جگہوں کی کل کے درست ہو جانے کا امکان ہے۔ اسلئے ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ دنیا کی کل کا تو ہم کچھ نہ کچھ خیال کر لیتے ہیں، مگر عقبیٰ کی کل کے لئے ہم نے کیا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ○ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکذبین۔ کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ (صرف) اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے۔ (عذاب الٰہی سے) چھوٹ جائیں گے (اور دارین حاصل کرلیں گے) اور (زبان سے ایمان کا اقرار کرکے ان کے ایمان کی پختگی اور خامی) کا امتحان نہیں لیا جائے گا۔ (ایمان بغیر کافی نہیں ہے) ان سے پہلے (اگلی امتوں میں) جو (ایمان دار گزر چکے ہیں) ہم نے اُن (کے ایمان) کو (بھی) آزما لیا تھا۔ پس اللہ ضرور

رح سے آزمائے گا،) جن لوگوں نے (ایمان کا دعویٰ کرنے میں) صداقت سے کام لیا ہے اُنہیں بھی معلوم کرے گا، اور جنہوں نے جھوٹ
ہیں بھی معلوم کرے گا۔ (مفہوم سورہ ۲۹ - آیات ۲ و ۳)

سورہ ۴۵، آیت ۲۱ میں ارشاد ہے:۔ ام حسب الذین اجترحوا السیأت ان نجعلھم کالذین امنوا وعملوا الصلحٰت ۫
یاھم و مماتھم ط سآء ما یحکمون۔ جنہوں نے برائیاں کمائی ہیں کیا اُن کا گمان ہے کہ ہم انہیں اُن کے برابر بنا دیں گے جو ایمان لے آئے ہیں اور بھلے عمل کرتے ہیں اور سب کا جینا اور مرنا ایک سا ہوگا۔ (اُن کے گمان غلط ہیں اور اُن کے دعوے جھوٹے ہیں۔ (مفہوم)
مثقال ذرۃ خیرا یرہ ۝ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہے (قیامت کے دن) وہ اسے دیکھے گا
ذرہ بھر بدی کی ہے وہ اُسے دیکھے گا۔ (مفہوم سورہ ۹۹ - آیات ۷ و ۸)

سورہ ۲ - آیت ۲۱۴ میں ارشاد ہے:۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم ط مستھم
والضرآء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین معہ متی نصر اللہ ط الا ان نصر اللہ قریب۔ کیا تم نے خیال کر
دیوں ہی) جنت میں داخل کر دیے جاؤ گے، حالانکہ تم پر اُن لوگوں جیسے مصائب نہیں بیتے جو تم سے قبل ہو چکے ہیں (اور جنہوں نے انقلاب آفرینی کی
کی تھیں) انہیں ایسی ایسی سختیوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ جھڑ جھڑا اُٹھے تھے، حتیٰ کہ (اس وقت کے) رسول اور رسول کے ساتھی
اے بشریت، ہمت شکن مرحلوں سے گھبرا کر) کہنے لگے تھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (پھر ہم نے جواب دیا تاکہ) اللہ کی مدد قریب ہے۔
ن مراحل سے گزرنا ہوگا جن سے گزشتہ لوگ گزرے تھے، ہمارا تجویز کردہ معاشرہ قائم کرنے ..... اب برداشت کر کے ہی تم ہماری مدد
اور جنت کے مستحق بن سکتے ہو۔) (مفہوم)

سورہ ۳ - آیت ۱۴۲ میں ارشاد ہے:۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جھدوا منکم ویعلم
ن۔ کیا تم نے خیال کر رکھا ہے کہ جنت میں (بغیر آزمائش) کے داخل ہو جاؤ گے۔ ابھی اللہ نے کہاں جانچا ہے کہ تم میں (خالص اللہ کے واسطے) لڑنے
کون ہیں، نیز (اللہ کو) ابھی یہ دیکھنا ہے کہ لڑائی میں ثابت قدم کون کون رہتے ہیں۔ (مفہوم)

سورہ ۹ - آیت ۱۶ میں ارشاد ہے:۔ ام حسبتم ان تترکوا ولما یعلم اللہ الذین جھدوا منکم ولم یتخذوا من دون
ورسولہ ولا المؤمنین ولیجۃ ط واللہ خبیر بما تعملون۔ کیا تم نے خیال کر رکھا ہے کہ (یوں ہی) چھوٹ جاؤ گے، حالانکہ
نے یہ بھی نہیں جانچا کہ تم میں سے کس کس نے (للّٰہیت سے) جہاد کیا ہے اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ اور مسلمانوں کے سوا کسی (غیر) کو اپنا
ی بنایا۔ اللہ کو خبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ (ایمان لانے اور اللہ کا بندہ بن جانے کے دعوے آسان ہیں۔ امتحان کی کسوٹی پر کسا جانا مشکل ہے۔
ان کی سب سے بڑی کسوٹی ہے اور جہاد میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ صدق و اخلاص سے کیا ہے یا نمود کی غرض سے۔) (مفہوم)

خیر اللہ کے واسطے جان دینا اور اللہ کے دین اور اللہ کے تجویز کردہ معاشرے کی خاطر اپنے آپ کو قربان کرنا تو اونچی بات ہے آج تو یہ دیکھنا ہے
دین کی سربلندی کے واسطے کون کون اپنی زندگی کو اتنا سنوارتا ہے کہ غیر مسلم کہیں کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔ مسلمان ایک دوسرے کی دل آزاری
، مسلمان ایک دوسرے کو نہیں لوٹتے۔ مسلمان اچھی چیزوں میں بُری چیزیں نہیں ملاتے۔ مسلمان چور بازاری سے دور رہتے ہیں، مسلمان رشوت
، مسلمان رشوت نہیں دیتے، اور رشوت نہ دے کر اپنے کاموں کا بگڑ جانا گوارا کر لیتے ہیں۔ مسلمان دوسرے مسلمانوں کے فائدے پر اپنے فائدے
رکھتے ہیں۔ مسلمان قناعت اور استغنا کے بادشاہ ہیں۔ مسلمان فقر و خاک نشینی کی عظمت سے واقف ہیں۔

آیئے، آیئے، میں بھی سوچوں اور آپ بھی سوچئے کہ کل عقبیٰ میں میرے ساتھ اور آپ کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ کیا میں نے اور آپ نے اپنا کردار سچے مسلمانوں کا سا پیش کیا ہے کیا میں اور آپ مندرجہ بالا آیات کی کسوٹی پہ ایک بٹا سو بھی پورے اُترتے ہیں۔

سوچنے سے تو میرا جی رزتا ہے۔ کردار کچھ نہیں۔ فقط اللہ کی رحمت کا آسرا ہے۔ بس قرآن کی یہ آیت ڈھارس بندھا رہی ہے — ورحمتی وسعت کل شیٔ۔ یعنی میری رحمت نے جملہ اشیا کو گھیر رکھا ہے۔ میری رحمت جملہ اشیا سے بڑی ہے۔ میری رحمت سے باہر نکلی ہوئی کوئی شے نہیں ہے (مفہوم سورہ ۷۔ آیت ۱۵۶)

اور دلی کے ایک اُمتی شاعر، مرزا مخمور کا یہ شعر بار بار زبان دوہرا رہی ہے؎

میں سر جھکا کے سوئے جہنم چلا ہی تھا
کچھ رحم آگیا مرے پروردگار کو

الٰہی! یہی کیفیت مرتے دم باقی رکھیو۔ اتنی کیفیت بھی غنیمت ہے۔ اتنی کیفیت کا مل جانا بھی تیرا کرم ہے۔ اتنی کیفیت جوانوں کو مل جائے تو ان کا کردار بن سکتا ہے، ہم بوڑھے تو اس شعر کے مصداق ہیں؎

اے حسن توبہ آں زماں کردی
کہ ترا طاقت گناہ نماند

(صفحہ ۲۸ کا بقیہ)

فقہی مذاہب اور......!

علامہ نواب صدیق حسن خاں صاحب قنوجی ثم بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ جو مشاہیر علماء اہل حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں، اُن کی کتاب — ابقاء المنن بالقاء المحن — کا اقتباس ہفت روزہ ترجمان دہلی (یکم اگست ۱۹۶۴ء) سے یہاں نقل کیا جاتا ہے

"ایک منت خدا کی مجھ پر یہ ہے کہ میں فقط جماعت اہل سنت کو فرقۂ ناجیہ جانتا ہوں۔ حنفی ہوں یا شافعی یا مالکی یا حنبلی ظاہری یا اہل حدیث یا اہل سلوک اور کسی کے حق میں ان میں سے گمانِ بد نہیں رکھتا۔ اگرچہ مجھ کو یہ بات معلوم ہے کہ ہر گروہ کے اندر ان میں سے مسائل خلاف دلائل بھی ہیں اور بعض موافق نصوص، بعض فتاویٰ ان کے صحیح اور بعض ضعیف یا مردود ہیں۔ اس لئے کہ حکم اکثر کو ہے نہ اقل کو ائمہ سلف سے جو عمل بعض احادیث میں متروک ہو گیا ہے اس کے بیس عذر ہیں جو کتاب "جلب المنفعت" میں لکھے گئے ہیں، ائمہ سلف پر طعن مخالفت سنت کی کرنا انصاف کا خون بہانا ہے۔ ہاں جو مقلد ان کے بعد وضوح دلیل کتاب وسنت کے تقلید رائے بحت پر جامد ہیں ان کو خاطی سمجھتا ہوں! لیکن گمراہ بحت نہیں جانتا نہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتا ہوں نہ معاذ اللہ ان کو کافر کہوں۔

مسائل عبادات ومعاملات میں اختلاف اہل علم کا منجر بکفر نہیں ہوتا ہے۔ غایت ما فی الباب یہ ہے کہ خطا فی الاجتہاد یا خطا فی الفہم ہے جس کو علماء راسخین پہچانتے ہیں۔ جن کا کام نفی تحریف غالین وانتحال مبطلین وتاویل جاہلین ہے۔ اللہ سے اُمید ہے کہ اگر قائل اس خطا کا اپنے دین میں مخلص غیر متعصب تھا اور کسی وجہ تری سے شبہ میں گرفتار ہو گیا ہے تو وہ خطا اس کی معاف ہو جاوے اور اگر جو اس کا اس خطا پر عمداً براہ عناد وشقاق خدا ورسول کے ہے تو محل نہایت اندیشہ کا ہے لیکن کسی مسلمان راجی وخائف کی نسبت ایسی بدگمانی کرنا کچھ ضرور نہیں ہے۔ نحن نحکم بالظواہر واللہ اعلم بالسرائر۔"

کاش! جماعت غرباء اہل حدیث کے امام اور اُن کے ماننے والوں کو اس اقتباس کو پڑھ کر فقہی مذاہب کے بارے میں اپنے غلط

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

زائرِ حرم حضرت حمید صدیقی مرحوم

اب سے تیس سال پہلے جناب حمید صدیقی لکھنوی کا نعتیہ کلام رسالوں اور اخباروں میں میری نگاہ سے گزرتا رہا، یہ اُس زمانہ کی بات ہے، جب میں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ لکھنؤ کے مدحِ صحابہ کے مشاعرے میں مجھے بلایا گیا، کان پور میں بھی انہیں دنوں ایک رہا تھا، دونوں مشاعروں میں چند دنوں کا فصل تھا، ایک چھوڑ دو دو مشاعروں کی دعوت، میں دکن سے چل کر سیدھا لکھنؤ پہونچا، مدحِ صحابہ کے مشاعرے میں حمید صدیقی کو دُور سے دیکھا، بات چیت کیا علیک سلیک تک نہیں ہوئی، ایک صاحب نے اشارے سے بتایا کہ یہ زائرِ حرم حمید صدیقی ہیں، مگر اُن کی طبیعت ناساز ہے اور گلا بیٹھا ہوا ہے، مشاعرے میں کچھ سنائیں گے نہیں، یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے، جو تھائی صدی ختم ہونے میں زیادہ سے زیادہ ایک برس رہ گیا ہے۔

اب پانچ سال قبل کراچی میں حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کی یاد میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا اُس میں حمید صدیقی مرحوم کو بھی بلایا گیا، پہلی بار معانقہ ہی میں یہ محسوس ہوا کہ ہم دونوں روحانی طور پر ایک دوسرے کے نہ جانے کب سے دوست ہیں! فرمانے لگے ریڈیو پر آپ کی نعتیں سنتا رہتا ہوں، اور . . . . " پھر کراچی کی شعر و ادب کی متعدد نشستوں میں اُن سے ملاقاتیں رہیں، اُن کا کلام سُنا، اُن کے ساتھ چائے پی، کھانا کھایا، یہاں تک کہ ہوائی جہاز میں کراچی سے ڈھاکہ تک کا سفر کیا۔ وہاں بھی مشاعرہ تھا ایک ہی بنگلہ میں کئی دن تک ساتھ ٹھیرنا ہوا۔ یہ تعلقِ خاطر کا کرشمہ اور دونوں کے ربط و اتحاد کا فیض تھا کہ انتقال سے چند ماہ پہلے حمید صدیقی نے اپنی دو نعتیہ نظمیں خاص طور سے فاران میں چھپنے کے لئے ایک صاحب کی معرفت روانہ فرمائیں! براہِ راست کلام بھیجنے اور خط لکھنے میں شاید وہ کسی خاص سبب سے متامل تھے! پچھلے دنوں ہندوستان کے ایک اخبار میں چند سطروں کی خبر پڑھی کہ زائرِ حرم حمید صدیقی اللہ کو پیارے ہو گئے، اس کے بعد کئی خط بھی مجھے ملے، جن سے اس سانحہ کی تصدیق بھی ہو گئی! کاش! یہ اطلاع غلط اور یہ خبر غیر مصدق ثابت ہوتی! مگر اللہ تعالیٰ کا کارخانہ ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کا پابند تھوڑی ہے! جس جاندار اور ذی حیات کیلئے جو گھڑی مقدر ہو چکی ہے وہ پھر ٹل نہیں سکتی!

حمید صدیقی کے نعتیہ کلام میں جو تنوع، تازگی، شادابی اور عقیدت و محبت پائی جاتی ہے بس وہ اُنہی کا حصہ ہے۔ مدینہ منورہ کے گلی کوچوں، بازاروں اور حرمِ نبوی کے دروازوں ستونوں اور دوسرے متبرک آثار و مقامات کو اُنہوں نے جس شاعرانہ زبان میں منظوم کیا ہے، اس سے اُن کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے، پڑھنے کا انداز بھی بڑا ہی دلکش تھا! صورت، شکل اور وضع قطع خالص مشرقی اسلامی! صوم و صلوٰۃ کے اس درجہ پابند کہ اشراق و تہجد اور تسبیح و ذکر معمولات میں داخل تھے، مدینہ اور مدینہ والے کے فدائی، عاشق، متوالے اور مدح خواں! یہ بیسوں حج کئے اور روضۂ نبوی کی زیارت سے مشرف ہوئے، ہر حاضری اور زیارت کے بعد شوق دوچند ہو جاتا، دل کی لگی اور بھڑک جاتی!

(باقی ص ۵۲ پر)

گذر جائے اُسے زندگی کے بہتر لمحات میں شمار کرنا چاہئے !

۱۹۵۳ء کا ذکر ہے، فروری کی ایک چمکیلی اور خوشگوار دوپہر کو میں لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۲ پر دہلی کی طرف سے آنے والی کلکتہ میل کا انتظار کر رہا تھا۔ اس گاڑی میں دارالعروبہ کے نگران الاستاذ مسعود الندوی جالندھر سے لاہور آ رہے تھے۔ یہاں انہیں شام کو ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر صوبہ بہار کی طرف جانا تھا۔ "مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر آپ مجھے اسٹیشن پر آ کر ملیں" انہوں نے مجھے اپنے عربی خط میں اس پروگرام کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا اس سے متصل ہی خط کا وہ آخری جملہ تھا جس نے گذشتہ کئی روز سے میرے دل و دماغ میں ایک کھلبلی مچا رکھی تھی: "لما استأنست فیکم من امارات النبوغ والکمال" (کیونکہ مجھے آپ کے اندر ہونہاری اور ہنرمندی کی علامات دکھائی دی ہیں) ——— ہونہاری اور ہنرمندی کی علامات! اس جملے کے ٹھیک ٹھیک مفہوم کا تصور کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی خاطر میں نے گذشتہ دنوں میں خدا جانے کتنی بار اس خط کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا تھا اور وہ اس وقت بھی میری جیب میں تھا۔ اس دن گاڑی کچھ لیٹ تھی۔ انتظار و اضطراب کے ان لمحوں کو بہلانے کے لئے میں نے ایک مرتبہ پھر جیب سے وہ خط نکالا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

استاذ مسعود الندوی معتمد دارالعروبہ کا خط، ایک اجنبی طالب علم کے نام اور وہ بھی ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا! ——— یہ کوئی اتنی آسانی کے ساتھ دستیاب ہونے والی چیز نہیں تھی۔ اس کی خاطر مجھے کتنی محنت اور جانکاہی کرنی پڑی تھی، اس کا اندازہ کچھ آگے چل کر ہوگا۔

استاذ مسعود کے ساتھ میرے تعارف کی ابتدا ان کے ایک "مقدمے" سے ہوئی تھی جو سات آٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا یہ مقدمہ انہوں نے ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے ایک سلسلہ "قصص النبیین للاطفال" کی تیسری یا چوتھی کتاب کے شروع میں، عربی زبان میں لکھا تھا۔ یہ سلسلہ میں نے ——— "ترجمان القرآن" کی سفارش پر لکھنؤ سے منگوایا تھا۔ صاف اور جلی قلم سے لکھی اور لیتھو پر چھپی ہوئی یہ کتابیں فی الواقع عربی زبان کے "اطفال" کے لئے جن میں اس وقت میں بھی شامل تھا، تحفے کی چیز تھیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان کتابوں میں بیک وقت عربی زبان و ادب اور دینی روایات کی تعلیم دینے کا ایک نرالا اور خوشگوار تجربہ کیا تھا۔ میں پہلے پہل تو ان کتابوں پر ٹوٹ کر گرا، لیکن پھر دن اور ہفتے اور مہینے گذر گئے اور میں اس سلسلہ کی اصل کتابوں کو پڑھنے کی بجائے، استاذ مسعود کے عربی مقدمے میں گم ہو کر رہ گیا۔ مجھے عربی شروع کئے ہوئے ان دنوں تین یا چار ماہ ہوئے ہوں گے اور اس وقت تک میں نے اس زبان کی کچھ ابتدائی درسی کتابیں پڑھی تھیں یا پھر علی گڑھ کی یونیورسٹی لائبریری میں جا کر ایک عربی رسالے "العرب" کی ورق گردانی کیا کرتا تھا جو اس وقت کی ہندوستانی حکومت خلیج فارس کے عربوں کے ساتھ میں جوڑ بڑھانے کے لئے دہلی سے نکالا کرتی تھی۔ رسالہ کے مضامین تو پوری طرح نہیں پڑھے جاتے تھے۔ لیکن اس میں دی ہوئی مختصر خبروں کا مطلب نکالنے میں بے اندازہ خوشی ہوتی تھی ——— انہی دنوں جب استاذ مسعود کا یہ عربی مقدمہ پڑھنے میں آیا تو یکایک محسوس ہوا کہ اب تک عربی زبان میں جو پڑھا وہ سب نقل اور دھوکا تھا اور عربوں کے انداز میں لکھی ہوئی اصل اور بلیغ عربی زبان کا نمونہ اگر کوئی ہو سکتا تھا تو وہ یہی تھا جو اب پڑھنے کو ملا تھا۔ مقدمے کی عبارت پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن لکھنے والے نے اس کی زبان میں کچھ ایسا رس گھول دیا تھا کہ بار بار پڑھنے کے بعد بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی اور پڑھتے پڑھتے یہ مقدمہ مجھے تقریباً حفظ ہو گیا تھا۔

"قصص النبیین" کے رسالوں کے ساتھ کتب فروش نے جن دوسری مطبوعات کے اشتہار بھجوائے تھے ان میں ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" بھی تھا، جو استاذ مسعود الندوی کی ادارت میں ندوہ سے کچھ سال کے لئے نکلا اور پھر بند ہو گیا تھا۔ اس رسالے کے کچھ پرانے پرچے فروخت کیلئے موجود تھے۔ استاذ کی عربی تحریر کا جادو اب مجھ پر چل چکا تھا۔ اس لئے میں نے "الضیاء" کے وہ پرچے منگوانے میں ذرا سا وقت بھی ضائع نہ کیا اور اس کے

سال کا باقی حصّہ میں (یہ اپریل۔ مئی ۴۶ء کی بات ہے) مجھے یاد نہیں کہ میں نے "الضیاء" کے علاوہ کسی دوسری کتاب یا رسالے کو اس قدر سنجیدگی اور انہماک سے پڑھا ہو۔

استاذ مسعود الندوی کی شخصیت رفتہ رفتہ میرے تصور میں ابھرنے لگی تھی ان کی ایک تصویر وہ تھی جو "الضیاء" کے صفحات پر ان کے مقالات میں، ان کے افتتاحیوں میں، ان کے تبصروں میں اور خاص کر اس رسالہ کے آخری شمارے کے افتتاحی نوٹ میں سامنے آئی تھی۔ اس میں وہ مجھے ایک ایسے شخص کے روپ میں نظر آتے تھے جس نے عربی لباس پہن رکھی تھی، جس کے منہ میں عرب کے اصل باشندوں کی زبان تھی، جس کے سینے میں اسلام کا درد، اپنے دین و وطن کی خاطر قربانیاں جھیلنے والوں کے لئے ایک پرجوش عقیدت تھی۔ شام کے امیر شکیب ارسلان اور مصر کے سید رشید رضا اس کے پیرو مرشد تھے اور عربی زبان سے والہانہ محبت اور اس کے فروغ کی آرزو سے اس کا سینہ معمور تھا ——— اور ایک دوسری تصویر اردو لٹریچر اور اخبارات و رسائل کے واسطہ سے نمایاں ہونے لگی تھی، جس میں وہ ایک معتبر عالم، ایک روشن دماغ رکنِ مجلس، ایک دردمند اور صلح جو انسان اور ایک ہر دلعزیز شخص کی صورت میں سامنے آتے تھے۔ ان کی تحریروں کی طرح ان کی شخصیت کے ساتھ بھی میری گرویدگی اب اتنی بڑھ چکی تھی کہ اُن سے قریب ہونے اور کسی نہ کسی طرح اُن کے نوٹس میں آنے کی خواہش ان دنوں میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اُن سے ملاقات اور بالمشافہ گفتگو کرنے میں میرا فطری شرمیلا پن اور کوتاہ لسانی مانع تھی۔ کہاں "الضیاء" کا مدیر شہیر اور کہاں ایک ——— اور کم حوصلہ نوجوان جسے صحیح اردو میں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد مجھے ان حالات میں اس سے بہتر اور کوئی صورت نظر نہ آئی کہ میں کسی بھی بہانے اپنی امکانی کوشش کے ساتھ ایک خط عربی زبان میں ایسا لکھوں کہ وہ مجھے آسانی کے ساتھ نظر انداز نہ کرسکیں ——— خزاں کا موسم تھا، بہاول پور کے نواح میں ایک تنہا مکان کے اندر عربی کی گنی چنی کتابوں اور "الضیاء" کے کچھ پرچوں کے درمیان بیٹھ کر میں نے ایک ہفتہ یا شاید اس سے بھی زیادہ دن دو صفحوں کا ایک عربی خط لکھنے میں صرف کئے۔ خط کا مضمون اور مدعا میرا تھا، لیکن الفاظ اور ترکیبیں اور جملوں کی ساخت امیر شکیب ارسلان کی تھی یا محب الدین الخطیب کی، یا مسعود عالم کی۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ یہ خط میرے پاس رہا اور میں برابر اس کی نوک پلک درست کرتا رہا آخر جب میں ریلوے ورکشاپ میں ٹریننگ لینے کی غرض سے آکر مقیم ہوا تو یہاں پہونچتے ہی وہ خط دارالعروبہ جالندھر کے پتہ پر بھجوا دیا ——— ایک صاحب نے جو اُن دنوں کچھ عرصہ استاذ مسعود کے قریب رہے مجھے بتایا تھا کہ جب تمہارا خط انہیں ملا ہے تو وہ پڑھ کر بے قرار سے ہوگئے۔ بار بار اس خط کو دیکھتے تھے اور حیرانی کا اظہار کرتے تھے ——— میرے اس خط کے جواب میں انہوں نے اپنے قلم سے وہ عربی خط مجھے لکھا تھا جس کا اوپر ذکر ہوا، اور جو اسی وقت لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۲ کی ایک بنچ پر میں ایک بار پھر پڑھ رہا تھا!

اُس دن کلکتہ میل سے استاذ مسعود کسی وجہ سے نہ آسکے۔ گاڑی جب پلیٹ فارم پر آکے رکی تو میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور متلاشی نگاہوں سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ ڈالا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئے، ان کے غائبانہ تعارف سے میں نے ان کی جو صورت اپنے تصور میں بنا رکھی ہوئی تھی اس صورت کا کوئی آدمی بھی اس گاڑی سے نمودار نہ ہوا اور میں اس یقین کے ساتھ واپس آگیا کہ انہوں نے اپنا پروگرام بدل لیا ہے۔

اس کے بعد کچھ مہینے یوں ہی گذر گئے!

بہار اب ختم ہو چکی تھی اور موسم گرما کا زمانہ تھا۔ نہر لوئر باری دوآب کے کنارے ہمارا ایک چھوٹی سی بستی میں سالانہ کانفرنس کے موقع پر دور دراز سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ شامیانے تنے تھے، فضا میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز گونجتی تھی اور ایک غیر معمولی چہل پہل کے درمیان لوگ ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں مصروف تھے، اس بھیڑ میں میں بھی کسی جگہ پھر رہا تھا کہ میرے بڑے بھائی مجھے تلاش کرتے کرتے آ نکلے۔ اور کہا "چلو مولانا مسعود عالم صاحب

"تو مجھے؟" میں نے کچھ حیرانی اور کچھ گھبراہٹ میں پوچھا "میرے متعلق انہیں کس نے بتایا ہے؟"
ہا پٹنہ میں انہوں نے اُس عربی خط کا ذکر کیا تھا تو میں نے بتا دیا تھا کہ اس کا لکھنے والا کون ہے، اب تمہارے یہاں آنے کا انہیں پتہ چلا ہے، تو وہ
یہیں پوچھ رہے ہیں۔" میرے بھائی اب مجھے ساتھ لئے اُن کی طرف جا رہے تھے۔
بارکوں کی شکل میں بنے ہوئے مختہ کمروں کی ایک لائن کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے ہم ایک کمرے کے سامنے پہنچے تو اندر سے ایک اُونچی آواز
پہ" آپ نے تو ہمیں کب کا گرویدہ بنا رکھا ہے" کمرے میں داخل ہو کر میں جھجک کے مارے جوتیوں کے پاس بیٹھنے لگا تو وہی آواز پھر آئی "نہیں نہیں
جائیے یہاں، قریب!"

میں نے خوف اور مرعوبیت کے باوجود ایک نظر بھر کر استاذ مسعود کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک بڑی میز کے آگے دری کے فرش پر بیٹھے تھے۔ سفید کھدر کا
پاجامہ پہن رکھا تھا، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کترواں مونچھیں اور قدرے لمبی کالی اور گھنی ڈاڑھی، دبیز شیشوں والی عینک کے پیچھے ان کی
ہیروں کی طرح چمکتی تھیں، زبان لکنت کی وجہ سے بعض اوقات اتنی تیز چلتی تھی کہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کی اس سرگرم اور پُر جوش خوش
میرے دل میں ان کا خوف اور دبدبہ بہت کچھ کم ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ایک استاد اور بزرگ کی بجائے ایک بڑے بھائی لگ رہے تھے اور میں نے قدرے
ساتھ ان کے ساتھ گفتگو شروع کر دی تھی۔

"آپ تو ماشاء اللہ نوجوان ہیں، میرا خیال تھا آپ کچھ عمر میں زیادہ ہوں گے" میں نے کچھ بے تکلف ہوتے ہوئے کہا "نوجوان؟ آ.... آ.... آ"
ایک قہقہہ لگایا "نوجوان تو نہیں، البتہ جوان اگر آپ کہنا چاہیں تو کہہ لیجئے" استاذ نے پہلی ہی صحبت میں اپنی نکتہ سنجی کا ایک عمدہ نمونہ دکھایا
وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب (مولانا عبدالغفار حسن) سے مخاطب ہوئے "تو یہ ہیں جناب وہ عربی کا معجزہ جن کا میں نے آپ
یا تھا۔ ان کا خط جب آیا تو میں پڑھ کر حیران ہوا۔ نہایت سلیس اور سہل ممتنع کا نمونہ! نیچے دیکھا تو نام کے ساتھ لکھا تھا: بی ایس سی
میں نے کہا نہیں صاحب، یہ کسی بی ایس سی کے بس کی بات نہیں ہے۔ صاحب زادے نے لاہور میں یونیورسٹی کے کسی پروفیسر سے خط لکھوا
ہے.... لیکن وہ پروفیسر بھی کون ہو سکتا ہے؟...."
یہ پہلی ملاقات زیادہ لمبی نہ رہی۔ دوپہر کے کھانے کا اعلان ہوا تو سب کو منتشر ہونا پڑا۔ لیکن اس کے بعد اس کانفرنس کے موقع پر استاذ مسعود
بعد اطمینان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک ملاقات میں ان کے پاس صرف ایک یا دو افراد موجود تھے۔ مصر کے ہفتہ وار ادبی مجلّہ "الرسالۃ"
ہا سے ان کے پاس رکھے تھے۔ موقع غنیمت جان کر انہوں نے ان میں سے ایک پرچہ اٹھایا اور پہلے صفحہ پر کھول کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا
نظر ڈال لیجئے اور مجھے پڑھ کر سنائیے" بالکل غیر متوقع طور پر میرا امتحان لیا جانے لگا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میرے جسم پر کپکپی سی طاری
ب میں نے ایک نظر اس صفحہ کے پہلے کالم پر ڈال لی تو کچھ ہمت بندھی اور میں نے قدرے بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ ابھی تین چار
اہوں گا کہ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا "بس بس بس" میرا عربی لغت اور قواعد کا علم ان کے نزدیک قابل اطمینان تھا۔ اسی موقع پر
چھوٹا سا مضمون بھی عربی میں لکھنے کی فرمائش کی۔ لیکن یہ ایک کڑی آزمائش تھی، جس میں میری اصل قابلیت کھل جانے کا قوی امکان تھا
ن اور تنہائی کے ماحول میں ہفتہ عشرہ کی محنت سے لکھی ہوئی تحریر اور کہاں اس شور و شغب میں ایک مضمون لکھنے کی بے ڈھب سی کوشش!
ش کو ٹالنے میں ہی خیریت سمجھی۔ استاذ نے ایک دو بار پوچھا بھی تو کہہ دیا "وقت اور سکون ہی نہیں مل رہا کہ کچھ بیٹھ کر لکھوں۔" اور اس
صرف بھی نہیں تھا۔

یہ ابتدا تھی اُس سات سالہ عہد کی جس میں میرا ربط استاذ مسعود کے ساتھ برابر قائم رہا اور جس میں اس پہلی ملاقات سے لے کر مارچ ۱۹۵۴ء میں ان کی وفات تک ذرہ بھر کہیں ڈھیل نہ آئی۔ میں اپنے روزگار کے سلسلے میں استاذ سے ہمیشہ دُور ہی رہنے پر مجبور تھا لیکن انہوں نے اپنی باقاعدہ اور منضبط خط وکتابت کی بدولت اس فاصلے کو باہمی ربط اور تعلق پر کبھی اثر انداز نہ ہونے دیا۔ متنبی کے الفاظ میں وہ اس سمندر کی مانند تھے جو قریب والوں کے لئے موتی نکال کے پھینکتا ہے اور دور والوں کو رحمت کے بادل بھجواتا ہے:

كَالْبَحرِ يَقذِفُ لِلقَرِيبِ جَوَاهِراً ۔۔۔ جُوداً وَيَبعَثُ لِلبَعِيدِ سَحَائِبَا

یہ خط وکتابت ابتداء میں کچھ عرصہ میری تربیت کا واحد ذریعہ تھی۔ میں عربی زبان میں استاذ کو خط نہیں لکھتا تھا، بلکہ خطوط کی شکل میں مضمون نگاری کرتا تھا۔ وہ ان کی اصلاح کرکے مجھے واپس بھجوا دیتے اور میرے ہر خط کے ساتھ اپنے زیر تربیت رفیق محمد عاصم الحداد سے بھی ایک خط عربی میں لکھوا کر بھیجتے۔ اس طرح ہم دونوں کی مشق ہوتی رہتی اور ایک خفیف اور دبا ہوا جذبہ مسابقت (جسے ہم نے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا تھا) ہمیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے پر آمادہ کرتا رہتا۔ لیکن یہ سلسلہ چار یا پانچ خطوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک تو عربی انشاء ترقی کر گئی تھی، دوسرے انہی دنوں تقسیم کا وہ ہنگامہ پیش آگیا جس کے سبب آبادیوں کو اِدھر سے اُدھر ہونا پڑا۔ میں ان دنوں لاہور کے ایک کارخانے میں ملازم تھا کچھ دن کی رخصت لے کر بہاولپور گیا تو گاڑیوں کی قلت اور مسافروں کے آئے دن قتل وغارت کے واقعات کی وجہ سے ایک طویل عرصہ تک واپس نہ آسکا۔ ملازمت جاتی رہی۔ جب اس طوفان کے تھمنے پر ستمبر یا اکتوبر میں لاہور آیا تو استاذ بھی فسادات کے اس ہفت خواں سے گذر کر یہاں پہونچ چکے تھے اور اسلامیہ پارک (اس زمانہ میں [illegible] پارک) میں اپنے رفیقوں کے ساتھ ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ ان کا سارا کتب خانہ جس میں عربی کی بعض قیمتی اور نایاب کتابیں تھیں جالندھر میں رہ گیا تھا۔ میں نے جب انہیں جا کر ان کی عاریتاً دی ہوئی عربی رسالہ "الفتح" کی دو جلدیں واپس کیں تو مارے خوشی کے ان کے منہ سے بے ساختہ "جزاک اللہ" نکلا۔ کہنے لگے "اب اس تنگدستی میں ان دو جلدوں کی بھی بڑی قیمت ہے اگر مجھے ان حالات کا علم ہوتا تو جالندھر میں آپ کو اپنی اور بھی بہت سی کتابیں دے دیتا، وہ محفوظ تو ہو جاتیں"۔ ان دنوں وہ فسادات پر مضامین کا ایک سلسلہ عربی میں لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن کافی عرصہ لکھنا پڑھنا موقوف رہنے کی وجہ سے طبیعت میں انشراح نہیں ہوتا تھا۔ کہتے تھے "یوں لگتا ہے جیسے میں اپنا ذخیرۂ الفاظ بھی اپنی کتابوں کے ساتھ جالندھر میں چھوڑ آیا ہوں۔ فسادات کی ہولناکیوں پر لکھنا چاہتا ہوں لیکن سوائے فظائع اور شنائع کے اور کوئی لفظ ہی ذہن میں نہیں آتا فظائع اور شنائع یہی دو لفظ ہیں جو بس یاد رہ گئے ہیں۔ اب ان دو لفظوں کے ساتھ میں کہاں تک اتنے بڑے مضمون میں کام چلا سکوں گا"

لاہور سے راولپنڈی اور راولپنڈی سے بلاد عرب کا سفر، واپسی پر حیدرآباد، حیدرآباد سے گوجرانوالہ اور پھر واپس راولپنڈی! استاذ پاکستان میں آکر بہت سی جگہوں کو اپنی صحت کے لئے آزما کر دیکھ چکے تھے۔ لیکن راولپنڈی کے سوا انہیں کوئی جگہ راس نہ آئی۔ انہیں ایسی آب وہوا کی تلاش جو مرطوب بھی نہ ہو اور جو گرد وغبار سے بھی خالی ہو۔ رطوبت اور گرد وغبار دونوں چیزیں ان کے دمہ کے عارضہ کے لئے سخت مضر تھیں۔ یہ عارضہ ان کا زندگی بھر کا عارضہ (LIFE-TIME DISEASE) تھا۔ دمہ کا دورہ ان پر بعض اوقات اس شدت سے پڑتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شاید ان کی زندگی کا آخری دورہ ہو۔ ایسا ہی ایک دورہ میں نے پہلی دفعہ اپنے قیام جالندھر کے موقع پر دیکھا تھا۔ استاذ مسہری لگا کر سوئے ہوئے تھے۔ تنفس کی تکلیف سے ان کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور سانس کی سیٹی دور تک سنائی دیتی تھی۔ ان کے قریب رہنے والوں کے لئے یہ ایک معمول کی چیز لیکن میرے اوسان خطا تھے اور سوچتا تھا کہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو میری یہ آمد کتنی نحس ثابت ہوگی اور پھر اس کام کا کیا بنے گا جو انہوں نے قابلیت کے ساتھ سنبھالا تھا ـــــ لیکن دوسرے دن وہ یوں اٹھ کے بیٹھے تھے جیسے رات کو وہ ساری تکلیف اُن پر نہیں کسی اور پر گذری تھی!

ایک تندرست آدمی ایک پُرسکون نیند کے بعد اُٹھ بیٹھتا ہے اور جب میں واپس جانے لگا تو مجھے رخصت کرتے وقت ان کے چہرے پر ایک صحت مندانہ سی بشاشت تھی۔ انہوں نے اپنی اس بیماری کو زندگی کی ایک تلخ حقیقت (A HARD FACT OF LIFE) سمجھ کر اس سے نبا کر لے جانے کا عزم کیا تھا۔ وہ اپنی بیماری کے اتار چڑھاؤ کی کیفیات ضرور بیان کرتے تھے اور دعاؤں کے لئے بھی عموماً تقاضا کرتے رہتے تھے لیکن ان کی زبان سے اس مرض کا شکوہ میں نے کبھی نہیں سنا تھا اور نہ اس کی وجہ سے انہیں کبھی دل گرفتہ اور مایوس پایا تھا۔ ان کی زندگی ایک ایسے بحری سفر کے مانند تھی جس میں وقتاً فوقتاً طوفانوں کا اٹھنا ایک متوقع بات ہوتی ہے۔ اور ان طوفانوں سے گزرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں ہوتی کہ ان کا پامردی سے مقابلہ کیا جائے۔ اس میں کیا شک ہے کہ اپنے اس مرض کی طوفان خیزیوں کا انہوں نے جس پامردی سے مقابلہ کیا وہ صرف اُن کے جیسی قوت ارادی رکھنے والا شخص ہی کر سکتا تھا۔

استاذ کے پاکستان میں آنے کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ پھر سے چل پڑا تھا۔ لیکن اب وہ میرے خطوں پر اصلاح نہیں دیتے تھے۔ بلکہ مجھے ادب اور نحو و بلاغت کے مطالعہ کے بارے میں مشورے دیتے، اچھی اچھی کتابوں اور مصنفوں کے نام بتاتے، اور عرب ممالک سے مفید عربی رسالے منگوا کر میری مدد کرتے۔ استاذ مسعود الندوی یوں تو مجموعۃ الصفات انسان تھے۔ لیکن میرے ذہن پر ان کی شخصیت کے جس پہلو کا نقش سب سے گہرا مرتسم ہوا، ان کے مربی اور معلم ہونے کا تھا۔ مجھے ان کے پاس دارالعروبہ میں تین یا چار مرتبہ کچھ روز کے لئے رہنے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان کے یہاں کا ماحول ایک تربیت گاہ کا ماحول تھا جس میں وقت، ایک آزاد اور محدود چیز نہیں بلکہ ایک نپی اور تُلی جانے والی چیز تھی جس میں رہنے والے ایک فوجی کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ صبح کی نماز، مطالعہ قرآن و حدیث، ناشتہ، تعلیم و تصنیف کا کام، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے، شام کی ہوا خوری، اور مغرب اور عشاء کے درمیان تلامذہ کے کام کی اصلاح و تصحیح ـــــ ان سب کا معمول کے اوقات مقرر تھے اور بغیر کسی دباؤ اور گھٹن کے احساس کے انسان ہر کام اپنے وقت پر کرتا چلا جاتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دارالعروبہ میں مستقل رہنے والے لوگ اس پابند اور منظم زندگی کو کیسا محسوس کرتے ہیں میرے لئے یہ چونکہ ایک آزاد اور بے راہ روزندگی سے نکل کر نظم و ضبط کی زندگی میں آنے کا چند روزہ تجربہ ہوتا تھا اس لئے بہت خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت شاگردوں کے کام کا جائزہ لینے کے لئے مقرر تھا اور میرے کام کی اصلاح بھی استاذ اکثر اسی وقت کیا کرتے تھے۔ اس نشست کا عام نقشہ کچھ اس طرح ہوتا کہ استاذ اپنے نرم اور گدے دار بستر میں دبے بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک بڑی تپائی رکھی ہے اور اس پر ایک ٹیبل لیمپ روشن ہے۔ میں ان کے بائیں جانب کرسی پر بیٹھا ہوں اور دائیں جانب محمد عاصم الحداد عربی لغت کی کتابوں (القاموس المحیط، مختار الصحاح، المصباح المنیر، اساس البلاغۃ وغیرہ) کا انبار لگائے بیٹھے ہیں۔ اصل متن استاذ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور عربی ترجمہ میرے ہاتھ میں۔ میں عربی عبارت پڑھتا جاتا ہوں اور وہ اردو اصل سے اس کا موازنہ کرتے اور جگہ جگہ اصلاح دیتے جاتے ہیں۔ جہاں عبارت میں کوئی ایسا لفظ یا ترکیب نظر آئی جس کے بارے میں انہیں خود بھی شک ہوا تو انہوں نے عاصم صاحب کو اشارہ کیا اور وہ لغت کی ورق گردانی کرنے لگے جب تک اس لفظ کی پوری طرح تحقیق نہ ہو گئی استاذ نے آگے ایک قدم نہ بڑھانے دیا۔ چلتے چلتے کبھی کبھار ایک آدھ جملہ عبارت میں ایسا بھی آجاتا جس میں بظاہر کوئی لفظ غلط یا ناموزوں نہ ہوتا۔ استاذ اس کی درستی بھی نہ کراتے لیکن آگے بھی نہ بڑھنے دیتے۔ مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کر کے آنکھیں نیم وا کر کے منہ میں کچھ گنگنانے لگتے۔ میں یا عاصم کچھ بولنا چاہتے تو وہ ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہتے۔ کچھ دیر گنگنانے کے بعد خاموشی کے ساتھ میرے ہاتھ سے قلم اور مسودہ لے لیتے، جملے میں ایک لفظ ادھر بڑھاتے، ایک آدھ گھٹاتے، ایک دو مترادفات بدل کرتے اور عبارت کو ایک آدھ بار پڑھ کر مسرت آمیز اطمینان کے ساتھ میری طرف بڑھاتے اور کہتے "مشی" یعنی اب عبارت رواں ہو گئی ہے۔ ایسے مقامات کے متعلق

ہوں نے مجھے بتایا تھا کہ "بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک فقرے میں بظاہر کوئی خامی نہیں ہوتی ہے الفاظ بھی صحیح ہوتے ہیں، مطلب کی ادائیگی بھی ہو جاتی ہے لیکن فقرے کا دروبست ٹھیک نہیں ہوتا، عبارت اکھڑی اکھڑی سی لگتی ہے۔ ایسے مقامات کی اصلاح صرف کچھ لفظوں کے آگے پیچھے کرنے گھٹانے بڑھانے سے ہو جاتی ہے، لیکن اس کے لئے ایک ہنر چاہئے!

شاگردوں کی تربیت کے بارے میں مختلف اساتذہ کے مختلف طریقے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک شاگرد اور نوآموز کے کسی کام کی تعریف نہ کی جائے، بلکہ ہمیشہ اسے ایک سخت اور کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ تاکہ وہ برابر خوب سے خوب تر کی کوشش میں لگا رہے اور یہ زعم کبھی اس کے دل میں پیدا نہ ہو کہ وہ کمال کے کسی مرتبے پر پہونچ گیا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نوآموز کے اچھے کام کی دل کھول کر تعریف کی جائے۔ یہاں تک کہ اس تعریف میں اگر کچھ مبالغہ بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تاکہ اس کا حوصلہ بلند ہو اور علم و فن کی اور اونچی اڑانوں پر پرواز کرنے کی سکت اس کے بازوؤں میں پیدا ہو۔ ان دونوں طریقوں کے اپنے اپنے فوائد بھی ہیں اور نقصان بھی۔ استاذ مسعود کا طریقہ تربیت اسی دوسری قسم کا تھا۔ وہ اپنے تلامذہ کے اچھے کاموں کی تعریف کرتے تھے اور مبالغہ کی حد تک کرتے تھے۔ لیکن اُن کی اس پہلی تعریف سے خود پسندی کا جو نشہ کچھ دیر کے لئے ناپختہ ذہنوں پر چڑھ جاتا تھا وہ اسے اتارنے کا فن بھی جانتے تھے، وہ یوں کہ بعد میں جب اسی کام کے تفصیلی جائزہ اور اصلاح و تہذیب کا موقع آتا تو پھر اس میں کبھی مساہلت نہ برتتے بلکہ اس کا کھرا کھوٹا الگ الگ کرکے رکھ دیتے ـــــــ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ کس طرح پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے میرے منہ پر مجھے "عربی کا معجزہ" اور میری تحریر کو "سہل ممتنع" اور خدا جانے کیا کیا قرار دیا تھا۔ ان کی اس تحسین کا فائدہ بھی یقیناً ہوا، لیکن مجھے یہ اعتراف بھی کرلینا چاہئے کہ ان کی اس پرجوش تعریف سے میرے دل میں اپنے متعلق بہت کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ اور کچھ عرصہ تک میری "انا" بغیر کسی وجہ کے پھولی رہی۔ پھر جب دوسری مرتبہ میں اُن سے ملنے کے لئے جالندھر گیا تو اپنے ساتھ عربی میں ایک چھوٹا سا مضمون بھی لکھ کر ساتھ لیتا گیا، جو کچھ طبعزاد تھا اور کچھ ترجمہ۔ استاذ کو جب یہ مضمون پڑھ کر سنایا تو توقع کے بالکل برعکس ان کا رد عمل بالکل سرد اور روکھا تھا۔ مضمون کی تصحیح تو انہوں نے کردی تھی، لیکن ان کی خاموشی بہت گہری اور پراسرار تھی۔ صاف صرف ایک چیز مجھے بار بار کہتے رہے کہ "آپ کی نحو بہت کمزور ہے، اچھا ہو کہ آپ اس مرحلہ پر نحو کی کوئی کتاب پڑھ ڈالیں"۔ ان کی اس صاف گوئی نے سارا نشہ اتار دیا اور میں اپنی خیالی اڑانوں سے اتر کر حقائق کی دنیا میں واپس آگیا۔

تعریف و تحسین کی یہ عادت ان کی آخر تک باقی رہی۔ ایک دفعہ مصر کے ہفتہ وار ادبی رسالے "الرسالۃ" میں پاکستان پر ایک مضمون شائع ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوئی کہ مضمون نگار نے لفظ "پاکستان" کو عربی میں کہیں "الباکستان" لکھا تھا اور کہیں "باکستان"۔ ایک ہی مضمون میں اس تلوّن کے معنی یہ تھے کہ انہوں نے یہ تحقیق کرنا ضروری ہی نہیں سمجھا تھا کہ قواعد کی رو سے کون سی صورت صحیح ہو سکتی ہے۔ اس پر میں نے "الرسالۃ" کو ایک مختصر خط شائع کرنے کے لئے بھیجا اور اس میں قواعد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ عربی میں "باکستان" بغیر "ال" کے لکھنا ہی صحیح ہے اور اسی کا التزام ہونا چاہئے۔ استاذ مسعود نے جب "الرسالۃ" میں میرا یہ خط دیکھا تو بے حد خوش ہوئے اور اسی دن اپنے قلم سے تعریف لکھ کر بھیجی: "بمّا اذکرو بمزید من الاعجاب والسّرور ان کلمتکم ھذہ فی الرسالۃ قد استبشرت بہا کثیراً ورجوت من وراء مثل تلک المقالات ـــ ان تجتہدی فی کتابتہا ـــ نفعاً کثیراً وفائدۃً جزیلۃً لکم ولنا ان شاء اللّٰہ، مسعود"۔ ان کی اس داد کو پڑھ کر میں نے اپنے اندر جو سرور (EXALTATION) اور جو کیف و وجد محسوس کیا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو خود اس تجربہ سے کبھی گذرے ہوں!

اس مدح و تحسین کا نقطۂ عروج ان کی وہ داد تھی جو انہوں نے جیل سے واپس آکر الجزائر کے ہفت روزہ "البصائر" میں میرا ایک طویل مضمون پڑھنے کے بعد دی تھی۔ یہ مضمون میں نے ان کی عدم موجودگی میں رسالے کے ایڈیٹر اور عربی زبان کے بہت بڑے ادیب و خطیب علامہ

محمد البشیر الابراہیمی کے ایک مضمون کے جواب میں، کچھ غلط فہمیوں کے ازالہ کی خاطر، لکھا تھا جو "البصائر" کے چار شماروں میں آیا تھا۔ جب استاذ نے یہ مضمون پڑھا تو ایک خط کے آخر میں اپنے قلم سے یہ سطریں لکھ کے بھیجیں :

"البصائر میں پورا مضمون نظر سے گذرا۔ جی چاہا کہ آپ کو ایک سطر میں جلد لکھ کر بھیج دوں :

(۲) یا لیتنی لو تیسّرت لی کتابۃ بضعۃ اسطر مثل ہذہ، پھر مرض کا ضعف غالب آگیا۔

انشاء اللہ بہاول پور قاسم باغ ہی میں آپ سے ملوں گا، کب ؟ جب قوت آ جائے اور طبیب اجازت دے، پروگرام ستمبر سے طے ہے"

اس تکڑے میں ان کا عربی جملہ پڑھ کر ایک دفعہ تو میرا سر گھوم گیا۔ شاگردوں کو اس طرح بھی کبھی داد دی جاتی ہے، میں نے سوچا، وہ آخر انسان ہی فرشتے تو نہیں ہیں۔ ادھر شیطان نے دبے پاؤں دل میں آکر وسوسہ ڈالنا شروع کیا کہ بیٹا ! کسی مقام کو پہونچ گئے ہو جبھی انہوں نے یہ بات لکھی ہے ورنہ کیوں لکھتے !

اس واقعہ کے آٹھ نو سال بعد، جب کہ استاذ ہم سے جدا ہو کر دوسری دنیا میں پہونچ چکے تھے۔ ایک دن "مکاتیب مہدی" پڑھ رہا تھا کہ ایک جگہ بالکل یہی جملہ اردو میں علامہ شبلی کے قلم سے مہدی افادی کے بارے میں دیکھنے میں آیا۔ مجھے یہ دیکھتے ہی یقین ہوا کہ استاذ مسعود کو جس طرح بعض دوسری چیزیں علامہ شبلی سے ماثوراً پہونچی تھیں، تعریف کا یہ انداز بھی شبلی ہی سے ان کو، بواسطہ سید سلیمان ندوی، ماثوراً پہونچا تھا، جسے انہوں نے برقرار اور زندہ رکھا۔ ایک بار مجھے خط میں لکھا :

(۱) میں انتہائی پسندیدگی اور خوشی کے ساتھ اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ الرسالۃ میں آپ کا یہ خط پڑھ کر میں بہت ہی مسرور ہوا۔ مجھے امید ہے کہ اس طرح کے مضامین سے — اگر آپ انہیں لکھتے رہے — آپ کو بھی، اور ہمیں بھی، انشاءاللہ بہت فائدہ پہنچے گا، مسعود۔

(۲) کاش میں بھی ایسی چند سطریں لکھ سکتا۔

مجھے افسوس ہے کہ استاذ مسعود کے طریق تربیت کی وضاحت کرتے ہوئے میری اپنی ذات کی بھی بالواسطہ کافی نمائش ہو گئی ہے جو بالکل مقصود نہیں تھی، ورنہ ان دنوں میں اپنی عربی دانی کے متعلق برا یا بھلا، کسی قسم کا احساس اپنے اندر پاتا ہوں۔ وہ جوش اور ولولے ختم ہو گئے۔ اب تو ایک عرصہ سے عربی میں کتابوں اور رسالوں کا پڑھنا بھی موقوف ہے اور یہ زبان کسی وقت یوں لگتی ہے جیسے اس سے کبھی شناسائی نہیں تھی ——————

کہنا صرف یہ مقصود تھا کہ استاذ مسعود الندوی کا یہ طریق ترتیب، اور یہ انداز مدح و ستائش اگرچہ خطرات اور مضرتوں سے خالی نہیں تھا، تاہم اس کی تاثیر بھی جادو کی سی تھی۔ استاذ کی شاباش سے ایک برقی رو ہمارے اندر دوڑ جاتی اور ہمیں اپنے اندر کچھ مافوق البشری قوتوں کا احساس ہونے لگتا تھا۔ یہ ان کے اسی اسلوب تربیت کا اثر تھا کہ ان کے بعد جب ان کے شاگردوں کو نہایت اہم اور بوجھل ذمہ داریوں کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو کبھی ہیٹا اور کمتر محسوس نہ کیا اور جو مہم بھی سامنے آئی اسے پوری آمادگی اور اعتماد کے ساتھ سر کیا۔

استاذ کی یہ تعریف اور مدح سرائی کسی ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنی تعریف یوں لٹاتے تھے جس طرح ایک سخی اپنی دولت لٹاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی طبیعت میں ایک سچا انکسار اور ایک بے ریا قسم کی کسرنفسی تھی وہ اپنی تحریروں کے آخر میں ہمیشہ "عاجز" لکھا کرتے تھے اور اس لفظ کے پیچھے اتنا خلوص، اتنی دیانت ہوتی تھی کہ اس میں کبھی تصنع کی بو نہیں آتی تھی اس کے مقابلہ میں ہم نے کتنے ہی فاضلوں نے دیکھا کہ اپنی طرف سے بہت کچھ کسرنفسی اور تواضع کا اظہار کرنا چاہتے ہیں لیکن بناوٹ کا چہرہ ان کے پرتکلف الفاظ کے پیچھے سے صاف جھانکتا ہوا دکھائی پڑتا ہے استاذ اپنے تئیں واقعی کمتر اور فرد سمجھتے تھے اور علم کے کسی شعبہ میں بھی انہیں اپنے منتہی اور کامل ہونے کا احساس نہیں تھا۔ ان کی عربی انشاء پردازی کا خود اہل عرب نے لوہا مانا تھا لیکن اپنے اس خاص ہنر میں بھی وہ اپنے احباب اور ہم چشموں کی تنقید کو بڑی وقعت دیتے تھے۔ ان کی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے جب ان

عربی کتاب "لمحات اجمالیۃ علی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ..." شائع ہوئی تو ندوۃ العلماء کے ترجمان "الرائد" میں مولانا ناظم ندوی نے اس کی ایک دو عبارتوں کے بارے میں سرسری طور پر رائے دی کہ یہ قدیم اور فصیح استعمال کے مطابق نہیں ہیں۔ میں نے اس کا تذکرہ ایک خط میں استاذ مسعود سے کر دیا۔ جواب میں انہوں نے لکھا:

"لمحات اجمالیۃ کی جس عبارت کو آپ نے نقل کیا ہے، اس کا حوالہ دیں تاکہ میں دیکھ سکوں۔ مولانا ناظم صاحب کی عربیت اچھی ہے، اور میری کمزوریاں سب سے بھی جانتے ہیں، اور میں بھی اور ہم دونوں کے تمام احباب، اور یہی وہاں انہیں خیال محسوس ہوں، ان سے پوچھ کر صفحہ اور سطر کے حوالہ سے مطلع کریں۔ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح ہو جائے گی۔"

یہ خط ناظم صاحب کے نام نہیں، میرے نام تھا اور استاذ کی دیانت، سچائی اور خلوص نے اس میں کوئی عار نہ سمجھا کہ وہ اپنے ایک شاگرد کے سامنے ایک دوسرے شخص کی برتری اور کمتری کا یوں کھلے دل سے اعتراف کرلیں۔

استاذ مسعود کی یاد آج گیارہ سال گذرنے پر بھی اسی طرح دل کو گرما رہی ہے اور ان کا تصور کرنے پر یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی ہمارے درمیان سے اٹھ کر گئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے ان کو ایک ایسا دل عطا کیا تھا جس میں حرارت تھی، سوز تھا، ہمدردی تھی، محبت اور انسیت تھی۔ وہ اپنے قریب آنے والوں کے لئے صرف ایک استاذ اور معلم ہی نہ ہوتے تھے بلکہ ایک شفیق بزرگ، بڑے بھائی اور غمخوار رہتے ——— وہ اپنے زیر تربیت نوجوانوں کے ذاتی اور خانگی معاملات کا بھی اتنا ہی خیال رکھا کرتے تھے جتنا ان کی علمی اور تعلیمی ضروریات کا۔ ایک دفعہ ابتدائی زمانے ہی میں ان کے یہاں کچھ دن کے لئے ٹھہرا ہوا تھا تو ایک روز میرے سامنے اپنے رفیق محمد واصم کے کسی خانگی معاملے کا ذکر اتنی سرگرمی اور سنجیدگی کے ساتھ کرتے رہے جیسے یہ دارالعروبہ کے تمام مسائل میں سے کوئی مسئلہ تھا۔ اپنے قریب رہنے والی "انسانیت" کے ساتھ یہ ہمدردی، یہ حرارت آمیز تعلق اور ان کے حالات میں یہ دلچسپی اور فکرمندی ——— یہی ان کی شخصیت کی مقناطیسیت کا راز تھا اور یہ وہ خصوصیت تھی جس کی دوسرے لوگوں میں ایک واضح کمی دکھائی دیتی تھی۔

وہ اگرچہ عام قیادت کے کسی منصب پر فائز نہیں تھے، لیکن جہاں بھی جاتے اپنے گرد شائقین علم و ادب کا ایک مجمع اکٹھا کر لیتے۔ ان کی مجلس میں ایک خاص بات یہ نظر آتی تھی کہ اس میں گفتگو زیادہ تر علم و ادب کے موضوعات پر ہوتی تھی۔ دوسروں پر ٹھٹھا یا مذاق نہیں ہوتا تھا، دوسروں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی تھی ——— دوسرے لفظوں میں اس میں ہلکی باتیں بالکل نہیں ہوتی تھیں۔

میں جب ان کے ساتھ اپنے تعلق کی کیفیت کا تصور کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے ان کی ساری شفقت، سارا مہر و کرم صرف میرے ہی لئے تھا۔ میں جب دارالعروبہ کچھ دن ٹھہرنے کے لئے جاتا، اور پہلے دن سامان وغیرہ رکھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ بڑے انہماک سے میرے ذاتی حالات سنتے اور جب باتوں کی یہ پہلی نشست ختم ہوتی تو کہتے: اب میں ذرا فلاں کام کرتا ہوں، آپ میری الماری کھول کر میری کتابوں کا جائزہ لیجئے۔ ایک دفعہ میں حالات کا رخ ٹھیک نہ دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے باہر سے خاص طور پر بلوایا اور اپنے مسودات اور خطوط کا ایک چھوٹا سا بکس میرے حوالے کیا۔ "یہ میری زندگی کا سرمایہ ہے" وہ مجھے اپنی یہ امانت سپرد کرتے ہوئے کہہ رہے تھے "اس میں میرے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین اور کتابوں کے مسودے ہیں، ذاتی خطوط ہیں، ڈائریاں ہیں، یہ لے جائیے اور اس میں سے جو آپ کا جی چاہے پڑھتے رہئیے، بس اتنا خیال رکھئیے کہ اس میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہو" ——— ان کا یہ بکس ایک عجائب خانہ تھا جس میں علاوہ دوسری بہت سی چیزوں کے امیر شکیب ارسلان، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے مشاہیر کے خطوط محفوظ تھے۔ میں جب بھی یہ بکس کھولتا اس عجائب خانے کی سیر کے لئے بیٹھتا تو وقت کا احساس جاتا

اور گھنٹوں اس شغل میں گذر جاتے۔ یہ کیف ڈیڑھ سال یا اس سے بھی زیادہ مدت میری تحویل میں رہا۔ اور اس کے مشمولات سے جتنا میں نے فائدہ اٹھایا اتنا کسی اور شخص نے کاہے کو اٹھایا ہوگا!

ہمارے بڑوں میں کچھ لوگ ایسے ملیں گے کہ ان کی صحبت میں اگر آپ کو بیٹھنے کا اتفاق ہو تو آپ کو یوں محسوس ہوگا۔ جیسے ان کی عقل اپنی پوری ٹھنڈک اور بے حسی کے ساتھ آپ کی عقل سے مخاطب ہے اور ان کے اور آپ کے درمیان غیریت کی ایک غیر مرئی دیوار حائل ہے جس کے سبب سے ان کی آواز ایک فاصلے سے سنائی دیتی ہے، جیسے وہ ایک فرد کے ساتھ باتیں نہ کر رہے ہوں بلکہ اسٹیج سے بول رہے ہوں۔ استاذ مسعود کی صحبت میں بیٹھنے سے یوں لگتا تھا جیسے ان کا دل آپ کے دل سے مخاطب ہے، جیسے وہ اور آپ ایک ہی سطح اور مرتبہ کے انسان ہیں۔ جیسے آپ کی خوشی اور آپ کا غم ان کا غم ہے ــــــ ایسے ہی انسانیت بھرے لوگوں کے دم سے، اگر دیکھا جائے تو اس دنیا میں یہ سارا حسن، گرمی اور تازگی ہوتی ہے اور یہ زندگی رہنے کے قابل لگتی ہے اور جب ایسے لوگ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو ان کی یاد کی دھنک ایک لمبے عرصے تک دلوں میں رواں رہتی ہے۔

استاذ مسعود الندوی کی موت یوں تو کسی وقت بھی ہوتی ایک عظیم سانحہ ہی سمجھی جاتی، لیکن وہ حالات جو ان کے بعد کے سالوں میں پیش آئے اور جن کا تسلسل ابھی تک ٹوٹا نہیں ہے ان کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سن ۵۴ء میں اُن کا منظر (scene) سے یوں اچانک ہٹ جانا ایک بہت ہی بڑے خسارے اور نقصان کی بات تھی۔ ہم یہ کہنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہیں کہ اگر وہ آج نہ ہوتے تو کیا ہوتا، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اگر آج موجود ہوتے تو چمن کی تنظیم کا کچھ اور ہی نقشہ ہوتا۔

انگریزی میں مشہور ادیب آر۔ ایل۔ اسٹیونسن کا ایک بہت عمدہ خاکہ ایڈمنڈ گوس نے لکھا تھا، اس کے آغاز میں وہ کہتا ہے:

'AND NOW PEN IN HAND I PAUSE TO THINK HOW I CAN RENDER IN WORDS A FAINT IMPRESSION OF THE MOST INSPIRITING THE MOST FASCINATING HUMAN BEING THAT I HAVE KNOWN' (1)

اسی طرح کی بات اب میں اپنے اس مضمون کا اختتام کرتے ہوئے، ہاتھ میں قلم لیے سوچ رہا ہوں کہ الاستاذ مسعود الندوی کی ذات کے متعلق میں کتنا کچھ لکھنا چاہتا تھا اور کتنا تھوڑا لکھ پایا ہوں اور کیا میں اس شخص کے بارے میں اپنے تاثرات کا دسواں حصہ بھی بیان کر سکا ہوں، جس نے اپنے علم، اپنے تجربے، اپنی محنت اور خیر اندیشی میں سے اتنا کچھ میرے دامن میں ڈال دیا تھا؟!

---

(۱) اور اب قلم ہاتھ میں لئے میں سوچ رہا ہوں کہ میں کس طرح اُس شخص کا ایک کمزور سا مرقع اپنے الفاظ میں کھینچ سکتا ہوں، جس کی شخصیت میرے لئے سب سے زیادہ روح پرور اور سحر انگیز تھی!

محمد نواز (ایم۔ اے)

اقامت دین کا تصور

جماعت اسلامی جس مقصد کو لے کر اٹھی ہے، اسے اس نے اپنے "دستور" میں جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ یہ ہیں:

"جماعت اسلامی پاکستان کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جدوجہد کا مقصود عملاً اقامت دین (حکومت الٰہیہ یا اسلامی نظام زندگی کا قیام) حقیقتاً رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کا حصول ہوگا۔" (دفعہ ۴)

یہ نصب العین اول روز سے لے کر آج تک اس کی ساری کوششوں کا محور ہے، اس کے علاوہ کوئی نصب العین نہ پہلے کبھی تھا نہ اب ہے اور نہ انشاء اللہ آئندہ کبھی ہوگا۔ جماعت اسلامی نے اس بات کا بارہا اعلان کیا ہے کہ:

"ہم اپنے خالق، مالک، اس کے فرشتوں، اس کی پوری کائنات، اور ساری نوع بشری کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے قیام کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ ہمارا پروردگار ہم سے راضی ہو اور قیامت کے روز جب ہم اس کی بارگاہ میں پیش کئے جائیں تو وہ مالک الملک اور مالک یوم الدین ہمیں اپنا اطاعت گزار سمجھ کر ہم سے انتہائی نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرے۔ یہ ہماری دعوت بھی ہے ـــــ اور ہماری آرزو بھی۔ ہم اسی ایک مقصد کے حصول کے لئے جمع ہوئے ہیں اور اسی کے لئے اپنی بساط کے مطابق جدوجہد کر رہے ہیں، ہمیں اس امر کا بھی پوری طرح اعتراف ہے کہ یہ عظیم اور بلند مقصد جس قسم کے اخلاص، جس نوعیت کے ایثار اور جس طرح کی مضبوط سیرت اور کردار کا متقاضی ہے، ہم اس کے تقاضوں کو کسی اعتبار سے بھی پورا نہیں کرتے ہماری ہمتیں پست، ہمارے ارادے متزلزل، ہمارے ایمان ناقص ہیں، ہمیں یہ سب کچھ تسلیم ہے، لیکن اپنی ان سب کمزوریوں کے اعتراف اور ان پر اظہار ندامت کے باوجود یہ بات کسی جذبۂ فخر سے نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم رب العالمین کے دین کو اس دنیا میں غالب کرنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں۔" (ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۶۱ء)

جماعت نے اپنے نصب العین کی وضاحت جدوجہد کے ہر مرحلے میں کی ہے، لیکن اس کے باوجود اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا یہ نصب العین دین کی ایک غلط تعبیر ہے، اس سے دین کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا ہے کہا جاتا ہے کہ:

"دین کی یہ تصویر اپنی جامعیت کے باوجود اس کی حقیقی تصویر نہیں، دین کی اس تصویر میں ایک زمینی نتیجہ کا پانا دین کا مقصد اصلی قرار پاتا ہے، جب کہ شخصی ذمہ داری کی حیثیت سے ایک ذاتی نتیجہ کو پانا دین کا اصل مقصود ہے۔" (تعبیر کی غلطی ص ۲۴۷)

یہ بات جماعت سے تعلق رفاقت منقطع کرنے والے وہ قابل احترام بندگان دین فرما رہے ہیں جو اس نصب العین کو اپنی زندگی کا مشن بنانے کا خدا اور خلق کے سامنے حلفاً اقرار کر چکے ہیں، ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار، خلوت ہی میں نہیں بلکہ جلوت میں سینکڑوں ہزاروں بندگان خدا سے صرف

تفسیروں ہی میں نہیں بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے بھی یہ اعلان کیا ہے کہ:

"ہماری تمنا اور کوشش یہ ہے کہ اس ملک کی زندگی کے ہر گوشہ پر اللہ کا رنگ چڑھ جائے، کوئی کونا اور کوئی گوشہ بھی صبغۃ اللہ سے محروم نہ رہے، جب تک ایک نقطہ کے برابر بھی کسی گوشہ میں ایسی جگہ باقی رہے گی، جس پر اسلام کا چھاپہ نہ ہوگا، اس وقت تک ہم سمجھیں گے کہ ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا اور ہم برابر اپنی کوشش جاری رکھیں گے تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہماری زندگی کے ہر گوشہ پر اپنے دین کو قائم فرما دے"

(مولانا امین احسن اصلاحی۔ ترجمان القرآن)

آج جماعت کے نصب العین پر جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں، اسی قسم کے اعتراضات ایک عرصہ پہلے بھی کئے گئے تھے، اسی وقت خود انہوں نے اعتراضات کے جوابات دیئے تھے، مثلاً ایک موقع پر مولانا امین احسن اصلاحی نے فرمایا تھا:۔

"حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ ہم ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی حکومت کی طرح حکومت قائم کر دیں نہ ہم دوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے، البتہ یہ مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے کہ ہم اقامت دین کے جہد کریں اور اس جدوجہد میں اپنا تمام سرمایۂ زندگی لگا دیں۔ جان بھی اور مال بھی اور اپنی تمام مرغوبات اور محبوبات بھی اور دین سے مراد دین میں سے کوئی خیر مراد نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی، عقائد بھی اور اعمال بھی، یہ جدوجہد پورے عشق اور پورے جوش کے ساتھ مطلوب ہے اور اللہ کے نزدیک یہی چیز ہمارے ایمان اور نفاق کی کسوٹی ہے کوئی سینہ اگر ولولہ سے خالی ہو، ایمان کا مسکن نہیں بن سکتا اور کوئی دل جو اس درد سے ناآشنا ہو خدا کا گھر نہیں ہو سکتا، کتنی ہی تسبیحیں گردانی جائیں یا وظیفے پڑھے جائیں اور کتنی ہی ضربیں لگائی جائیں اس عشق کے بدل نہیں ہو سکتے، ساری دینداری کی روح یہی ہے اور خدا کے ہاں ہمارے دلوں کے اندر سب سے پہلے یہی چیز ڈھونڈی جائے گی اور یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ یہ جدوجہد جماعتی شکل میں ہو انفرادی شکل میں نہ ہو، ہر مردِ حق کا کام ہے کہ وہ پہلے اپنے اندر اس کی گرمی پیدا کرے اور پھر یہ کوشش کرے کہ اس آگ سے سارے دل بھڑک اٹھیں، یہ سوال بحث سے خارج ہے کہ جدوجہد کس نتیجہ تک منتہی ہوگی، ہو سکتا ہے کہ ہم آروں سے چیر ڈالے جائیں، گلیوں میں گھسیٹے جائیں، انگاروں پر لٹائے جائیں، ہمارے جسم جیل اور کوڑے نوچیں اور ساری یاتنوں کے بعد بھی ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکے کہ ہم موجودہ نظامِ باطل کو ایک نظامِ حق سے بدل دیں، نہ تو یہ ناکامی ناکامی ہے اور نہ اس کا اندیشہ بلکہ اس کا یقین بھی ہم کو اس مطالبہ سے سبکدوش کر سکتا ہے جو خدا نے اقامت دین کے لئے ہم سے کیا وہ تو ایک قطعی اور اٹل فرض ہے جو ہر قیمت پر ہر حال میں ہمیں ادا کرنا ہے۔ اگر ہندوستان کی تمام خانقاہیں بھی آپ کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ فلاں فلاں اوراد اس ذمہ داری سے سبکدوش کر سکتے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ شیطان کا دھوکا ہے، جب تک آپ کی گردنوں پر ہیں اور اللہ کے دین کی عمارت کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے اور خدا کی زمین کا ایک ٹکڑا بھی غیر اللہ کی اطاعت کے نیچے دبا ہوا ہے اس وقت تک آپ کے لئے چین کی نیند حرام ہے"　(روداد حصہ سوم ص ۱۲۲)

اس نصب العین کے حصول کی جدوجہد کو جن لوگوں نے "زمینی نتیجہ" حاصل کرنے کی جدوجہد قرار دیا تھا انہیں مولانا اصلاحی نے جن الفاظ میں جواب دیا تھا وہ یہ ہیں:۔

"بعض لوگ طنز سے کہتے ہیں کہ ہماری جدوجہد حکومت کے لئے ہے اور خدا کی رضا کی طلب، جو خلاصہ دین ہے ہمارے سامنے نہیں ہے یہ خیال بالکل غلط ہے، ہماری ساری جدوجہد اللہ کے دین کے قیام اور ایک صالح اور خدائی نظام کی اقامت کے لئے ہے اور یہ جدوجہد کوئی

ہے، جس پر ہمیں شرمانے کی ضرورت ہو اور ہم جب کبھی حکومت الٰہیہ کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی نظام ہوتا ہے اور میں نہیں سمجھتا
ن کے مطلوب اور محبوب ہونے میں کس پہلو سے بحث کی جا سکتی ہے اور آخر یہ خدا کی رضا طلبی سے الگ چیز کیوں ہے؟ خدا کی رضا اس سے بڑھ کر
بات میں ہو سکتی ہے کہ اس کی زمین پر اس کے احکام چلیں اور ان لوگوں سے بڑھ کر رضائے الٰہی کا طالب کون ہو سکتا ہے جو اس بات کے لئے سر دھڑ
بازی لگائیں کہ خواہ کچھ ہو کیوں نہ ہو خدا کی زمین پر غیر اللہ کے اقتدار کا کوئی شعبہ نہ رہنے دیں گے، اگر یہ جدوجہد دنیا داری ہے تو کیا دینداری
یہ ہے کہ راتوں کو جاگ کر اللہ ہو کی ضربیں لگائی جائیں اور دن میں خدا کی زمین پر شیطان کا تخت بچھانے کی کوشش کی جائے"

(روداد حصہ سوم ص ۱۲۳)

اس اعلان اور اظہار کے باوجود یہ بات کہیں اشاروں اور کنایوں کے رنگ میں، کہیں سرگوشیوں کے انداز میں اور کہیں کھل کر برملا کہی جا رہی
ہے کہ اقامت دین کے اس تصور کا کتاب و سنت میں کہیں ذکر نہیں، جماعت کے لٹریچر میں اس کی ایک ایسی تعبیر کی گئی ہے، جس سے پورے دین کا حلیہ
بگڑ گیا ہے، ان حضرات کے نزدیک اقامت دین کا حقیقی مفہوم "دین پر قائم رہنا" ہے نہ کہ اسے "قائم کرنے" کی عملی جدوجہد کرنا، دین کو قائم
کرنے کی دعوت دینا ایک تکلیف مالا یطاق ہے۔ اس پر اصرار کرنا، اس کے لئے عملی اقدام کی دعوت دینا، دین کی ایک ایسی تعبیر ہے جسے یہ حضرات نہ تو
قرآن و سنت میں پا سکے ہیں اور نہ ہی سلف صالحین کے عمل میں۔

قطع نظر اس بات کے کہ "دین پر قائم رہنے" کے مفہوم میں اشارۃً، اقتضاءً یا دلالۃً دین کو قائم کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے یا نہیں
نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام، اور سلف صالحین کے طرز عمل سے اقامت دین کے مفہوم پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ آپ اس پہلو پر غور کریں کہ آخر دین
پر قائم رہنے" کے مفہوم پر اصرار یا اس کے "قائم کرنے" کے مفہوم کی نفی کرنے کا حقیقی مطلب کیا ہے؟ اقامت دین کی اصطلاح کے ان دونوں ترجموں میں
وہ کیا معنوی فرق ہے جس کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے، ان حضرات کے نزدیک، سارے دین کی تعبیر ہی غلط ہو گئی ہے؟

"دین پر قائم رہنے" کے جس نظریہ کی تبلیغ کی جا رہی ہے اس سے پہلی بات جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دین کے حق میں حالات خواہ کتنے
ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں امت مسلمہ خواہ طاغوت کے پنجہ میں ہو یا بدعات کے بھنور میں، ایک فرد کی صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ دین کے جس حصہ پر
وہ بآسانی عمل کر سکتا ہے، اسی پر عمل کرتا چلا جائے، دین کے جو حصے ماحول کے آہنی شکنجہ سے بچ گئے ہیں، بس انہی پر قناعت کر لی جائے لیکن دین
کے جن اجزاء پر عمل کرنا دشوار تر بنا دیا گیا ہے اور جن پر عمل کرنے کے لئے ماحول کا جس طرح مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس کے لئے ہم مکلف نہیں۔ حالات
کے بدلنے کے لئے عملی جدوجہد ایک ضمنی اور اضافی تقاضا ہے، اس میں الجھنے سے خدا کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے والے اہم تقاضوں کو پورا
نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ان حضرات کا خیال ہے کہ دین کا اصل تقاضا صرف یہ ہے کہ انسان اپنا تعلق اپنے رب کے ساتھ مضبوط کرنے کے لئے "اصل
دین" ——— یعنی ایمانیات اور فرائض عبادت پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو، رہے دین کے باقی اجزاء تو یہ اصل دین نہیں بلکہ فروعات ہیں، ان
فروعات پر عمل کرنے اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے منظم اجتماعی جدوجہد کرنا ایک ضمنی اور ثانوی کام ہے اگر اس کی طرف توجہ کی گئی تو دین
کی "اصل" نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی۔

اس کے برعکس دین کے "قائم کرنے" کے مفہوم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دین مغلوب ہو چکا ہو، ملت کا شیرازہ بکھر چکا ہو اور
امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کا اجتماعی نظام بھی موجود نہ ہو، تو ایسے حالات میں ہر فرد ملت کا فرض ہے کہ دین کو غالب کرنے
امت کے شیرازہ کو دین ہی کی بنیاد پر منظم کرنے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک اجتماعی

ادارے کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہو جائے۔ اس جدوجہد میں اپنا سب کچھ لگا دے اگر اس فریضہ کی ادائیگی سے غفلت برتے گا اور ماحول سے جیسا کچھ بھی وہ ہے مصالحت کر کے مطمئن زندگی بسر کریگا — نہ اس کی نماز نتیجہ خیز ثابت ہوگی اور نہ اوراد اور وظائف اس کے کسی کام آسکیں گے۔

دین پر "قائم رہنے" کے اس تصور سے دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ اس سے خود دین ہی کا دائرہ سکڑ کر اور سمٹ کر انسان کی انفرادی زندگی کے ایک مخصوص گوشے میں محدود ہو جاتا ہے، وہی کچھ اہم اور اہم تر ہے جو ایک فرد کی زندگی کے انفرادی پہلو سے تعلق رکھتا ہے اور یہی دین کی اصل ہے — رہے زندگی کے اجتماعی پہلو، تو ان کا تعلق دین کے ساتھ بنیادی نہیں بلکہ ضمنی ہے یعنی انفرادی زندگی میں چند فرائض کی کما حقہٗ پابندی کر لیجئے کچھ نوافل اور اوراد کی مقدار میں اضافہ کر لیجئے، اپنے اٹھنے بیٹھنے، چال ڈھال اور لباس وغیرہ میں ایک مخصوص رنگ پیدا کر لیجئے، دین کا بنیادی اصلی تقاضا بھی پورا ہو جائے گا اور اللہ میاں بھی راضی ہو جائیں گے۔ لیکن اگر زندگی کے اجتماعی معاملات میں دین کو جاری اور نافذ کرنے کی کوشش کو اسے سمجھ کر سر انجام دیا گیا تو اس سے ایک "زمینی نتیجہ" تو ممکن ہے حاصل ہو جائے مگر اس سے خدا کی رضا حاصل نہیں ہوگی کیونکہ دین "قائم کرنے" کی نئی تعبیر نے سرے سے اس مقصد ہی کو گم کر دیا ہے۔

لیکن دین کو "قائم کرنے" کے تصور میں یہ بات شامل ہے کہ خدا کی رضا حاصل کرنے کا واحد راستہ ہی یہ ہے کہ خدا کے دین کو غالب کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش میں اپنے تن، من اور دھن کی ساری متاع لٹا دی جائے، خواہ کوئی "زمینی نتیجہ" حاصل ہو یا نہ ہو لیکن خدا کی رضا کے حصول کی یہی اور بس یہی راہ ہے اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں۔ خود نماز، روزہ اور چند فرائض کی مقبولیت کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ دین کو زندگی کے معاملات پر حکمران بنانے کی جدوجہد میں حصہ لیا جائے جو دل خدا کے دین کو مغلوب دیکھ کر اس کے غلبہ کیلئے تڑپنا نہیں جانتا وہ ایمانی غیرت سے خالی ہے۔ خدا کی حدود کو پامال ہوتا دیکھ کر جس پیشانی پر شکن نہیں پڑتی تو اس کے سجدے اور ریاضت و عبادت بے روح ہیں۔

دین پر "قائم رہنے" کے اس نرالے تصور سے تیسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ باطل نظام کے زیر سایہ ایک پُر امن، دیانتدار، متدین اور تقویٰ اور خشیت کی علمبردار رعایا بن کر زندگی بسر کرنے سے "اصل دین" کو ہرگز کہیں خراش بھی محسوس نہیں ہوتی، خدا اور بندے کا تعلق مضبوط ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر دین کے "قائم کرنے" کی جدوجہد کو دین کا اہم تقاضا قرار دیا جائے تو پوری زندگی نظام باطل کے خلاف ایک بغاوت کا اعلان بن کر رہ جاتی ہے۔

دین پر "قائم رہنے" کی اس راہبانہ تعبیر سے جو سچی بات جو عیاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ماننے کے ساتھ ہی اہل دین کا کشمکش حیات کے ہر میدان سے پسپائی اختیار کر لینا اور پھر ہر پسپائی پر قناعت کر لینا اور مزید پسپائی کیلئے اپنے آپ کو پہلے ہی سے تیار رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ قوتِ مدافعت سرد پڑ جاتی ہے، آگے بڑھنے اور نئے نئے میدان مسخر کرنے کی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں، وقت کا اقتدار اگر ان کی معاشرت بگاڑنے کے لئے عائلی قانون نافذ کرے تو وہ اسے گوارا کر لیتے ہیں، اس قانون کو بدلنے کی کوشش کرنا، اس کے خلاف اشتہار اور پوسٹر شائع کرنا، جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام کرنا، یہ ساری کی ساری سرگرمیاں تکلیف مالایطاق کی تعریف میں آتی ہیں ان پر اصرار کرنا دین کی ایک غلط تعبیر ہوگی۔

لیکن "دین کو قائم کرنے" کی جب بھی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت دین ایک تحریک کی شکل اختیار کرے گا۔ اس کے اندر پھیلاؤ بھی ہوگا اور قوتِ توسیع بھی، اس کے اندر دفاع کی طاقت بھی ہوگی اور اقدام کا حوصلہ بھی اس تحریک کا ہر کارکن اپنی اور اپنے ماحول کی ایک ایک برائی سے برسرِ پیکار ہوگا۔ گھروں، کوچہ اور بازاروں، عدالتوں اور ایوانوں میں، زندگی کے ہر مقام پر خیر و شر کی ایک کشمکش برپا ہو جائے گی۔ گویا انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پورا میدان ایک میدان جنگ بن جائے گا، جس میں حق اور باطل، معروف اور منکر اور سنت اور بدعت باہم ٹکرا رہی ہوں گی۔ نیکی اور بدی کی اس کشمکش کے برپا ہو جانے کے بعد کوئی فرد ملت بھی خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا۔ ہر شخص کو اپنی استطاعت کے مطابق، اس کشمکش میں ہر حال حصہ ادا کرنا

ں اگر کوئی شخص اس کشمکش میں حصہ نہیں لیتا یا نہیں لینا چاہتا تو وہ یہ بات اپنے ذہن میں تازہ رکھے کہ آخرت ——— میں دین کی کوئی دوسری "اصل"
فائدہ نہ پہونچا سکے گی۔

دین پر قائم رہنے" کی اس خانقاہی تعبیر کے مان لینے کے بعد آپ اپنے آپ کو اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت اور تجدید و احیائے دین سے
ہوا محسوس کریں گے ۔ آپ حضرت حسینؓ کے اقدام کی وجہ نہ سمجھ سکیں گے ، آپ کے لئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی نا قابلِ فہم ہو کر رہ جائے گی ۔
یہؒ کی زیرِ زمین تحریکِ انقلاب قیادت آپ کے ذہنی سانچے میں جگہ نہ پا سکے گی ، حضرت ابراہیم بن میمون کی شہادت کے راز کو پانا آپ کے لئے مشکل ہو
۔ امام ابن تیمیہؒ ، محمد بن عبدالوہابؒ اور سید احمد بریلویؒ جیسے مصلحین اور مجددین امت کے سارے کارنامے معترض کر رہ جائیں گے ۔

لیکن اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ "دین کو قائم کرنا" بھی فرض ہے اور امت مسلمہ کے سارے رہنماؤں نے اسے ایک اہم فرض ہی سمجھا ہے ، بزرگان دین میں سے
ـنے اپنے اپنے حالات کے مطابق اس فرض کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے تو آپ کو یہ محسوس کر کے اطمینان ہوگا کہ جس راہ پر آپ
ہم میں یہ وہی راہ ہے جس پر اللہ کے برگزیدہ انبیاء چلتے رہے ہیں یہ وہی راہ ہے جو ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے متعین فرمائی
ی راہ پر صحابہ کرام کے مقدس نقوش پا کی زیارت ہوتی ہے، اسی پر امام ابوحنیفہ ، امام مالک ، امام احمد بن حنبل ، امام شافعی ، امام ابن تیمیہ ، مجدد الف
ہ شاہ ولی اللہ اور دوسرے بے شمار جلیل القدر بزرگان دین چلتے رہے ہیں ، اسی راہ میں کہیں "حرا" ہے تو کہیں "شعب ابی طالب" اور "غار ثور"
مات و آثار بھی ہیں ، اگر کہیں "بدر و حنین" ہیں تو کہیں "حدیبیہ" اور "فتح مکہ" کی منزلیں بھی آجاتی ہیں ، اسی راہ پر چلتے ہوئے اگر کہیں حسینؓ نظر
ی تو ان کے خون سے "کربلاؤں" کے کئی میدان بھی رنگین دکھائی دیتے ہیں ۔ یہ راہ اقامت دین ہی کی راہ ہے اور یہ ساری منزلیں اقامت دین
منزلیں ہیں ، ان منزلوں پر حق پرستوں کے کئی قافلے گذر چکے ہیں اور نجانے کتنے اور گذریں گے ۔

اقامت دین کے اس تصور کو قبول کر لینے کے بعد ایمان و یقین کی ایک حقیقی حلاوت محسوس ہوتی ہے ، اس سے توحید اور آخرت کے اسرار سے پردہ
ٹھ جاتا ہے ، اس سے رسالت کی حقیقی عظمت کا شعور ابھرتا ہے اور اقامتِ دین کے اسی تصور سے "توکل" اور "تقدیر" کے معنی سمجھ میں آتے ہیں اور اسی سے
ان کے مقامات کا صحیح و واقعی ادراک نصیب ہوتا ہے ۔

ہمارے یہ بزرگانِ دین جب اقامت دین کے اس نصب العین پر حملہ کرتے ہیں تو ان کا پہلا حملہ خود تصورِ دین پر ہوتا ہے ، ان کے نزدیک دین صرف
یات اور فرائض عبادات ہی کا مجموعہ ہے ، سورۂ شوریٰ کی جس آیت میں خدا کے ان جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کو "اقیموا الدین" کا جو حکم دیا گیا ہے ۔
حکم سے بھی یہ حضرات شریعت کے تفصیلی احکام کو خارج تسلیم کرتے ہیں ، اس لئے دین کے بنیادی عقائد اور فرائض کے ماسوا جو کچھ بھی ہے ، اس کی اقامت
کلیف سے وہ امت اور افراد امت کو بری قرار دیتے ہیں ۔

یہ حضرات اس پہلو پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ قرآن میں اہل کتاب کو توریت ، انجیل اور قرآن کی اقامت کا جو حکم دیا گیا ہے تو کیا
، سے بھی دین کے صرف بنیادی عقائد اور فرائض پر "قائم رہنے" کا مفہوم ہی مراد ہے ؟ جیسا کہ فرمایا گیا ۔

قل یا اھل الکتاب لستم علی شیءٍ حتیٰ تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم[1] (المائدہ ۷ رکوع ۱۰)

کہہ دے ! اے اہل کتاب تم کسی راہ پر نہیں جب تک کہ نہ قائم کرو توریت اور انجیل کو اور جو تم پر اترا تمہارے رب کی طرف سے ۔

(ترجمہ از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

---

[1] اس آیت کی مفصل تشریح کیلئے ملاحظہ ہو ۱ ۔ ترجمان القرآن جنوری ۶۵ء ۔ ۲ ۔ زندگی ماہ رمضان شعبان ۸۴ھ

اس کے علاوہ اقامت دین کے مقصد پر اعتراض کرنے والے ان قابلِ احترام بزرگوں نے اقامت دین کی اصطلاح کے اس ترجمہ کو بھی ہدف بنایا بنایا ہے، جو جماعت کے رہنما علماء نے کیا ہے۔ اُن کے نزدیک اس کا ترجمہ "دین قائم کرو" نہیں بلکہ "دین پر قائم رہو" ہے۔ حالانکہ دین پر قائم رہنے کا ترجمہ اردو کے کسی بھی قابلِ ذکر مفسر نے نہیں کیا۔ مثلاً اسی آیت پر غور فرمائیں جو اوپر درج ہے، اس میں توریت، انجیل اور قرآن کی اقامت کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر، شیخ الہند اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ نے "قائم کرو" کیا ہے، اس کے علاوہ بعض مترجمین نے اقامت کا ترجمہ "قائم رکھنا" بھی کیا ہے۔ مگر کسی بھی بزرگ نے "قائم رہنے" کا ترجمہ اختیار نہیں کیا۔

اگر اقامت دین کا مفہوم "دین پر قائم رہنا" تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے کچھ زیادہ معنوی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ خود ان کے اسی ترجمہ کے مفہوم میں "دین کو قائم کرنے" کا مفہوم شامل ہے کیونکہ جس طرح "دین پر قائم رہے" اور اسے "قائم رکھے" بغیر دین "قائم کرنا" ایک فعل عبث ہے، بالکل اسی طرح "دین قائم کرنے" کے ارادے اور نیت کے بغیر دین پر "قائم رہنے" کا دعویٰ کرنا فریب نفس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

جماعت اسلامی نے اپنے لٹریچر میں اپنے نصب العین کے لئے صرف اقامت دین ہی کی اصطلاح استعمال نہیں کی بلکہ اس کے مترادف کئی اور اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں مثلاً ان میں سے ایک اصطلاح "شہادتِ حق" ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے :-

وکذٰلک جعلناکم امۃً وّسطاً لتکونوا شہداءَ علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیداً (بقرہ)

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔

یا ایہا الذین اٰمنوا کونوا قوامین للّٰہ شہداءَ بالقسط (المائدہ - ۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا کی خاطر اٹھنے والے اور ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے ہو۔

ن دونوں آیات میں جس "شہادت" کا ذکر ہے وہ صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی مطلوب ہے خاص طور سے آخری آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :-

"اس سے پہلی آیت میں مومنین کو حق تعالیٰ کے احسانات اور اپنا عہد و پیمان یاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہاں بتا دیا کہ صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ عملی رنگ میں ان سے اس کا ثبوت مطلوب ہے۔ اس آیت میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے، کہ اگر تم نے خدا کے بے شمار احسانات اور اپنے عہد و اقرار کو بھلا نہیں دیا تو لازم ہے کہ اس محسن حقیقی کے حقوق ادا کرنے میں بھی پوری جدوجہد کرو۔ چنانچہ "قوامین للّٰہ" میں حقوق اللہ کی، اور "شہداء بالقسط" میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے"

(حاشیہ مولانا شبیر احمد عثمانی)

ہ طرح اقامت دین کے مفہوم کو اظہار دین، غلبۂ دین یعنی حکومت الٰہیہ جیسی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

ھو الذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ و دین الحق لیظہرہٗ علی الدین کلہٖ ولو کرہ المشرکون ط

وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول راہ کی سوجھ دے کر اور سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے اور پڑے بُرا مانیں شرک کرنے والے۔ (ترجمہ از شیخ الہند)

رت شاہ ولی اللہ علیہ رحمۃ اس آیت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

"جان لینا چاہیئے کہ اس آیت کے سلسلے میں صحیح توجیہ یہ ہے کہ دین حق کو جس قدر بھی غلبہ حاصل ہوا وہ سب لیظہرہ میں داخل

ہے اور سب سے بڑا غلبہ جو کسریٰ اور قیصر کی حکومتوں کو زیر و زبر کر دینے جانے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس لئے ظہرۃ کے اندر یہ غلبہ اولیٰ داخل ہے اس شرف کے حامل خلفاء راشدین تھے اور ان حضرات کی مساعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقتضاء تھیں اور اس کے عملی پروگرام میں شامل" (ازالۃ الخفاء مقصد اول صـ۹۳ بحوالہ زندگی رامپور)

غلبۂ دین اور نظام عدل کا قیام انبیاء کی بعثت کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے :- جیسے فرمایا

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰتِ وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط . . .	ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر جس مقصد کے لئے بھیجا ہے اور جس غرض کے لئے ان پر کتابیں نازل کیں اور ان کو منابطۂ حق کی میزان عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں ۔

اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دعوت حق کا منشا انسانی زندگی کو نظام قسط کے سانچے میں ڈھالنا اور اس میں عملاً عدل اور توازن پیدا کرنا ہے اسی آیت میں آگے " انزل الحدید" کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نظام حق کی اقامت، اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کے لئے آہنی اسلحہ کا استعمال یعنی سیاسی اور فوجی قوت بھی ناگزیر ہے،

اسی طرح اقامت دین کے مفہوم کو جماعت نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر محض اخلاقی تبلیغ و تلقین کا فریضہ نہیں کہ صرف وعظ گوئی اور درس و تدریس کے مشاغل سے پیدا ہو سکے ۔ بلکہ یہ قرآن کی اپنی مخصوص اصطلاح ہے جس سے سارے احکام شریعت کی ترویج اور تنفیذ کی جدوجہد مراد ہے۔ اس کی تشریح میں امام رازی فرماتے ہیں کہ :-

" معروف کی اصل اللہ پر ایمان ہے اور منکر کی اصل اللہ کا انکار ہے "

امام غزالی فرماتے ہیں کہ جو اس فریضہ کو ترک کر دے وہ " دائرہ مومنین " سے خارج ہے :-

" اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ پس جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ترک کر دے وہ ان مومنین سے خارج ہے جن کا اس آیت (توبہ ۷۱) میں بیان ہوا ہے"

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فریضہ کی ادائیگی کی جن الفاظ میں تاکید فرمائی ہے، ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر محض اخلاق کی تبلیغ و تلقین تک محدود نہیں۔ آپ فرماتے ہیں :-

- "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یا تو تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرو گے یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب نازل فرمائے، پھر تم دعا مانگو گے اور تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی" (ریاض الصالحین)
- " مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس امت میں بھی اپنا کوئی نبی بھیجا ہے تو اس امت میں ایسے مددگار اور ساتھی ضرور رہے ہیں جو اس کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرتے اور اس کے احکام کی اتباع کرتے ۔ پھر ان کے ایسے برے جانشین پیدا ہونے لگے، جو باتیں وہ کرتے جن پر خود عمل نہیں کرتے اور کام وہ کرتے جن کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا پس جس نے ان سے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے، اور جس نے ان سے زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے ان سے اپنے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے اگر یہ بھی نہیں ہے تو ایمان رائی کے ذرے کے برابر بھی نہیں "

● — "تمہارے اوپر کچھ حاکم امرا مقرر کیے جائیں گے لہٰذا تم ان کی بعض باتوں کو پہچانتے ہوگے اور بعض باتوں کو نہ پہچانتے ہوگے۔ پس جس نے ان کی باتوں سے کراہت ظاہر کی وہ بری ہوگیا اور جس نے انکار کیا وہ سالم رہا مگر اس کے جس نے رضامندی ظاہر کی اور اتباع کیا صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ کیا ہم ان سے جہاد نہ کریں؟ تو آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ نماز قائم کرتے رہیں"

(ریاض الصالحین)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے قومی بگاڑ اور تباہی کے ذکر کے بعد امت کو ہدایت کی ہے کہ

"ہاں! قسم خدا کی تم ضرور معروف کا حکم دو اور ضرور منکر سے روکو ظالم کا ہاتھ لازماً پکڑلو اور اس کو ضرور حق کی طرف پھیر دو"

ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بعض لوگوں کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا:- یا ایہا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرّکم من ضل اذا اھتدیتم۔ یعنی اے ایمان والو اپنے نفسوں کو لازم پکڑو جو شخص گمراہ ہوگیا تم کو ضرر نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ تم خود ہدایت پر ہو" اس پر انہوں نے فرمایا:-

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت کے بارے میں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ ظالم کو دیکھیں کہ وہ ظلم کر رہا ہے اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ حق تعالیٰ ان کو اپنے عذاب میں گرفتار کر دے" (ریاض الصالحین)

ایک موقعہ پر آپ نے خوش خبری دی ہے کہ اس امت کے دور آخر میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں گے اور دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کرتے رہیں گے!

"اس امت کے آخر میں ایسے لوگ ہیں، جن کو اس امت کے اگلوں کا سا اجر ملے گا اور وہ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے، اور فتنوں کا مقابلہ کریں گے۔

یہ ہے جماعت اسلامی کا نصب العین اقامت دین اور یہی اس کا نصب العین بھی ہے اسی فریضہ کی ادائیگی کا حکم سارے انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا اور یہی وہ نصب العین ہے جس کے بارے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس وقت فرمایا ہے جب کہ مظلوم اور بے سہارا حق پرستوں کی ایک نہایت ہی مختصر جماعت آپ کے ساتھ تھی کہ:-

"بس وہ ایک کلمہ ہے، اسے اگر قبول کر کے میرے ساتھ آؤ تو تم اس کے بل پر سارے عرب کو ہاتھ میں لوگے اور اس کے اثر سے عجم تمہارے زیر نگیں ہوگا"

اقامت دین کی یہی انقلابی دعوت تھی کہ جب مکہ میں گونجی تو جاہلیت کا پورا ایوان لرز اٹھا، مخالفتوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا، ہر گھر اور ہر قبیلے میں ایک کشمکش برپا ہوگئی، بھائی بھائی سے کٹ رہا ہے، بیٹا باپ کو چھوڑ رہا ہے، ماں اپنے لخت جگر کو الوداع کہہ رہی ہے۔ ظلم کے الاؤ بھڑکائے گئے حق پرستوں کی بیٹیوں اور بیٹوں کو داغا گیا۔ استبداد نے بے گناہوں کے خون کو چوسا اور پیا مگر پھر بھی اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اس کا غضب اور بپھرا حضور کے چچا پر دباؤ ڈالا گیا کہ کسی طرح اقامت دین کے فریضہ کی ادائیگی سے آپ کو روک دے۔ چچا بھی حالات سے گہرا اثر قبول کئے ہوئے تھے، حضورؐ کے پاس گئے اور اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ اگرچہ آپ نے بارہا پڑھا اور سنا ہوگا لیکن ایک بار پھر پڑھ کے دیکھ لیجئے، اس سے اقامت دین کا مفہوم اور روشن ہو جائے گا۔

"چچا جان خدا کی قسم یہ لوگ اگر میرے داہنے ہاتھ پہ سورج اور بائیں ہاتھ پہ چاند رکھ کر چاہیں کہ اس مشن کو چھوڑ دوں تو میں

اس سے باز نہیں آسکتا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے اور یا میں اسی جدوجہد میں ختم ہو جاؤں۔"

حکومت الٰہیہ کے قیام کی خبر اور اقامت دین کی کشمکش کا ذکر تو بکثرت روایات میں پایا جاتا ہے لیکن ذیل کی حدیث میں آپ اس کا پورا نقشہ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ حضرت خبابؓ بن الارت فرماتے ہیں:-

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے مصائب) کی شکایت کی جب کہ آپ کعبہ کے سائے میں اپنی ایک چادر سے تکیہ لگا کر لیٹے ہوئے تھے ہم نے کہا کیا آپ ہمارے لئے (اب بھی) اللہ سے مدد نہ مانگیں گے۔ کیا آپ ہمارے لئے دعا نہ کریں گے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تم سے پہلے کے لوگوں میں مرد مومن کا حال یہ تھا کہ اس کے لئے زمین کا گڑھا کھود کر اس میں اسے داخل کر دیا جاتا، پھر آرہ لے کر اس کے سر پر رکھا جاتا اور اسے دو ٹکڑوں میں چیر دیا جاتا لیکن یہ ظلم بھی اس کو اس کے دین سے نہ پھیرتا اور کسی کے جسم میں لوہے کی کنگھیاں گڑو کے اس کی ہڈی اور پٹھے تک کھرچ دیا جاتا لیکن یہ سزا بھی اس کو اس کے دین سے نہ پھیرتی! خدا کی قسم! اسلام پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا یا یہ کہ اس کو اپنی بھیڑ بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کا خوف ہو"

آپ کے ان ارشادات کا صاف مقصد یہی تھا اور یہی مقصد سننے والوں نے سمجھا کہ آپ جس دین کی دعوت دے رہے ہیں اس کا ظہور غلبہ حکومت کی صورت میں ہوگا۔

لیکن قرآن و سنت کی ان واضح تصریحات کے باوجود اقامت دین کے اس متفق علیہ نصب العین کو بھی اعتراض کا ہدف بنایا جا رہا ہے حالانکہ ابھی معترضین میں اکثر اپنی عمر کا ایک نہایت قیمتی حصہ اسی مقصد کی تبلیغ اور اشاعت میں صرف کر چکے ہیں لیکن اب اس نصب العین کی اس تعبیر میں ایک ایسی غلطی نظر آتی ہے کہ جس سے ان حضرات کے نزدیک دین کا حلیہ بگاڑ کر رہ گیا ہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان بزرگوں کی اس حیرت انگیز جسارت کے حقیقی اسباب کیا ہیں؟

متین عسکری

فلاحی مملکت کا اسلامی تصور

اصل مضمون پر گفتگو کرنے سے پہلے آیئے لفظ "فلاح" کو سمجھ لیں۔ اصطلاح عرف عام میں دنیاوی کامرانی اور مصائب و آلام سے نجات کے بارے
بولا جاتا ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے وہ شخص فلاح یافتہ ہے جو رنج و غم سے بے پروا، برائی بھلائی، نیکی بدی اور خیر و شر کے مفہوم سے ناآشنا، ایک کثیر دولت
الک، زندگی کی تمام مسرتوں اور نفس کی تمام لذتوں سے متمتع ہو ـــــ لیکن اسلام کے مکتبۂ فکر میں یہ لفظ بالکل علیحدہ مفہوم رکھتا ہے۔ اس کے
نی اسلام کے بنیادی حقائق کی آمیزش سے اجاگر ہوتے ہیں۔

اسلام اس دنیا کو دارالامتحان اور انسان کی اس کائناتی زندگی کو غیر مستقل و ناممکن قرار دیتا ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں مادی اسباب و
ائل سے بہرہ مند اور لذت و عیش سے ہمکنار ہیں، ضروری نہیں کہ وہ فلاح یافتہ بھی ہیں۔ بلکہ وہ قادر مطلق کی طرف سے سخت امتحان میں مبتلا ہیں
الک حقیقی یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون لوگ ایسے ہیں جو اس دنیا میں ہر طرح کا عیش و آرام پانے کے باوجود میری اطاعت کا دم بھرتے
یرے اتارے ہوئے قانون کو مانتے اور میرے بھیجے ہوئے نبی کی سنت پر چلتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ اس دنیا میں مادی اسباب کی تنگی، مصیبت،
بت اور کشمکش سے دوچار ہیں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ لازماً ناکام و نامراد بھی ہیں بلکہ وہ حاکم مطلق کی طرف سے ایک آزمائش میں مبتلا ہیں،
وہ آزمانا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون لوگ ایسے ہیں جو واقعی میرے تابعدار اور اطاعت گزار بندے ہیں، اور رنج و راحت ہر حال میں میری رضا
قدم رکھنے والے ہیں ـــــ جو لوگ امتحان کی ان دونوں صورتوں میں کامیاب رہتے ہیں، اسلام ان کے متعلق یہ خوشخبری سناتا ہے کہ بے شک
لوگ فلاح یافتہ ہیں۔ اور اس عارضی زندگی کے بعد وہ ایک مستقل پائیدار اور لازوال زندگی سے بہرہ ور ہوں گے، جہاں کبھی نہ ختم ہونے والی
تیں اور مسرتیں میسر آئیں گی۔

اس وضاحت کے بعد آیئے فلاحی مملکت کے مادی تصور پر بھی نظر ڈال لیں تاکہ اصل مضمون اور نکھر کر سامنے آ جائے۔

حی مملکت کا مادی تصور

جس طرح مادی نقطۂ نظر سے انفرادی فلاح کا مفہوم یہ ہے کہ فرد دکھ اور تکلیف سے نا ہر طرح کی دنیاوی
خوش حالی و کامرانی سے لطف یاب ہو، بالکل اسی طرح قومی فلاح کا مفہوم بھی ٹھہرایا ہے کہ عوام و حلال
ناجائز کی فرسودہ منطق کو چھوڑ کر خالص مادی منافع کی بنیاد پر پوری کی پوری قوم حرکت کرے اور کاروبار دانائی ریاست ایک فلاحی مملکت کے
کے مطابق خطوط پر چلیں، جن سے ایک ہیبت شان و شوکت وجود میں آ جائے۔ فلک بوس عمارتیں، وسیع و عریض سکریٹریٹ جدید سامان آرائش سے
تہ قیام گاہیں، کشادہ سڑکیں، باغات، ایٹمی آبدوزیں، دیوپیکر سمندری جہاز، تیز رفتار طیارے، آرام دہ ریلیں، جدید اسلحہ سے لیس ہوائی،
و بحری افواج اور ایک محدود پیمانے پر عوام کے لئے معاشی انصاف کا قیام ـــــ یہ چیزیں ایک فرض شناس، مادہ پرست فلاحی مملکت کا
ٹھہرتی ہیں۔ عوام کی اصلاح و تربیت کی بجائے انہیں نفسانی خواہشات کی تکمیل کی ہر ممکن چھوٹ دی جاتی ہے، اگر عوام میں کوئی سخت جان عنصر

جو وہ جو اصلاح کا خواہاں اور ہر بُرائی کے آڑے آنے والا ہو تو حکومت کی ساری مشینری اسے دبانے اور مٹانے پر تل جاتی ہے حکومت اس سرپرستی میں سود، قمار بازی، فحاشی، بدکاری اور اس قسم کی تمام پسندیدہ برائیوں کو فروغ دیتی ہے جس سے عوام احساس و شعور سے ہو کر ایک وقتی حظ اٹھا سکیں۔

یہ حکومت بعض ناپسندیدہ برائیوں مثلاً رشوت، اسمگلنگ، اشیاء کی گرانی، ملاوٹ اور غبن وغیرہ کو روکنے کی بھی کوشش کرتی ہے برائیوں کے یہ پودے اپنے حق میں نہایت سازگار رفضا کو موجود پاکر ہر آن اُبھرتے رہتے ہیں اور ان کی ذراسی چھانٹ انہیں اور پھل لانے کا دیتی رہتی ہے۔

قصہ مختصر فلاحی مملکت کا مادی تصور ان مذکورہ شکلوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

حی مملکت کا اسلامی تصور

اب آیئے اپنے اصل موضوع "فلاحی مملکت کے اسلامی تصور" کی طرف رجوع کریں جس طرح اسلام انفرادی فلاح کا یہ معیار قائم کرتا ہے کہ "ضرور وہی شخص فلاح یافتہ ہے جس نے (ہر حال میں) اپنے نفس کو پاکیزہ ما۔ خدا کی یاد کو (ہر لمحہ) اپنے دل میں جگہ دی اور اس کی بندگی اختیار کی" بالکل اسی طرح وہ ایک قوم کی فلاح کا مفہوم بھی یہ ٹھہراتا ہے کہ وہ اعی طور پر انہی لائنوں پر حرکت کرے، عمال حکومت خدا کی خشیت اور نزاکت فرض کے احساس کو اپنے دل میں جاگزیں کرکے کاروبار حکومت چلائیں حکومت کا بنیادی مقصد لوگوں کو معاملات نفس میں چھوٹ دینا نہیں بلکہ انہیں خدا کے قانون کا سچا پیروکار بنانا ہو جس کا کام اصلاح پسند طبقہ دبانا نہیں بلکہ اسے ابھارنا اور پھیلانا ہو۔ جس کی عملداری میں برائی کو سر چھپانے کی جگہ نہ ملے، جس کی نگرانی میں کوئی ایسا کام نہ پھلے پھولے اسلام کے نظریۂ فلاح کے منافی ہو، جو حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق لوگوں میں سماجی مساوات اور معاشی انصاف قائم کرسکے جس کے زیر یہ لوگ اپنے آپ کو مامون و محفوظ سمجھتے ہیں۔ جس کے کرتا دھرتا سرتاپا اسلامی نظریۂ حیات کے علمبردار ہوں، جن کی رہائش گاہیں عوام کی رہائش ہوں سے ممتاز نہ ہوں جن کے لباس عوام کے لباس سے مختلف نہ ہوں اور جو دل سے اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھیں —— بلاشبہ ایسی ہی حکومت مملکت اسلام کی نظر میں فلاح یافتہ کہلانے کی مستحق ہے۔

یہاں یہ وضاحت کردینا انتہائی ضروری ہے کہ ایسی خدا پرست حکومت مادی اسباب و وسائل اور جدید عصری تحقیقات سے پہلو تہی نہیں رتی بلکہ انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتی اور عوام کے لئے کار آمد و مفید بناتی ہے۔ اسلام بنی نوع انسان کو مخاطب کرکے بتا ہے کہ خدائے واحد نے زمین و آسمان کی ہر شے تمہارے لئے مسخر کردی ہے اب اگر تم ان کو اللہ کے مصرف میں لاؤ گے تو دنیا و آخرت کا راستہ اپنے لئے برکت وہ کرلوگے اور اگر شیطان کی پیروی میں ان کا استعمال کروگے تو یہی چیزیں دنیا میں بھی تمہاری ذلت کا باعث ہوں گی اور آخرت میں بھی عذاب کی کھائی میں گرائیں گی۔

اسلامی فلاحی مملکت اس ہدایت کے عین مطابق اپنا نقشہ کار ترتیب دیتی ہے —— وہ اپنی فوج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس تو کرتی ہے لیکن اس لئے نہیں وہ اپنے ہمسایہ ممالک پر اپنی فوجی برتری کی محض دھاک بٹھانے کے لئے آئے دن اپنی طاقت کے زعم میں اُن سے چھیڑ خانی کرتی رہے بلکہ وہ ملک کی مدافعت، مظلوم کی حمایت، نیکی کی اشاعت اور امن کی بحالی کے لئے انہیں کام میں لاتی ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے مراکز، ریڈیو اور ٹیلیویژن اسٹیشن تو قائم کرتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ ان سے امن عالم کو خطرے میں ڈالے اور فحاشی و بدکاری کی تشہیر کرے، بلکہ وہ دنیا کو سلامتی کا راستہ دکھانے اور نیکی کی تبلیغ کرنے کے لئے ان کا استعمال کرتی ہے وہ عوام کی فلاح و بہبود کیلئے ان کا استعمال کرتی ہے، وہ عوام کیلئے کٹ وہ سڑکیں، باغات، ہموار

؎ اس دور میں رہنے سہنے، کھانے پینے اور دوسرے اسباب تمدن و تہذیب میں مساوات بہت دشوار ہے۔ (م۔ ق)

مکانات آرام دہ ریل گاڑیاں، بسیں، ہوائی جہاز، روزگار کی سہولتیں، تعلیم کے مواقع اور حق رائے دہی کی آزادی فراہم تو کرتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ سب کچھ پاکر خدا کے باغی و نافرمان بن جائیں ——— بلکہ اور زیادہ اُس کے مطیع و فرماں بردار بنیں۔ اس کی گوناگوں نعمتوں کے شکر گزار ہوں اور ہر آن ان کی پیشانیاں سرنگوں رہیں[1]۔ یعنی یہ مادی اسباب و ذرائع اسلامی مملکت میں عین مقصود نہیں بلکہ ایک آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے عوام کو انسانیت کا صحیح مشورہ دیتی اور نیابت خداوندی کا صحیح عرفان بخشتی اور انہیں فلاح و کامرانی کی حقیقی راہ پر ڈالتی اور قرآن کی زبان میں ——— واولٰئک ھم المفلحون

---

[1] قارئین کرام کو میرا یہ طرزِ تحریر کچھ عجیب سا محسوس ہوگا کہ دنیا کی کسی اسلامی حکومت میں بھی ان جدید مادی وسائل کو مندرجہ بالا مقصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن میں ایسے ایک امر واقعہ کے طور پر لکھ رہا ہوں، یہ تعجب درست ہے لیکن یاد رکھیئے کہ نام نہاد اسلامی کی بجائے جب خالص اسلامی نظریہ کی بنیاد پر کوئی حکومت استوار ہوگی اور اس کے چلانے والے سراپا اسلامی شریعت کے پیروکار ہونگے تو کام کا خاکہ اختلاف کے یہی ہوگا۔ جس کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: "اگر ہم ان لوگوں (یعنی اسلامی نظریۂ حیات کے علمبرداروں) کو زمین میں حکم و فرماں روائی دیں تو وہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام (واضح رہے کہ یہ صحت مند اسلامی معاشرے کے بنیادی لوازم ہیں) قائم کریں اور ان کی ساری طاقتیں بھلائی کو پھیلانے اور برائی کے مٹانے میں صرف ہوں گی۔ (الحج۔ ۴۱)

(ص ۳۴ کا بقیہ)

مینہ اور سرکار مدینہ کی یاد اور تصور ہی میں ابدی نیند سو گئے:

شاعر مرحوم حمید صدیقی مرحوم کی زندگی توکل و قناعت کی زندگی تھی، اصغر علی محمد علی کارخانہ عطر (لکھنؤ) سے آخر دم تک ملازمت کا تعلق رہا۔ حاجی اصطفا خاں مرحوم اُن کے قدردان اور مداح تھے۔ خوش نویسی اور خطاطی پیشے کے طور پر سیکھی تھی، شاعری میں جگر مرادآبادی سے متاثر بلکہ یوں کہئے اُن کے فیض یافتہ تھے، ترنم، انداز بیان یہاں تک کہ داڑھی اور چہرے مہرے میں جگر کا مثنیٰ دکھائی دیتے تھے، طبیعت میں اس درجہ تواضع و مسکنت اور مزاج میں اس قدر انکسار تھا جیسے اُنہیں اپنی شاعرانہ شہرت اور مقبولیت کی کچھ خبر ہی نہیں ہے! اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو منور و معطر اور اُن کی آخرت کو فوز و فلاح اور نجات و مغفرت سے ہمکنار بنائے۔ (آمین)

ماہرالقادری

ترے نام سے جس کو نسبت نہ ہوگی | وہ افسانہ ہوگا حقیقت نہ ہوگی
خزاں کے تصور میں اس طرح گم ہوں | بہار آئے گی مجھ کو وحشت نہ ہوگی
یہ روزِ ازل فیصلہ ہو چکا ہے | خوشی سازگارِ محبت نہ ہوگی[1]
خزاں ہے غنیمت بہار آ نہ جائے | نشیمن بنانے کی فرصت نہ ہوگی
بہت شوخ ہیں میری مشتاق نظریں | خطائیں کروں گا ندامت نہ ہوگی
خدا جانے کب تک مرے ناصحوں کو | خدا کی طرف سے ہدایت نہ ہوگی
سلامت رہے میری بزمِ تصور | وہ آئیں گے اور اُن کو زحمت نہ ہوگی

بہت کچھ ہے اُن کے ستم کا سہارا
کرم کی بھی شاید ضرورت نہ ہوگی

[1] یا — مسرت شریکِ محبت نہ ہوگی

ہماری نظر میں

فخرِ کونین (حصہ دوم) از:- محشر رسول نگری، ضخامت ۲۵۶ صفحات (مجلد، خوشنما سرورق)
ملنے کا پتہ:- میسرز پاکستان پریس، جناح روڈ، کوئٹہ

جناب محشر رسول نگری خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں، کئی سال سے اُن کے فکر و سخن کا موضوع "نعتِ رسولؐ" ہے اور اسی میں اُن کی تمام توانائیاں صرف ہو رہی ہیں، یہ وہ سعادت ہے جو دوسرے شاعروں کے لئے قابلِ رشک ہے!

محشر رسول نگری نے سیرتِ نبوی کو بہ طرزِ مسدس نظم کیا ہے، اُن کے مسدس (فخرِ کونین) کی پہلی جلد شائع ہو کر مقبول ہوئی، دوسری جلد کتابت و طباعت کے خاصے اہتمام کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے، جس پر جناب فرمان فتحپوری (ایم۔ اے) نے بلند پایہ دیباچہ تحریر کیا، اس دیباچہ کی ایک ایک سطر معلومات آفریں ہے۔

"فخرِ کونین" (حصہ دوم) میں سیرتِ نبی کے اہم واقعات خاصی تفصیل کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں، عقیدت و محبت کا دریا اس مسدس میں ہلکورے لے رہا ہے، اندازِ بیان شگفتہ، فکر سلجھی ہوئی اور تخیل پاکیزہ ہے۔

منتخب اشعار:-

ظلمت فروغ پا تی تھی لالہ کے داغ سے
بڑھتی تھی اور تیرگی دودِ چراغ سے
ہنگامۂ جہاں ہے رسالت مآب سے
قائم یہ سلسلہ ہے اسی آفتاب سے
گھر گھر ہے تذکرہ شہِ گردوں رکاب کا
آغاز ہو رہا ہے نئے انقلاب کا

ہر دورِ روزگار میں وحدت نشاں ہیں آپ
سچ پوچھئے تو خود ہی زمان و مکاں ہیں آپ
جانِ جہاں ہیں اور تب و تابِ جہاں ہیں آپ
نورِ چراغِ محفلِ روحانیاں ہیں آپ

اپنے امیر تا بہ قیامت حضورؐ ہیں
ہو کوئی دور مرکزِ ملت حضورؐ ہیں

ساقی کو اس سے کیا کوئی میخوار ہو نہ ہو — پروا نہیں گہر کو خریدار ہو نہ ہو

پہلے تو حق کے لشکرِ جرار بن گئے — سمٹے اگر تو بندۂ کرار بن گئے
طوفان کوئی اٹھا تو یہ کہسار بن گئے — آئی خزاں تو ابرِ گہر بار بن گئے
ان کے فسانے مشرق و مغرب کو یاد ہیں
یہ لوگ زندہ حجتِ فقر و جہاد ہیں

باطل کو ان کے ہاتھ سے حق نے کیا ذلیل — ہے ان کی حرب و ضرب کا مداح جبرئیل
ان کی جزا ہے کوثر و تسنیم و سلسبیل — ان کا کمال، فیضِ نبوت کی ہے دلیل
پرتو ہے سب میں آپ کے خلقِ عظیم کا
کیا زندہ معجزہ ہے رسولِ کریم کا

ہم جہاں میں بندۂ کامل حضورؐ ہیں — انسانیت کی آخری منزل حضورؐ ہیں
دولت کے واسطے نہ حکومت کے واسطے — اٹھی ہے تیغ حق کی حفاظت کے واسطے
ذوقِ نظر سے مرحلے الفت کے طے ہوئے — آوارہ تھے جو نغمے وہ پابندِ نے ہوئے
منظور تھی خدا کو حفاظت جو دین کی — کھینچیں ملائکہ نے طنابیں زمین کی

کچھ فصلِ گل سے کم نہیں دامانِ مے فروش — پیدا ہو کیوں نہ قلقلِ مینا سے دل میں جوش
وہ مستیٔ نگاہ وہ ترغیبِ نازِ نوش — ساقی کا جلوہ دیکھ کے اڑتے ہیں خود ہی ہوش
ہر رات مے کشوں کی شبِ ماہتاب ہے
ان کی نظر میں غم کا مداوا شراب ہے

دل تھا اسیرِ غم تو سلاسل تھیں پاؤں میں — آیا تھا بھاگ کر وہ ستاروں کی چھاؤں میں

ہر ملک اور قوم کے رہبر ہیں مصطفیٰؐ — شیرازہ بندِ اسود و احمر ہیں مصطفیٰؐ
ہر دورِ زندگی کے پیمبر ہیں مصطفیٰؐ — آئینہ صفات کا جوہر ہیں مصطفیٰؐ
رحمت بھی ان کی عام ہے بعثت بھی عام ہے
خیر الوریٰ کا فیضِ ہدایت بھی عام ہے

ہر نوع کے لئے ہیں نبی و شاہ و مجدد بہ　　　احمدؐ ہیں آسماں پہ، محمدؐ زمیں پہ

اقلیم کائنات کے سرور حضورؐ ہیں

کوئی جہاں ہو اُس کے پیمبر حضورؐ ہیں

نقشِ قدم ہیں آپ کے یوں کائنات میں　　　جیسے چراغ جلتے ہوں تاریک رات میں

قندیلِ حق ہے جس کا ضمیر اور کون ہے　　　جز مصطفےٰؐ سراجِ منیر اور کون ہے

دوسرا رُخ

یوں ظلمتیں نہ چھائی تھیں آفاق پہ کبھی　　　ڈستی تھی سانپ بن کے نہ یوں رہگذر کبھی　　　(ص ۱۷)

مصرعہ ثانی بھرتی کا ہے۔ "رہگذر کا سانپ بن کر ڈسنا" یہ اندازِ فکر و بیان وجدانِ صحیح کو کھٹکتا ہے!

انساں تھا خیر و شر کے دوراہے پہ نیم جاں　　　تاریکیاں عدم کی ڈراتی تھیں ہر زماں　　　(ص ۱۸)

دوسرا مصرعہ بہت کمزور ہے، ایک تو عدم کی تاریکیاں پھر ان کا ہر لمحہ ڈرانا، آخر یہ بات کیا ہوئی؟

دیکھے تو کوئی ذوقِ اطاعت کی انتہا　　　مزدور کے لباس میں ہیں خودستہ رضا　　　(ص ۴۶)

"خودستہ رضا" کتنی نامانوس ترکیب ہے!

خلقِ محمدیؐ میں کچھ ایسا کمال ہے　　　اس تیر سے قلوب کا بچنا محال ہے　　　(ص ۴۴)

خلق کے ساتھ "تیر" کا ذکر بے جوڑ سا ہے!

توحید سے عرب میں کوئی آشنا نہ تھا　　　حضرت سے پہلے کوئی یہاں باخدا نہ تھا

مقصودِ زندگی کا تعین ہوا نہ تھا　　　فکر و عمل کسی کا حقیقت نما نہ تھا　　　(ص ۵۵)

اس بند کے دوسرے مصرعہ میں جو بات کہی گئی ہے، وہ خلافِ واقعہ ہے، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں صدیوں تک عرب کے لوگ توحید آشنا اور باخدا رہے ہیں! چوتھے مصرعہ میں "حقیقت نما" قافیہ کی مجبوری کی نشان دہی کرتا ہے۔

ساتھی نبیؐ کے چین سے سوئے تمام رات　　　کفار اپنے بخت کو روئے تمام رات　　　(ص ۶۳)

مصرعہ ثانی جاندار نہیں ہے خاص طور سے "بخت" نے شعر کو کمزور بنا دیا۔

پروانے حق کے صبح دم آ بیٹھے پئے نماز　　　حضرت کی اقتدا میں ہوئے خم سرِ نیاز

"پروانے حق" کی جگہ "بندے خدا کے" ہوتا، تو شعر میں کتنی بے ساختگی پیدا ہو جاتی!

اُٹھی تو رخت زیست کے پرزے اُڑا گئی　　　جس دم گری تو کفر کے خرمن جلا گئی　　　(ص ۶۸)

یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تیغ کی تعریف میں ٹیپ کا بند ہے! جس میں آمد کے سوا اور کیا رکھا ہے!! اتنے کمزور اشعار اس مسدس میں دیکھ کر ذوقِ شاعرانہ کو تعجب ہوتا ہے۔

نوکروں کے ہاتھ سے اجل اس بدزباں کی تھی　　　دوزخ ہی جانتا ہے یہ مٹی کہاں کی تھی　　　(ص ۱۰)

مصرعہ اولیٰ بچگانہ ہے۔

بیٹی کوئی نہ باپ سے دولت کو پاسکی — اخلاقِ حق سے لیک نہ گھر اپنا سجا سکی (ص ۱۰۵)

اق سے گھر کو سجانا " یہ کہاں کی زبان اور طرزِ بیان ہے ! اس طرح لفظوں کے جوڑ دینے سے شعر تو بہرحال موزوں ہو جاتا ہے مگر
یہ شاعری .... !!

رکھتے تھے سب وہ حدِ نظر پر اٹھا کے پاؤں — جھکتے نہ تھے زمیں پہ اہلِ جفا کے پاؤں (ص ۱۳۳)

پاؤں کا مفہوم ابہام کی حد تک مبہم ہے ۔

یہ ایک بات چوٹ تھی تقدیس عشق پر — غیرت سے شعلہ بن گیا وہ مردِ دیدہ ور (ص ۱۹۱)

ت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب حدیبیہ سے مکہ گئے تھے اور قریش نے ان کو کعبہ کا طواف کرنے کی اجازت دی تھی، ان کی یہ بات
ق کی تقدیس پر نہیں غیرتِ عشق پر چوٹ تھی، یا یوں کہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت پر ایک طرح کی طنز تھی ۔
قدیس " کا یہاں استعمال بے محل ہے ۔

پھیلا عرب میں اور بھی اسلام کا اثر — ہونے لگیں اداتیں رسالت کی کارگر (ص ۲۱۱)

سالت کی اداتیں، پھر ان کا کارگر ہونا، عجیب سے عجیب تر !

کر دو نیچ کر ایک طرف تو رہے گا کیا — سمجھے گا کس طرح کوئی قرآں کا منتہا (ص ۲۲۵)

مدعا " کہنا تھا ۔ (جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے لگے، تو محشر صاحب کو چاہئے کہ نظرِ ثانی کر کے سست مصرعوں کو چست
بنا دیں اور بھرتی کے مصرعوں کو بدل ڈالیں)

محشر صاحب نے عرفی کی طرح مرحلۂ نعت کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں :-

نظروں سے چومتا ہوں مدینے کے بام و در — کرتا ہوں پھر ثنائے شہنشاہِ بحر و بر
دشوار ہے یہ مرحلۂ نعت کس قدر — میں چل رہا ہوں تیغ برہنہ کی دھار پر

سرمست ہوں اگرچہ فروغِ نشاط سے
رکھتا ہوں ایک ایک قدم احتیاط سے

بعض مقامات پر زورِ شاعری اپنے عروج کمال پر پہونچ گئی ہے، مثلاً :-

اس وقت تھا قریش سے کعبہ بھرا ہوا — ہر شخص دم بخود تھا حرم میں کھڑا ہوا
تھا ہیبتِ رسول سے ہر سر جھکا ہوا — ہر آدمی تھا خوف سے اک بت بنا ہوا

کوئی شک نہیں سیرتِ نبوی کو بطرز مسدس نظم کر کے جناب محشر رسول نگری نے اردو شاعری میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے، ان کی
یہ کتاب مسلمانوں کے گھروں میں، محفلوں میں اور سیرت کے جلسوں میں پڑھی جائے گی اور وقت کے چند روز کے ساتھ اس کی مقبولیت او
شہرت میں اضافہ ہوتا رہے گا !

کارمینا
دردِ شکم، بدہضمی، بھوک کی کمی،
اپھارہ، قبض، قے، دست،
ہضم کی خرابی
یہ اور معدہ اور جگر کے دوسرے امراض، آج کل عام ہیں۔ اور ان شکایتوں کی وجہ سے نہ صرف صحتیں خراب
رہتی ہیں بلکہ کاروبار اور زندگی کے دوسرے مشاغل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اچھا ہاضمہ اور صحیح معدہ اچھی صحت کا
ضامن ہوتا ہے کہتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جو کچھ آپ کھاتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا کھایا ہوا جسم کو نہ لگے،
اور جزوِ بدن ہوکر، خون بن کر آپ کو طاقت نہ پہنچائے تو کھانا پینا ہی بے کار نہیں ہوتا بلکہ اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا
مشکل ہو جاتا ہے اور جینا دوبھر۔
ہمدرد کی لیباریٹریوں اور ہمدرد مطبوں میں چیدہ جڑی بوٹیوں اور ان کے قدرتی نمکیات پر طویل تجربات اور
سائنسی تحقیقات کے بعد ایک متوازن اور مفید دوا کارمینا تیار کی گئی ہے جو ہضم کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے میں
خصوصیت رکھتی ہے۔ کارمینا معدے پر نہایت خوشگوار اثر کرتی اور اس کے افعال کو درست کرتی ہے۔ ہضم
کے فعل کے لیے جو رطوبتیں ضروری ہیں کارمینا ان کو مناسب مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ جگر کی اصلاح کرتی اور جگر
کی جملہ خرابیوں کو درست کرتی ہے۔
سینے کی جلن، تیزابیت، پیٹ کا بھاری پن، نفخ، بدہضمی،
پیٹ کا درد، کھٹی ڈکاریں، دردِ شکم، متلی اور قے، بھوک کی
کمی، قبض یا معدہ اور جگر کی دوسری بیماریوں میں کارمینا
کا استعمال نہایت مفید ہوتا ہے۔
کارمینا نظامِ ہضم کو درست اور تندرستی کرنے کی یقینی
دوا ہے۔ ہر موسم اور ہر آب و ہوا میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے
فائدہ بخش اور موثر ہے بلا خطر استعمال کی جا سکتی ہے۔
کارمینا ہر گھر کی ایک ضرورت ہے
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور چاٹگام
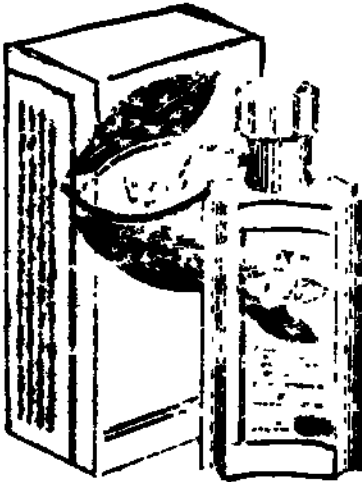
ماہنامہ فاران

جلد ۱۷ ماہ جون ۱۹۶۵ء شمارہ ۳

ایڈیٹر: ماہر القادری

ترتیب

پبلشر مسرور حسین

قیمت سالانہ سات روپے | دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱ | قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

طابع: نیشنل پریس کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

جماعتِ اسلامی کے قیام کا مقصد "اقامتِ دین" ہے اور یہ جماعت اپنے آغازِ قیام ہی سے اس مقصد کے لئے اپنی استطاعت کی حد تک جدوجہد کر رہی ہے، بعض مسائل میں جماعت کے طریقِ کار سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر اس واقعیت اور حقیقت سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ جماعت کا مقصود و منتہاء "اقامتِ دین" ہی رہا ہے جس کی اصل غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے، اس مقصد اور غرض و غایت سے جماعتِ اسلامی ایک قدم بھی ادھر سے اُدھر نہیں ہوئی انتہائی ناسازگار فضا میں بھی اُس نے اس جدوجہد کو جاری رکھا ہے اور اس راہ میں مرلیتہ قربانیاں دی ہیں! جماعت کی تاریخ صداقت و استقامت اور ایثار و قربانی کی تاریخ ہے!

جماعتِ اسلامی کے پیش کئے ہوئے لٹریچر نے مسلمانوں میں تو یرِ فکر پیدا کی ہے اور تجدد زدہ ماحول اور مادیت پرورزدہ فضا میں ایمان و یقین کے چراغ روشن کئے ہیں، یہ فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت ہے اس لئے جماعت کے کاموں میں کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی پائی جاتی ہیں، مگر مجموعی طور پر جماعت کا وجود ملتِ اسلامیہ کے لئے باعثِ خیر و برکت ہے! جماعت پر اُس کے ارکان اور امیر پر تنقید کی جا سکتی ہے، ان کوتاہیوں کی نشاندہی دین و ملت کے بہی خواہوں کو کرنی ہی چاہئے، نقد و احتساب سے کوئی تنگ نہیں اصلاحِ حال کی جانب دین کے خدمت گزاروں کی توجہ کا رُخ پھرتا ہے!

مگر

ایک تو ہوتا ہے ہمدردانہ نقد و احتساب پُرخلوص وعظ و نصیحت، اور اصلاحِ حال کی خیر خواہانہ کوشش! جس کا ہر حق پسند فرد اور جماعت کی طرف سے خیر مقدم ہونا چاہئے، اس کے مقابلہ میں دوسرا رُخ اُس تنقید، طعن و طنز اور احتساب کا ہے جو کسی فرد یا جماعت کی تنقیص، تذلیل اور تحقیر پر مبنی ہے۔ اس قسم کی تنقید کے تیور معاندانہ اور حریفانہ ہوتے ہیں، ایک ایک لفظ میں نیشتر چھپے ہوتے، زیادہ سے زیادہ چرکے دینے اور جراحتیں پہنچانے کی کوشش! آج جماعتِ اسلامی کو زیادہ تر اسی قسم کے بغض و عناد اور بے رحمانہ تنقید اور جارحانہ احتساب سے سابقہ پڑ رہا ہے اہلِ عداوت معاندین اور مخالفین کی ایک پلٹن ہے جو جماعت کے خلاف ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر صف آرا بلکہ نبرد آزما ہے! ہم تمام احوال و کوائف کا طرح جائزہ لینے کے بعد اس احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے قول و عمل کی جواب دہی کرنی ہے، اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی معاندانہ مخالفت سے دراصل دینی محاذ کمزور ہو رہا ہے اور اس مخالفت اور بغض و عناد کے مظاہروں کا لادینی گروپ، تجدد زدہ طبقہ کو فائدہ پہونچ رہا ہے! ایک ہی کیمپ کے لوگوں کے ہاتھوں سے جماعتِ اسلامی پر چاند ماری اور گولہ باری ہوتے دیکھ کر ترقی پسند اور منکرینِ حدیث خوشی سے پھولے نہیں سماتے، کہ اس سیلابِ کفر و ضلالت کے آگے جو پشتہ سب سے زیادہ روک ثابت ہو رہا ہے اُس کا پشتیبان حق

کمالیں لے کر پل پڑے ہیں! ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس غلط اندیشی اور خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ آج کی دنیا میں اسلام کی بقا خدانخواستہ جماعت اسلامی کے وجود سے وابستہ ہے، ہمارا کہنا یہ ہے کہ جماعت اسلامی اسلام کی مخلص خدمت گزار اور دینِ حق کی نمائندہ جماعت ہے، اس لئے اس کے دب کے آزار رہنے سے کسی نہ کسی درجہ میں ہی، دینی محاذ کو نقصان ضرور پہونچتا ہے! لوگ اپنے زہد و تقویٰ پر نہ جائیں اور علم و فضل پر مغرور نہ ہوں قیامت کے دن انہیں اپنی اس لیاقت کی جواب دہی کرنی پڑے گی، اور اس دن یہ جان کر انہیں بڑی پشیمانی ہوگی کہ شیطان دین ہی کے نام پر دینی محاذ کو اُن کے ہاتھوں سے پارہ پارہ کرا رہا تھا!

اس تمہید کے بعد ہم جو کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں وہ ایک ایسا جرعہ ناخوش گوار ہے جسے ہمیں جانتے ہیں کہ کس بے دلی اور ناخوشی کیساتھ گوارا کیا جا رہا ہے! ؟ !

پالے بے رتو مشکل، نہ پیئے تو مشکل
زہر کا نام ستمگر نے دوا رکھا ہے

کاش! اس کی نوبت نہ آتی اور یہ اذیت کوش داستان "فاران" کے صفحات پر نہ دہرائی جاتی، مگر کیا کیا جائے ایک طرف ایک بلند و بالا محترم شخصیت کا سوال ہے اور دوسری طرف ایک حق پسند جماعت کی مظلومیت کا مسئلہ درپیش ہے، ذہن و فکر اور ضمیر بات کی کشمکش میں یہ فیصلہ ہے کہ مظلوم کی حمایت اور مدافعت کی جائے!

جماعت اسلامی سے بعض ارکان خود بھی علیحدہ ہوئے ہیں اور بعض کو جماعت سے خارج بھی کیا گیا ہے، مگر جماعت نے ارکان کی علیحدگی اور اخراج پر اخبارات میں نہ کوئی بیان دیا، نہ ان کے خلاف فرد جرم شائع کی، نہ اس قسم میں رہا کردہ کیا کرتے ہیں اور نہ جماعت کی برتری قائم رکھنے کے لئے ان حضرات کی تنقیص کی گئی، مگر جماعت سے علیحدہ ہونے والے بعض ارکان نے یہ ضرور کیا ہے کہ سیاسی لیڈروں کی طرح اپنی علیحدگی اور جماعت کی کوتاہیوں کا اخبارات میں اعلان کیا اور اس کے بعد جماعت کے عناد و مخالفت کی گرہ ان کے دل میں پڑ گئی! ہمارے محترم بزرگ مولانا امین احسن اصلاحی بھی انہی حضرات میں شامل ہیں، جو جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد جماعت کے خلاف مسلسل نیش زنی کئے جا رہے ہیں! اُن کے علم و فضل اور ادب و انشاء کا رُخ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر طنز و طعن بلکہ تنقیص و تکذیب کی جانب ہو گیا ہے اور اب چند دنوں سے زمانہ کی ہوا دیکھ کر جماعت کی دشمنی میں وہ اس سطح تک آ گئے ہیں جو درباریوں، حاشیہ نشینوں اور خوشامدیوں کی پست سطح ہے، تفسیر فراہی کا جائز و موقف اور چڑھتے سورج کی قصیدہ خوانی اور مجنبی، اس کا کس طرح دل کو یقین نہیں آتا مگر کیا کیا جائے کہ یہ انہونی بات ہو کر رہی، ماہنامہ "میثاق" کے صفحات اس کی شہادت دے رہے ہیں

مولانا اصلاحی جماعت اسلامی سے جب علیحدہ ہوئے ہیں تو انہوں نے جماعت پر گمراہی اور راہِ حق سے انحراف کا الزام لگایا تھا حالانکہ اس وقت ملک خلاف کعبہ کی نمائش کا واقعہ ظہور میں آیا تھا نہ عورت کی صدارت کا مسئلہ درپیش تھا، اس الزام کے بعد بھی وہ جماعت کو اُس کے حال پر چھوڑ سکتے تھے مگر وہ جماعت کے خلاف اپنے عناد و برہمی اور بغض و عداوت کے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے، انہوں نے مروت اور شرافت کے علی الرغم پورے خلوص و عداوت و بے دردی بلکہ ناانصافی کے ساتھ جماعت اور مولانا مودودی کی ذات کو نشانہ بنایا ہے! مولانا اصلاحی صاحب جب تک جماعت سے وابستہ رہے، زبان و قلم سے مولانا مودودی کے مداح رہے، اُن کی تحریریں موجود ہیں، جن میں انہوں نے مودودی صاحب کی ژرف نگاہی، وسعتِ مطالعہ اور تفقہ فی الدین کا بڑا کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے، مگر جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد انہوں نے اعلان فرمایا کہ "مودودی اور پرویز میں کوئی فرق نہیں ہے" (لافرق بین المودودی و پرویز) یعنی یہ دونوں ایک ہی علمی سطح کے آدمی ہیں! یہ پہلی ناانصافی ہے جو مولانا مودودی کے بارے

ن سے سرزد ہوتی یا اس کے بعد سے مودودی صاحب کی تنقیص کا سلسلہ کھل کر یا رمز و اشارات کے پیرایہ میں جاری رہا ہے وہ اپنی پرائیویٹ
ں اور نجی مجلسوں میں مودودی صاحب پر "امیر المومنین" کی پھبتی کستے رہتے ہیں حالانکہ جماعت کے دستور میں واضح طور پر اس سوءِ ظن، التباس اور
باہ کا پہلے ہی سے ازالہ کر دیا گیا ہے۔ دستور کی دفعہ ۱۰ میں لکھا ہے :—

"جماعتِ اسلامی پاکستان کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت "امیر المومنین" (باصطلاح معروف) کی نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اس
جماعت کے امیر کی ہوگی۔ جماعت کے ارکان اس کی اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے۔"

مارشل لاء کا دور جماعت کے شدید ابتلا کا دور تھا، اس دور میں —— مولانا اصلاحی صاحب نے جماعت کی مظلومیت کا اس طرح مذاق اُڑایا
اعت کے ارکان کو بلوں میں گھس جانے والے "چوہوں" سے تشبیہ دی، حالانکہ اس دور میں مولانا اصلاحی صاحب نے بھی کوئی کارنامہ اسد اللہی
م نہیں دیا۔ جماعت سے علیحدگی کے بعد وہ قید و بند کے خطروں سے بھی آزاد اور بے خوف ہوگئے ہیں، وادی اُن کے بارے میں اب چین ہی چین لکھتا ہے
کے مزاج کا اب یہ عالم اور ان کی طبیعت کا یہ رنگ ہوگیا ہے کہ حکومت عورت کی صدارت کے مسئلہ میں اُن کی تحریروں کو اپنے لئے مفید پاکر بڑے
نہ پر ان کی اشاعت کا انتظام کرتی۔ یہ تو اصلاحی صاحب اس کا فخر کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں! وہ جو علامہ اقبال نے کہا تھا —

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ آشیاں کہ نہ ہو جس کی گھات میں صیاد

مولانا اصلاحی صاحب کی طبیعت اب — "خطر پسند" نہیں رہی" امن پسند" بلکہ "آرام پسند" بن گئی ہے، اب تو اس قسم کے تذکروں سے وہ لطف
ہیں کہ کس بڑے آدمی نے اُن کا کتنے قدم بڑھ کر استقبال کیا اور سرکاری "تائید و حمایت" پر مشتمل اُن کے مضامین کو کس انداز میں کس لب و لہجہ کے
اتھ سراہا گیا۔ اُن کا قلم اب اس درجہ "درباری" ہوگیا ہے کہ جمال عبد الناصر جیسے مستبد آمر کی مدح و منقبت کا زہر اُن کے قلم سے ٹپکا ہے، اس
کی تبدیلی کو کیا کہئے جو علم و حکمت کے موتی لٹاتے لٹاتے کنکر اور پتھر بکھیرنے لگے! بلندیوں کو اس قدر پست ہوتے کم ہی دیکھا گیا ہے، اس ٹریجڈی
کے اظہارِ افسوس کے لئے کہاں سے کوئی الفاظ لائے کہ ایورسٹ کی چوٹی دیکھتے ہی دیکھتے سطح سمندر سے بھی زیادہ پست ہوگئی۔

پاکستان میں معروف آزاد اور عوامی جمہوریت کی بجائے "بنیادی جمہوریت" کا جو نسخہ کیمیا" ایجاد کیا گیا ہے، اُس کے نتائج لازمی طور پر
ہی نکلنے چاہئیں تھے جو ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اسی نسخہ کے ذریعہ "مطلق العنانی" کی عمر بھی دراز ہوئی ہے اور اُسے استحکام بھی میسر آیا ہے
یہاں جو کچھ ہو تا رہا ہے، اس سے مولانا اصلاحی اچھی طرح باخبر ہیں مگر اُن کے "علم و تقوی" کی پوری ہمدردیاں "حزبِ اقتدار" ہی کے ساتھ رہی ہیں
ں کا "انتخابی فتح مندی" پر مولانا موصوف نے تبریک و تہنیت کے پھول نچھاور کئے ہیں یہاں تک کہ اس معرکہ میں اخبارات کے جو تاثرات سب ہیں
وام نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے! ان تمام حقائق و واقعات سے مولانا اصلاحی جان بوجھ کر بے خبر بن گئے ہیں! "متحدہ محاذ" کا انہوں نے
خوب مزے لے لے کر مذاق اُڑایا ہے۔ خاص طور سے جماعت اسلامی کی تضحیک و تذلیل میں اُن کے قلم نے بغض و عناد کے تقاضوں کا پورا پورا حق
ادا کر دیا ہے "تازہ ترین میثاق" (ماہ ذی الحجہ) کا صرف ایک اقتباس ہی مولانا موصوف کے ذہن و فکر کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہے فرماتے ہیں!

"ہم کو اس متحدہ محاذ کے اُن دیندار حلیفوں کی اس عبرت ناک شکست پر ذرا بھی اُن کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے، ایسے
بے اصول لوگوں سے آخر کس خیر کی اُمید تھی کہ اُن کی شکست پر افسوس ہو، ہمارا یہ خیال بھی نہیں ہے کہ یہ شکست حکومت اور
پولیس کے جبر اور دباؤ کا نتیجہ ہے"۔۔۔ (ص ۳)

مشرقی پاکستان میں صوبائی اسمبلی کے ضمنی انتخابات ہوئے تھے، اس سلسلہ میں وہاں کے الیکشن ٹریبونل نے صوبائی وزیر زراعت قاضی عبدالقادر صاحب کو بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دیتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ وزیر موصوف نے سرکاری اختیار کا ناجائز استعمال کیا، سرکاری غرض سے مقدمہ اداروں کو انتخابی قواعد کے پیش نظر روپیہ دیا، سرکاری جماعت کے امیدوار کے حق میں کنوسنگ کے لئے سرکاری گاڑیوں کے استعمال کی اجازت دی، حلقہ انتخاب میں صوبائی گورنر کی آمد پر ووٹروں کو دعوت پر بلایا اور اپنے پسندیدہ امیدوار کے لئے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر اپنی اعلیٰ پوزیشن سے ہر طرح کام لیا، حتیٰ کہ ایک موقعہ پر ایک ووٹر کو یہ دھمکی بھی دی کہ سرکاری جماعت کے نامزد امیدوار کے حق میں ووٹ نہ دیا تو اسے خطرناک نتائج بھگتنے پڑیں گے ..... ۔

مولانا اصلاحی صاحب کے رشحات خامہ اور افکار عالیہ کا یہی رنگ رہا تو کیا عجب ہے کہ اُن کا قائم کیا ہوا "حلقۂ تدبر قرآن" رفتہ رفتہ "حلقۂ تدبر اقتدار" میں تبدیل ہو جائے! حکومت و اقتدار کی مدافعت اور وکالت کا یہ رنگ اور طرز خاص مولانا اصلاحی صاحب کے علاوہ اور کسی عالم دین کو میسر نہیں آیا! ایسا کیا ہو رہا ہے؟ یا اللہ! ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں! جماعت اسلامی کی دشمنی میں اتنے بڑے آدمی کے ذہن و فکر کی یہ تبدیلی کا دین و دانش کی کتنی عبرت خیز ٹریجڈی ہے!

ہے ہی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جماعت اسلامی سے جن وجوہ و اسباب کی بنا پر علیحدگی اختیار کی تھی، جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ان میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ جماعت کو اسمبلی کے انتخابات کے جھمیلوں اور دوسرے سیاسی مخمصوں کی بجائے خالص دینی امور کی جانب توجہ دینی چاہئے! جب ایسی صورت تھی تو مولانا موصوف کو تبلیغی جماعت کی طرح ملک کے سیاسی امور سے بے تعلق ہو جانا چاہئے تھا، بے چاری جماعت اسلامی کو بھی وہ اُس کے حال پر چھوڑ دیتے تو ان کی یہ روش سلامت پسندی کی روش ہوتی! اگر انہوں نے جماعت کو سیاسیات میں ملوث دیکھ کر اس سے علیحدگی اختیار کی مگر خود سیاسیات سے کنارہ کش نہیں ہوئے، متحدہ محاذ پر تنقید خاص طور سے ان معاملات میں جماعت پر شدید اعتاب، حزب اقتدار کی مدح خوانی اور اس کی سیاسی فتحمندی پر مبارک باد دیں ..... یہ "سیاست" نہیں تو اور کیا ہے! جو زبان کنونشن مسلم لیگ کو انتخابات کی فتح پر مبارکباد دے سکتی ہے، وہ متحدہ محاذ و جماعت اسلامی کے تعاون پر کس منہ سے اس قسم کی پھبتیاں کس سکتی ہے کہ،

" متحدہ محاذ کے پیچھے انہوں نے دنیا بھی برباد کی اور دین بھی ......" (میثاق)

یہ بات تو بے شک درست ہے کہ جماعت اسلامی نے دین کی جو خدمت انجام دی ہے اُس نے جماعت والوں کی "دنیا" کو بے شک نہیں بنایا، اب رہا "دین" تو اس کے بارے میں قیامت ہی کے دن پورا فیصلہ ہو سکے گا لیکن مولانا نے سیاست و حکومت کے معاملات میں جو روش اختیار فرمائی ہے اور ان کی تحریروں میں تقیہ کا جو رنگ پیدا ہو گیا ہے اُسے دیکھ کر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی "دنیا" کا مستقبل بہر حال روشن ہو گیا ہے۔

لطافتِ نگہ ملتفت کا کیا کہنا
کبھی کبھی تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتی

ماہنامہ میثاق کے تازہ شمارے سے مولانا اصلاحی صاحب کے انداز کا پتہ لگتا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کی مخالفت کے سلسلہ کو جاری رکھنے سے باز نہیں آ سکتے اس کارِ ثواب کو وہ شاید مسلسل انجام دیتے رہیں گے اُن کے ہاتھ میں قلم ہے اُن کا اپنا رسالہ ہے اپنے اس شوق کو وہ آسانی سے پورا کر سکتے ہیں! اگر وہ ذرا اس کا بھی خیال رکھیں ؎

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے!

ف آخر جماعت اسلامی جس مقصد اور پیام کو لے کر اُٹھی ہے وہ کسی سازگار ماحول اور عوام کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا پابند نہیں ہے، لوگ مانیں یا نہ مانیں ماحول موافق و سازگار ہو یا نہ ہو، اُسے تو اقامتِ دین کی جد و جہد کو
ہر حال جاری رکھنا ہے، اسمبلیوں کے انتخابات کی ہار جیت اُس کے ارکان کو دل شکستہ اور مایوس نہیں کر سکتی، ہاں، طبعی طور پر
ہم کے نتائج سے کوفت ضرور ہوتی ہے، اس کوفت کو بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے جماعت والوں کو اجر ملے گا کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی
ندی کی خاطر انہیں یہ کوفت برداشت کرنی پڑی ہے، جماعت اسلامی اب تک مشکلوں کے خارزار سے گزرتی رہی ہے، قدم قدم پہ
نیں بلکہ بڑھتیں! مگر زخم کھا کر اس کا عزیمت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی ڈھیل پیدا نہیں ہوئی! حکومت نے تو اپنی دانست
اس کا پتّا پانچہ ہی کر دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت و رحمت عدالت کے فیصلہ کی شکل میں ظاہر ہوئی اور جماعت بحال ہو گئی! آئندہ
ت کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کا جواب مستقبل ہی دے سکے۔ اتنے اہم اور ذمہ دارانہ معاملات میں عقل کے تیر تکّے لڑانا
نادانی کی بات ہے! رہی جماعت اسلامی تو اس کا پروگرام، مقصد اور عزائم کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہیں، وہ پاکستان میں اُس
م کو قائم کرنا چاہتی ہے۔ جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے! اور یہ نظام "اسلام" ہے جس کی بنیاد ایمان، اخلاق اور پاکیزگی پر ہے،
عت کا متحدہ محاذ کے ساتھ تعاون پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کی غرض سے تھا، اور مقصود صرف "جمہوریت" کی بحالی نہ تھی، یہ تو اسلامی نظام برپا
نے کے لئے ایک ذریعہ ہے، مصر کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں آمریت، استبداد اور مطلق العنانی نے اسلامی نظام کے قیام کی ہر راہ بند کر
ی ہے، جمال ناصر نے تختِ حکومت پر براجمان ہوتے ہی سب سے پہلا وار "اخوان المسلمون" پر کیا کہ یہی تنظیم اُس کی آمریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ
تھی!

یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے، ظالموں اور حق ناشناسوں نے انبیاء کرام جیسے نفوسِ قدسیہ کو قتل کیا ہے، یزید کی
جوں نے گلشنِ اہلِ بیت کو مسل کر رکھ دیا اور راکبِ دوشِ نبیؐ کو چشمِ آفتاب نے غربت و بیکسی کے عالم میں خاک و خون میں تڑپتے دیکھا! یہ سب کچھ
نا رہا مگر نہ آسمان سے کوئی بجلی گری نہ بالمشت بھر زمین کہیں سے شق ہوئی! بعض سطح بیں ان واقعات کو دیکھ کر اور پڑھ کر مذبذب ہو جاتے ہیں
ور ہذیان بکنے لگتے ہیں (سبحان اللہ عما یصفون) وہ نہیں جانتے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے، دار الجزا نہیں ہے، یہاں عام طور پر
یکی اور بدی کا ہاتھ کے ہاتھ بدلا نہیں ملتا اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یومِ آخرت مقرر فرمایا ہے، جہاں جس نے رائی برابر بھی نیکی اور بدی
کی ہے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا! جن کی آخرت پر نگاہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر پورا یقین رکھتے ہیں وہ دنیا کی کامیابی پر نہ تو
مغرور ہوتے ہیں اور نہ یہاں کی ناکامی انہیں مایوس بناتی ہے! اس دنیا میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات علم و فضل اور زہد و
تقویٰ بھی جور و استبداد کے ہاتھوں کو مضبوط بناتے اور مظلوموں کی پامالی میں ظالموں کے مددگار ثابت ہوتے ہیں!

آخر میں ہمیں پھر اس حقیقت کو دہرانا ہے کہ جماعت اسلامی کے اغراض و مقاصد اُس کا ماضی اور حال اور اُس کے ارکان کی زندگیاں کھلی کتاب کی طرح
سب کے سامنے ہیں، جماعت کے پروگرام میں کوئی راز داری اور اُس کے پیغام میں فداسا بھی ابہام نہیں ہے، سیدھی سی بات ہے کہ ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں
تو انفرادی زندگی سے لے کر تجارت گاہوں اور حکومت کے ایوانوں تک اسلام ہی کا پورا پورا عمل دخل ہونا چاہئے، جہاں تک اطاعت معروف کا تعلق ہے جماعت ایک نکٹے حبشی حاکم
کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کر دے گی مگر اطاعتِ معصیت میں وہ ستا پشت کے شہنشاہ اور ہفت اقلیم کے فرمان کو بھی ٹھکرا دے گی، نیکی کے لئے اُس کی پاس آغوشِ محبت ہے اور بدی کے لئے اُس
کے یہاں نفرت و حقارت کی ٹھوکریں ہیں! اللہ تعالیٰ اس حق پسند جماعت کو قائم اور صحیح و سلامت رکھے کہ اس نے پُر آشوب آندھیوں میں حق و صداقت کے چراغ روشن کر رکھے ہیں!

ماہر القادری

حکیم محمود احمد برکاتی

شاہ محمد محدث دہلویؒ
شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے ایک گم نام فرزند

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) کی شخصیت سے اظہار عقیدت کے باوصف ان کی جامع و کامل سوانح کی ترتیب پر آج تک کوئی توجہ نہیں کی گئی، شاہ صاحب کی حیات کے صدہا پہلو ہنوز تشنۂ تحقیق و تفحص ہیں، مثلاً:

● شاہ صاحب کے فرزندانِ گرامی کی تعداد عموماً چار بتائی جاتی ہے حالانکہ یہ تعداد پانچ ہے!

● شاہ صاحب کی عربی و فارسی شاعری میں تو کلام کی گنجائش نہیں ہے لیکن ان کی اردو شاعری میں کلام کیا جاسکتا ہے، شاہ صاحب میرو سوداؔ اور مظہر جانِ جاناں کے معاصر تھے اس لئے ان کا اردو میں شعر کہنا بعید از قیاس نہیں ہے، لیکن کہتے بھی تھے یا نہیں؟ اس کی تحقیق ابھی تک نہیں کی گئی، بعض تذکروں میں شاہ صاحب کی طرف چند اردو اشعار منسوب کئے گئے ہیں، ہوسکتا ہے یہ اشعار ان کے ہم نام معاصر کے ہوں، جو التباس کی بنا پر شاہ صاحب کی طرف منسوب ہو گئے اور شاہ صاحب کے اردو اشعار کسی اور کے مجموعہ کلام میں شامل کر دئے گئے ہوں۔

● شاہ صاحب پر نجف خاں کے مظالم کا افسانہ بھی جرح و نقد کا مستحق ہے۔[1]

● شاہ صاحب اور محمد بن عبد الوہابؒ نجدی کے اشتراکِ تلمذ کا بھی فیصلہ ہونا چاہیئے، ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کا کتب خانہ شاہ عبد العزیز کو منتقل ہوا ہوگا، شاہ عبد العزیز نے وہ شاہ اسحٰق صاحب کر دے دیا تھا، شاہ اسحٰق صاحب ہجرت کے وقت بڑا حصہ اپنے ساتھ حجاز لے گئے تھے ان کے ایک نواسے عبد الرحمٰن کا ذکر آتا ہے جو حجاز ہی میں تھے اب ان کے ورثا کے پاس وہ کتب خانہ ہوگا، شاہ اسحٰق صاحب کے ایک داماد مولانا عبد القیوم بڈھانوی نے بھوپال میں وفات پائی ہے، کچھ کتابیں ان کے پاس بھی ہوں گی، بھوپال میں ان کے اخلاف کے یہاں ممکن ہے اب بھی مل جائیں، بہرحال یہاں جہاں بھی ممکن ہو اس خاندان کی کتابوں کا سراغ لگایا جائے، ان میں کچھ کتابیں شاہ صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوں گی، کچھ تالیفات کے مسودات ہوں گے کچھ کتابوں پر حواشی ہوں گے، کہیں کہیں کوئی یادداشت ہوگی، اس طرح شاہ صاحب کی حیات کے بہت سے گوشے آشکار ہوں گے سنین کا تعین ہوگا کئی غلط بعض غلط فہمیاں دور ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان رجال و کتب کا یقین ہوسکے گا جن سے شاہ صاحب متاثر ہوئے۔

● شاہ صاحب کے افادات پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، مثلاً:

شاہ صاحب کے کئی رسائل ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، ہم کتابوں میں صرف اُن کے نام پڑھتے ہیں آج تک ان کی زیارت سے محروم ہیں، النوادر النخبہ

---

[1] اس پرچہ ہی میں مضامین آتے ہیں کہ یہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔ (م۔ق)

مقدمہ در فن ترجمۂ قرآن، غالباً آج تک کہیں طبع نہیں ہوئے،

● بعض رسائل چھپ چکے ہیں لیکن نامکمل و ناقص چھپے ہیں، انتباہ کے تین اقسام (حصوں) میں سے صرف پہلا حصہ چھپا ہے، باقی دو حصے ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

● ــ شاہ صاحب کی جو کتابیں پہلے طبع ہوئی تھیں وہ بھی اب "نوادر" کی صنف میں شامل ہو گئی ہیں اس لئے ان کی دوبارہ اشاعت کی شدید ضرورت ہے، شاہ صاحب کی فکر کو سمجھنے کے لئے ان کے پورے سیٹ کا پیش نظر رہنا لازمی ہے ہم ایسے کئی حضرات سے واقف ہیں جو شاہ صاحب پر کام کر رہے ہیں لیکن ان کی تالیفات سے محرومی کے شاکی ہیں، ان دنوں بعض ادارے اس طرف متوجہ نظر آ رہے ہیں مگر وہ صرف ترجموں کی طباعت پہ اکتفا کرتے ہیں غیر حامل المتن ترجموں سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔

● ــ شاہ صاحب کے رسائل و کتب کی صحیح تعداد ہی اب تک متعین نہیں ہوئی، ہماری نظر سے آج تک کوئی ایسی تحریر نہیں گذری جس میں حضرت شاہ صاحب کی تالیفات کی مکمل فہرست درج ہو، شاہ صاحب کی بعض کتابوں کے اجزاء کو ناشرین نے علیحدہ بھی شائع کر دیا تھا، ان کو اکثر حضرات ــــ اہل علم تک ــــ مستقل رسائل سمجھ لیتے ہیں، الجزء اللطیف اور مکتوب مدنی اصل میں انفاس اور تفہیمات کے اجزا ہیں۔

● ــ ایک گروہ ــ اہل حدیث حضرات ــ نے شاہ صاحب اور ان کے اخلاف کی طرف ایسی تحریروں کو منسوب کر دیا جو حقیقتاً ان کی نہیں تھیں، اس سلسلہ کا آغاز، ۱۸۵۰ء سے قبل ہی ہو گیا تھا، چنانچہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور نواب قطب الدین خاں نے اس زمانے میں اس کی تردید کر دی تھی، پھر موجودہ صدی کے آغاز میں سید ظہیر الدین احمد ولی اللّٰہی نے بار بار اس کی تردید کی لیکن البلاغ المبین اور تحفۃ الموحدین جیسے رسائل آج تک شاہ صاحب کے نام سے چھپ رہے ہیں۔

ایک اور ستم یہ کیا گیا کہ شاہ صاحب کے حقیقی رسائل میں ترمیم و اضافہ کی کوششیں کی گئیں، الفوز الکبیر اور حجۃ میں ابن تیمیہ وغیرہ کے جو اقتباسات بلا حوالہ درج ہیں وہ غالباً اسی قبیل سے ہیں، فیوض کے مطبوعہ نسخوں میں نمایاں اختلافات ہیں۔

● ــ متعدد وجوہ سے سب سے زیادہ ضرورت، ان کی تحریروں کی تاریخی ترتیب کا تعین ہے داخلی و خارجی شواہد سے بڑی حد تک اس کام کی تکمیل ہو سکتی ہے، شاہ صاحب کی مختلف تحریروں میں انداز بیان کا تفاوت یا ان کے بعض اقوال و افکار میں جو تضاد نظر آتا ہے اس کا واحد حل یہی ہے

مختصر یہ کہ شاہ صاحب کی حیات اور تالیفات کی ترتیب و اشاعت کی طرف اہل علم کی توجہ کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کے بعد ان کے علوم پر تحقیق کی راہ کھلے گی خصوصاً شاہ ولی اللہ اکیڈمی (حیدرآباد) اگر "الرحیم" میں غیر متعلق مضامین کی اشاعت کے بجائے یہ اہتمام و التزام کرے کہ ہر ماہ شاہ صاحب کے مختصر رسائل کے اصل متن صحت کے ساتھ شائع ہوتے رہیں تو سال دو سال میں بیشتر رسائل عام ہو جائیں گے۔

ہم ان میں سے فی الحال پہلے مسئلے کے سلسلے میں اپنے نتائج مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام تحریر فرماتے ہیں :ــ

"عام طور (شاہ صاحب کے فرزندوں کے) تذکروں میں چار نام ہی ملتے ہیں"

رود کوثر ص ۵۶۴

اور یہ واقعہ ہے کہ عام طور پر مورخین شاہ صاحب کے چار صاحب زادوں کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ پانچ صاحب زادے[1] تھے جن میں سب سے

---

[1] اور ایک صاحب زادی امۃ العزیز تھیں جن کا عقد شاہ محمد عاشق کے صاحبزادے سے ہوا تھا، تذکرۃ الرشید ص ۳۰

بڑے شاہ محمد محدث دہلوی تھے، اُن کو لوگوں نے بھلا دیا،

مولوی محمد محسن ترہتی اپنی تالیف الیانع الجنی (تالیف ۱۲۸۰ھ) میں لکھتے ہیں :-

وکان لعبد العزیز اخ اقدم منہ سناً	شاہ عبدالعزیز کے ایک بھائی تھے جو اُن سے
اسمہ محمد وکان اخاہ لابیہ اخذ عن ابیہ	عمر میں بہت بڑے تھے ان کا نام محمد تھا، وہ شاہ
وھو ایضاً قدیم الوفاۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ"	صاحب کے اخیافی بھائی تھے اور ان کی وفات بھی شاہ
(ص ٦٦)	صاحب سے بہت پہلے ہوئی تھی، ان پر اللہ کی رحمت ہو

مولانا عاشق الٰہی لکھتے ہیں -

"شاہ ولی اللہ کے پانچ صاحبزادے تھے ایک پہلی بیوی کا سے مولوی شیخ محمد . . . . . مولوی شیخ محمد لاولد گئے"

تذکرۃ الرشید ص ۳۰

شاہ ولی اللہ کی پہلی شادی اپنی ماموں زاد بہن شیخ عبید اللہ کی صاحب زادی سے ۱۱۲۸ھ میں ہوئی تھی، انہی کے بطن سے شیخ محمد پیدا ہوئے تھے، شاہ صاحب کی کنیت اسی بناء پر ابو محمد تھی، "الارشاد" کے سرورق پر شاہ صاحب کا مکمل اسم گرامی یوں تحریر ہے -

"ابو محمد احمد بن عبد الرحیم المدعو بہ شاہ ولی اللہ الدھلوی"

اس کتاب کے ص ۲ پر تحریر ہے -

ولہ ولد قبل مولانا عبد العزیز مسمیٰ بہ محمد فکنی بابی محمد"	شاہ عبدالعزیز سے بڑے آپ کے ایک صاحب زادہ محمد تھے اس لئے آپ کی کنیت ابو محمد ہے -

مولوی سید ظہیر الدین احمد ولی اللہی نے جو اس خانوادے کے ایک فرد تھے، "تاویل الاحادیث" کے آخر میں شاہ صاحب کے حالات تحریر کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"شاہ صاحب کا پہلا عقد شیخ عبید اللہ صاحب پھلتی کی صاحب زادی اور شیخ محمد عاشق پھلتی کی بہن کے ساتھ ۱۴ سال کی عمر میں ہوا تھا" ص ۸۷

صاحب نزہۃ الخواطر مولوی عبد الحی نے ۱۳۱۹ھ میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا دہلی میں ان کی ملاقات سید ظہیر الدین احمد سے ہوئی جنہوں نے انہیں بتایا تھا کہ

"شاہ صاحب کی بھی دو شادیاں ہوئی تھیں پہلی پھلت میں ہوئی . . . . ان سے ایک صاحبزادے ہوئے شیخ محمد صاحب" (دہلی اور اس کے اطراف) ص ۶۸

شیخ محمد کی تعلیم و تربیت شاہ صاحب ہی کی نگرانی میں ہوئی تھی انہوں نے علوم دینیہ کی تکمیل اپنے والد ماجد ہی سے کی تھی، شاہ عبدالعزیز نے شمائل ترمذی اپنے ان بڑے بھائی کی قرأت ہی سے پڑھی تھی -

مولوی عبد الحی جنہوں نے ان کے ترجمہ کے لئے "الشیخ العالم المحدث" کا عنوان قائم کیا ہے . لکھتے ہیں :-

وقرء شمائل ترمذی سماعاً علیہ بقراۃ اخیہ	شاہ عبدالعزیز نے شمائل ترمذی اپنے والد سے اپنے

باقی ؎

آسی ضیائی

وہ لفظ کون سا ہے؟

مولانا آزاد نے آبِ حیات میں بتایا ہے کہ ایک بار میر سوز نے سودا کے سامنے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا ؎

نہیں نکسے ہے مرے دل کی اُبا ہے گا ہے اے فلک بہرِ خدا، رخصتِ آہے، گا ہے

سودا نے اس پر فقرہ کسا "میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشاور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں۔ یا تو جب یہ لفظ سنا تھا، یا آج سنا ہے"

مولانا آزاد نے یہ قصہ نقل کر کے یہ نہیں بتایا کہ وہ لفظ کون سا تھا جس پر سودا کو اعتراض ہوا۔ لیکن پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں کسی شاعرہ "خفیہ بیگم" والدہ میر صابر کی ایک غزل نقل کی ہے، جس کا مطلع ہے ؎

اتنا سخن ہے، دل میں سمائی ہو جاوے گی جہاں بات منہ سے نکسی، پرائی ہو جاوے گی

اور اس کے لفظ "نکسی" پر حاشئے میں آبِ حیات کا مندرجہ بالا قصہ بلا تبصرہ نقل کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیرانی مرحوم کے نزدیک سودا کے بچپن میں پشاور کی ڈومنیاں "نکسنا" بولا کرتی تھیں۔ بالفاظِ دیگر، یہ لفظ بھی شیرانی کے نظریے کی رُو سے اصلاً پشاور، پنجاب وغیرہ کا ہے، جہاں سے رفتہ رفتہ دہلی اور دوسرے علاقوں میں مستعمل ہو گیا۔

پروفیسر شیرانی میدانِ تحقیق میں اردو کے مایۂ ناز اور لائقِ رشک بزرگ گزرے ہیں، ان کے پائے کا محقق ہمارے ہاں ایک آدھ ہی اور ہوا ہے، مگر ان کی کتاب "پنجاب میں اردو" ان کے "ذہنی تحفظ" کی ایک عجیب مثال ہے، اس میں انہوں نے تحقیق کو اپنے مفروضے کا تابع بنایا ہے، اور اسی بنا پر ایسی کتنی ہی باتیں کہہ گئے ہیں جو تحقیق بلکہ عقلِ عام کے بھی خلاف پڑتی ہیں، مندرجہ بالا واقعہ اس کی ایک عبرت ناک مثال ہے۔

سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ کیا "نکسنا" سودا کے زمانے سے پہلے اردو میں رائج ہی نہ تھا؟ اگر نہیں، تو کیا وجہ ہے کہ آج تک اس لفظ کے دو ایک مشتقات "نکاس" اور "نکاسی" —— اردو میں عام ہیں، حالانکہ بطورِ فعل اسے اردو میں کبھی بار نہ ملا؟ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگرچہ "نکسنا" اردو اور بعض دوسری مقامی بولیوں (کھڑی بولی، ہریانی) میں مستعمل نہیں، مگر مشرقی بولیوں، اودھی، بگھیلی، ماگھی وغیرہ میں یہ فعل بہت عام ہے؟ گویا "پشاور" سے یہ لفظ کہاں تو دہلی، میرٹھ، نجیب آباد وغیرہ کو پھلانگ کر لکھنؤ، پرتاب گڑھ، گونڈہ وغیرہ جا پہنچا، اور وہاں بڑی آسانی سے بس گیا! آپ آج بھی اودھ وغیرہ کے علاقے میں دیہاتیوں سے اس قسم کے فقرے عام سن سکتے ہیں کہ "ہمرے پران نکسے جات ہیں"، "گاڑی نکس گئی" وغیرہ۔ لیکن مغربی یوپی اور دہلی کے دیہات میں نکسنا اور اس کی مختلف شکلیں سننے میں نہیں آئیں۔ پھر کیا یہ لفظ "پشاور" سے سیدھا مشرق میں پہنچا، اور سارا درمیانی علاقہ چھوڑ گیا؟ (واضح رہے کہ پنجابی میں بھی "نکسنا" استعمال نہیں ہوتا۔) اور مشرق میں بھی پہنچتے ہی ایسا مقبول ہوا کہ سودا کے بچپن سے آج تک دو ڈھائی صدی ہی میں دیہاتی بولیوں کا جزو بن گیا؟ (مشرقی یوپی کے شہروں میں بھی یہ مستعمل نہیں ہے۔)

میرے پاس پشتو کی صرف ایک مختصر سی لغت "نیر اللغات" ہے، جو پشتو کی پہلی لغت بھی ہے۔ اس میں بھی "نکسنا" نہیں ملتا، حالانکہ اگر

آج سے ڈھائی سو سال پہلے بھی یہ لفظ "پشور کی ڈومنیاں" بولتی تھیں تو اسے اتنا عام تو ہونا چاہیئے تھا کہ پشتو کی لغت میں درج کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف، پلیٹس (JOHN T. PLATTS) کی "اردو، کلاسیکی ہندی اور انگریزی لغت" (DICTIONARY OF URDU, CLASSICAL HINDI AND ENGLISH) میں "نکسنا" اور "نکاسنا" درج ہیں، اور ان کی اصل پراکرت "نکاس" بتائی گئی ہے، جو سنسکرت "نیشکس" سے ماخوذ ہے، سنسکرت میں یہ لفظ (نِس + کس) کا مرکب ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ پشاور یا لاہور سے نہیں آیا، بلکہ اُسی علاقے کا قدیم لفظ ہے جو متھرا اور اس کے مضافات پر مشتمل ہے کیوں کہ پراکرت اور سنسکرت اسی خطے کی پیداوار ہیں۔

اس کے بعد ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا سودا کے بچپن میں پشور سے صرف ڈومنیاں ہی آتی تھیں؟ جن کی زبان سے نکلا ہوا یہ لفظ اُنہیں یاد رہا؟ سودا خود کابلی خاندان کے فرد تھے، اُن کے والد میرزا محمد شفیع بسلسلہ تجارت آئے اور دہلی میں بسے تھے، ظاہر ہے کہ سودا کے گھر میں اُن کے گھر میں پشتو ہی بولی جاتی ہوگی۔ اگر نکسنا پشتو کا لفظ ہوتا تو یہ ایسا غریب اور کم استعمال ہونے والا لفظ تو نہ تھا کہ سودا نے کبھی اپنے گھر میں سُنا ہی نہ ہو اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کابلی پشتو میں یہ لفظ نہیں ہے، پشاوری پشتو میں ہوگا تو کیا دہلی میں پشاور کے باشندے کبھی آتے ہی نہ تھے؟ ظاہر ہے کہ پشاور سے ڈومنیاں تو کبھی کبھار ہی آتی ہوں گی، اور ان کا دائرۂ عمل بھی زنان خانوں تک محدود رہتا ہوگا۔ البتہ پشاور سے مرد بڑی تعداد میں، اور آئے دن، آتے رہتے ہوں گے، کیونکہ دہلی کے ہمیشہ سے پایۂ تخت ہونے کے باعث نہ صرف برصغیر بلکہ دوسری ولایات کے لوگ بھی مختلف ضروریات کے تحت دہلی آتے جاتے رہتے تھے۔ پھر یہ تو عجیب بات ہوئی کہ سودا نے یہ لفظ پشاوری مردوں سے کبھی نہ سُنا، صرف پشاوری ڈومنیوں سے سُنا۔

گویا نتیجہ یہ نکلا کہ میر سوز کے اس مطلع میں سودا کے نزدیک قابلِ اعتراض لفظ "نکسے ہے" نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ کون سا لفظ ہے؟ آزاد نے اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اُن کی تحریر میں جا بجا بے تکلف گفتگو کا سا رنگ ملتا ہے اور اسی لئے انہوں نے اس نکتے میں بھی وہی بے تکلفی برتی، اور غالباً فرض کر لیا ہے کہ قاری خود ہی جانتا ہوگا کہ سودا نے کس لفظ پر اعتراض کیا۔ مگر آج ہمارے لئے یہ معما بن کر رہ گیا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو بہت مختصر سا شعر ہے، جس میں ایک آدھ کے سوا کوئی لفظ بھی نامانوس نہیں، اس لئے زیرِ بحث لفظ کی تفتیش میں زیادہ وقت نہ ہونی چاہیئے مگر پروفیسر شیرانی نے اپنے عجیب نظریے کی ترنگ میں ایک ایسے لفظ پر انگلی رکھ دی جو کسی طرح متکلم فیہ لفظ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا لفظ جس پر نظر پڑتی ہے "اُپا ہے" معلوم ہوتا ہے، اور بادی النظر میں یہی قرینِ قیاس بھی ہے، کیونکہ اُردو میں یہ لفظ بالکل نیا لگتا ہے اور تمام اُردو لغات اس سے خالی ہیں، یہاں تک کہ پلیٹس کی "اردو، کلاسیکی ہندی اور انگریزی لغت" میں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا مشکل نور اللغات سے اتنا قیاس ہوتا ہے کہ یہ لفظ شاید سنسکرت "اُپاہت" بمعنی "خستہ و شکستہ" سے ماخوذ ہو۔ (صاحب نور اللغات نے بھی "اُپاہت" کی تحقیق "اُپاہج" کے ذیل میں کی ہے؛ "اُپا ہے" انہوں نے بھی نہیں دیا ہے۔) لہٰذا اس کے معنی خستگی، غمگینی، حسرت وغیرہ ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی "اُپاہ" سے "اُپاؤ" اور "اُپایہ" بمعنی درماں، مداوا بھی بنے ہوں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ "اُپا ہے" اُردو میں کبھی مستعمل نہیں رہا لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سودا نے اسی لفظ کا مذاق اُڑایا تھا تب بھی وہ اعتراض اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ اس ضمن میں "پشور کی ڈومنیوں" کا کیا مذکور تھا، جب کہ پنجابی اور پشتو میں بھی "اُپا ہے" موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد جس لفظ پر تامل ہوتا ہے وہ صرف ایک ہی رہ جاتا ہے؛ اور وہ بھی تنہا نہیں بلکہ دوسرے لفظ سے مل کر وہ مضحکہ خیز آواز پیدا کرتا ہے جس پر سودا کو یہ پھبتی سوجھی۔ گانے والے بالعموم گانا شروع کرتے وقت طرح طرح کی عجیب اور بے معنی آوازیں نکالتے ہیں، اور اس طرح گلے کو مخصوص گ

ب جھونے کے قابل بناتے ہیں۔ بلکہ قوال تو گانے کے بیچ بیچ میں بھی اس قسم کی آوازیں نکالتے رہتے ہیں، مثلاً آآآ... آہے آہے، آہے واہ... ہے جی... وغیرہ... مجھے ڈومنیوں کا گانا سننے کا تو ایک آدھ دفعہ کے سوا کبھی اتفاق نہ ہوا اور وہ بھی کم عمری میں، خصوصاً پشاور کی ڈومنیوں کو تو دیکھا تک نہیں، لہٰذا میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس قسم کی آوازیں نکالتی ہیں ("واقف کار" صاحبان اطلاع دیں۔) البتہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ آہے گاہے" جیسی آوازیں نکالتی ہوں گی۔

اس قیاس کو ایک تقویت اس کی صوتی ترکیب سے پہونچتی ہے۔ حقیقتاً اس شعر سے علیحدہ کرکے یہ فقرہ زبان سے ادا کیا جائے تو مضحکہ خیز ہوگا، دوسری تقویت اس روایت کے بقیہ حصے سے پہونچتی ہے، جس کو شیرانی مرحوم نے بالکل حذف کردیا ہے، کیونکہ ان کے مقصد کے لئے وہ حصہ بے کار اور وہ یہ ہے کہ سودا نے اس مطلع کے جواب میں خود بھی ایک مطلع کہا ؎

ابر کہسار ہوں، جوں برق نگا ہے گا ہے ———— (بحوالہ آب حیات) ؟

[اور نہ صرف اس میں، بلکہ سودا کے دیوان میں شامل پوری غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس میں "آہے" کا قافیہ انہوں نے باندھا ہو، حالانکہ قافیہ بہت ہی سامنے کا اور برجستہ ہے، اور سودا کو میر سوز کے مطلع سے اس قافیے کی سجھاونی بھی مل گئی تھی۔ مطلع میں نہ سہی، کسی اور شعر میں یہ باندھا سکتا تھا! اور اگر سودا کا اعتراض اسی لفظ پر نہ ہوتا تو انہیں یہ قافیہ باندھنے میں کوئی تامّل نہ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر انہوں نے اس طرف مطلق اعتنا ، ———— خود حزیں کی اصل غزل، جس کی زمین میں ان دونوں صاحبوں نے یہ غزلیں کہیں، اُس کا مطلع بھی اس قافیے سے خالی ہے ؎

می گرفتیم بجاناں سر راہے، گاہے ——— اوہم از لطفِ نہاں داشت نگاہے گاہے

اس کے بعد آزاد لکھتے ہیں کہ اُسی صحبت میں کسی نے سودا سے میاں جرأت کی طرف اشارہ کیا (جو اُن دنوں نوعمر تھے) کہ انہوں نے بھی کچھ کہا ہے۔ چنانچہ ان کا شعر (مطلع) بھی نقل کیا ہے، جسے سن کر سودا نے تحسین کی ؎

سرسری اُن سے ملاقات ہے گاہے گاہے ——— غیر کی بزم میں گاہے، سرِ راہے گاہے

اور پھر آزاد نے حسبِ عادت اپنی طرف سے ظفر کا شعر بھی (ذوق کا بتاکر) پیش کیا ہے ؎

اس طرف بھی تمہیں لازم ہے نگاہے گاہے ——— دم بدم، لحظہ بہ لحظہ نہیں، گاہے گاہے

ان دونوں مطلعوں میں، جیسا کہ ظاہر ہے، "آہے" کا قافیہ نہیں ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ نہ صرف سودا کو "آہے" پر اعتراض تھا بلکہ خود آزاد بھی یہی سمجھتے تھے کہ سودا کو اسی پر اعتراض تھا، اور یہ کہ واقعی یہاں یہ قابلِ اعتراض ہے؟

بہرصورت، اس تمام بحث کا حاصل محض ایک قیاس پر مبنی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ شیرانی کا مذکورہ بالا دعویٰ بھی محض قیاسی ہی ہے۔ اب یہ قارئین ہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کس کا قیاس درست ہوسکتا ہے، یا یہ کہ دونوں ہی کی قیاس آرائی غلط ہے۔ اس موضوع پر اگر کوئی اور صاحب بھی میری رہنمائی کریں تو میری ممنونیت کا باعث ہوگا۔

ؔ اقبال نے یہ قافیہ اپنے ایک فارسی قطعہ میں باندھا بھی ہے ؎ وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے ؍ طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

ماہرالقادری

مدح ومناقب

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

صدیقؓ آفتاب، عمرؓ ماہتاب ہے — عثمانؓ حیا کی جان، علیؓ بوتراب ہے
اللہ رے! فراستِ مومن کا ارتقا — رائے عمرؓ مطابقِ وحی و کتاب ہے
فاروقؓ جا رہے ہیں مدینہ سے سوئے شام — اس شان سے کہ فتح و ظفر ہم رکاب ہے
خادم سوار اور خلیفہ پیادہ پا — اس حسنِ سادگی کا بھلا کیا جواب ہے
اسلام میں عمرؓ کے ہے اک شانِ امتیاز — یہ حاصلِ دعائے رسالت مآبؐ ہے
وہ زندگی کہ جس پہ فرشتوں کو رشک آئے — اور اس پہ آخرت کا غم بے حساب ہے
جس دل میں جتنی کھوٹ ہے جس ذہن میں فساد — اتنا ہی اس طرف سے اُسے اجتناب ہے

ماہر! رہے گی سطوتِ فاروقؓ شمعِ راہ
جب تک جہاں میں کشمکشِ انقلاب ہے

سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

یہ جامعِ قرآں ہیں، عثمان غنیؓ ہیں — اللہ کے مقبول ہیں، محبوبِ نبیؐ ہیں
صدیقؓ ہوں فاروقؓ کہ عثمانؓ و علیؓ ہوں — یہ لوگ تو اللہ کی آیاتِ جلی ہیں
ایمان و حیا جود و سخا ہو کہ مروت — دیباچۂ اخلاق کا عنوان یہی ہیں
جنت کی بشارت کے سزاوار ہیں کتنے — اللہ کے بندے تو زمانے میں سبھی ہیں
دل ذکرِ خدا میں ہے زہے شانِ شہادت — آنکھیں ہیں کہ قرآں کے حرفوں پہ جمی ہیں
جس روز خلیفہ کو خود اُمت نے کیا قتل — اس دن سے اخوت کی حدیں ٹوٹ گئی ہیں
اے جانِ وفا! یثرب و حبشہ کے مہاجر — راہیں ترے قدموں کے نشاں ڈھونڈ رہی ہیں

امت کے امیں، خویشِ نبیؐ، صاحبِ نورین
یہ نسبتیں، یہ عزتیں اللہ نے دی ہیں

دینی مسائل اور اضطرار

محمد نواز۔ ایم اے

پاکستان کے صدارتی انتخاب کے موقع پر جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شاورت نے جو قرارداد پاس کی تھی۔ اس سے علمی حلقوں میں یہ
بحث نکلی ہے کہ آیا شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کی حرمت اکراہ، اضطرار یا شدید ضرورت کے وقت ساقط ہو
ہے یا ساری حرمتیں ابدی، اٹل اور قطعی ہیں کہ جن سے ان کی حرمت کسی حال بھی الگ نہیں ہو سکتی، یہ ایک نہایت سنجیدہ علمی سوال تھا
ں بات کا متقاضی تھا کہ اس پر سنجیدگی اور عالمانہ وقار کے ساتھ گفتگو کی جاتی۔ لیکن افسوس ہے کہ بزرگانِ دین کے ایک مختصر گروہ نے
۔ اختلاف کا جس انداز اور جس زبان میں اظہار کیا ہے، اس نے حسن ظن، اکرام مسلم، اور رواداری کے ان سارے مسلمہ ضابطوں کو
ل کرکے رکھ دیا ہے جن کی تبلیغ اور تلقین میں ان بزرگوں کی عمریں بیت گئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس اور حیرت کا یہ مقام ہے کہ دین و
یت کے ان مسلمات کی پامالی، ان کے ہاتھوں عین اس وقت ہوتی ہے جب وہ دنیا کو سمجھا رہے تھے، کہ دین کی ساری حرمتیں ابدی اور
ی ہیں اور کسی میں بھی ہرگز کوئی استثنا نہیں اور انہی حرمتوں میں ایک مسلمان کی آبرو کی حرمت بھی شامل تھی، لیکن نہ معلوم ان بزرگوں
بلاد میں اس شخص کی عزت اور آبرو اب کیسے مباح ہو گئی ہے، جس شخص کے علم و دیانت کی کل یہ حضرات قسمیں کھایا کرتے تھے، آج وہی
س ان کے نزدیک جاہل، بددیانت اور اقتدار کا حریص ہے، کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب انہی قابل احترام بزرگوں میں سے ایک
رگ نے تحریر فرمایا تھا:۔

"میں تو نہیں جانتا کہ مودودی صاحب نے کہاں پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے، لیکن اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت
ین، نہایت قابل آدمی ہیں اور نہایت وسیع النظر عالم ہیں۔ ان کا مرتبہ صرف اسی پہلو ہی سے اونچا نہیں ہے کہ وہ جدید علوم و افکار
نہایت وسیع نگاہ رکھتے ہیں اور ایک بلندپایہ انشاپرداز ہیں بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت پر نہایت گہری اور وسیع نظر
کھتے ہیں، قرآن کا انہوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے اور برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں، صرف بیضاوی اور جلالین "بقدر نصاب"
ھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے ہیں انہوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف حرف نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھا ہے، صرف ان کے "دورہ" پر
تفا نہیں فرمایا، اسی طرح فقہ، اصول، سیرت، اور رجال کی تمام ضروری کتابیں ان کی نگاہوں سے گزری ہوئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ وہ عربی زبان کو عالمانہ طور پر سمجھتے ہیں، حاطب اللیلوں کی طرح ہوائی تیر تکے نہیں چلاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کام کو وہ جس ذمہ داری
ے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی تقریر بھی اس وقت تک کرنا پسند نہیں کرتے، جب تک
س کے لئے اچھی طرح تیاری نہ کرلیں ـــ اگر ایک ایسے شخص پر بھی کتاب و سنت کے علوم کے بارے میں ہم اعتماد نہیں کر سکتے تو میں نہیں
سمجھ سکتا کہ کتاب و سنت کے علم کے بارے میں اس ملک میں کس شخص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔" (مولانا اصلاحی۔ تنقیدات ۱۴۲)

آج یہی بزرگ مولانا مودودی کو بوالہوس اور نجانے کیسے کیسے القاب اور خطابات سے نواز رہے ہیں، کل انہی بزرگوں نے عزت واحترام سے ان کا ہاتھ "چومے تھے" اور اُن کا گریبان پکڑ کر منصب امارت پر لا بٹھایا تھا۔ اور مولانا مودودی کو یہ خراج تحسین پیش کرنے والے بھی یہی بزرگ تھے:۔

"اس کے برعکس ان لوگوں کو دیکھیے، جن پر خانقاہی طریق تربیت کا پرچھاواں بھی نہیں پڑا ہے۔ میرا اشارہ مولانا ابواللیث صاحب اور مولانا مودودی کی طرف ہے انتہائی رنجدہ اور اشتعال انگیز رویہ کے مقابلے میں جس صبر، جس رزانت، جس شرافت لہجہ اور کظم غیظ اور عفو عن الناس کا مظاہرہ کیا ہے کیا کوئی شخص، اس کا انکار کرسکتا ہے؟ پھر بتائیے کہ اگر مودودی صاحب اور ابواللیث صاحب اپنے مزکیوں اور مزکا کے مقابل میں سخط اور رضا دونوں حالتوں میں سچائی اور انصاف پر قائم رہنے میں بہتر آدمی ثابت ہوسکتے ہیں۔ درانحالیکہ انہوں نے ایک دن بھی خانقاہی طریق پر تربیت نہیں پائی" (تنقیحات، ص۲۳۷)

محترم مولانا اصلاحی صاحب کی یہ رائے غالباً ۱۹۵۵ء تک رہی کیوں کہ یہ اقتباسات جس کتاب سے نقل کئے گئے ہیں اس کے دیباچے کے آخر میں خود محترم مولانا نے "جولائی ۱۹۵۵ء" تحریر فرما دیا ہے، لیکن انہوں نے ۱۹۵۶ء کے اوائل میں یہ خبر دی کہ مولانا مودودی کے طرز عمل اور طرز فکر میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ ان کی اس تبدیلی کے اسباب کیا تھے؟ اس کے جواب میں مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:۔

"لیکن پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد مولانا کے طرز فکر اور طرز عمل میں بڑی نمایاں تبدیلی واقع ہوگئی۔ یہ تبدیلی کچھ تو حالات کی تبدیلی کے نتیجہ کے طور پر واقع ہوئی اور اس کا واقع ہونا ضروری تھا۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ حالات کی نسبت سے کہیں زیادہ بدل گئے ہیں۔ یہاں وہ سیاسی طرز پر سوچنے اور اسی طور پر کام کے نقشے بنانے لگے، ان کے اقدار اور پیمانے بھی آہستہ آہستہ بدلنے لگے یہ پتہ خدائے علام الغیوب ہی کو ہے کہ اس تبدیلی میں اصل دخل کس چیز کو ہے، ممکن ہے پاکستان میں اُن کو ایک روشن سیاسی مستقبل کی جھلک دکھائی دی ہو۔ یہ گمان اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قومی اور بین الاقوامی دونوں ہی میدانوں میں ضرورت اور حقیقت سے زیادہ اہمیت دینے لگے تھے، ان کے پاس بیٹھنے والوں نے بھی ان کو غلط فہمیوں میں مبتلا کیا اور پامسٹری کے ایک ماہر صاحب نے بھی ان کو سبز باغ دکھائے۔ (الفرقان ص۳۱ شوال ۷۶ھ)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا مودودی کو گمراہ، جاہل اور سادہ لوح ثابت کرنے کے لئے مولانا اصلاحی صاحب کے پاس کتنے وزنی، کتنے ٹھوس اور کس قدر جاندار دلائل ہیں[1]۔؟

---

[1] مولانا اصلاحی فرماتے ہیں:۔ مولانا مودودی کے صبر وضبط اور سکون واطمینان کا جب بھی میں نے کوئی اندازہ لگایا تو وہ ہمیشہ اس سے کچھ زیادہ نکلے۔ خود اس بیان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کا مصنف ابھی ابھی ایک طویل قید تنہائی سے نکلا ہے اور گذشتہ رات ہی کو اسے ایک سخت قسم کی اعصابی جنگ سے سابقہ پیش آچکا ہے، نہ غصہ نہ جھنجلاہٹ نہ تلخی اور نہ درشتی بلکہ اس کی بجائے وہی باوقار انداز، سنجیدہ طرز بیان، ٹھوس دلائل اور ٹھنڈا طریق استدلال۔ پس یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیل کی چار دیواری میں نہیں بلکہ اپنی لائبریری کی پُرسکون فضا میں بیٹھ کر یہ بیان لکھا ہے۔ شاید یہ اسی تاثیر کا نتیجہ ہے کہ جب بھی باہر جانے سے قبل مولانا سے رخصت ہونے اور ان کا تحریری بیان واپس کرنے کے لئے ان کے پاس گیا تو معانقہ کے ساتھ ہی میں نے بے ساختہ ان کے ہاتھوں کو چوم لیا جن میں اللہ تعالیٰ نے اظہار حق کی کیسی قدرت ودیعت فرمائی"

(بروایت جناب سلطان احمد بحوالہ چراغ راہ احتجاج نمبر ص ۱۰۔

(ترجمہ ص۱۰ پر)

پاکستان بننے کے بعد مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی کے ساتھ ۲۰ ماہ تک جیل کاٹی، مارچ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک مولانا دوبارہ قید میں رہے اور ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک کا عرصہ اندرونی خلفشار میں گذرا جو زیادہ تر مولانا اصلاحی صاحب ہی کے ساتھیوں کا پیدا کردہ تھا۔ پھر مارشل لاء نافذ ہوگیا۔ اس سارے دور کے حالات خود مولانا اصلاحی ہم سب سے بہتر جانتے ہیں۔ خود ہی ارشاد فرمائیں کہ مولانا مودودی کو اپنا "روشن سیاسی مستقبل" پہلی نظر بندی کے دوران نظر آیا تھا جب کہ مولانا اصلاحی صاحب بھی ان کے ساتھ تھے یا اُس وقت اس مستقبل کی جھلک انہوں نے دیکھی تھی، جب وہ پھانسی، عمر قید اور شاہی قلعہ کی اذیتیں برداشت کر رہے تھے، اور کیا مولانا مودودی کو اپنی سیاسی ترقی کے امکانات اس وقت نظر آرہے تھے، جب خود جماعت اپنے اندرونی بحران کا شکار تھی اور خود مولانا کو اپنی امارت سے بھی استعفیٰ دینا پڑ گیا تھا۔ یا اس وقت انہیں اس مستقبل کا دکھائی دیا تھا جب کہ مارشل لاء نے ملک کی ساری سیاسی سرگرمیوں کو ختم کر دیا تھا؟ ـــــ کیا ان حالات میں کوئی عقل مند انسان اس طرح کے مغالطہ کا شکار ہو سکتا ہے جس کا مولانا اصلاحی ذکر فرما رہے ہیں؟ بدگمانی کی بنیاد پر اتنی بڑی بات گھڑ لینا مولانا اصلاحی جیسے خدا ترس انسان کے لئے ہرگز مناسب نہیں تھا اور غالباً اسی بدگمانی کی روشنی میں جب مولانا محترم نے جماعت اسلامی کی مجلس شاورت کی قرارداد پڑھی تو انہیں اس میں سب سے زیادہ خطرناک بات جو نظر آئی وہ یہ تھی کہ جماعتِ اسلامی نے اپنے سیاسی مستقبل کو حسین تر اور روشن تر بنانے کے لئے دین کی حرمتوں کو ابدی اور غیر ابدی میں تقسیم کر ڈالا ہے اور یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے، اس لئے اس فتنے کا سر کچلنے کے لئے وہ میدان میں آگئے۔ اس بدگمانی نے انہیں اس بات کے سوچنے کی ہرگز مہلت نہ دی کہ شریعت کی حرمتوں کے بارے میں "ابدی" اور "غیر ابدی" یا "قطعی" اور "غیر قطعی" کے الفاظ کے استعمال سے جماعت اسلامی کی فی الواقع مراد کیا ہے؟ اور اگر اس تفریق و تقسیم کی شریعت میں واقعۃً گنجائش نہیں تو اس بات کا بھی جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے تھا کہ جماعت سے یہ غلطی کہیں سہواً تو سرزد نہیں ہوئی؟ کیوں کہ خود مولانا محترم ہی کا ارشاد ہے کہ:

> "حق پر قائم رہنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص سے کوئی غلطی صادر ہی نہ ہو۔ اس کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ متبع ہو اور طالب طریقۂ جاہلیت نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اجتہاد میں غلطی کر جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی امر کو مسلمانوں اور اسلام کے مصالح کے مطابق سمجھے فی الواقع وہ مصالح کے خلاف ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی امر کو روح دین کے مطابق خیال کر کے اختیار کرے اور اس کا گمان ہو کہ یہ کم از کم نعم البدعۃ کے حکم میں داخل ہے۔ لیکن اس کے بعد والے اس کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہو سکیں اور اسے بدل ڈالیں" (تنقیحات ص ـــ)

لیکن مولانا محترم اپنے ہی تحریر کردہ اصولوں کے برعکس صرف ایک شخص کے خلاف ہی نہیں بلکہ پوری جماعت کے بارے میں سوءِ ظن میں مبتلا ہوگئے اور آخر کار یہ بدگمانی شریعت کے ممنوعات میں سے تھی مگر اسے ایک بڑے شر ـــــ جماعت اسلامی ـــــ کا "سر کچلنے" کے لئے گوارا فرما لیا۔ جماعت کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت دستیاب نہ بھی ہو جب بھی مولانا کے لئے غالباً یہ بات اب مباح ہوگئی ہے کہ وہ جماعت کے رہنماؤں کی نیتوں کو کرید کر کچھ غلط قسم کے مفروضات قائم کر کے ان کے خلاف ایک نئی فرد قرارداد جرم تصنیف فرمائیں اور انہیں ملکیت

حاشیہ صفحہ ۱۷ ـ بعض "ذہین" لوگوں نے تو یہ بات تک باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ مولانا مودودی کو "دماغی دورے" پڑتے ہیں۔ کیونکہ جیل میں مولانا کو کچھ اس طرح کی ذہنی اذیتیں پہنچائی گئی ہیں کہ جن کی وجہ سے مولانا محترم کو "دماغی عارضہ" لاحق ہوگیا ہے ـــ اس لئے ان کے فکر و خیال میں "عظیم تبدیلی" واقع ہوگئی ہے۔

ختم نبوت اور سنت کا انکار کرنے والوں سے بھی زیادہ خطرناک بلکہ محرّف دین ثابت کریں۔ لیکن اس کے باوجود اگر یہ حضرات کچھنیا، سخت جان نکلیں تو ان کے اس مقصد پر حملہ کرکے اس کی صداقت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دئے جائیں جو ان کی تحریک کا حقیقی محرک ہے اور جس کی وجہ سے خدا نے ان کی تنظیم کو قوت و شوکت کی دولت سے نوازا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اسلام صرف مسجد کا دین نہیں ہے بلکہ حکومت کا بھی دین ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام کی دعوت ہر معاشرے اور ہر ماحول میں حکومت الٰہیہ یا انقلاب قیادت کی دعوت سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بڑی ہی شدید غلط فہمی ہے بلکہ شدید قسم کی جہالت ہے، جس کی جس قدر جلد اصلاح ہو جائے اچھا ہے" (میثاق جون ۶۳ء)

اس اقتباس میں نہایت محتاط طریق پر اقامت دین کے کام کو شدید جہالت سے تعبیر کیا گیا ہے اب تازہ شمارہ میں یہ "شدید جہالت" ترقی کرکے "خبط" تک پہونچ گئی ہے، فرماتے ہیں :-

"ہمارا خیال ہے کہ ہر آدمی انبیاء کے طریقے پر پورے دین کو لے کر نہیں اٹھ سکتا بلکہ سچ پوچھئے کہ ہم تو اس کو ایک خبط سمجھتے ہیں" (میثاق مارچ)

سر دست اس بحث کو جانے دیجئے کہ انبیاء کے طریقے پر پورے دین کو لیکر اٹھنا ہر شخص کی ذمہ داری ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر شخص کے لئے خود شریعت نے عملی تدابیر کا کیا ضابطہ تجویز کیا ہے؟ اس کی اگر تفصیل معلوم کرنی ہو تو خود مولانا محترم ہی کی تصانیف میں سے "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار"، "اسلامی ریاست۔ اطاعت کی شرائط و حدود"، تفہیمات، توضیحات، اور ان کے ساتھ ساتھ مولانا کی وہ تحریریں مطالعہ فرمائیں جو جماعت کی روددادوں میں درج ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر وقت صرف کرنا بھی تحصیل حاصل ہے کہ سورہ شوریٰ کی آیت شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحاً ۔ ۔ ۔ الآیہ میں "کُمْ" کے مخاطب سارے مسلمان ہیں یا نہیں ان بحثوں کو میثاق کے صاحب علم بزرگ ہم سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی اب کوئی راز نہیں کہ ان اقتباسات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ محض نظری اور اصولی ہے اور اس کا فی الحقیقت کوئی متاثر الیہ نہیں۔ انداز اور پیرایہ بیان خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، ان استنادات کا صاف اور واضح مطلب بس یہ ہے کہ :

"اقامت دین کا وہ کام جو جماعت اسلامی کر رہی ہے وہ ناقابل اعتماد ہے، شدید جہالت ہے اور ایک قسم کا خبط ہے"

اس کے علاوہ کوئی دوسرا مطلب مولانا اصلاحی صاحب کی بے شمار تحریروں کی موجودگی میں ہرگز متعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو کھل کر کہنا پڑا کہ :

- "جماعت اسلامی کے متعلق تو ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لئے اس ملک میں اس سے زیادہ مضر جماعت کوئی نہیں ہے"۔
- "اس نازک موقعہ پر اس بات کو بھی یاد رکھیئے کہ دین اور عقل دونوں سے بعید تر جماعت اس ملک میں کوئی ہے تو جماعت اسلامی ہے"

(میثاق ص۷ دسمبر)

میثاق کے قابل احترام بزرگ نے مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کی جس لب و لہجہ میں خدمت فرمائی ہے وہ ان کے اپنے علم و مرتبہ سے بہت فروتر ہے۔ نیتوں کو کریدنا، غلط مفروضات کی عمارتیں تعمیر کرنا اور بے بنیاد اتہامات[1] لگانا اور پھر ان کی بنیاد پر خدا کے مخلص بندوں کے

---

[1] مولانا محترم نے میاں طفیل محمد پر یہ اتہام لگایا ہے کہ انہوں نے مس فاطمہ جناح کو نعوذ باللہ خدا سے تشبیہ دی ہے۔ ۔ ۔ پھر اس پر مزید تبصرہ۔ باقی ص۱۹ پر

دین، ایمان اور ان کی عزت خاکمبدوش پر جارحانہ حملوں کو اپنا شعار بنا لینا اس آسمان کے نیچے خدائے قادر و توانا کی اس زمین پر ایک بہت بڑی جسارت ہے اور یہ جسارت اس وقت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے، جب کہ خدا کے یہ بندے ان کے ایک ایک مفروضے اور ان کے ایک ایک الزام اور اتہام سے واضح اور کھلے الفاظ میں اپنی برأت کا اعلان کر چکے ہوں۔

مولانا اصلاحی صاحب، مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کے خلاف جب بھی قلم اٹھاتے ہیں ان کا انداز یہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے سارے دلائل کی بنیاد چند من گھڑت مفروضات سوءِ ظنی پر رکھتے ہیں۔ یہی انداز انہوں نے "حکمت عملی" کی بحث میں اختیار کیا اور اسی انداز کو انہوں نے حرمتوں کی اس تقسیم کے باب میں بھی اختیار کیا ہے۔

محترم مولانا امین احسن اصلاحی مجلس مشاورت کی قرارداد کے جن الفاظ پر زیادہ برہم ہیں وہ یہ ہیں:—

"شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھیرائی گئی ہیں، اُن میں بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔"

اس پر مولانا محترم نے جن الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:۔

"شریعت کی حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی، قطعی اور غیر قطعی کی کوئی تفریق و تقسیم نہیں ہے سب حرمتیں ابدی اور قطعی ہیں یہ شیطان کا اٹھایا ہوا فتنہ ہے۔ اگر آج اس کا سر نہ کچل دیا گیا تو شیطان اس حربے سے کام لے کر ساری شریعت کو تاراج کر کے رکھ دیگا۔" (میثاق نومبر)

قرارداد میں جو بات کہی گئی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ بعض حرمتیں تو ایسی ابدی اور قطعی اور اٹل ہیں جن کی حرمت کسی حال بھی اُن سے الگ نہیں ہو سکتی اور بعض حرمتیں ایسی ہیں جن کی حرمت اگرچہ عام حالات میں تو ابدی اور قطعی ہے لیکن اضطرار اور اکراہ یا شدید ضرورت کی وجہ سے ان کی حرمتیں ان سے مرتفع ہو جاتی ہے۔ ابدی اور قطعی کے الفاظ جن معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ بڑے سے بڑا اکراہ اور شدید سے شدید اضطرار حرمتوں سے اُن کی حرمت ہرگز الگ نہیں کر سکتا۔ لیکن حرمتوں کی ایک دوسری قسم ایسی بھی ہے جو اضطرار یا اکراہ یا شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک سقوط قبول کرتی ہیں۔ لیکن آپ غور فرمائیں کہ مجلس مشاورت نے حرمتوں کی اس دوسری قسم کے بارے میں "غیر ابدی" اور "غیر قطعی" کے الفاظ استعمال نہیں کئے —— کیوں؟ اس لئے کہ حرمتوں کی یہ قسم بھی عام حالات میں ابدی اور قطعی ہی ہوتی ہے، اس میں اگر عارضی طور پر استثنا کی صفت پیدا ہوتی ہے تو بعض اضطرار یا شدید ضرورت ہی کی وجہ سے نہ کہ غیر ابدی یا غیر قطعی ہونے کی وجہ سے۔ اس لئے مجلس مشاورت نے ابدی اور قطعی کے الفاظ تو استعمال کئے ہیں لیکن اس لئے یا جماعت کے کسی بھی رہنما نے اپنی کسی تقریر یا تحریر میں

(بقیہ حاشیہ ص۱۸) ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "جب کسی کی غیرت ایمانی مردہ اور بصیرت روحانی سلب ہو جاتی ہے تو اس کو اس طرح کے عجائب نظر آتے ہیں" (ملاحظہ ہو میثاق جنوری) اسی طرح غالباً مدیر تجلی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:۔ "اس جماعت سے وابستہ بعض رسائل مجھے ہمیشہ اپنی گالیوں سے نوازتے بھی رہتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کا بھی کبھی نوٹس نہیں لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان رسالوں کا جماعت اسلامی پاکستان سے شریفانہ معاہدہ ہے کہ وہ جتنی گالیاں میثاق کے ایڈیٹر کو دیں گے فی گالی کے حساب سے پاکستان کی جماعت ان کے اتنے ہی پرچے بیچے گی۔ یہ ان کے معاش اور پیشے کا معاملہ اور میں دوسروں کے پیشے کے معاملے میں مرزا غالب کی طرح بڑا روادار واقع ہوا ہوں۔" (میثاق فروری ص۱۵)

"غیرابدی" یا "غیر قطعی" کی قسم کا کوئی لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ مجلس مشاورت کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ حرمتیں دو قسم کی ہیں، ایک وہ جن کی حرمت کسی بھی وجہ سے ہرگز زائل نہیں ہوتی اور دوسری وہ جن کی حرمت ضرورت اور اضطرار کے موقع پر حلت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ حرمتیں بھی عام حالات میں ابدی اور قطعی ہی ہوتی ہیں۔

یہ صاف اور سیدھی بات تھی جس سے کوئی صاحب علم اختلاف کی جسارت نہیں کرسکتا تھا، لیکن مولانا اصلاحی صاحب نے اس کی بھی تردید کرڈالی۔ فرماتے ہیں کہ کسی بھی حرام چیز سے اس کی حرمت ہرگز الگ نہیں ہوسکتی۔ بڑے دعوے سے ارشاد ہوتا ہے:۔

"شریعت کی کوئی حرمت حکمت عملی، یا عملی ضرورت یا شدید ضرورت یا مصلحت کے عذرات پر حلت میں تبدیل نہیں ہوجاتی بلکہ اکراہ اور اضطرار کی حالت میں اس کو حرام سمجھتے ہوئے احتیاط اور بے دلی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھالینے کی رخصت ہوجاتی ہے"
(ص۲۳ میثاق نومبر)

ان سطروں میں یہ بات بصراحت بیان کی گئی ہے کہ "اضطرار کی حالت میں اس —— (حرام) —— کو حرام سمجھتے ہوئے احتیاط اور بے دلی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانے کی رخصت حاصل ہوجاتی ہے گویا ان کے نزدیک اضطرار کی حالت میں بھی کوئی حرمت سقوط قبول نہیں کرتی۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"اکراہ و اضطرار کے معنے شدید ضرورت کے نہیں ہیں، جو شخص بھی جب چاہے شدید ضرورت کے عذر پر حرام کو حلال بنا لیا کرے بلکہ بے بسی کی اس حالت کے ہیں جس میں گھر جانے کے بعد آدمی کے لئے دو حراموں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی راہ فرار باقی نہ رہ جائے۔ اس صورت میں شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس حرام سے فائدہ اٹھالے جو دونوں میں مقابلۃً اہون ہو"
(میثاق نومبر)

اس سلسلے میں، مولانا کا یہ ارشاد بھی نگاہ میں رہے کہ:۔

"اضطرار و اکراہ کو شدید ضرورت سے تعبیر کرنا اور شرعی حرمتوں کو ابدی اور غیر ابدی یا قطعی اور غیر قطعی کے دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دینا محض تعبیر کی عامیانہ غلطی نہیں ہے بلکہ اسلامی شریعت کے خلاف دیدہ و دانستہ ایک ایسی شرارت ہے جس کی اگر بروقت بیخ کنی نہ کی گئی تو یہ فتنہ بن کر بہت جلد پوری شریعت کو اپنے لپیٹ میں لے لے گی" (میثاق نومبر ص۵)

مولانا محترم کے ان ارشادات کا ماحصل یہ ہے کہ:۔

● —— حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی کی تقسیم اور تفریق غلط ہے البتہ ان کو اہون اور غیر اہون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے بالفاظ دیگر شریعت کی کوئی حرمت ہرگز سقوط قبول نہیں کرتی۔ پھر اہون کے اختیار کرنے کا فیصلہ بھی مضطر کا اضطرار کرتا ہے اس سلسلے میں "شدید ضرورت" کے لفظ کا استعمال اسلامی شریعت کے خلاف "دیدہ و دانستہ" ایک شرارت ہے۔

● شدید ضرورت کو "اضطرار" کے بجائے ہرگز استعمال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اضطرار کا مطلب بے بسی کی وہ حالت ہے جس میں گھر جانے کے بعد آدمی کے لئے دو حراموں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

مولانا محترم کی ان دونوں باتوں پر اچھی طرح غور کر لیجئے اور پھر فیصلہ دیجئے کہ ان سے کوئی ایک بات بھی ایسی ہے جو آپ کے علم و مرتبہ کے شایان شان ہو——

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا شریعت کی حرمتوں میں بعض ایسی ہیں جن کی حرمت کسی وقت اضطراراً مرتفع ہو سکتی ہے۔ مجلس مشاورت کا جواب ں" میں ہے لیکن مولانا اصلاحی اپنے نومبر ۵۸ء کے میثاق میں اس کے جواب میں "نہیں" فرماتے ہیں۔ ان کے نزدیک حرام ہر حال میں حرام ہی رہے گا ی حرمت کسی اضطرار سے مرتفع نہیں ہوگی۔

ہم اپنی علمی مائیگی کے اعتراف کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ مولانا کا یہ ارشاد ناقص اور نامکمل ہے اور ہم باصرار کہتے ہیں کہ بات وہی حق ہے بس مشاورت نے بیان کی ہے اس سلسلے میں اگر آپ اصول شاشی، نور الانوار، حسامی اور مسلم الثبوت اور قدوری وغیرہ کے متعلقہ ابواب نکال یکھیں تو آپ بھی مجلس مشاورت ہی کی بات کو صحیح اور درست پائیں گے، ان کتابوں میں سے چند ایک کے اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں جن مطالعہ سے قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں :-

- اصول شاشی میں ہے کہ :- واما الرخصة ..... فانواعها مختلفة لاختلاف اسبابها وهي اعذار العباد وفي العاقبة تؤول الى نوعين احدهما الفعل مع بقاء الحرمة بمنزلة العفو في باب الجناية وذالك نحو اجراء كلمة الكفر على اللسان مع اطمينان القلب .... وحكمه انه لو صبر حتى قتل يكون ماجوراً لامتناعه عن الحرام تعظيماً لنهي الشارع عليه السلام والنوع الثاني تغيير صفة الفعل بان يصير مباحاً .... وذالك نحو الاكراه على اكل الميتة وشرب الخمر وحكمه انه لو امتنع تناوله حتى قتل يكون اثماً بامتناعه عن المباح وصار كقاتل نفسه

یعنی رخصت کی مختلف اسباب کی بنا پر مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور ان اسباب کا دارومدار انجام کار کے لحاظ سے بندوں کے عذرات پر ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں بنتی ہیں، ایک قسم وہ ہے جبکہ حرام اختیار کرنے کی صورت میں اس کی حرمت باقی رہتی ہے جیسا کہ باب الجنایہ میں معاف کر دینا ہوتا ہے اور اس پہلی قسم کی مثال یہ ہے جیسے اکراہ کے وقت اطمینان قلب رکھتے ہوئے زبان سے کفر کا کلمہ ادا کرنا .... اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مجبور شخص صبر کرے یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے تو اسے اجر ملے گا کیونکہ وہ شارع علیہ السلام کے حکم کی خلاف ورزی سے تعظیماً باز رہا ہے۔

رخصت کی دوسری قسم وہ ہے جس میں حرام فعل کی صفت اباحت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال حالت اضطرار میں مردار کا کھانا شراب کا پینا ہے اگر کوئی مضطر اپنی جان بچانے کی خاطر یہ حرام چیزیں استعمال نہ کرے اور مر جائے تو وہ ایک مباح شے کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوگا۔ اور خودکشی کرنے والے شخص کی طرح خیال کیا جائے گا۔

- اسی طرح نور الانوار میں اکراہ کی مختلف شکلیں اور اس کی مختلف اقسام کی تشریح کرنے کے بعد یہ الفاظ ملتے ہیں :-

والفرق بين الاباحة والرخصة ان في الرخصة لا يباح ذالك الفعل بان ترتفع الحرمة اعني

اباحت اور رخصت میں یہ فرق ہے کہ رخصت میں کسی فعل پر عمل کرنے سے اس کی حرمت مرتفع نہیں ہوتی البتہ اس پر عمل کرنے سے اس کا گناہ نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس اباحت میں حرام فعل کی حرمت ختم ہو جاتی ہے :

- مسلم الثبوت میں رخصت کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے پہلی یہ ہے :-

الاول ما استبيح مع قيام المحرم وقيام حكمه كاجراء كلمة الكفر على اللسان عند الاكراه وفيه

العزیمۃ اعلیٰ ولو علت کان ماجوراً" یعنی رخصت کی پہلی قسم کی رو سے کسی حرام فعل پر عمل کرنا تو جائز ہو جاتا ہے لیکن اس کا حکم اور اس کی حرمت برقرار رہتی ہے، جیسے زبان سے کلمۂ کفر ادا کرنا اور اس میں عزیمت کی راہ اختیار کرنا اولیٰ ہے اور اس صورت میں اگر کوئی مر جائے تو اجر پائے گا ۔

مسلم الثبوت کی چوتھی قسم یہ ہے :۔ والرابع ما سقط مع العذر مع مشروعیتہ فی الجملۃ ویسمّی رخصۃ اسقاط کسقوط حرمۃ المیتۃ المضطر . . . . یعنی چوتھی قسم "رخصت اسقاط" کی ہے، جس میں کسی حرام چیز کے جائز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی حرمت کا حکم بھی ساقط ہو جائے جیسے مضطر شخص کے لئے مردار کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے "

" اصول فقہ کی تقریباً ہر چھوٹی بڑی کتاب کے اندر یہ تقسیم موجود ہے اس سلسلے میں تفسیر ابن کثیر کی یہ صراحت بھی پیش نظر رہے :۔

" . . . . . . غرض ایسے وقت میں خدا کی مہربانی اور نوازش سے یہ حرام اس کے لئے حلال ہے ۔ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں اضطرار کے وقت بھی جو شخص حرام چیز نہ کھائے اور مر جائے وہ جہنمی ہے ۔ (جلد ا صد ۲۲ ۔ مترجم)

ان حوالوں سے یہ بات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ جہاں ایسی ابدی اور اٹل حرمتیں ہیں جن سے ان کی حرمت کسی حال بھی ساقط نہیں ہوتی اضطراراً ان کے اختیار کرنے سے صرف گناہ مرتفع ہوتا ہے وہاں اس بات کی صراحت بھی موجود ہے کہ کچھ دوسری حرمتیں ایسی بھی ہیں جن کو اگر اکراہ کی شکل میں اختیار کیا جائے تو ان کی حرمت حلت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور گناہ بھی نہیں ہوتا اور بعض صورتوں میں ان پر عمل نہ کرنے سے الٹا گناہ ہوتا ہے اور سزا کا خدشہ بھی ۔

ظاہر بات ہے کہ شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں سے حرمت کا ساقط ہو جانا اور ان کا اضطرار کی شکل میں نا بحد اضطرار حلت میں تبدیل ہو جانا اور بعض صورتوں میں ان پر عمل نہ کرنے سے گناہ اور سزا کا مستوجب ہونا اس بات کے ہرگز مستلزم نہیں کہ وہ حرام چیز حرام ہی رہے گی اور بس" اہون" سمجھ کر اختیار کیا جائے گا ۔ لیکن مولانا اصلاحی صاحب کو صدارتی انتخاب کے فیصلے کے اعلان سے قبل تک تو اس بات پر اصرار تھا کہ شریعت کی حرمتوں میں سے کسی سے بھی ان کی حرمت ہرگز مرتفع نہیں ہوتی۔ یہ حرمتوں کی تقسیم یا تفریق شیطان کا پیدا کیا ہوا فتنہ ہے، لیکن جب دو جنوری کی شام اس فتنہ کا "سرکچل" دینے کا اعلان کیا گیا تو مولانا امین احسن اصلاحی نہایت فراخ دلی سے اور ایک فاتحانہ تمکنت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ :

" یہ خیال آپ کے مفتی صاحب کا بالکل غلط ہے کہ قتل کی حرمت بھی ان حرمتوں میں سے ہے جو کسی حالت میں سقوط قبول نہیں کرتی، واضح رہے کہ انفرادی اضطرار میں بالعموم یہی صورت ہے کہ قتل ناحق کی حرمت ساقط نہیں ہوتی لیکن اجتماعی ـــــ اضطرار کی بہت سی حالتیں ہیں جن میں قتل ناحق تو درکنار قتل مومن کی حرمت بھی ساقط ہو جاتی ہے اس کا ذکر قرآن ، حدیث اور فقہ سب میں ہے ۔ (میثاق جنوری)

مولانا محترم کی اس تصریح کے بعد اب فرمایئے مجلس شاورت کی قرار داد پر کیا اعتراض وارد ہوتا ہے ۔ اگر آپ کو بلا وجہ " ابدی " اور" قطعی" کے الفاظ پر ضد ہے تو کم از کم یہ بات تو اب ۔ تقریباً متفق علیہ ہے کہ شریعت کی حرمتیں دو قسم کی ہیں ایک وہ جو کسی بھی صورت میں سقوط قبول نہیں کرتیں بلکہ ان کی حرمت اضطرار اور اکراہ کے دوران ساقط ہو جاتی ہے ـــــ اور یہی نقطۂ نظر جماعت اسلامی کی مجلس شاورت کا ہے ۔ وہ بس ! !

اب مولانا اصلاحی صاحب کے دوسرے اعتراض کا جائزہ لے کر دیکھئے انہوں نے شدید ضرورت کی اصطلاح کے استعمال پر گرفت فرمائی

برکے میثاق میں مولانا شدید ضرورت کو اضطرار سے مختلف لفظ بتاتے ہیں اور اضطرار کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ اس حالت کو قرار دیتے ہیں، جس میں بغیر
نے کے بعد آدمی کے لئے دو حراموں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی راہ فرار باقی نہ رہے ۔

لیکن یہ باتیں بھی مولانا نے صدارتی انتخاب کی کامیابی سے قبل فرمائی تھیں مگر فتح کا اعلان سننے کے بعد جنوری کے میثاق میں اپنی رائے میں
ترمیم فرماتے ہیں ۔

"میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ فقہا جو ضرورت کا لفظ استعمال کرتے ہیں یہ ان کی اپنی اصطلاح ہے اور اس سے مراد
وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اضطرار کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اضطرار کا مفہوم اردو میں ہرگز ضرورت یا شدید ضرورت
سے ادا نہیں ہوتا" (میثاق جنوری)

یہ بات تو اب طے ہو گئی کہ فقہا نے ضرورت کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور فقہا کے استعمال کئے ہوئے معنوں میں اب بھی استعمال ہو سکتا
ہے لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اضطرار کے لفظ کے ہوتے ہوئے فقہا نے خواہ مخواہ ضرورت کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے ۔ دوسرا
سوال یہ ہے کہ کیا اضطرار کا مطلب صرف وہی ہے جو مولانا نے بیان فرمایا ہے ؟ اور کیا یہ مفہوم حکم کی ساری صورتوں پر حاوی ہے ۔ مثال کے طور پر مولانا
فرماتے ہیں ۔

"قلبی اعتقاد جو سقوط قبول نہیں کرتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ظاہر اقرار کے سقوط سے اضطرار رفع ہو جاتا ہے" ص۱۱

محترم مولانا کے نزدیک اضطرار کی بس ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ مضطر بے بسی کی حالت میں دو حراموں میں سے کسی ایک کو اہون سمجھ کر
اختیار کر سکتا ہے مگر مندرجہ بالا مثال کی صورت میں مضطر کے سامنے صرف ایک ہی حرام ہے اور وہ ہے منہ سے کلمہ کفر نکالنا لیکن وہ دوسرا حرام کون سا
ہے جسے ترک کر کے اس کو اختیار کیا جائے گا ۔ اس صورت میں دوسری بات تو صرف یہ ہے کہ مومن ظاہری اقرار پر سہارا ہے اور قتل ہو جائے تو کیا اپنے قتل
کا اختیار کرنا مولانا کے نزدیک دوسرا حرام ہے ۔ ہم تو جانتے ہیں کہ اس حالت میں مومن اگر قتل ہو جائے تو شہید ہوگا ۔ (زندگی لاہور مارچ ۵۹ء)

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علماء نے معمولی معمولی ضرورتوں کے پیش نظر پاسپورٹ پر تصویر کھچوانے کو جائز قرار دیا ہے اور نسخہ جات میں حرام اجزاء
کے استعمال کی عام اجازت دے ڈالی ہے ۔ ہومیوپیتھی کی کوئی دوائی بھی قطرۂ شراب سے پاک نہیں ہوتی لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لینے والے اس
کے استعمال میں ہرگز قباحت محسوس نہیں کرتے اور دینے والے اس کو حلال اور طیب سمجھ کر دیتے ہیں اور اس کے بیچنے کو اپنی معاش کا پاکیزہ ذریعہ جانتے
ہیں ۔ اسی طرح سود کی ہر شکل حرام ہے لیکن استحسان ضرورت اور مصلحت مرسلہ کے اصول بیان کرنے والوں نے سود کی اس شکل کو جائز اور مباح قرار
دیا ہے جو ایک ہمسایہ کسی دوسرے ہمسایہ سے روزمرّہ کے معاملات میں ایک چھٹانک وزنی روٹی بطور قرض لیتا ہے اور پھر ڈیڑھ چھٹانک وزن کی روٹی
واپس کر دیتا ہے ۔

یہ اور اس طرح کی متعدد صورتوں پر مولانا اصلاحی کی اضطرار کی تعریف منطبق نہیں ہوتی ۔ اس لئے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ مولانا نے اضطرار
کی جو تعریف فرمائی ہے وہ ناقص اور ادھوری ہے اور یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مندرجہ بالا مسائل کی ساری صورتیں غلط ہیں ۔ اب ظاہر بات یہ ہے کہ
اس کا فیصلہ بھی اہل علم ہی کر سکتے ہیں چنانچہ اس سلسلے میں چند حوالے نقل کرتا ہوں جس سے اضطرار کی صحیح تعریف بھی معلوم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ
ساتھ "ضرورت" اور "اضطرار" کا باہمی رشتہ بھی واضح ہو جائے گا ۔ سب سے پہلے مولانا عروج قادری مدیر زندگی کا نقطۂ نظر تحریر کرتا ہوں ۔

"اضطرار مجبوری کو کہتے ہیں اور اکراہ زبردستی کو ـــــ اکراہ میں کسی دوسرے شخص کی طرف سے زبردستی ضروری نہیں"
(زندگی ۔ رامپور ۔ مارچ ۶۵ء)

- امام رازی علیہ الرحمۃ ضرورت اور اضطرار کے مفہوم پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:—

اضطر احوج والجئ وھو افتعل من الضرورۃ واصلہ من ضر وھو ضیق۔ یعنی اضطر کے معنی ضرورت مند اور مجبور ہوا کے ہیں اور یہ لفظ ضرورت سے مشتق ہے، اس کی اصل "ضر" ہے جس کے معنی "ضیق" یعنی تنگی کے ہیں۔ (التفسیر الکبیر رازی۔ جلد ۲ صہ)

امام رازی "ضرورت" کی تشریح میں مزید فرماتے ہیں کہ ضرورت دو اسباب سے پیدا ہوتی ہے ایک اضطرار اور دوسرے اکراہ چنانچہ امام موصوف کے الفاظ یہ ہیں:— لما حرم اللہ تعالیٰ تلک الاشیاء استثنا عنھا حال الضرورۃ وھذہ ضرورۃ لھا سببان احدھما الجوع الشدید وان لا یجد ما کولاً حلالاً یسد بہ الرمق فعند ذالک یکون مضطراً الثانی اذا اکرہ علیٰ تناولہ مکرہ فیحل تناولہ۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا تو ضرورت کے وقت ان میں استثنا پیدا کر دیا اور ضرورت دو اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے ان میں سے ایک شدید بھوک ہے جب کہ کوئی حلال کھانے کو نہ پائے جس سے اپنی بھوک مٹا سکے تو اس انسان کو مضطر کہتے ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ جب کسی انسان کو حرام چیز کے کھانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو اس صورت میں بھی حرام کا کھانا اس کے لئے حلال ہو۔

- امام رازی کے مندرجہ بالا قول کی تائید طبری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ:—

قولہ فمن اضطر افتعل من الضرورۃ وغیر باغ نصب علی الحال من من فکانہ، قیل فمن اضطر لا باغیاً ولا عادیاً فاکلہ فھولہ حلالٌ وقد قیل ان معنی قولہ فمن اضطر فمن اکرہ علی اکلہ فاکلہ فلا اثم علیہ

یعنی "اضطر" ضرورت سے مشتق ہے اور "غیر باغ" مضطر کی کیفیت بیان کرنے کے لئے ہے گویا کہ یوں کہا جا رہا ہے کہ جو مضطر ہو اور نہ حد سے تجاوز کرے اور نہ سرکش ہو تو اس شکل میں اگر وہ حرام کھالے تو وہ حرام چیز اس کے لئے حلال ہو جائے گی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فمن اضطر سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی "مکرہ" حرام چیز کھالے تو اس کے کھانے میں اسے کوئی گناہ نہ ہوگا۔ (طبری ج۔

ان تصریحات سے مندرجہ ذیل باتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں کہ:

- ضرورت اضطرار سے مختلف چیز نہیں بلکہ ضرورت اصل ہے اور اضطرار اور اکراہ اس کی دو مختلف صورتیں ہیں۔
- اکراہ میں کسی زبردست کی طرف سے دباؤ کا ہونا ضروری ہے، لیکن اضطرار میں کسی دوسرے شخص کی طرف سے زبردستی ضروری نہیں
- اضطرار کی شکل میں یہ بھی ضروری نہیں کہ مضطر ہمیشہ دو حراموں سے ہی دوچار ہو اور ان میں سے صرف "اہون" کو اختیار کرے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا سابقہ صرف ایک ہی حرام سے پڑے اور جس کو اختیار نہ کرنے کی شکل میں اسے قتل ہونا پڑے تو اس شکل میں وہ صاحب عزیمت اور شہید کہلائے گا۔ اور بعض اوقات شخصی یا اجتماعی زندگی میں شرعی نقطۂ نگاہ سے آسانیاں پیدا کرنے کے لئے کسی مفید کو گوارا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، جیسے پاسپورٹ کے لئے فوٹو کا حاصل کرنا یا ہومیوپیتھی میں شراب کا استعمال وغیرہ۔

ضرورت کا لفظ اتنا جامع ہے کہ صرف اکراہ اور اضطرار کی ان شکلوں پر ہی حاوی نہیں جو مولانا اصلاحی صاحب نے بیان فرمائی ہیں بلکہ سفر، مرض، نسیان، جہل، عام ابتلاء یا کسی فطری یا طبعی نقص وغیرہ کی بنا پر جو انفرادی یا اجتماعی زندگی کے میدان میں احتیاجات پیدا ہوتی ہیں جن کا اثر شرعی احکام پر پڑتا ہے ضرورت کا لفظ ان سب کے تقاضوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

جماعت اسلامی کی مجلس مشاورت نے شدید ضرورت کے لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں فقہاء نے الضرورات تبیح المحظورات کے قاعدے میں استعمال کیا ہے۔ لیکن مولانا اصلاحی صاحب کو اس بات پر شدت اصرار ہے کہ جماعت اسلامی کی مجلس مشاورت۔

..تو اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں یہ عام طور پر اردو میں معروف اور مستعمل ہے اور دوسرے اس لفظ کو استعمال کر کے دین
..لاف دیدہ و دانستہ شرارت کی ہے۔

مجلس مشاورت کے ارکان کی نیت کے راز جاننے کا دعویٰ تو مولانا محترم ہی کر سکتے ہیں اور یا پھر علام الغیوب نیتوں کے راز جان سکتا ہے؟

اس ساری بحث سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا محترم نے جن بنیادوں پر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تحقیق اور تفسیق
..مارت تعمیر کی تھی وہ کس قدر کمزور ہے۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں مولانا نے حرمتوں کو اصولی اور غیر اصولی میں تقسیم کر کے اس بات کا انکار کیا تھا کہ کسی بھی حرمت کو
..طرار سے حلت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ حرام بہرصورت حرام ہی رہے گا لیکن جنوری ۱۹۶۵ء میں تسلیم کر لیا کہ بعض حرمتیں ایسی بھی ہیں جن کی ان کی
..ت بعض حالتوں میں ساقط یا زائل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح نومبر ۱۹۵۶ء میں مولانا محترم نے یہ بات فرمائی تھی کہ شدید ضرورت کے تحت کسی حرام چیز
..حرمت کا سقوط دین کے خلاف دیدہ و دانستہ ایک شرارت ہے لیکن جنوری ۱۹۶۵ء میں ضرورت کو اضطرار کے مترادف قرار دے کر تسلیم کیا کہ ضرورت تو
..اصطلاح ہے اور اضطرار کے حکم میں داخل ہے۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کا بڑا جرم تحریف دین تھا مگر جنوری ۱۹۶۵ء میں فرماتے ہیں کہ:-

"اصل سوال جس پر ان حضرات کو غور کرنا تھا وہ تو یہ تھا کہ صدر ایوب کے مقابل مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ جو جماعت اسلامی نے بعد از
..طرار کیا وہ روئے شرع ٹھیک ہے یا نہیں؟ (جنوری ۱۹۶۵ء)

گویا اب حرمتوں کی تقسیم کا قضیہ بھی ختم۔ "شدید ضرورت" کی اصطلاح بھی درست۔ اب جھگڑا صرف مس فاطمہ جناح کی حمایت کے جواز و عدم
..ز کا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر مولانا اصلاحی صاحب خود اپنے موقف پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دیتے کہ آیا انہوں نے جس والہانہ شیفتگی کے ساتھ
..ب صدر کی حمایت فرمائی ہے وہ ان کے حقیقت شرک اسلامی ریاست" اطاعت کی شرائط و حدود اور اسلامی ریاست۔ کارکنوں کے اوصاف میں
..ہ شدہ اصول و نظریات کے عین مطابق ہے؟

اب ذرا مولانا محترم کے مندرجہ بالا سوال پر بھی غور کر لیں لیکن اس سے پہلے خود مولانا موصوف کی تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرما لیں کیونکہ
..ہیں اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک مختصر راہ اختیار کرنی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

> "غیر منقسم ہندوستان میں جب کہ ہم نے اپنا دستور بنایا تھا اس وقت ہم نے انگریزی نظام کے ساتھ ہر قسم کے تعاون
> کو حرام قرار دیا تھا اس لئے کہ ملک کے سیاسی نظام کے اندر ہمارے لئے اس بات کی گنجائش موجود تھی کہ ہم براہ راست اپنے
> نصب العین کے مطابق ملک کے نظام کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کر سکتے تھے، پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم انگریزوں کی گاڑی پر
> قانع رہتے یا ملک میں اس نوعیت سے تبدیلی کے لئے جدوجہد کرتے جس نوعیت کی تبدیلی دوسری سیاسی جماعتیں پیدا کرنے کی کوشش
> کر رہی تھیں لیکن فرض کیجیے کہ اسی زمانہ میں نازیوں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہوتا اور اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہوتا کہ ہندوستان
> پر جاپان یا جرمنی کا قبضہ ہو جائے گا اور ان کی حکومت میں ہمارے لئے نظام حق کے قیام کی جدوجہد کے اتنے مواقع بھی نہ
> مل سکیں گے۔ جتنے انگریزی حکومت میں موجود ہیں تو ہم انگریزوں کے نظام کو جرمنوں اور جاپانیوں کے حملے سے بچانے کی ضرور
> کوشش کرتے اس لئے نہیں کہ ایسی صورت میں ہمارے لئے باطل سے تعاون جائز ہو گیا ہے بلکہ اس لئے کہ جب دو برائیوں میں
> سے کسی ایک برائی کا اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے اور خیر کی راہ مسدود ہو جائے تو شریعت اور عقل دونوں کا فتویٰ یہ ہے
> کہ ایسی شکل میں اس برائی کو اختیار کیا جائے جو ہمارے اپنے نصب العین کے پہلو سے ہلکی ہو۔ (تنقیحات صفحہ ۲۴۴)

اس اقتباس کو دوبارہ پڑھیے اور فیصلہ دیجئے کہ صدارتی انتخاب کے موقع پر جماعت اسلامی نے محترمہ خاتون کی حمایت کا جو فیصلہ کیا تھا، کیا وہ مولانا اصلاحی کے انگریزوں کے نظام کی حمایت کے فتوے سے مختلف تھا؟ ایک طرف صدارتی نظام تھا، دوسری طرف پارلیمانی نظام، جس کے اندر اس کے امکانات تھے کہ جمہور کا اقتدار دین و اخلاق کی قدروں کا احترام کرے گا یا مطلق العنانی اور جمہوریت کے حدود عمل سب کو معلوم ہیں، جماعت اسلامی نے جمہوری یعنی پارلیمانی نظام کو ترجیح دی، کیونکہ اس کے نزدیک عقل و شریعت کا یہی فیصلہ تھا! مولانا اصلاحی صاحب تو اب نے انگریزوں کے جس نظام کی حمایت کا مشورہ دیا تھا ملحدانہ اور مشرکانہ پارلیمانی جمہوریت کا نظام تھا اور یہ مشورہ غیر مسلم گریز کے ایک کافرانہ ملک کے لئے دیا تھا اور جماعت اسلامی نے جس نظام کی حمایت کی وہ مسلمان کہلا کر (مشرکانہ اور ملحدانہ نہیں) غیر صالح پارلیمانی جمہوریت کا نظام تھا وہ بھی مسلمانوں کی غالب اکثریت کے ایسے ملک کے لئے جو بفضلہ تعالیٰ مسجد کی طرح مقدس ہے! جماعت اسلامی کی رائے میں پاکستان میں اسلام کے لئے راہیں اسی وقت کھل سکتی ہیں جب یہاں جمہوریت کا عملی دخل ہو۔

اب قارئین خود ہی انصاف کر کے بتائیں کہ کس کا "جرم" زیادہ سنگین ہے۔ جماعت اسلامی کا یا مولانا اصلاحی صاحب کا؟ اور فکر و عمل کا عبرت ناک تضاد کس کے یہاں ملتا ہے!

کاش! محترم مولانا امین احسن اصلاحی اپنے موجودہ موقف پر نظر ثانی فرما سکتے!

(صفحہ کا بقیہ)

الشیخ محمد (نزہتہ الخواطر، جز سادس ص ۳۳) بھائی شیخ محمد کی قرأت سے پڑھی تھی،

شیخ محمد غالباً شاہ ولی اللہ کی دوسری شادی کے بعد پھلت منتقل ہو گئے تھے، مولوی سید ظہیر الدین احمد کا بیان ہے کہ:۔

"وہ ہمیشہ پھلت ہی میں رہے" (دہلی اور اس کے اطراف) ص ۶۸

مگر مولوی عبدالحیٔ لکھتے ہیں:۔

وانتقل بعد وفات ابیہ الی بڈھانہ فسکن بھا مات سنۃ ثمان ومائتین والف ودفن فی الجامع الکبیر بقریۃ بڈھانہ"	اپنے والد کی وفات کے بعد بڈھانہ منتقل ہو گئے اور وہیں رہے ۱۲۰۸ھ میں وصال ہوا اور بڈھانہ کی جامع مسجد کے متصل دفن کئے گئے۔

نزہتہ جلد ۶ ص ۴۷۲

بڈھانہ اور پھلت ضلع مظفر نگر (یوپی، بھارت) کے دو گاؤں ہیں، شاہ ولی اللہ کا مولد اور ننہال بھی پھلت ہے شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ اہل اللہ کا مزار بھی یہیں ہے، پھلت میں آج بھی وہ کمرہ محفوظ و مقفل ہے جس میں شاہ ولی اللہ کی ولادت ہوئی تھی ہم نے ان دونوں مقامات کی زیارت کی ہے!

دعوتِ انبیاء کا ایک بنیادی پہلو

محمد حسام الدین شریفی

ابتدائے آفرینش سے لیکر شبابِ عالم تک اللہ تعالیٰ نے مختلف اوقات میں، جب کوئی قوم راہِ راست سے بھٹک کر کفر و شرک کی ظلمتوں میں ڈوب گئی اور انسانیت سے ناتہ توڑ کر حیوانیت و بہیمیت سے اُس نے رشتہ استوار کر لیا تو اس گم کردہ راہ قوم کی رہبری اور رہنمائی کے لئے اپنے خصوصی نمائندے بھیجے۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگی انسانوں کے سدھارنے اور کائنات کے ذرے ذرے کی اصلاح کے لئے وقف کر دی۔ رُشد و ہدایت کا یہ سلسلہ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء والمرسلین جنابِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک چلتا رہا اور آپ پر اس سلسلے کی تکمیل کر دی گئی۔

تمام انبیاء کی دعوت و تبلیغ کا جائزہ لینے سے ایک بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے جسے اُن کے پیغام کا بنیادی نقطہ قرار دیا جا سکتا ہے اُن کی ساری دعوت و تبلیغ اسی ایک نقطے اور محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہے جسے احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کا نام دیا جاتا ہے اور یہی وہ قدرِ مشترک اور بنیادی پتھر ہے جس پر انبیاء نے اپنے ارشاد و ہدایت کی عمارت تعمیر کی ہے۔

تمام انبیاء نے اپنے پیغام کے ذریعے ان دونوں چیزوں کو ختم کرنے کی کوشش کی کہ اسی کے نتیجے میں کفر و شرک کو ختم کر کے توحید و ایمان کی عمارت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے کیونکہ جب تک کوئی قوم احساسِ کمتری کا شکار رہتی ہے وہ اپنے مقام کو بھلا کر ہر ادنیٰ چیز کے سامنے اپنے آپ کو لپٹ کر دیتی اور سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے پتھروں کو تراش کر ان کے سامنے سر ٹیک دیتی اور مظاہرِ قدرت کی پرستش میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جب وہی قوم احساسِ کمتری سے نکل کر احساسِ برتری میں مبتلا ہوتی ہے تو پھر اس کی نظر میں کوئی جچتا ہی نہیں جسے وہ خدائی کے منصب کے اہل قرار دے سکے اور بالآخر خدا کا انکار کرتے ہوئے خود کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتی اور انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرنے لگتی ہے۔

انبیائے کرام نے اپنی دعوت کے ذریعے بنی نوعِ انسان کو احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کے اسی چکر سے نکال کر اس کی عزتِ نفس کو بحال اور خودداری کے جذبے کو بیدار کیا اور اس میں احساسِ ذمہ داری پیدا کیا۔ اسے سمجھایا کہ تمہیں مخلوقات میں مقامِ امتیاز بخشا گیا اور اشرف المخلوقات کے اعزاز سے نوازا گیا ہے پھر تم کیوں اپنی عزتِ نفس کو پامال کرتے اور خودداری کو ٹھیس پہونچاتے ہو؟ کیوں اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھروں کے سامنے سر جھکاتے ہو؟ کیوں شمس و قمر کو پوجتے اور خدا کے نیک اور برگزیدہ بندوں کی پرستش کرتے ہو؟ قانونِ خداوندی کے مقابلے میں کیوں غیروں کے قانون کو اپنے اوپر نافذ کر کے احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کیا تمہارے شایانِ شان ہے؟

انبیاء نے اس معاملے کو ادھورا نہیں رہنے دیا بلکہ بنی نوعِ انسان کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی کہ جس طرح انسان احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اپنے مقامِ بلند کو کھو بیٹھتا ہے اسی طرح انسان کے لئے یہ بھی مناسب نہیں کہ وہ اپنے مقام سے اونچا اٹھنے کی سوچنے لگے اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کا نعرہ بلند کر کے دعویٰ خداوندی کرنے لگے ——— خداوندی کا دعویٰ کرنے والوں کا جو حشر ہوا اُس سے تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی بخوبی واقف ہے۔

"بندگانِ خاص نے اپنی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں جس احساسِ کمتری اور احساسِ برتری سے لوگوں کو نجات دلائی اُس کی کارفرمائی صرف

اسی ایک میدان تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعے اگر ایک طرف کفر و شرک کو ختم کر کے زر و جواہر ایمان کی دولت سے لوگوں کو مالا مال کیا تو دوسری طرف زندگی کے مختلف شعبوں میں اسی کی وساطت سے اصلاح و تطہیر فرمائی اور لوگوں کے دل و دماغ سے ان تصورات کو ختم کر کے عزتِ نفس اور خود داری کی نئی عمارت کی بنیاد رکھی۔

تہذیب و تمدن، معاشرت اور ثقافت کے معاملے میں بھی نبی آخر الزماں نے امتِ مسلمہ کو احساسِ کمتری کا شکار ہونے سے بچایا۔ عزتِ نفس کی بحالی اور خود داری کے جذبے کو پروان چڑھایا اور اس احساس کو اس کے اندر اس حد تک بیدار کیا کہ پھر ان کی نظر میں اپنی زبان، اپنا لباس اور اپنے رہن سہن کا طریقہ ہی سب کچھ تھا۔ غیروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے بھی وہ روادار نہ تھے۔ عمرؓ جیسا جلیل القدر خلیفہ بیت المقدس پہونچتے وقت اپنے سیدھے سادے لباس میں امرائے فوج کے اصرار کے باوجود ذرہ برابر تبدیلی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ـــــ پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ حسن و خوبصورتی کے لئے انسانی شکل و صورت کو بگاڑنے اور اس پر مختلف مصنوعی اشیاء کا خول چڑھانے سے بھی روکا گیا کہ یہ بھی احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے :

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ
(مسلم عن عبداللہ بن مسعودؓ)

آدمی کا شمار ان لوگوں ہی میں کیا جاتا ہے جن سے اُسے تعلق ہو جن کے اقوال و افعال کو اور طرزِ معاشرت کو اس نے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا رکھا ہو اور قیامت کے روز اُس کا حشر و نشر بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی ہوگا دنیا میں جن کی پیروی کیا کرتا تھا۔

لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المتشبّھین من الرجال بالنساءِ وَالمتشبّھاتِ من النساءِ بالرجالِ　(بخاری عن ابن عباسؓ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتے ہیں اور اُن عورتوں پر بھی جو مردوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتی ہیں۔

وہ لوگ جو اپنے چہرے کو بے ریش کرنے کے علاوہ لباس، وضع قطع، چال ڈھال، غرض ہر طرح عورتوں سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش ناکام کرتے ہیں اور وہ خواتین جو نہ صرف اپنے سر کو، بالوں کے بوجھ سے، ہلکا کرانا پسند کرتی ہیں بلکہ اپنے لباس، وضع قطع اور بول چال میں بھی مردانہ صفات پیدا کرنے کی خواہش مند ہیں انہیں اپنے نبیؐ کے اس فرمان پر بھی غور کرنا چاہیئے جس میں ان افعال میں مبتلا خواتین و حضرات کے لئے زبانِ مبارک سے لعنت کے الفاظ نکلے ہیں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو صاف طور پر منع فرما دیا کہ وہ اپنے سروں کو بالوں کی نعمت سے محروم نہ کریں سر کے بال ختم کرانے اور کم کرانے کی بھی اُن کو ہرگز اجازت نہیں :

نھیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان تحلقَ المرأۃُ رأسھا　(نسائی)

حضرت علیؓ نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو سر کے بال منڈانے سے منع فرمایا۔

ایک پیش گوئی میں نبی کریمؐ نے اس حالت و کیفیت کو بھی بیان فرما دیا جب امت مسلمہ بے غیرتی اور بے حمیتی میں مبتلا ہو کر احساسِ کمتری کا اس درجہ شکار ہو جائے گی کہ وہ اپنی شکل و صورت تک بدل ڈالے گی۔ بود و باش، معاشرت اور ثقافت، بول چال، کھانے پینے، پہننے اور اوڑھنے اور تعلیم و تعلم غرض زندگی کے تمام شعبوں میں وہ یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید کو اپنے لئے لازم قرار دے دے گی۔ ان کی اچھی باتوں کو اختیار کرنے کے بجائے ان کی برائیوں کو اپنا لے گی اور ان تمام معاملات میں وہ اپنی عقلِ سلیم سے کام لینے کو گناہ کبیرہ سمجھے گی۔ ارشاد فرمایا

لتتبعنّ الذین من قبلکم شبراً بشبرٍ و ذراعاً بذراعٍ حتی لو دخلوا فی جحر ضبٍّ لا تبعتموھم ـــ قلنا یا رسول اللہ الیھود والنصاری؟ قال فمن؟

(مسلم عن ابی سعید الخدریؓ)

(ایک وقت وہ آئے گا جب تم احساس کمتری میں اس درجہ مبتلا ہو جاؤ گے کہ اپنے تمدن و معاشرت کو غلط تصور کرتے ہوئے، پہلی امتوں کے طریقے کو (بعینہٖ) اختیار کرو گے بالشت بھر اور ہاتھ برابر (یعنی معمولی سا فرق بھی نہیں رہنے پائے گا) یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں بھی گھسیں تو تم بھی ان کے ساتھ گھس جانے کی کوشش کرو گے۔ ہم نے دریافت کیا کہ پہلی امتوں سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟

حدیثِ مذکورہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب امت مسلمہ سوچنے سمجھنے کی زحمت گوارا کئے بغیر یہود ۔۔اریٰ کے طریقوں کو اپنانے کی کوشش کرے گی۔ لباس میں ان کی پیروی کو اپنے لئے باعثِ عزت، ان کی زبان اور ادب کو وحیِ آسمانی کی طرح ۔۔ک سمجھ کر سیکھنے لگے گی، سر کھلا رکھنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھنا ۔۔ پینے میں اُن کے طریقے کو اختیار کرنا ذریعہ اظہارِ تہذیب و تمدن سمجھنے لگے گی ـــ حالانکہ امت مسلمہ کی اس نقالی اور اندھی تقلید کا یہود و نصاریٰ پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا بلکہ الٹا اثر ہوتا ہے اور اس طرح دھوبی ۔۔ا گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا ـــــ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں اس طرح بیان فرمایا:

ولن ترضیٰ عنک الیھود ولا النصاریٰ حتیٰ تتبع ملتھم۔
(القرآن الحکیم)

یہود و نصاریٰ ہرگز تم سے راضی نہیں ہو سکتے، تاوقتیکہ تم ان کی ملت میں شامل نہ ہو جاؤ۔

(صـ ۳۷ کا بقیہ)

۔۔ہی ہونا چاہئے اور اسلامی ادب (پاکستانی ادب) کیا ہے؟ اُس پر ہم خاصی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں۔

پاکستانی ادب وہی ادب ہے جس میں پاکستان کے مقصدِ وجود (اسلام) کی روح کوئی ہوتی ہے جو جامد نہیں نمو پسند ہے جو خشک نہیں ۔۔ن ہے، جو تنگ نہیں وسیع بلکہ بے حد و بیکراں ہے جو رنگین ہے مگر فحش نہیں ہے۔ جس کے مطالعہ سے ذوق و وجدان کو آسودگی میسر آتی ہے اور ۔۔ و فکر کو روشنی ملتی ہے۔

اسلام پسند ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی مثالیں دی جائیں تو بات بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم اشارہ ۔۔ دیتے ہیں۔ کہ پاکستانی ادب میں جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، علامہ اقبال کی شاعری اس کا بہترین نمونہ اور شاہکار ہے، ناول اور افسانہ میں ۔۔م حجازی اور نعیم صدیقی پاکستانی ادب کے نمائندے ہیں اور علوم دین میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں پاکستانی ادب کا قابلِ فخر نمونہ ہیں:

۔ کی مسلمان نے ترقی جو فرنگی بن کر ؛ وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلمان کی نہیں (ا ستسلامی مرحوم)
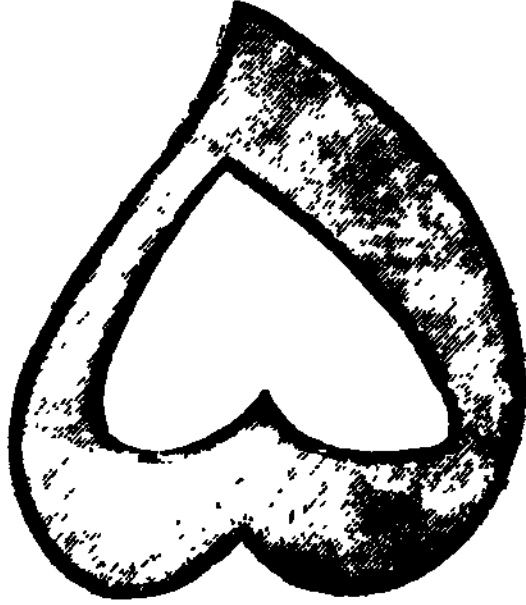
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit

ماہر القادری

پاکستانی ادب کیا ہے

پاکستانی ادب پر گفتگو کرنے سے پہلے پاکستان کے بارے میں اختصار ہی کے ساتھ سہی مگر وضاحت ضروری ہے کہ خود پاکستان کیا ہے؟ اس
حت سے یہ فائدہ ہوگا کہ پاکستانی ادب کی تعریف اور اس کی صفات و خصوصیات متعین کرنے میں سہولت پیدا ہو جائے گی یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ۔

"درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"

مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھل کی شناخت کے لئے خود درخت کا تجرہ نسب بیان کرنا پڑتا ہے۔ آج جس ملک اور حکومت کا نام پاکستان ہے ۔
سے پہلے یہ خطۂ زمین برطانوی ہند میں شامل تھا اور مختلف صوبوں اور دیسی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ملت
سے نہیں دین و تہذیب سے بنتی ہے۔ اس لئے ہم ہندوستان کے رہنے والے مسلمان ایک جداگانہ ملت ہیں، جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے ان صوبوں کے
سے جو خطۂ زمین متشکل ہوگا اس میں ہماری اپنی حکومت ہونی چاہئے۔ تاکہ ہم وہاں اسلامی قدروں کے مطابق اپنی حکومت چلا سکیں اور زندگی بسر کر سکیں
اس خطہ کا نام "پاکستان" تجویز کیا گیا، بڑی سخت آئینی کشمکش کے بعد اس جدوجہد میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ متحدہ ہندوستان تقسیم ہوا اور
ستان وجود میں آگیا، مگر یہ تقسیم یوں ہی خاموشی کے ساتھ نہیں ہوگئی۔ مسلمانوں کو بچ بچ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا۔ یہ داستان بڑی المناک ہے
کی تفصیل بیان کرکے بزم ادب کو میں بزم ماتم بنانا نہیں چاہتا۔

اس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ پاکستان اسلام کے لئے بنا ہے اور اسلام کے نام پر بنا ہے۔ پاکستان کے مطالبے سے پہلے متحدہ
دوستان میں مسلم لیگ بھی موجود تھی اور مسٹر محمد علی جناح مرحوم بھی رہتے تھے، مسلم لیگ نیم سرکاری قسم کی جماعت سمجھی جاتی تھی اور مسٹر جناح ایک
ن پسند ماہر وکیل کی حیثیت سے مشہور تھے، اسلام کے نام پر جب پاکستان کا مطالبہ کیا گیا، اس کے بعد مسلم لیگ کو مسلمانوں میں قبول عام حاصل ہوا اور
ر محمد علی جناح کو ملت نے "قائد اعظم" تسلیم کیا۔

مسلم لیگ کی غیر معمولی مقبولیت اور کامیابی مسٹر محمد علی جناح کی ممتاز قیادت کی عظمت و ہر دلعزیزی اور پاکستان کا وجود غرض یہ کہ سب اسلام
رہین منت ہیں کہ اسی مقدس نعرے کے طفیل میں یہ کامیابیاں اور عزتیں حاصل ہوئی ہیں۔

- اسلام جب پاکستان کا مقصد وجود قرار پایا تو ظاہر ہے اس ملک کا ادب بھی اسی کے مقصد وجود کا ترجمان اور آئینہ دار ہونا چاہئے، مختصر لفظوں
یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ادب دراصل پاکستانی ادب ہے اور پاکستانی ادب وہی ادب ہو سکتا ہے، جس میں اسلامی افکار اور اسلامی اقدار جلوہ گر
محسوس و مشہود ہوں۔

"اسلامی ادب" کا نام زبان پر لاتے ہی ایک اور بحث چھڑ جاتی ہے کہ کیا ادب بھی اسلامی اور غیر اسلامی ہو سکتا ہے اور ادب کی وحدت اور

آفاقیت کو کیا کفر و اسلام کے خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے ؟ اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ کائنات میں ہمہ گیر وسعت کے باوجود "خوب و ناخوب ، شریف و غیر شریف جھوٹ اور سچ ، دن اور رات ، سفید و سیاہ ، تلخ و شیریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دو عالم ہونا ، کی فطری تقسیم ملتی ہے ۔ اسی تقسیم پر ہمارے شعور اور تجربہ کی اساس قائم ہے اور اس تقسیم و تجزی کے باوجود کائنات کی وحدت بھی اپنی جگہ ثابت ہے ۔

جن لوگوں کو "اسلامی ادب" کا نام کھٹکتا ہے ، وہ ادباء کے تین گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں ، پہلا گروہ اُن مذہبی لوگوں کا ہے جو اسلام کے بارے میں محدود تصور رکھتے ہیں ۔ حالانکہ اسلام ہندومت ، بدھ ازم ، عیسائیت ، یہودیت ، زرتشتیت اور دوسرے مذاہب سکھ اور شنٹو وغیرہ کی طرح "مذہب" نہیں ہے بلکہ "الدین" ہے جس کے ترجمہ کے لئے ــــــــــــ اور کسی زبان و ادب میں "الدین" کا مترادف اور ہم معنی لفظ موجود نہیں ہے اور کسی زبان و ادب میں "الدین" کا مترادف اور ہم معنی لفظ ہوتا کہاں سے ، جب کہ کسی قوم ، ملک اور زبان میں "الدین" کا تصور ہی سرے سے نہیں پایا جاتا ۔

"مذہب" ایک محدود اصطلاح ہے جو چند بنیادی عقائد اور پوجا پاٹ کی رسموں سے عبارت ہے اس کے مقابلے میں "دین" انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے ، زندگی کے کسی شعبہ کو بھی ہم "دین" کے حدودِ عمل سے خارج اور مستثنیٰ نہیں کر سکتے ـــــ "ادب" کا بھی زندگی سے تعلق ہے اس لئے زندگی کے دوسرے شعبوں اور حلقوں کی طرح "ادب" کو دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا ۔

صحابہ کرام کی زندگیاں اس کی گواہ ہیں کہ اسلام لانے کے بعد اُن کی پوری کی پوری زندگی بدل گئی ۔ اُن کی سیاست ، معاشرت ، تجارت ، ثقافت اور ادب بھی کچھ دین کے ماتحت ہو گیا ، جاہلیت کے زمانے میں عرب کے شعراء نسل و رنگ اور وطنیت پر فخر کرتے تھے ، شراب خواری ، قمار بازی اور بدکاری کو طرح طرح سے سراہتے تھے ، صنفِ نازک کے جسمانی اعضا کا شعروں میں مزے لے لے کر بیان کرتے تھے ۔ یہ شعراء بادۂ تصوف اور صہبائے معرفت نہیں ۔ سچ مچ کی شراب پیتے تھے ان کے یہاں شراب کا ذکر بطور استعارہ نہیں کیا گیا ، بلکہ واقعہ کے طور پر کیا گیا ہے ۔ طرفہ کہتا ہے : ۔

وما زال تشرابی الخمور ولذتی ۔۔۔ وبیعی انفاقی طریفی ومتلدی

میرا ہمیشہ کا شغل قسم قسم کی شرابیں پینا ، مزے اڑانا اور نئے پرانے مال کو بیچنا اور دھڑلے سے ، خرچ کرتے رہنا ہے ۔

امرؤ القیس (بن حجر الکندی) اپنی محبوبہ کی تعریف یوں کرتا ہے : ۔

ھصرت بفودی راسھا فتمایلت ۔۔۔ علیّ ھضیم الکشح ریا المخلخل

میں نے اس کی زلفیں پکڑ کر جو اپنی جانب جھکایا تو وہ جھک گئی ، اور عالم یہ تھا کہ اس کی کمر پتلی اور اس کی پنڈلیاں فربہ اور بھاری تھیں ۔

جاہلیت کے عرب شعراء جب وصل و خلوت کے معاملات و واقعات نظم کرتے ہیں تو شرم و غیرت کی بساط لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں اور رمز و اشارہ کی بجائے برہنہ گوئی سے کام لیتے ہیں ۔ جن عرب شعراء کو قبول اسلام کی سعادت نصیب ہوئی اُن میں سے بعض نے تو شعر کہنا ہی ترک کر دیا اور جن شعراء نے شعر گوئی کے سلسلہ کو جاری رکھا اُن کی شاعری کا رنگ بھی بدل گیا ۔

حضرت کعبؓ اور حضرت حسانؓ نے دورِ جاہلیت اور عہدِ اسلام میں شاعری کی ہے اس لئے ان کا شمار "مخضری شعراء" میں ہوتا ہے اسلام لینے کے بعد بادہ و شاہد کی بجائے اُن کی شاعری کے موضوعات نعتِ رسولؐ اور اخلاق و شائستگی کے مضامین ہو گئے اس تفصیل پیش کرنے کا مقصود یہ تھا کہ صحابہ کرام نے اسلام کو یہ سمجھ کر قبول کیا تھا ۔ کہ ہماری پوری کی پوری زندگی کو مسلمان ہونا ہے "یہاں تک کہ شعر و ادب اور مزاح و ظرافت کو بھی اسلامی اخلاق کا عکاس و ترجمان بننا ہے ۔

دوسرا گروہ جو "اسلامی ادب" میں کھٹک محسوس کرتا ہے وہ مغرب زدہ حضرات کا گروہ ہے۔ جنہوں نے مغرب کی عینک سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اور اُن کے خوب و ناخوب کا معیار بہت کچھ تہذیب زدہ اور مغربیت آلودہ ہے یہ وہ فن کے شیدائی ہیں۔ جو "آرٹ" کے اعتبار سے مولانا جلال الدین رومی اور تان سین کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتے ہیں۔ شعر ہو، موسیقی و مصوری ہو، اور بت گری ہو، ان کو تو بس صنعت اور لطف و لذت چاہیئے۔

تیسرا گروہ اُن معترضین کا ہے جو مشترک، نیم ملحد، ملحد اشتراکی اور مادہ پرست ہیں۔ ان کی غالب اکثریت کو "اسلام" سے کد اور عناد ہے وہ اللہ کے نام سے بدکتے اور بھڑکتے ہیں۔

حیرت ہے کہ جو حضرات اسلامی اور غیر اسلامی ادب پر وحدتِ ادب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی طنز فرماتے ہیں وہ "اشتراکی ادب" کو کس طرح گوارا کر لیتے ہیں اور انہیں اشتراکی اور غیر اشتراکی ادب میں، وحدت کے مجروح ہو جانے کا کوئی خطرہ اور اندیشہ نظر نہیں آتا یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ اشتراکیت تو اس کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ شعر و ادب میں اس کی ترجمانی ہو سکتی ہے۔ مگر اسلام کو اس حق سے نہ جانے کیوں محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ لوگوں کی تنگ نظری اور نادانی ہے اگر اشتراکیت ادب کے قالب میں ڈھالی جا سکتی ہے تو اسلامی افکار بھی ادب کا قالب اختیار کر سکتے ہیں۔

آج کی دنیا میں کتنے بہت سے اشتراکی ادیب اور اشتراکی شعراء پائے جاتے ہیں یہ لوگ اپنے کو اشتراکی کہنے میں کسی قسم کا کوئی عار محسوس نہیں کرتے بلکہ فخر سمجھتے ہیں جب ایک ادیب اپنے کو اشتراکی کہہ سکتا ہے اور وہ اپنے مسلک کو نہیں چھپاتا اور مختلف پیرایوں میں اشتراکیت کا ذکر کرتا ہے ـــ تو کوئی شخص اپنے کو اسلامی ادیب کہتا ہے تو اس نام کو سن کر لوگ کیوں چونکتے ہیں اور بعض پیشانیاں کیوں شکن آلود ہو جاتی ہیں ــ اشتراکیت سے نسبت باعثِ فخر اور اسلام سے نسبت وجہ ندامت و عار! اس احساس کمتری میں جو مسلمان شاعر اور ادیب مبتلا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ توبہ کے ساتھ اپنے ایمان کی تجدید کرے۔

اسلامی ادب پر ایک یہ طنز کی جاتی ہے کہ کیا اس میں غسل و وضو کے مسائل پیش کئے جائیں گے اور ادب کو مولانا اشرف علی تھانوی کا ـ ـ بہشتی زیور بنا یا جائے گا؟ اس قسم کی طنزیں بڑے اوچھے پن اور علم و فن سے بے خبری کی دلیل ہیں، اور اگر یہ بات نہیں ہے اور جان بوجھ کر یہ نشتر چھوڑا جاتا ہے تو یہ کھلی ہوئی عصبیت اور جانب داری ہے اور کم سے کم اہل علم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔

اشتراکی ادب میں کیا ماسکو کے واٹر ورکس اور محکمہ حفظانِ صحت کے بائی لاز پیش کئے جاتے ہیں اگر نہیں کئے جاتے اور اشتراکی ادب اُس ادب کا نام ہے جس میں اشتراکی قدروں کی ترجمانی کی جاتی ہے تو اس طرح اسلامی ادب میں بھی اسلامی قدروں کی عکاسی کی جائے گی، اب رہے غسل و وضو کے مسائل تو یہ مسائل تو بے شک بیان نہیں ہوں گے۔ مگر غسل و وضو میں جو طہارت و نظافت کی روح کار فرما ہے۔ اُس کی جھلک اسلامی لٹریچر میں ضرور آئے گی۔

ادب اور اخلاق

اسلامی ادب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اخلاقی پابندیوں کے سبب اسلامی ادب خشک اور جمود پسند ہوگا یہ جواب بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے اس سلسلہ میں فلسفہ اخلاق اور نفسیات کی بحث چھڑ جانے سے یہ داستان پھیلتی اور دراز تر ہوتی چلی جائے گی اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔ سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا ہے کہ کیا اخلاق اور نیکی میں یبوست اور جمود پایا جاتا ہے؟ اگر اخلاقی پابندیوں کے بعد زندگی خشک اور جامد ہو جاتی ہے تو انسان کے مقابلے میں حیوانوں کی زندگیاں زیادہ رنگین اور دلپسند ہونی چاہئیں کہ وہ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہیں اور ان کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی امتیاز اور تصور ہی سرے سے نہیں پایا جاتا اس دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان مل سکے، جو حیوانی زندگی کو رشک اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔

اس عالم اسباب میں "پابندیوں" سے آدمی کو مفر نہیں مثلاً یہ اخلاقی احساس ہے جو انسان کو اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانے اور اُن کی ستر پوشی کے لئے مجبور کرتا ہے اور اس پابندی اور مجبوری پر کوئی یہ پھبتی چست نہیں کرسکتا کہ اس پابندی کے سبب انسان کے جسمانی حسن میں کمی واقع ہوگئی اور جسم کی عریانیت کے مقابلے میں ستر پوشی خشک اور بے رنگ چیز ہے۔

سامنے کی بات یہ ہے کہ لوگ۔ بڑی اک خاتون اور بلوسے "کٹ گھروں" کی کھڑکیوں پر "کیو" میں کھڑے ہونے کی پابندی گوارا کرتے ہیں اور اس پابندی سے ان لوگوں کی قطاروں میں کتنی شائستگی پیدا ہوجاتی ہے یہی حال "ادب" کا ہے کہ یہ اخلاقی پابندیاں ادب کو شائستہ اور مہذب بناتی ہیں۔ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہونے کے بعد "ادب" "بے ادب" ہوجاتا ہے اور کوئی شائستہ اور مہذب آدمی ادب میں بے ادبی کو پسند نہیں کرسکتا۔

جہاں تک جمالیاتی ذوق کا تعلق ہے، سب سے بڑا حسن تو "نیکی" اور "خوش اخلاقی" میں پایا جاتا ہے۔ شجاعت، سخاوت، عفت و عصمت ایثار و ہمدردی ۔۔۔۔ ان صفات کا تصور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس تصور میں کتنا حسن اور دلکشی ہے؟ ایک جوان عورت آپ کے سامنے آتی ہے جو شباب و رعنائی کا مجسمہ اور حسن و خوبی کا پیکر ہے اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اس عورت نے اپنے شوہر کو قتل کردیا تھا تو اس بات کے سنتے ہی اُس عورت کو آپ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے اور اس کی خوبصورتی بھیانک اور کریہہ نظر آئے گی، اس مثال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نیکی حسین اور بدی بدصورت ہوتی ہے۔

اسلامی ادب چونکہ نیکی کا علمبردار اور منبع ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بڑا حسن و جمال پایا جاتا ہے۔ اور اسلامی ادیب و شاعر کا جمالیاتی ذوق بڑا پاکیزہ اور اعلیٰ ہوتا ہے، شراب نوشی، سود خواری، بدکاری، رشوت ستانی اور اس قسم کی تمام دوسری برائیوں میں جو کشش ہے وہ نفس کے غیر تقاضوں کے سبب ہے اس کشش کا بہت کچھ دارومدار سفلی جذبات پر ہے، جب بھی جذبات کے اس طوفان کا زور ٹوٹتا ہے اور یہ دور ختم ہے، تو آدمی اپنے اندر انفعال اور ندامت کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ نفس کی طرح طرح کی حیلہ سازیوں اور تاویلوں کے بعد بھی ضمیر مطمئن نہیں ہوتا اس کے برعکس نیکی کا جذبہ لازوال ہے۔ اس مسرت کو کوئی جوکھوں نہیں۔ اس لئے یہ بات عین واقعہ کے مطابق ہے کہ اسلامی ادب اُن موضوعات کو پیش کرتا ہے جن میں دائمی مسرت پائی جاتی ہے اس احساس سے جوان اور بوڑھے یکساں طور پر اکتساب مسرت کرتے ہیں۔

جس کسی نے بھی جوانی کو "دیوانی" کہا اس نے گھٹیا قسم کی بات کہی۔ جب ادب میں جوانی کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ جوانی آوارگی اور عشق کا نام ہے اور یہ زمانہ آدمی کے ٹھوکریں کھانے کا ہے، اس قسم کا ادب ہوس کارانہ ادب ہے جس کے پڑھنے سے نوجوانوں کو غیر ذمہ دارانہ اور بے راہ روی کی شہ ملتی ہے اسلامی ادب نوجوانوں کو نہ تو اس قسم کے بڑھاوے دیتا ہے اور نہ بے راہ روی پر انہیں اُکساتا ہے۔ اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلامی ادب جوانوں کو پاک بازی، نیکی، سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کا درس دیتا ہے کہ زندگی میں یہی زمانہ کام کرنے، سیکھنے اور بننے کا، اسی دور میں انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل ہوتی ہے، جو کوئی نوجوانی میں بگڑ گیا، اُسے پوری زندگی بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

جسمانی خوبصورتی کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ حسن تناسب اعضاء کا نام ہے بالکل اسی طرح ادب کا حسن بھی خیال و اظہار کے تناسب کا نام ہے، جو بات کہی جائے دلنشین انداز میں سلیقہ کے ساتھ کہی جائے۔ لفظوں کا برمحل استعمال، زبان و روزمرہ کی صحت، خیال و اظہار میں پورا ربط و ہم آہنگی ادب کے یہ وہ عناصر ثلاثہ ہیں جن سے ادب میں حسن کشش اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اگر کوئی خیال پھیلا کر بیان کیا گیا ہے، تو یہ اطناب ایسا نہ ہو کہ پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس کرنے لگے اور "اطناب" کی بجائے "ایجاز" اختیار کیا گیا ہے، تو یہ اس حد تک نہ پہونچ جائے کہ قاری کا احساس کے ذہن وقت کریں گھٹن ہونے لگے۔

قرآن کریم کا موضوع "ہدایت" ہے اس لئے وہ صحیفۂ اخلاق و ہدایت، مکمل ترین ضابطۂ حیات اور مقدس دستورِ زندگی ہے مگر ساتھ ،ادب کے اعتبار سے بھی قرآن نطق و گویائی کے خالق کا شاہکار ہے، عرب اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان دانی کے سامنے ساری دنیا کو زنگا سمجھتے تھے، قرآن کریم کی آیات سن کر انہوں نے اپنے شاعروں کے قصیدے (معلقات) کعبہ کی دیوار سے اتار لئے، قرآن کریم کے اس لہ کوئی اس کی ایک آیت ہی کا جواب پیش کردے آج تک کسی نے قبول نہیں کیا۔ علامہ اقبال نے تعریف تو مرد مومن کی فرمائی ہے کہتے ہیں :-

آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

مگر اس تعریف میں قرآن کریم کے لہجہ اور آہنگ کی یکتائی کا بھی ذکر آگیا، قرآن کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بانۂ وسلاسۂ نہام" میں اپنا جواب نہیں رکھتے، حضورؐ کا ارشاد ہے :-

"اوتیت بجوامع الکلم"

۔ مجھے جوامع کلم دیئے گئے ہیں ——— "جوامع کلم" کی تعریف یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مفہوم کو کم سے کم الفاظ میں حسن و خوبی کے بیان کردینا۔ کلماتِ نبوی کی جامعیت اپنی جگہ بے مثال ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرام کی تقریریں اور خطبات ہیں، خاص طور سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبات ادب عالیہ کا مثالی نمونہ ہیں، پھر بعد کے دور میں سینکڑوں ادیب اور اہل قلم پیدا ہوئے ہیں۔ جن کا ب نگارش اور طرزِ تحریر زبان و ادب کی جان ہے اور فصاحت و بلاغت جن پر ناز کرتی ہے۔ امام شافعیؒ، زمخشریؒ، غزالیؒ، ابن خلدونؒ فیؒ۔ ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ جیسے بلند پایہ انشا پردازوں اور ادیبوں کے کارناموں سے اسلامی ادب کی تاریخ معمور ہے۔

اسلامی ادب اتفاقی واقعہ کے طور پر یکایک ظہور میں نہیں آگیا ہے۔ اس سے صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے جو ادب اس قدر شاندار ماضی اور اتنا عظیم الشان ماضی رکھتا ہو جس کی بنیادیں اس درجہ پائیدار اور استوار ہوں اس ادب کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس ادب سے غفلت اہل علم و ادب کا کتنا عظیم نقصان ہے۔

بدان وادب اور . . . !

شاعری، ناول نویسی اور افسانہ نگاری ادب کی ایک شاخ ہے، یہ نہیں ہے کہ ادب تمام تر شعر و افسانہ کا نام ہے مگر آج کل ذہنوں میں "ادب" کا عام تصور شاعری، ناول، ڈرامہ اور افسانہ سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ ہر وہ یہ کتاب یا مقالہ جس میں "ادبیت" پائی جاتی ہے، ادب میں شمار کیا جائے گا، ایک شخص خالص الہیات پر مقالہ لکھتا ہے اور اس میں وہ عناصر ملتے ہیں سے ادب ترکیب پاتا ہے تو وہ مقالہ ادبی سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس دوسرا شخص رومانی افسانہ لکھتا ہے مگر اس میں زبان و بیان کی غلطیاں پائی جاتی ۔ جملے غیر مربوط ہیں، عبارت جگہ جگہ کسی غیر زبان کی کتاب کا ناقص ترجمہ معلوم ہوتی ہے ان کمزوریوں کے سبب اس رومان انگیز افسانہ کو "غیر ادبی" ۔ دیا جائے گا۔

کس چیز میں ادبیت اور شعریت پائی جاتی ہے اور کس میں نہیں پائی جاتی۔ اس کا بہت کچھ تعلق وجدان صحیح سے ہے۔ جس طرح ہم کہتے ہیں فلاں بات کو عقل عمومی صحیح تسلیم نہیں کرتی اسی طرح کسی نثر پارے یا شعر کے بارے میں ذوق و وجدان ہی فیصلہ دیتے اور حکم لگاتے ہیں۔ مثلاً ۔ الشعراء محمد ابراہیم ذوق دہلوی کے اس شعر کو۔

واہ رے شورِ جراحت خوب ہی چھڑکا نمک ۔۔۔۔ ہڈیاں میری تہا کس کس مزے سے کھانے ہے

وجدان صحیح ہرگز پسند نہیں کرسکتا۔ اس شعر میں زبان و روزمرہ اور گرامر کی کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ مصرعہ اولیٰ میں تو صنعت پائی جاتی ہے لیکن

اس میں شعریت کا وہ درد پتا نہیں جس کسی شخص کو یہ شعر پسند آتا ہے۔ اس شخص کا وجدان مریض اور اس کا ذوق غیر صحیح ہے۔ وجدان و ذوق کا معاملہ کچھ
و تبسم کا ہے کہ آسمان پر قوس قزح کو دیکھ کر کتوں اور بھینسوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا مگر انسان اُس کی رنگتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور وہ اس لئے
ہ انسانوں کے اندر جمالیاتی ذوق و وجدان پایا جاتا ہے۔

عرب کے مشہور شاعر فرزدق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس شعر پر ۔۔۔

وَجلِ السیول عن الطلول کانّہا
زُبُرٌ تجد متونہا اَقلامہا

بے ساختہ سجدے میں گر پڑا۔ یہ دلیل ہے شاعر کے وجدان کی شدتِ احساس کی!

قرآن کی تفسیر ہو، اخلاقیات و الٰہیات ہو، تاریخ و فلسفہ ہو۔ افسانہ اور ناول ہو غزل یا نظم ہو جس میں ادبیت و شعریت پائی جائے گی
و کو ادب میں مقام دیا جائے گا۔ ہم نے شعر و افسانہ کی ایسی کتابیں پڑھی ہیں جن میں کوئی لطف بیان نہیں۔ روزمرہ اور زبان کی غلطیوں سے ہر صفحہ
بریز، ان کتابوں کے مطالعہ کے دوران وجدان کو صبر آزما کوفت سے دوچار ہونا پڑا ہے ان کتابوں کے مقابلے میں ایسی کتابیں بھی ہماری نظر سے گزری ہیں
ن کا موضوع اخلاقیات کی تبلیغ ہے۔ بعض میں فقہ و تفسیر کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ مگر اُن میں بڑی ادبی دلکشی نظر آئی۔

"اسلامی ادب" صرف تبلیغ اخلاق اور انسانی قدروں کے احترام کا نام نہیں ہے۔ تقدیس فکر و خیال اور پاکیزگی موضوع کے ساتھ "اظہار"
(EXPRESSION) بھی خوب سے خوب تر ہونا چاہئے، عروس جمیل کے لئے لباس حریر بھی بہت ضروری ہے۔

شعر و ادب میں الفاظ کی نشست، ترتیب اور دروبست ساز کے پردوں کی طرح ہوتا ہے۔ جس شعر میں نغمگی نہیں اور جس نثر پارے کا لہجہ نرم و
ریں اور موضوع سے ہم آہنگ نہیں اُس پر ادب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے اسلامی ادب خشک و بے کیف نہیں۔ رنگین، دلکش اور مترنم
تا ہے۔

دلکشی اور جاذبیت اسلامی ادب کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔

اسلامی ادب کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں "رومان" بھی ہوتا ہے۔ مگر کیسا رومان؟ جسے پڑھ کر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی خلوتیں اور
تیاں خیالی طور پر بھی ہوس آلودہ نہ ہونے پائیں۔ محبت کے پیشنگاروں کے ساتھ غیرت و حیا اور شرافت و انسانیت کے تقاضے بھی ملحوظ رہنے چاہئیں۔ اصل
ربات کا سلیقہ سے کہنا ہے۔ جواز ہوس کے واقعہ کو بھی اس انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہئے کہ اسے پڑھ کر اصل واقعہ تو معلوم ہو جائے مگر ذہن
کر ہوس ناکی کی طرف مائل نہ ہوں۔

اسلامی ادب اور "ترقی پسند ادب" میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے کہ "ترقی پسند ادب" میں معاشرے کی برائیاں اس انداز میں بیان کی جاتی ہیں کہ
برائیوں سے نفرت کی بجائے دلچسپی اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلامی ادب میں برائیوں کا ذکر اس طرز پر ہوتا ہے کہ اصل واقعات کے اظہار کے ساتھ وہ
برائیاں قاری کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں اور طبیعت اُن سے نفرت کرتی ہے۔

وہ جو غالب نے کہا ہے ۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو بادہ و ساغر اور جام و مینا کے استعارے شعر و سخن میں ناگزیر ہیں۔ ان استعاروں سے ایک طرف تو شاعری میں رنگینی پیدا ہوتی ہے اور

خاکی (مدور) ـــــ

جو راستہ ہے ترے راستے سے ملتا ہے　　جو انجمن ہے تری انجمن ہے کیا کہنے
دکھا رہے ہیں جنوں کو خرد کا آئینہ　　یہ اہلِ ہوش کا دیوانہ پن ہے کیا کہنے
عجیب رنگ بلا کشش غضب کا جمال　　بہشت ہے کہ تری انجمن ہے کیا کہنے

زکی زاکانی ـــــ

حلقۂ طوق بنے چاک گریبانوں کے　　آپ کے بعد بُرے حال ہیں دیوانوں کے
گھر سے ہر شخص نکلتا ہے یہاں سنگ بدست　　کون رہ سکتا ہے اس شہر میں دیوانوں کے
ہم نے مانا کہ وفا کیش نہیں ہے دنیا　　پھر بھی انساں ہی کام آتے ہیں انسانوں کے
کاش مل جاتا کوئی اہلِ کرم زاکانی　　ہم فقیر آ کے ہوئے شہر میں سلطانوں کے

ہنر کیفی ـــــ

ناز کرتی تھیں زمانے کی بہاریں جن پہ　　اب چمن میں وہ گل تر نہیں دیکھے جاتے
کاش! اشکوں کو میسر ترا داماں آ جائے　　خاک میں ملتے یہ گوہر نہیں دیکھے جاتے

شفیق اُونگی　　سوئے تھے نشیمن میں بس اتنی تو خبر ہے　　جاگے تو نظر آئے گرفتار قفس میں

مری خاطر جہاں میں آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں　　مرے ہمراہ رہ کر آپ کیوں مشکل میں پڑتے ہیں

دمِ شکوہ وہ نادم ہوں یہ منظر کون دیکھے گا　　وہ محشر تو بھگت لیں گے یہ محشر کون دیکھے گا
نگہبانوں، گھر والوں کا اچھا ڈر کیا تم نے　　تمہیں لے جائیں گے دل میں چھپا کر کون دیکھے گا

برہمنا تقدرت قاصر (امرت سر)

مفلسی اور وہی آہ و فغاں آج بھی ہے　　منعمی اور ہمہ عیش جہاں آج بھی ہے
ظلمت شر میں نہاں آج بھی ہے جلوۂ خیر　　گرم پیکار بہاروں سے خزاں آج بھی ہے
اوج پرواز بشر پر بھی بشر کی منزل　　خود بشر ہی کی نگاہوں سے نہاں آج بھی ہے
دولتِ علم و ہنر ہے سرِ معراجِ کمال　　آدمیت کا مگر قحط یہاں آج بھی ہے

راقب حسین راغب میرٹھی

ہشیار میرٹھی

کہتے ہیں کہ ایک شاعر نے حضور اقدس کی مدح میں قصیدہ پڑھا آپ نے خوش ہو کر فرمایا "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" یعنی شعرا خدا کے شاگرد ہوتے ہیں یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس کی صداقت میں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا ایک شاعر خواہ کتنا ہی ذی علم اور ہونہار ہو اُس وقت تک اچھا شعر نہیں کہہ سکتا جب تک کہ عالم قدس کی جانب سے اشارہ نہ ہو، شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک فطری اور دوسرا اکتسابی۔ فطری شاعر وہ ہوتا ہے جو پیدائشی طور پر قدرت سے موزوں طبیعت رسا ذہن، بلند تخیل اور آمد کا جوہر لے کر آیا ہو ایسا شاعر حاضر طبیعت اور زود گو ہوتا ہے اس کے کلام میں روانی اور جوش بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے، اکتسابی شاعر وہ ہوتا ہے جسے فطری طور پر یہ اوصاف نہ ملے ہوں، جس کی طبیعت میں آمد نہ ہو آورد ہو اور اپنے علم و محنت کے بل بوتے پر شعر کہتا ہو ایسا شاعر کم گو ہوتا ہے اس کے کلام میں وہ روانی، اثر اور جوش نہیں ہوتا جو ایک فطری شاعر کے کلام میں ہوتا ہے۔

میرٹھ دہلی سے تیس میل کے فاصلہ پر گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں واقع ایک قدیم شہر ہے دریائے جمنا ضلع میرٹھ اور دہلی کے درمیان حد فاصل ہے گنگا اور جمنا کے بیچ (DOABA) کے شہروں میں سب سے اچھی آب و ہوا اسی شہر کی ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے اس کو بہت بڑی فوجی چھاؤنی بنایا تھا جس سے ان کا مقصد دار السلطنت دہلی کی حفاظت بھی تھا آزادی ہند و پاکستان کے بعد بھی اس کی وہی اہمیت ہے بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے، یہ پرگنہ، تحصیل، ضلع اور کمشنری چاروں صورتوں میں ایک ہی نام میرٹھ سے موسوم ہے دہلی کے قریب ہونے کی وجہ سے دہلی جیسی تہذیب و تمدن ہے ہر وہ انقلاب جو دہلی میں آیا میرٹھ پر بھی ساتھ ساتھ اثر انداز ہوا بالفاظ دیگر دہلی اور میرٹھ کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میرٹھ ہی سے شروع ہوئی تھی، کمشنری میرٹھ عموماً اور ضلع میرٹھ خصوصاً مردم خیز خطہ ہے یہاں بڑی بڑی سیاسی، مذہبی اور ادبی ہستیاں پیدا ہوئیں اس خطہ کے شاعروں اور ادیبوں میں شاہ نصیر (استاد شہنشاہ دہلی) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، حکیم مولا بخش قلق، مولانا رحیم الدین (مصنف قاطع برہان) سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی، مجدد وقت مولانا شوکت، مولوی محمد اسماعیل، ندا دگلاؤٹی، اطہر اور رنجیتی و ہاپوڑی ماسٹر قدر (جانشین و فرزند مولانا شوکت) اور بابائے اردو مولوی عبدالحق بڑی قابل قدر ہستیاں ہوئی ہیں۔

میرٹھ کی اردو شاعری کی تاریخ میں سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی (اردو میں بیان اور فارسی میں یزدانی تخلص تھا) اور مجدد وقت مولانا شوکت کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا میرٹھ میں اردو شاعری کے دو اسکول مانے جاتے ہیں، ایک بیان یزدانی اسکول اور دوسرا مجدد وقت مولانا شوکت اسکول، دونوں اساتذہ باکمال تھے لیکن وہی فطری اور اکتسابی شاعری یا آمد اور آورد کا فرق۔ بیان یزدانی کی زود گوئی اور آمد کا یہ عالم تھا سنا ہے کہ کئی آدمیوں کو ایک ساتھ بٹھا کر اشعار کا املا کراتے تھے، ۱۸ - ۱۹ سال کی عمر میں ایک عجیب دماغی

ن کراچی   جون ۶۵ء

میں مبتلا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے آواز کا دھماکہ برداشت نہ ہوتا تھا اور روشنی سے وحشت ہوتی تھی اندھیرے میں پڑے رہتے تھے
ن شباب سے عمر بھر گوشہ نشین رہے گھر سے کہیں مشکل ہی سے جاتے تھے میرٹھ سے باہر کہیں نہیں گئے شہر میں کسی دوست یا شاگرد کے ہاں
تو پالکی میں بیٹھ کر شام کو جاتے اور صبح کو واپس آ جاتے لیکن اخبارات کی ادارت کے سبب سیاسی وملکی معاملات سے باخبر رہتے ،
ادب میں کسی کے شاگرد نہ تھے داغؔ اور امیرؔ کے ہم عصر تھے دربار رام پور سے بلاوا آیا مگر بیماری کے سبب نہ جا سکے ۔

مولانا شوکتؔ اپنے علم وفضل کی وجہ سے مجدد وقت کہلاتے تھے بیانؔ یزدانی کے معاصر تھے دونوں اساتذہ اور ان کے
دوں کے درمیان خوب خوب مقابلے ہوتے تھے ، مگر نہایت شائستہ اور تہذیب کے دائرے میں مولانا شوکتؔ کے کلام میں آمد کم اور آورد
ف زیادہ ملتا ہے !

میں نے جب ہوش سنبھالا تو ماسٹر انورؔ ، مولانا ندرتؔ ، اکبرؔ وارثی ، منشی شمس الدین شمسؔ ، ضیاء الاسلام عیاںؔ اور عبدالمجید
یار کا دور تھا ماسٹر انورؔ ، اکبرؔ وارثی اور مولانا ندرتؔ تقریباً گوشہ گیر ہو چکے تھے اب سوائے آخر الذکر کے سب اللہ کو پیارے ہو
ہیں ، عبدالمجید ہشیارؔ صاحب ماسٹر انورؔ کے شاگرد ہیں ، آپ ایک فطری شاعر ہیں مگر اساتذۂ قدیم کی طرح قدرت کی ستم ظریفیوں کے
۔ جہاں تک علم وفضل کا تعلق ہے زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں گندری بازار میرٹھ شہر میں برتنوں پر قلعی کرنے کی دکان ہے خود دن
تن مانجھتے رہتے ہیں اور دکان پر شاگردوں کا ہجوم رہتا ہے ۔ برتن مانجھتے جاتے ہیں اور اصلاح کرتے جاتے ہیں ، غزل گو ہیں اور
، الفاظ پڑھتے ہیں اگر جگرؔ کی طرح ترنم سے پڑھتے تو خدا جانے کیا مقام حاصل کر لیتے میرٹھ میں ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں
پہنچتی ہے ، افسوس کہ بوجہ افلاس میرٹھ کے دوسرے اساتذہ کی طرح ان کا بھی کوئی مجموعۂ کلام اب تک شائع نہیں ہو سکا مجھے میرٹھ
سے ہوئے سترہ سال ہو چکے ہیں ان کے کلام کا بیشتر حصہ جو مجھے یاد تھا بھول چکا ہوں ۔ بہرحال چند شعر سردست حاضر ہیں ۔

کہتے ہیں جسے خواب نمونہ ہے فنا کا ۔۔۔ اس بھیس میں مل لیتا ہوں یارانِ عدم سے

کیا کہوں پہلو میں رکھ لینے کے قابل ہو گیا ۔۔۔ عکس سے کر تیرا آئینہ مرا دل ہو گیا
وہ دمِ آخر یہ کہہ کر میری بالیں سے اٹھے ۔۔۔ ہم سے آنکھیں پھیر لیں ہشیارؔ غافل ہو گیا
نالے فضائے دہر میں گونجیں گے حشر تک ۔۔۔ میں غمزدہ رہوں نہ رہوں داستاں رہے
وقتِ اخیر جن سے فنا کا سبق ملا ۔۔۔ وہ چند سانس حاصلِ عمرِ رواں رہے
عشق آئینہ بنا حسن کی رعنائی کا ۔۔۔ اب تو منہ تکتی ہے دنیا تیرے شیدائی کا
عشق میں ذلت ورسوائی سے بچنا کیسا ۔۔۔ عشق تو نام ہے خود ذلت ورسوائی کا
وہ عیادت کو اگر آئیں مکافات تو ہو ۔۔۔ آدمی بات پہ مرتا ہے مگر بات تو ہو
ان کی صورت دیکھ کر حیران ہوں خاموش ہوں ۔۔۔ ابتدائے بیخودی ہوں انتہائے ہوش ہوں
دم بدم کاندھا بدلتے ہیں عزیز واقربا ۔۔۔ موت کے ہاتوں سبک ہو کر وبال دوش ہوں
باعث بیتابیٔ دنیا کیوں نہ ہو میرا سکوت ۔۔۔ میں کسی مایوسِ حسرت کا لب خاموش ہوں
کیا بتاؤں عشق نے کس حال کو پہنچا دیا ۔۔۔ سب مجھے ہشیارؔ کہتے ہیں مگر بیہوش ہوں

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

یہ اب سے تقریباً ۲۷-۲۸ سال پہلے کی بات ہے، جلد ترجمان القرآن اُن دنوں حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا تھا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جدوجہد کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا جو تبلیغی جماعت کا غالباً سب سے پہلا عمومی تعارف تھا۔ یہ سعادت مولانا مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" کے حصہ میں آئی۔ مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف نے تبلیغی جماعت کی رہنمائی کا فرض انجام دیا، میں نے ان کا نام سب سے پہلے (غالباً) ملتان سے سنا کہ سکھر میں تبلیغی جماعت کے جلسے ہو رہے تھے وہاں جماعت اسلامی کی کتابوں کی دکان بھی قائم تھی، مولانا مرحوم نے جماعت کی بک اسٹال کو جلسہ گاہ سے اٹھوا دیا اس خبر کو سن ——— یہ حقیقت معاً سامنے آئی کہ بڑے مرتبہ کے لوگوں کو بھی بعض معاملات میں غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں!

کراچی میں مکی مسجد تبلیغی جماعت کا مرکز ہے، میں جس علاقہ میں رہتا ہوں، وہاں سے یہ مسجد بہت سے بہت دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہوگی، جمعہ کی نماز زیادہ تر اسی مسجد میں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہتی ہے حضرت مولانا محمد یوسف ——— کی تقریر کئی بار اسی مسجد میں سُنی، ایک بار اُن کی قیام گاہ پر خاص طور سے تعارف ہوا، بڑی محبت کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور خاکسار کو قدرے غور سے دیکھا! اُن کی آخری بار زیارت کو بھی دو سال ہو رہے ہیں، اپنی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ ہارون الرشید کے کئی بیٹے تھے ایک بیٹے نے تخت و تاج کو چھوڑ کر درویشی سنبھالا۔ حضرت مولانا مرحوم نے اپنے وعظ میں ایثار کا درس دیتے ہوئے یہ بھی کہا ——— کہ "مزدوری دو، مزدوری لو، یہ ہوئے نہیں"! ان کے وعظ و ارشادات کا خلاصہ اور لب لباب یہ تھا کہ لوگ ایثار سے کام لیں اور لینے کے بجائے دینے کا جذبہ ابھاریں تو ایسا کرنے سے ایک طرف نفس کا تزکیہ ہوگا اور دوسری طرف نفسا نفسی اور معیشت و مسابقت کی رسہ کشی سے چھٹکارا مل جائے گا! اُن کے وعظ کے دوران یہ خیال ابھرا کہ ہارون الرشید کا کوئی ایک لڑکا ہی تھا جس نے تخت و تاج چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی اور مزدور کام کر کے اپنی مزدوری وصول نہ کرے گا تو بےچارہ کھائے گا کیا مگر معاً ذہن اس طرف گیا کہ وعظ و نصیحت میں نیکی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے ایسی باتوں کو گوارا کر لیا جاتا ہے!

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغی جماعت کے کام کو جس مقام پر چھوڑا تھا اُن کے لائق جانشین اور سعادت مند فرزند مولانا محمد یوسف نے اسے منزلوں آگے پہونچا دیا، مولانا الیاس صاحب اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے کہ وہ تبلیغی وفود کو یورپ، امریکہ اور جاپان تک میں گشت کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، مولانا مرحوم کی یہ پیش گوئی صحیح اور مطابق واقعہ ثابت ہو گئی، اہل اللہ کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ بعض اوقات آنے والے واقعات ان کے آئینۂ ادراک میں منعکس ہو جاتے ہیں۔

کراچی کی مکی مسجد میں ہر طرف سے تبلیغی جماعتیں آتی رہتی ہیں، اُن کے خلوص و ایثار، تواضع و فروتنی، ذکر و شغل اور نماز سے شغف کو دیکھ کر طبیعت اثر قبول کرتی ہے، ایک بار راقم الحروف بھی تبلیغی جماعت کے وفد کے ہمراہ شہر سے باہر کسی کی بستی میں گیا تھا اور ان نیک لوگوں کے ساتھ ایک رات گزاری تھی!

کوئی شک نہیں تبلیغی جماعت کی جدوجہد سے لاکھوں مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت ہوئی ہے، دنیا کے گوشوں میں ان کے وفود جاتے ہیں اور اچھا اثرات چھوڑ کر آتے ہیں، ان کے دینی عقائد بھی پختہ ہیں۔ مشرکانہ رسوم و بدعات جن کا مسلمانوں میں خاصہ چلن ہے، اُن سے کوسوں دور! بے نمازیوں

باقی صفحہ ۶۱ پر

ے جو مجھے ہدایت کرتا ہے کہ میں اپنے اور دوسر
وں کے اندر جھانک کر ارباب دانش و بینش کا
نصب العین پورا کروں۔ ایتھنز کے لوگو! میں
تمہاری عزت کرتا ہوں اور تم سے محبت رکھتا ہوں
لیکن میں اطاعت صرف خدا کی کروں گا، تمہاری نہیں! اور
جب تک مجھے زندگی اور قوت حاصل ہے میں یہ تعلیمات
پھیلانے سے ہرگز باز نہیں آؤں گا۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ
خدا کا حکم ہے اور میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ میری
فرمانبرداری خدا سے عظیم تر کوئی بھلائی اس ریاست میں
نہیں پائی گئی۔ اے حاکمانِ ایتھنز! اگر آپ لوگ یہ
سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر آپ کسی کو اپنی
اسنرزندگیوں پر ملامت کرنے سے روک سکیں گے تو
آپ غلطی پر ہیں۔ فرار کا یہ طریقہ نہ تو ممکن ہے،
عزت مندانہ، آسان اور شریفانہ راستہ
یہ نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو بے بس
کر دیں؟ بلکہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بہتر
بنائیں۔ اب ہمارے جدا ہونے کی گھڑی آ
گئی ہے اور ہم اپنے اپنے راستے پر مڑ جانے
والے ہیں ــــ میں مرنے کے لئے اور آپ
جینے کے لئے!
کون سا راستہ بہتر ہے، یہ صرف خدا جانتا ہے۔

سقراط

سزائے موت کا فیصلہ ہو جانے پر آخری تقریر

اگر میری ہزار جانیں بھی ہوتیں تو میں انہیں اسلام کے
لامتناہی حقائق میں سے ایک حقیقت پر بھی قربان کر
دینے سے پس و پیش نہ کرتا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا
کہ میں تو ایک طالبِ حق ہوں۔ میں ہر چیز کو شریعت
کی میزان میں تولوں گا، میں ایسی کسی بات کو تسلیم
نہیں کروں گا جو اسلام سے خارج ہو۔ میں اس
وقت برزخ کے سامنے، جسے تم لوگ جیل کہتے
ہو کھڑا ہوں اور اس گاڑی کے انتظار میں
ہوں جو مجھے آخرت کی جانب لے جائے اور
میں جو کچھ تمہیں کہہ رہا ہوں یہ اس لئے نہیں کہ
صرف تم اسے سن لو بلکہ اس لئے کہ یہ تمام
دنیا کے علم میں آجائے۔
وقت آگیا ہے کہ اسرار منکشف ہو جائیں اور
دل کی گہرائیوں سے باہر آجائیں پس جو غیر محرم ہے
وہ ان کی طرف نہ دیکھے۔
میں سفرِ آخرت کے لئے پورے شوق کے ساتھ تیار کھڑا
ہوں اور ان لوگوں کی معیت کے لئے حاضر ہوں جو سولی
پہ چڑھائے جا چکے ہیں تم اس بدوی کا تصور کرو
جسے استنبول دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا مجھے بھی آخرت میں
پہنچنے کا شوق ہے تم لوگوں کا مجھے جگہ جگہ جلا وطن کر
دینا کوئی سزا نہیں اگر سزا دے سکتے ہو تو میرا کام تمام کر دو

بدیع الزماں نورسی (ترکی)

کا عدالتی بیان ۱۹۰۹ء

جس وقت ہم نے
۱۹۴۱ء میں
اپنے کام کا آغاز کیا تھا
اس وقت ہمیں پورا اندازہ تھا کہ ہم
کیا کرنے چلے ہیں اور اس کا خیر
مقدم دنیا میں ہمیشہ کس طرح ہوتا آیا
ہے۔ اس لئے ہم پہلے ہی اس راستہ کی
آزمائشوں کے لئے تیار ہو چکے تھے البتہ
افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس دعوت کے
راستے میں مزاحمت کا شرف خود مسلمانوں کو
حاصل ہو رہا ہے دوسرے اگر یہ کام کرتے تو
کچھ عجیب بات نہ ہوتی لیکن اپنوں کے لئے
بظاہر ایک عجیب چیز ہے ــــ
بہر حال ــــــــ دنیا
کی تاریخ میں یہ کوئی پہلا ہی موقع نہیں
ہے کہ کچھ خدا کے بندوں کو وہی لوگ تکلیف
پہنچانے کے لئے تیار ہو جائیں۔
جن کی
فلاح و بہبودی کے لئے
وہ کام کرنے اٹھے ہوں یہ پہلا
موقع نہیں ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۹۴۸ء

ہماری نظر میں

قصص النبیین (عربی) تالیف :- مولانا ابوالحسن علی ندوی (حصہ اول) ضخامت ۴۶ صفحات، قیمت ۸۵ پیسے ـــ (حصہ دوم) ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ۸۸ پیسے۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

انبیاءِ کرام کے وہ قصے جو قرآن شریف میں بیان ہوئے ہیں ان دونوں کتابوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کو نہایت ہی سادہ مگر دلنشین اور اثرانگیز انداز میں پیش کیا ہے، قصوں کی زبان عرب کے متابیرادیوں جیسی ہے، قصوں کے پس منظر اور کالموں کے درمیان قرآن کریم کی آیتیں انگوٹھی میں نگینوں کی مانند جگ مگ کر رہی ہیں ان قصوں کے پڑھنے سے عربی زبان وانشا میں بصیرت پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی عبرت و موعظت کے دریچے ذہن و فکر پر کھلتے ہیں، یہ کتابیں بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں مگر ان سے علما تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جامعہ ازہر (مصر) کے پروفیسر شیخ احمد الشرباصی نے ان دونوں حصوں پر مقدمہ لکھا ہے اور مولانا علی میاں کے اسلوب نگارش اور دینی فکر کو سراہا ہے

قصص النبیین کے متعدد ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرے حصہ کا چھٹا ایڈیشن (طبع سادس) ہمارے سامنے ہے، یہ دلیل ہے اس کتاب کی مقبولیت کی، یہ کتاب اعراب کے ساتھ خوش نما ٹائپ پر چھپی ہے! پاکستان اور ہندوستان کے عربی مدارس کے نصاب میں "قصص النبیین" شامل ہونی چاہئے۔

پیارے رسولؐ کی پیاری باتیں مرتبہ :- مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔
ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۷۵ پیسے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور

اس کتابچہ میں وہ مبارک دعائیں ۔ عربی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ درج کی گئی ہیں جو حضور خاتم النبیین سید الاولین و الآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معمول رہی ہیں۔ ساتھ ہی مسنون نماز کی ترکیب بھی اس کتاب میں شامل ہے! اس کتاب کی ہر دعا حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے، آج کل "بے خوابی" (INSOMNIA) کی مرض کی عام شکایت ہے اس لئے افادہ عام کے پیش نظر اس مرض کے ازالہ کے لئے دعا نقل کی جاتی ہے:۔

"حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بے خوابی کے عارضہ کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا یہ دعا پڑھ لیا کرو۔
اَللّٰهُمَّ غَارَتِ النُّجُوْمُ وَهَدَأَتِ الْعُيُوْنُ وَاَنْتَ حَيٌّ قَيُّوْمٌ لَا تَأْخُذُكَ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ اَهْدِئْ لَيْلِيْ وَاَنِمْ عَيْنِيْ"

حضرت زید فرماتے ہیں، اس پر عمل کرنے سے میری تکلیف رفع ہو گئی (ص ۹)

تعالیٰ اس کتابچہ کے مرتب اور ناشر کو دارین میں اجر عطا فرمائے گا۔

تفسیر نوری سورۃ الفاتحہ

از :- مولانا سید نوری شاہ چشتی القادری، ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- سید محمد عارف الدین نوری، حیدر آباد دکن ۵۰

کتاب کے سرورق ہی پر لکھا ہے کہ "تفسیر نوری، بطرز معارف"! مگر رموز و معارف اور تصوف کا رنگ تفسیر میں گہرا ہونے نہیں پایا

ب کے آخر میں مولانا سید نوری شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے نے اعلان کیا ہے —

"یہ نورانی خیالات جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں فی الحقیقت حضرت قبلہ کی یہ کوئی ارادی تصنیف نہیں ہے، بلکہ حضرت مرشدی و مولائی والدی کے ان تعلیمات کا مجموعہ ہے جن کو حضرت قبلہ نے بہ حین دورۂ تبلیغ پانڈی چیری و ٹامل ناڈیں اہل سلسلہ کو فرما رہے تھے۔"

ب کی زبان میں دکنی اردو کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں —— "پھر وہ کون سا صراط مستقیم ہے" (ص ۲۲) حالانکہ "صراط" مونث ہے —— بندہ انابت کی راہ سے عبادت کیا (ص ۲۳) لکھنا یوں چاہیے، "بندہ نے انابت کی راہ سے عبادت کی" —— "ماسوا اللہ سے تٹ کر اللہ سے جٹ جائے" (ص ۲۵) صحیح زبان یہ ہے —— "ماسوا اللہ سے ٹوٹ کر اللہ سے جڑ جائے" —— "جٹ جائے" میں تو قدرے ذم کا پہلو نکلتا ہے اور یہ "تٹ" تو عجیب زبان، ہجہ اور رسم الخط ہے! —— اس کتابچہ کی یہ عبارت :——

"ایک بولنا الحاد ہے، دو بولنا اشراک ہے، دونوں کو نفی ایمان ہے، کچھ ان سے جھک، کچھ یوں سے جھک، جب یار تیرے ہاتھ ہے۔"

شکی —— اللہ تعالیٰ کو ایک بولنا الحاد کیوں ہے؟؟ یہ تو "معطلین" کا مذہب ہے کہ وہ صفات الٰہی کی یہاں تک نفی کرتے ہیں کہ اُسے "واحد" اور "احد" تک کہنے کو جائز نہیں سمجھتے، مگر قرآن کریم تو اس عقیدہ کی نفی کرتا ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ

مرتبہ :- مولانا ابو الحسین اور مولانا محمد عبد الحلیم قاسمی، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- جامعہ حنفیہ قاسمیہ ٹمپل روڈ، لاہور

اس کتابچہ میں —— "نماز کی اہمیت، فرضیت نماز کی شرائط، فرائض واجبات سُنن اور دیگر ضروری مسائل کو مستند اور آسان طریق پہ کتاب و سنت اور مذہب حنفیہ کے تحت پیش کیا گیا ہے" —— اپنے موضوع پہ یہ کتاب ہر اعتبار سے کارآمد اور لائق استفادہ ہے۔

"امام کو اگر سجدۂ سہو نکالنے کی ضرورت پیش آئے" (ص ۷۰) "سجدہ نکالنا" غلط زبان ہے، صحیح زبان و محاورہ اور روزمرہ "سجدہ کرنا" ہے! کتاب کی زبان آسان اور عام فہم ہے، جس سے معمولی لکھے پڑھے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

قرآن حکیم کا عمرانی فلسفہ

از مولانا محمد فضل الرحمٰن انصاری قادری، ضخامت ۴۴ صفحات قیمت ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- المرکز الاسلامی ۲ ماسٹر ٹاؤن سمرسٹ اسٹریٹ کراچی ۳

اس کتابچہ میں سورۂ والعصر کی تفسیر "عمرانی انداز و اسلوب" پہ کی گئی ہے، طرز بیان خالص علمی اور سائنٹفک ہے۔ ڈارون، مالی نوسکی گولڈن وائزر، سوروکن اور میکس ویبر وغیرہ مستشرقین کی کتابوں کے حوالے لائق مفسر کی وسعت مطالعہ کا اتا پتا دیتے ہیں ظاہری صورت

ڈگیٹ اپ) کے اعتبار سے بھی یہ کتابچہ کتابت و طباعت کا مثالی حسین نمونہ ہے۔

تھوڑی دیر اہلِ حق کیساتھ

از:- جناب یونس نگرامی، ضخامت ۱۴۶ صفحات، قیمت ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طیبہ بلی ۲۰/۲۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ

اس کتاب کی پہلی جلد پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے اب یہ دوسری جلد اسی انداز پر دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے، اس میں اولیاء کرام کی سیرت و زندگی کے ایمان افروز اور عبرت آموز واقعات سلیس اردو میں پیش کئے گئے ہیں۔

"مشہور عباسی خلیفہ کو سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عقیدت تھی، ایک مرتبہ ایک شخص رومال میں جوتہ لپیٹ کر لایا اور کہا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک ہیں اور آپ کی خدمت میں لایا ہوں مہدی نے اس کو لے کر بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا اور لانے والے کو انعام سے مالا مال کر دیا اس کے جانے کے بعد حاضرین سے مہدی نے کہا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ اس جوتے پر حضور کی نگاہ بھی نہیں پڑی ہے، پہننا تو درکنار لیکن چونکہ اس نے ذات نبوی کی طرف انتساب کر دیا تھا اس لئے میں نے لے لیا ہے" (ص ۴۴)

خلیفہ مہدی کے اس واقعہ کو نقل کرنا نہیں چاہئے تھا! جس طرح کسی غلط حدیث کو صرف "قال رسول اللہ" کی لفظی نسبت کے سبب قبول نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح جانتے ہوئے کہ فلاں چیز (جوتہ، پیالہ، جبہ وغیرہ) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلط طور پر منسوب کیا گیا ہے، اس غلط نسبت کا احترام نہیں بلکہ اس کی تردید کرنی ضروری ہے۔

اسلام اور فطرت

از:- مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، ضخامت ۱۲۴ صفحات، قیمت:- دو روپے پچیس پیسے۔

ملنے کا پتہ:- ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور

اس کتاب میں عقلی اور نقلی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، مندرجہ ذیل عنوانات سے اس کتاب کی علمی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فطرت کیا ہے؟ فاطر کا مطلب، قرآن اور انسان کے فطری رذائل، فطرۃ اللہ، عقل کی فطرت، نیکی اور بدی کے نتائج کا قانون، اخلاق و معاملات کا باہمی ربط، عائلی زندگی، زن و مرد کا فطری فرق، اخلاق اور فطرت ۔۔۔۔!

اس کتاب کا ایک اقتباس:-

"اسی طرح صفات محمودہ کے غلط استعمال سے وہ صفات غیر محمود ہو جاتی ہیں، رحم بڑی اچھی اور فطری صفت ہے، لیکن بچھو اور سانپ یا درندے کے ساتھ یہ سلوک رحم کیا جائے تو محمود نہیں کہا جائے گا، سخاوت بڑی نیک صفت ہے لیکن اگر بے جا عیاشیوں کے لئے یہ سخاوت کی جائے اور دوسرے مستحقین محروم ہو جائیں تو یہی صفت غیر محمود ہو جائے گی، غرض جس طرح صفاتِ محمودہ کے لئے غلط محل استعمال موجود ہیں، اسی طرح صفاتِ رذیلہ کے لئے صحیح محل استعمال بھی موجود ہیں، فنا کسی جذبے کو بھی نہیں کرنا ہے، بلکہ اس کی سمت صحیح کر دینی ہے۔"

پوری کتاب حکمت و دانش سے لبریز ہے، مثالیں دلنشین، استدلال وزنی اور اسلوب نگارش دل میں اتر جانے والا ہے! کیسے کیسے نفسیاتی

طوں کا فاضل مصنف نے ازالہ کیا ہے ! اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے وجود پر بھی جگہ جگہ عقلی دلیلیں ملتی ہیں اور سائنس دانوں کی بس سطح
کو بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ انہیں کائنات میں فطرت تو دکھائی دیتی ہے مگر "فاطر" نظر نہیں آتا۔ اور یہ اصول کس طرح قابل فہم ہو سکتا ہے کہ رحمت
و رحیم نہ ہو"

"اسلام اور فطرت" اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے، عصر حاضر کا ذہن جس قسم کے عقلی دلائل سے مطمئن ہوتا
، وہ دلائل اس کتاب میں موجود ہیں! مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی اس تصنیف پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں! ادارۂ ثقافت اسلامیہ کو بھی
بنکوں کے سود کے مسائل کی بجائے اسی قسم کے موضوع پر کتابیں پیش کرنی چاہئیں کہ ایسی کتابوں سے عقیدہ و فکر اور سیرت کی ایک طرف اصلاح
ہے اور دوسری طرف اسلام کی حقانیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

اعلام مرفوعہ

از:۔ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، ضخامت ۷۶ صفحات، قیمت ۵۰ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ مجلس علمی جامعہ مفتاح العلوم مئو اعظم گڑھ یو۔ پی۔ انڈیا

کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:۔

"ایک مجلس کی تین طلاقیں چاہے بیک لفظ دی جائیں، یا بالفاظ متعددہ وہ واقع ہو جاتی ہیں اور تین طلاقوں
کے بعد چاہے وہ جس طرح دی گئی ہوں رجعت کرنا شرعاً ممکن نہیں ہے، شریعت کا یہ وہ مسئلہ ہے جس پر اہل سنت
والجماعت کے چاروں امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا اتفاق ہے اور نہ صرف یہی ہیں
بلکہ دیگر اکابر ائمہ فقہ وحدیث مثلاً امام اوزاعی، و امام شام / امام نخعی، امام ثوری، امام اسحٰق، امام ابوثور،
امام بخاری کا بھی یہی قول ہے بلکہ جمہور صحابہ وتابعین و جمہور ائمہ سلف وخلف اسی کے قائل ہیں"

ی کتاب اسی فقہی اصول کی تشریح ہے، فاضل مصنف نے دلائل سے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے! کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دئے جانے سے ایسی
اق واقع ہو جاتی ہے جو قابل رجعت نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں احادیث کی نوعیت کیا ہے؟ راوی کس حیثیت کے ہیں؟ اُن پر جو جرح کی گئی ہے
ں کی تعدیل کس طرح ممکن ہے؟ یہ تمام علمی اور فنی مباحث اس کتاب میں ملتے ہیں، علامہ ابن قیم پر جگہ جگہ لائق مصنف نے نقد واحتساب
یا ہے!

"مجھے اندیشہ ہے کہ مخالفین زمانہ میرے مواخذات سے گھبرا کر کہیں یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ امضائے ثلث کو سیاسی و
تعزیری حکم قرار دینا علامہ ابن القیم کی ذاتی رائے ہے اور ہم کو ان کی رائے سے اتفاق نہیں ہے ـــــــــ
علامہ ابن القیم کی یہ رائے غلط ہے، صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہی فتویٰ تھا کہ تین یکجائی طلاقیں تین
ہی ہیں اور اس کے بعد رجعت جائز نہیں ہے، لیکن حضرت عمرؓ سے اس مسئلہ میں خطائے اجتہادی سرزد ہوئی ہے
اس لئے میں پہلے ہی اُن کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ اس بے باکی کا خطرہ بھی اپنے دل میں نہ لائیں اور ٹھنڈے
دل سے غور کریں کہ امضائے ثلث میں حضرت عمرؓ منفرد نہیں تھے۔ بلکہ سارے صحابہ کرام اُن کے ساتھ تھے ـــ"

یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور مدلل ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ہر پہلو سے اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے، اس موضوع پر یہ جامع
کتاب ہے!

گلدستۂ قرآن وحدیث

از :- ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ :- مکتبہ کلیمیہ بازار نور الامرا حیدر آباد دکن ۲۴ (بھارت)

اس کتاب میں قرآن مجید کی ایسی مختصر اور ضروری آیتیں اور حدیثیں جمع کی گئی ہیں جو بچوں اور بچیوں کی نفسیات اور حالات کے مطابق ہیں! آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا اردو ترجمہ سادہ اور عام فہم ہے، دکن میں انگریزی الفاظ کو اس طرح لکھا جاتا ہے ـــ فیکڑی کو فیاکٹری، ہیٹ کو ہیاٹ، اس رسم الخط کے اتباع میں اس کتاب میں بھی "چیلنج" کو "چیالنج" (ص، ۶) لکھا گیا ہے۔

زینوا القرآن باصواتکم
تمہاری خوش الحانی سے قرآن شریف کو زینت دو (ص ۶۸)

"تمہاری" کی جگہ "اپنی" لکھنا تھا! یہ کتاب واقعی قرآن وحدیث کا گلدستہ ہے جس میں جگہ جگہ اخلاق وحکمت کے پھول بکھرے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی ایجادیں

از :- محمد حفیظ اللہ پھلواروی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ :- دفتر یونیٹی والنصاف ۸/۷ لیاقت بازار، کراچی

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے کن علوم وفنون اور چیزوں کو ایجاد کر کے تہذیب وتمدن کو ترقی دی اور مدنیت کو فائدہ پہونچایا ـــ مثلاً "منطق استقراء" کا سہرا اہل یورپ نے لارڈ بیکن کے سر باندھ دیا ہے، مگر حقیقت میں امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں "استقراء" کی بنیاد ڈالی ہے ـــ اور دنیا کے سب سے پہلے گزیٹر کا مصنف شہنشاہ اکبر کے زمانہ کی مشہور شخصیت "ابو الفضل" ہے، کتاب مختصر ہونے کے باوجود جامع اور مفید ہے، اب سے تقریباً پچاس سال قبل علامہ عمادی مرحوم اس موضوع پر "صنعت العرب" کے نام سے ایک رسالہ لکھ چکے ہیں۔

یزید ابن معاویہؓ

از :- ابن تیمیہؒ - ترجمہ :- جمیل احمد ندیم ایم اے، ضخامت ۲۴ صفحات، قیمت ۸۰ پیسے
ملنے کا پتہ :- ابن تیمیہ اکیڈمی ایف ون ۱۹/۲ ملیر اکسٹینشن کراچی ۲۷

یہ دور جس سے ہم گذر رہے ہیں سیاسی انتشار اور سماجی فساد کی طرح فساد عقائد واعمال کا بھی زمانہ ہے، نئے نئے فتنے ابھر رہے ہیں اور پرانے فتنوں کا اعادہ ہو رہا ہے۔ یزید ابن معاویہؓ جیسے ناپسندیدہ شخص کو آج "ناصبیت" نے صلاح وامامت کا مقام عطا کر دیا ہے! امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کے زمانہ میں یہ فتنہ ابھرا تھا اور امام موصوف سے فتوی پوچھا گیا تھا کہ کیا یزید صحابی تھا؟ امام ابن تیمیہؒ نے اس کے جواب میں ایک رسالہ لکھا، جو دمشق کی "المجمع العلمی" نے شائع کیا ہے! کتاب زیر تنقید میں رسالہ مذکور کا عربی متن اور اس کے اوپر اردو ترجمہ درج ہے کتاب کے آغاز میں علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں۔ ـــ

اس کتاب کے چند اقتباسات :ـــ

- ـــ "یزید بن معاویہ بن ابو سفیان جو اپنے والد معاویہ بن ابو سفیان کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا صحابی نہیں تھا۔ ہاں! البتہ اس کے چچا یزید بن ابو سفیان صحابی تھے۔"
- ـــ "اسی یزید کے زمانہ خلافت میں امام حسینؓ شہید ہوئے، یہی وہ یزید ہے جس کے اور اہل حرہ کے درمیان حادثہ جانگداز پیش آیا تھا، یہ صحابی نہ تھا۔ بحر اصنہ خلفاء راشدین و مہدئین میں اس کا شمار ہوتا ہے، دیگر اموی اور عباسی خلفاء کی طرح یہ بھی ایک اموی خلیفہ ہے۔"

- ــــ " اگر کوئی شخص یزید کے بارے میں " امام ابن امام " کہتا ہے ، ایسی صورت میں اگر اس کی مراد صرف یہ ہے کہ دیگر اموی اور عباسی خلفاء کی طرح اس نے بھی عنانِ حکومت سنبھالی تھی تب تو ٹھیک ہے ، ورنہ نہیں ، اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے مدح و ثنا اور تعظیم و تفضیل لازم آتی ہو "
- ــــ " ایک بار امام احمد بن حنبل سے یزید کے متعلق پوچھا گیا کہ اس سے حدیث کی روایت کی جائے ؟ آپ نے فرمایا نہیں وہ اس قابل نہیں ہے ، جس نے اہل حرہ کے ساتھ وہ فعل قبیح کیا ، جو کیا "
- ــــــ ایک روز امام حنبل سے ان کے صاحبزادے نے پوچھا ــــ

" لوگ کہتے ہیں کہ ہم یزید سے محبت کرتے ہیں "

آپ نے جواب دیا " کیا کوئی شخص جس میں ذرا سی بھی نیکی ہے ، وہ یزید سے محبت کر سکتا ہے ! اس ـ الٹے صاحبزادے بول پڑے " پھر کیوں نہیں آپ اس پر لعنت کرتے ! امام حنبل نے مختصر سا جواب دیا ـ ـ

کیا تم نے اپنے باپ کو کسی پر لعنت کرتے دیکھا ہے ؟

- ــــ اس کے باوجود یزید نے نہ توقتل حسینؓ کا حکم دیا تھا اور نہ اس کے سامنے آپ کا سر مبارک لایا گیا اور نہ آپ کے دندانِ مبارک کو اس نے چھڑی لگائی . . . "

حق تو یہ ہے کہ یزید ناپسندیدہ کردار کا حامل ہے اور اس سے ظلم کی نسبت غلط نہیں ہے ، یزید کے لئے مرد مومن کے دل میں احترام و [عقی]دگی کا جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہئے ، ہم نہ تو اس پر لعنت بھیجتے ہیں اور نہ اس کی مدح و توصیف کرتے ہیں ۔

از : ـ گنگا پرشاد اوپادھیائے ، ضخامت ۲۰۰ صفحات ، قیمت پانچ روپے ـ

[ت]اریخ الاسلام

ملنے کا پتہ : ـ ٹریکٹ وبھاگ آریہ سماج چوک الٰہ آباد (بھارت)

یہ بڑی فریب آمیز کتاب ہے جو اسلام کی تکذیب و تنقیص میں لکھی گئی ہے ، فریب آمیز اس لئے ہے کہ قرآن ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [ا]سلام کی تعریف کے پردہ میں اسلام کو جھٹلایا گیا ہے ، گنگا پرشاد صاحب اوپادھیائے (ایم ـ اے) کا بالخصوص قرآن و حدیث کا خاصہ مطالعہ [ہے] غالباً ترجموں کی مدد سے نہیں براہِ راست یا پھر کسی ایسے مسلمان کا اس کتاب کی تصنیف میں ہاتھ ہے ، جو کتاب و حدیث کا علم رکھتا ہے مگر [اس پ]ر انکار و الحاد کا غلبہ ہو گیا ہے ـ

اس کتاب میں لکھا ہے ؛ ــــ

" اس لئے باوجود اس کے کہ ہم قرآن شریف کی بہت سی باتوں کے مداح ہیں ، دگر ، ہم قرآن شریف کو محمد صاحب کا ہی کلام سمجھتے ہیں اور محمد صاحب کو عربی ادب کا ایک مشہور ادیب تصور کرتے ہیں "

[حالا]نکہ جو کوئی عربی زبان و ادب کا ذوق رکھتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور قرآن کریم کے زبان و ادب اور اسلوب بیان [میں] فرق محسوس کر سکتا ہے ! ـ

قرآن کریم پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ قرآن میں راون ، کنس وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے ، یہ (معاذ اللہ) اس کا ثبوت ہے [کہ اس] کا عام انسانی جماعت سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں ، معترض کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم میں چین ، بھارت ، جاپان ، روس وغیرہ ملکوں کا قدیم

تہذیب وتاریخ کا ذکر آنا چاہئے تھا ، یہ اعتراض نتیجہ ہے سطح بینی اور اسلام دشمنی کا ، قرآن کریم تاریخ وجغرافیہ کی کتاب نہیں ہے ، وہ تو صحیفۂ ہدایت وموعظت ہے اُس میں چند سرکش ونافرمان قوموں اور چند ظالم اور حق ناشناس شخصیتوں کے ذکر پر کفایت کی گئی ہے کہ عبرت وہدایت کے لئے اتنا تذکرہ کافی ہے ! پھر قرآن کریم کے جو مخاطبین اولین تھے ، جن کو قرآنی اخلاق کی بنیاد پر " صالح امت " بنانا تھا ۔ جو حاملین قرآن بھی تھے ، اُن کے ذہن وفکر اور ماحول کی بھی رعایت ضروری تھی ، دنیا کے تمام ظالموں اور خدا کے باغیوں کی قریب قریب ایک سی فطرت ہوتی ہے لہٰذا چند ظالموں اور نافرمانوں کا تذکرہ ہر ملک اور خطہ کے ظالموں کی سیرت وکردار سمجھنے کے لئے کافی ہے ۔

مصنف کتاب شری اوپادھیائے جی قرآن کریم کو الہامی کتاب نہیں مانتے اس اپنی حق ناشناسی سے یہ وہ مطلب نکالتے ہیں کہ عیسائیوں اور یہودیوں سے حضرت محمد نے فرشتوں کے بارے میں سُن لیا تھا ، سوال یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر تک آپ ان سُنی ہوئی باتوں کو کیوں چھپائے رہے ، اعلان نبوت سے قبل اس قسم کی کوئی بات آپ کی زبان سے نہیں سُنی گئی ، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ حضور مہبطِ وحیٔ الٰہی تھے ۔ جب آپ پر وحی آئی تو آپ نے ایمان ، ملائکہ ، آخرت وغیرہ پر اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی آیتیں لوگوں کو سنائیں ۔

" اب رہے چوتھے حضرت ابوبکر صدیق ، آپ ایک باثروت بااثر بزرگ ہستی تھے ، لیکن شاید اُن کی مثال دولت مند اور محترم سیٹھ سے دی جاسکتی ہے جو ضعیف الاعتقادی کے لئے مشہور ہیں اور کسی نئے سادھو کے بآسانی مطیع ہوسکتے ہیں "

یہ دنیا کا کیا کوئی مسئلہ ہے کہ ہر دولت مند آدمی " ضعیف الاعتقاد " ہوتا ہے ، حضرت ابوبکر کا تو قریش کے صاحب الرائے لوگوں میں شمار ہوتا تھا ۔ پھر ایک دوست کی حیثیت سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی دیکھی تھی ، حضور کے حالات سے رتی رتی بھر واقف تھے ، حضور کی دعوت پر کسی ردوکد کے بغیر اُن کا ایمان لے آنا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اور انتہائی نیک اور پاکباز ہونے کی دلیل ہے ، جب آدمی کی مت ماری جاتی ہے اور ذہن وفکر مسخ ہوجاتے ہیں تو صاف اور سیدھی بات سے وہ الٹا مطلب نکالتا ہے ۔

" جب حضرت محمد صاحب دنیا میں تھے ، تو اُن کی تعظیم وتکریم ہمارا عین فرض تھا ، لیکن آج مسلمانوں نے اپنے کلمہ کے اندر محمدؐ صاحب کو بھی شامل کر رکھا ہے ، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں تو اللہ حاضر وناظر ہے ، وہ ہماری بات سنتا ہے ، لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ محمد صاحب ہمارے رسول ہیں اور اس جملہ کو اللہ کے کلمہ کے ساتھ وابستہ کردیتے ہیں تو حضرت محمد صاحب ہماری بات سنتے نہیں ، اللہ کے تصور کے ساتھ محمدؐ صاحب کا بھی تصور اسی وقت ہمارے دل کے سامنے آجاتا ہے ، پھر توحید کہاں رہی ؟ " (ص ، ۲۲۴)

اسے کہتے ہیں مار دل گھٹنا پھوٹے آنکھ ! اس اعتراض کی کوئی کل بھی سیدھی ہے ! کلمہ میں اس کا اقرار کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اس سے توحید پر کیوں حرف آنے لگا ؟ جب کوئی یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو بنایا تو یہ کہتے ہی آسمان وزمین کا تصور سامنے آجاتا ہے کیا یہ تصور " توحید " کی نفی کرتا ہے ؟

اسی قسم کے لغو اعتراضات اور خرافات سے یہ کتاب بھری پڑی ہے ، مگر وہ مسلمان جن کا مذہبی مطالعہ زیادہ نہیں ہے اور دین کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے وہ اس کتاب کے پڑھنے سے شک میں مبتلا ہوسکتے ہیں ، ہندوستان کے علماء کو چاہئے کہ وہ اس کی رد میں کتابیں لکھیں !

اس کتاب کے مصنف نے مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت، سر سید احمد خاں اور غلام جیلانی برق کے اقوال سے استدلال ہے، افسوس ہے ہمارے تجدد پسند اہل قلم کی جدت طرازیاں اور گمراہیاں اہل کفر کو کیسے کیسے ہتھیار فراہم کرتی ہیں۔

پکار از :۔ اسعد گیلانی، ضخامت ۱۰۴ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔
ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ ادب اسلامی سرگودھا۔

اس کتاب میں جناب اسعد گیلانی کے ۷ مضامین یکجا کئے گئے ہیں، ہر مضمون اپنے اندر ادبیت ہی نہیں دینی افادیت بھی رکھتا ہے یہ مضامین ہلکے پھلکے اور عام فہم ہیں، جن سے معمولی استعداد کے لوگ بھی استفادہ کر سکتے ہیں! خاص طور سے مسلمان گھرانوں اور دینی مدرسوں میں یہ کتاب پہونچنی چاہئے۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک کے علماء سو سے مودبانہ گزارش کروں کہ اے منبر رسولؐ پر قابض بزرگو! اور اے امت مسلمہ کی رہنمائی کے مدعیو! یہ دین کے منبر کو چھوڑ کر دنیا پرستوں کی کاروں کے پیچھے دوڑنے میں تم اتنے اوباکیوں ہو گئے ہو، کوئی غرض پرست ایسا نہیں رہا، جس نے اپنے اعمال قبیحہ کے جواز کے لئے تم میں سے ہی نہ کسی کو دینِ قیم کا استہزا کرنے کے لئے مامور نہ کر رکھا ہو۔"

میں تم سے کیا کہوں کہ تم نے ہر قدم پر اللہ اور اس کے نبیؐ کے احکام سُنائے اور پھر ہر قدم پر انہیں احکام سے چشم پوشی کی، تم نے شاہوں کو للکارا اور انہیں کے ہاتھوں بک گئے، تم نے حق کی پشت پناہی کی اور اس کو پیٹھ دکھا گئے۔"

اس مختصر سے اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "پکار" وقت کی آواز اور دین کی پکار ہے!

ضربِ آتشیں از :۔ قمر ساحری، ضخامت ۱۵۲ صفحات، قیمت دو روپے پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ سعدی نیو بلڈنگس اعظم آباد، حیدرآباد ۲۰ (ہندوستان)

جناب قمر ساحری کا مجموعۂ کلام خاصے ظاہری اہتمام سے منظر عام پر آیا ہے، جناب سجاد ظہیر نے اس پر پیش لفظ اور جناب ظ انصاری نے مقدمہ لکھا ہے! قمر ساحری کی نظموں میں جوش و ولولہ اور غزلوں میں سوز پایا جاتا ہے! اس نوجوانی میں بھی بعض مقامات پر وہ رسیدہ پختہ مشق فن کار نظر آتے ہیں۔

منتخب اشعار :۔

کرنیں برسائے گا اس طرح سحر کا پرچم
بھوک فوجوں سے دبائی نہیں جا سکتی

کوئی دم میں ختم یہ فسطائیت ہونے کو ہے
کور چشموں میں مانی و بہزاد

جب بھی اٹھا چمن کے لئے خون کا سوال
یہ کیسی بزم کہ انصاف ہے یہاں معدوم

وقت تاریخ کے ماتھے سے لہو دھوئے گا
بھوک گولی سے مر نہیں سکتی

اہلِ زنداں صبر! صبحِ حریت ہونے کو ہے
جہل زادوں میں حافظ و خیام

سو دار کے بار بار پکارے گئے ہیں ہم
شراب ساز ہی خود ہیں شراب سے محروم

وہ زندگی عذابِ مسلسل نہیں تو کیا — جس زندگی میں کوئی تصورِ حسیں نہیں
یہ فکرِ صبح و شام یہ آزار کشمکش — دنیا بہشت ہو کے بھی دوزخ سے کم نہیں
جانے کیوں ڈرتے ہیں اربابِ حکومت مجھ سے — میرے ہاتھوں میں قلم ہے ابھی تلوار نہیں
فصلِ بہار ہم تو تہی دست ہی رہے — وحشت ملی تو چاکِ گریباں نے چھین لی
وہ اک خلش کہ جس سے تھی تسکینِ دل ہمیں[1] — تیری نگاہِ زود پشیماں نے چھین لی
مے سے غرض نشاط یقیناً تھی ہم نشیں — وہ بھی نوازشِ غمِ دوراں نے چھین لی
جن کے پیشِ نظر کوئی منزل نہ تھی — ہر زمانے میں اُن کو بدلنا پڑا
اک وہ کہ ذکرِ تلخیٔ دوراں نہ سُن سکے — اک ہم کہ مسکراتے ہوئے زہر پی گئے
خیر! بُروں کا ذکر ہی کیا ہے — اچھے بھی بدنام بہت ہیں

دُوسرا رُخ :

روحِ دہقاں کی بیدار نظر آتی ہے — اب درانتی بھی چمک دار نظر آتی ہے

کسانوں کی درانتیاں جب کند ہو جاتی ہیں تو وہ انہیں لوہار کے یہاں جا کر اس کی دھار کو تیز کراتے رہتے ہیں اور اس طرح درانتیاں چمکدار ہوتی رہتی ہیں! اس واقعیت کو ذہن میں رکھ کر اس شعر کا مصرعہ ثانی پڑھیے اور سوچیے کہ شاعر نے کوئی ٹھکانے کی بات نہیں کہی یعنی روحِ دہقاں کے بیداری سے درانتی کے چمکدار ہونے کا کوئی ربط اور واسطہ نہیں ہے۔

مصیبتوں پہ تری حکمرانیاں تسلیم — مگر پنپ نہ سکے گا یہ احتساب عظیم (ص ۲۸)

احتساب اور وہ بھی عظیم، پھر اس کا پنپنا . . . . یہ آخر بات کیا ہوئی! اس طرح کون بولتا ہے کہ فلاں شخص کی دار و گیر یا احتساب یا گرفت پنپ رہی ہے، مفہومِ شعر میں سلیقہ کے ساتھ ادا ہونا چاہیے۔

ذرا بتائیں تو دار و رسن کے سوداگر — کہیں مٹی ہے کسی سے عوام کی تنظیم (ص ۲۸)

"دار و رسن کے سوداگر" کوئی شک نہیں نئی ترکیب ہے مگر کتنی نامانوس اور خلافِ واقعہ! مصرعِ ثانی تو مشقوں کے کہنے کا تھا۔

اور صالح سے اونٹنی لے کر — دشمنوں کو کھلا دیا تو نے
خاک داؤد کو کھلا ڈالی — خوب دی دادِ آوریا تو نے (ص ۹۰)

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ زبان و روزمرہ کے اعتبار سے غلط ہے، "صالح سے اونٹنی لے کر، دشمنوں کو کھلا دی" یہ ہے صحیح زبان! دوسرا شعر نِرا بھرتی کا ہے!

غرورِ زر کا ابھی تک مٹا نہیں طاعون — ابھی جہاں میں ہے فرقِ حاکم و محکوم (ص ۱۱۰)

غرور زر کا بھی طاعون ہوتا ہے؟ خوب! کس قدر تکلف اور کتنی آورد پائی جاتی ہے اس مصرعہ میں!

---

[1] "ہمیں" کی جگہ "نصیب" کہنا تھا۔

صرف حسرت میں مرگیا کوئی　　وقت بن کر گزر گیا کوئی　(ص ۱۴۰)

یعنی ؟ ٥ ٥ ٥ ٥ ٥ ٥ ٥ ! ! ؟ ؟

بے سکوں زندگی نہ کہا جائے　　کوئی زخموں کو اور گہرائے　(ص ۱۳۵)

مصرعہ اولیٰ انتہائی پست اور بے لطف ہے ! اور زبان و بیان کے اعتبار سے بہت کمزور ہے !

قمر ساحری نام نہاد "ترقی پسند شاعری اور ادب" سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اس لئے ان کے یہاں بعض مقامات پر خیال و اظہار میں ربط نظر نہیں آتا اور مفہوم ٹھیک طرح سے ادا نہیں ہو پاتا - یہ کوتاہی ترقی پسند شاعری کا طرۂ امتیاز ہے ! انہوں نے اپنی بعض نظموں میں اللہ تعالیٰ پر طنز بھی کی ہے اور "بھوک" کا ذکر بھی اشتراکیت زدہ ادیبوں اور شاعروں کے انداز میں کیا ہے ——
"ضربِ آتشیں" پڑھنے کے بعد یہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ جناب قمر ساحری کا شاعرانہ مستقبل روشن و تابناک ہے -

یادگارِ جگر

از :- محمد اسلام (ریسرچ اسکالر) ضخامت ۱۲۸ صفحات ، قیمت ۵ روپے
ملنے کا پتہ :- دانش محل بک سیلرز، امین الدولہ پارک ، لکھنؤ

حضرت جگر مرادآبادی مرحوم ، جناب محمد اسلام صاحب کے محبوب ترین شاعر ہیں - جگر پر ان کی چار کتابیں زیر طبع ہیں اور تین کتابیں زیر ترتیب ہیں ! زیر تنقید کتاب (یادگار جگر) میں انہوں نے جگر مرادآبادی کا غیر مطبوعہ اور تلف کردہ کلام بڑی محنت اور کاوش سے جمع کیا ہے اس کام کے لئے انہوں نے "جلوۂ یار" (میرٹھ) ۱۹۱۰ء سے لے کر "نیا دور" (لکھنؤ) ۱۹۵۹ء تک یعنی نصف صدی کے اردو رسالے کھنگالنے پڑے ہیں !

"یادگارِ جگر" کے منتخب اشعار :—

یہاں بھی حسرتیں بے تاب ہیں دل سے نکلنے کو　　ادھر بھی ایک دن اے نیم پردہ ہو گئے ہوتے

اللہ اللہ یہ تاثیر فغانِ شبِ ہجر　　خیر مقدم مرے نالوں کا قیامت نے کیا

اشک خونیں ہے کہیں ، نالہ رنگیں ہے کہیں　　ہر قفس میں اتر آتا ہے گلستاں کوئی

معلوم ہیں سب ایک نظر کے فریب ہیں　　الجھے نگاہِ شوق زمان و مکاں سے کیا

تمہیں گزر گئے دامن بچا کے ورنہ یہاں　　وہی شباب ، وہی دل ، وہی زمانہ تھا

دل کو حریف جلوۂ جاناں بنا دیا　　میں وہ ہوں جس نے حسن کو حیراں بنا دیا

میں عشق بے نیاز ہوں تم حسن بے پناہ　　میرا جواب ہے نہ تمہارا جواب ہے

آغازِ محبت ہے آنا ہے نہ جانا ہے　　اشکوں کی حکومت ہے آہوں کا زمانا ہے

جب اس طرف سے کوئی اہل نظر گیا ہے　　دل کی نزاکتوں پہ عالم گزر گیا ہے

یہ نقوشِ دہر ، یہ ہنگامہ ہائے کائنات　　ساری تعبیریں ہیں وابستہ مری تعبیر سے

مایوس پھرا بارگہِ خاص سے اُس کی　　واقف جو نہ تھا مرحلۂ بے خبری سے

ہائے ! اُس عاشقِ دیوانہ گلشن کی بہار　　کہ جب آئی ہو بہ اندازِ خزاں آئی ہو

جز ذوقِ طلب جز شوقِ سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا، کہتے ہیں[1] کہ منزل دور نہیں

مدت میں جو اس شوخ کا دیدار ہوا ہے	تا دیر سنبھلنا مجھے دشوار ہوا ہے
کچھ دل کا تقاضا ہی نہ تھا عرضِ محبت	کچھ اُن کی نگاہوں کا بھی اصرار ہوا ہے
ہر چند کہ تکرارِ نظر بے ادبی ہے	پر کیجئے کیا عشق کی فطرت ہی یہی ہے
خزانے بھر لئے ہیں اہلِ دل نے	ترے مستوں کے دامانِ تہی سے
خبردار! اپنے میخانے سے ساقی	اُٹھے شعلے مرے جامِ تہی سے
ہر انقلاب ایک پیامِ سحر سہی	ہر روشنی دلیلِ طلوعِ سحر نہیں
اس عہد میں کہ جز غمِ دوراں نہیں ہے کچھ	وہ شخص ہے ولی جو محبت سے کام لے
مے کی حاجت ہے نہ اب درکار پیمانہ مجھے	میرے ساقی نے پلا دی روحِ میخانہ مجھے
میرے ہوتے یہ کرم ہو نہ کسی پہ یارب	ہر بلا کے لئے میرا ہی سیہ خانہ سہی

تصورات کی آئینہ بندیاں ہیں جگر
یہی ہے جلوہ گری، اس نگار خانے کی

جناب محمد اسلام کی محنت اور جستجو قابلِ داد ہے کہ اُن کی بدولت کتنے "جگر پارے" جو گمنام تھے یا تلف ہو گئے تھے اس کتاب میں یک جا ہو گئے!

برگِ نوخیز از :- عزیز تمنائی، ضخامت ۱۳۶ صفحات، دبیز چکنا کاغذ، خوش نما ٹائپ، مجلد، رنگین گردپوش، قیمت ڈھائی روپے
ملنے کا پتہ :- دار التصنیف مدراس - ۱۴ (بھارت)

اس کتاب کا نام "برگِ سبز" رکھا گیا تھا مگر کتاب کے چونسٹھ صفحے چھپ چکے تھے، تو شاعر کو اس کا علم ہوا کہ حیدرآباد دکن سے اس نام کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے چنانچہ "برگِ سبز" کو "برگِ نوخیز" میں بدل دیا گیا۔ کتاب کے سرورق پر ——— اُردو زبان میں سانیٹ کا پہلا مجموعہ ——— مرقوم ہے، پیش لفظ جناب احتشام حسین نے لکھا ہے، جس میں یہ جملہ :-

"ڈاکٹر عزیز تمنائی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے بہت کم عمری ہی میں شعری و شاعری کی دیوی سے دل لگا لیا۔"

احتشام حسین جیسے پختہ مشق ادیب و نقاد کو زیب نہیں دیتا، پیش لفظ کے بعد جناب عزیز تمنائی کا مقالہ "سانیٹ کا تعارف" عالمانہ مقولہ ہے۔ انہوں نے سانیٹ کی تاریخ بیان کی ہے ——— یہ کہ اس صنف کی اٹلی میں ایجاد کب اور کیسے ہوئی؟ اور پھر اس صنف نے کس طرح ترقی کی اطالیہ کے شاعر پیٹرارک کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی کا ہے، انگلستان میں تقریباً تین صدی کے بعد "سانیٹ" نے رواج پایا، ویاٹ (WYAT) انگریزی کا پہلا شاعر تھا جس نے "سانیٹ" کہا، اس کے بعد سرے، ڈرائیڈن اور شکسپیئر نے اس طرزِ سخن میں کمال حاصل

---

[1] مجھے "سنتے ہیں" یاد تھا (ماہر)

اور یہ صنف" مقبول ہوتی چلی گئی۔

جناب عزیز تمنائی میں شاعرانہ صلاحیتیں موجود ہیں مگر ان کی صلاحیتیں ایک ایسی صنف (سانیٹ) میں صرف ہوئی ہیں، جو اُردو
ری کے لئے اجنبی ہے، وہ ن م راشد سے متاثر ہیں اور راشد صاحب نے اردو شاعری کے مزاج کو بگاڑنے کے سوا اور کوئی کارنامہ
م نہیں دیا۔

نعتِ رسولؐ میں عزیز تمنائی کے یہ شعر کتنے اچھے ہیں:—

ہستی کو جس پہ ناز ہے وہ ہستیِ عظیم
جس کا وجود باعثِ تخلیقِ کائنات
جس سے حریمِ ذات میں ہے جلوۂ صفات
وہ منتہا وہ منزلِ ہر راہِ مستقیم
اس حسنِ بے مثال کے اوصاف کیا کہوں
خیر البشر کہوں، اسے خیر الوریٰ کہوں

اسی "سانیٹ" میں یہ مصرعے بھی ہیں:—

روحِ چمن کو نعرۂ حق سے جھنجوڑ کر
اوراقِ گل کو سلکِ اخوت میں جوڑ کر
پیشانیِ چمن پہ رکھی مہرِ احترام

ں تو روح کا جھنجوڑنا ہی محلِ غور ہے پھر پیشانیِ چمن پر مہرِ احترام کا رکھنا اس پر مستزاد! تیسرا مصرعہ مبہم بلکہ مہمل ہے۔

منزل کی سمت دیدۂ حیراں لئے ہوئے　　منزل سے دور بادۂ نسیاں پئے ہوئے (ص ۵)

ادۂ نسیاں" نے شعر کا لطف خاک میں ملا دیا۔

طلوعِ صبح کے آثار ڈھونڈنے والے　　اُجالے رات کے پردوں میں ہیں انہیں پالے (ص ۶)

ں "سانیٹ" کا یہ شعر ہے اُس کا عنوان "اُجالے" ہے! "سانیٹ" کے آخری مصرعہ کو کس قدر جاندار ہونا چاہئے، مگر یہ مصرعہ:—

~ اجالے رات کے پردوں میں ہیں اُنہیں پالے

نا بے جان اور کمزور ہے! "پالے" خاص طور سے وجدان پر گراں گزرتا ہے۔

سوچ کے دام میں جب تک میں گرفتار رہوں
یہ مقدر ہے کہ محرومِ سکوں زار رہوں (ص ۱۲)

ں مصرعہ میں دام اور گرفتار جیسے قفس کے الفاظ آئے ہوں اس میں "سوچ" غور و فکر اور اندیشہ کے معنی میں بے جوڑ سا لگتا ہے، اس کے
لاوہ "سکوں زار" کی ترکیب کتنی نامانوس ہے۔

تیغ و تبر کہ جو ہے وہ آلودہ زنگ ہے　　کیا کام اس کو دا آج جنگ سے (ص ۱۱)

"اسوہ" کی جمع "اسوے" ہے "اسوں" کتنی غیرشاعرانہ ہے! اور غلط بھی!

"دامان" کا یہ شعر کتنا اچھا ہے :—

ایک دزدیدہ نظر اک التماسِ لب سہی
مانتا ہوں زندگی محرومیٔ جاوید ہے

"زلزلہ" کا ایک شعر ہے :—

شگاف پڑ گئے ، ایوانوں، آشیانوں میں
نگار خانۂ ہستی میں ایسا بال آیا

"آشیانوں" میں شگاف پڑ جانے کو گوارا بھی کر لیا جائے مگر نگار خانۂ ہستی میں "بال آنا" ہر اعتبار سے غلط ہے! "بال" چینی یا کانچ کے برتن میں آتا ہے، مکان میں نہیں آتا۔ کوئی مکان پورے کا پورا شیشہ اور کانچ کا بنا ہو، اور اس میں درز پیدا ہو جائے تو اس "درز" کو "بال" نہیں کہتے، اس سانیٹ کا آخری شعر :—

زبانِ حال سناتی ہے یہ علی الاعلان
کوئی سُنے نہ سُنے کل من علیہا فان

خوب نہیں بہت خوب ہے —

شدتِ خوف دبائی رہی میری آواز کھل نہ جائے کہیں سیاحت میثاق کا راز (ص ۲۵)

صحیح زبان "دبائے رہی" ہے! پھر مفہوم کے اعتبار سے شعر میں خاصہ ابہام پایا جاتا ہے۔

یہ شہنشاہ کا بُت ، جارج کا بُت ، لاش کا بُت
ایک کھوئی ہوئی ڈوبی ہوئی عظمت کا نشان
ایک تہذیبِ لطیف سوزِ جگر پاش کا بُت
بھرے بازار میں استادہ مثالِ کہسار
زنگ آلودہ و بوسیدہ غبار آلودہ
اثرِ دورِ روایاتِ خمار آلودہ (ص ۸۶)

"لاش کا بُت" آخر کیا بات ہوئی! "عظمت کا ڈوب جانا" عام طور پر نہیں بولا جاتا، "دیوار" کہتے تو ایک بات بھی تھی۔ بت کے لئے یہ کہنا کہ وہ بازار میں "کہسار" کی طرح کھڑا ہے، خیال و اظہار کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ رہا چھٹا مصرعہ اُس میں صرف لفظوں کو جوڑ دیا ہے! "روایاتِ خمار آلودہ" سے شاعر کی آخر کیا مراد ہے!

چاہو تو چراغِ غمِ فردا ہی جلا لو
خاکسترِ ماضی کو نہ رہ رہ کے کریدو (ص ۱۰۸)

مصرعہ ثانی کس قدر بے لطف اور پھس پھسا ہے، حالانکہ "سانیٹ" کا یہ ٹیپ کا شعر ہے۔

ایک سانیٹ ہے جس کا عنوان ہے " یہ شہر " فرماتے ہیں :۔

اس شہر میں آیا ہوں بہت دور سے چل کے
فاتح نہیں، تاجر نہیں، سیاح نہیں ہیں
کیا کوئی نمائندۂ ارواح نہیں ہیں
رندوں میں چلا آتا ہے جو بھیس بدل کے

ہلی بار اس کا علم ہوا کہ شہروں میں کوئی نمائندۂ ارواح بھی بھیس بدل کے چلا آتا ہے ! آخر یہ کیا " تلمیح " ہے، کوئی تک کی بات ی تو ہو ۔

میں عالم ملکوت کا جاسوس نہیں ہوں
چپکے سے جو لوں جائزہ فطرتِ انساں
دیکھوں کہ ہے کس درجہ یہاں عظمتِ انساں
یہ سچ ہے کہ اک پیکر محسوس نہیں ہوں

نمائندۂ ارواح " کے بعد یہ دوسری عجیب بات کہی ہے ! عالم ملکوت کے جاسوس کا فطرت انساں کا جائزہ لینے کے لئے شہروں میں آنا لہاں کی " دیومالا " ہے ! تلمیح، روایت، مسلمہ، مفروضہ، لوگوں کا " توہم " آخر کوئی نہ کوئی پس منظر یا بنیاد تو اس بات کی ہونی چاہیے تھی !

یہ سچ ہے کہ اک پیکر محسوس نہیں ہوں

پھر شاعر جو شہر میں دور سے چل کر یعنی اپنے پیروں کے سہارے آیا ہے، وہ " پیکر محسوس " نہیں ہے تو اور کیا ہے ۔
اس سانیٹ کا آخری حصہ پہلے جز سے کم مضحکہ انگیز نہیں ہے :۔

آیا ہوں کہاں سے مجھے کچھ یاد نہیں ہے
ہر نقشِ کفِ پا کو مٹاتا ہوا آیا
یہ شہر مرے خواب مجسم کی زمیں ہے
آیا ہوں مگر صورتِ تصویر ہوں حیراں
یہ شہر اماں ہے کہ کوئی شہر خموشاں (ص ۳۰)

نقش کفِ پا " کو مٹاتے ہوئے کیوں آئے ؟ شاید " نقش کفِ پا " سے قدیم روایات مراد ہوں مگر راستہ کی ہر روشنی کو کیوں بجھایا گیا۔ ت کہنے کا کوئی قرینہ ہوتا ہے ! " سانیٹ " کے آخری مصرعہ میں " شہر اماں " نے رہے سہے لطف کو بھی غارت کر دیا ۔
آخر یہ کیسی شاعری ہے، کہ نہ فکر و خیال میں کوئی ربط ہے، نہ مصرعوں میں شاعرانہ لطف ہے نہ کہنے والا اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا کرسکتا ہے، جو الم غلم جی میں آیا نظم کر دیا ۔ " سانیٹ " کی آگ ہی " ٹیک نک " ہے تو غریب اردو شاعری کی جان پر یہ " ظلم " بند ہونا چاہئے ۔ ہم اس جورِ ناروا کے خلاف احتجاج کرتے ہیں ۔
ایک سانیٹ " دستک " ہے، جناب عزیز تمنائی ارشاد فرماتے ہیں :۔

کھول دو بند دریچے کہ سحر آتی ہے
سنو کس شان سے بجتا ہے سویرے کا گجر
دیکھو استادہ ہوا روشنیوں کا لشکر

تیسرے مصرعہ میں "شوریت" بس کچھ یوں ہی سی ہے اہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے !

وہ چلے آئے ہیں ہر سمت سے خوشبو کے سفیر
وہ افق تا بہ افق کھنچ گئی کرنوں کی لکیر
گنگناتی ہوئی نغمات کی لہریں اٹھیں

نہریں جاری اور رواں ہوتی ہیں، اٹھتی نہیں ہیں !

سینۂ ارض میں جذبات کی لہریں اٹھیں
دیدنی چہرۂ آفاق کی رعنائی ہے

اور

حجلۂ تیرہ کوئی گوشۂ آرام نہیں
یہ اندھیرا، یہ گھٹن، اور یہ اٹل سناٹا
آہنی کھڑکیاں، فولاد کے در، بام اونچا
یہی جینا ہے تو جینے سے بُرا کام نہیں
دیر سے سنتے ہو کرنوں کی سریلی دستک
کھڑکیاں کھولو، چلی آئے گی بھرپور چمک (ص ۶۳)

ایک ہی نظم میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ سحر آرہی ہے، سویرے کا گجر بج رہا ہے، تمام افق کرنوں سے منور ہے اور روشنی اور رعنائی کے سبب دنیا کا چہرہ دیکھنے کے قابل ہے اور سانیٹ کے دوسرے حصہ میں فرماتے ہیں کہ تاریک حجلہ ہے، جس میں سکون اور آرام کا نام نہیں، ہر طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا ہے! اور

آہنی کھڑکیاں، فولاد کے در، بام اونچا

صبح کا ذکر کرتے کرتے آخر یہ "جیل خانہ" کہاں سے آگیا، پھر "بام اونچا" شعر میں کس قدر اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے ا

یہی جینا ہے تو جینے سے برا کام نہیں

یہ شاعری نہیں شاعری کی مکمل رسوائی اور بے آبروئی ہے !

.. کرنوں کا دستک دینا، تو ٹھیک تھا مگر "سریلی دستک" نے استعارہ کا لطف بھی غارت کر دیا۔

.. "برگِ نوخیز" کے زیادہ تر "سانیٹ" یہی رنگ رکھتے ہیں، ابہام، اہمال، الفاظ کا بے محل استعمال "سانیٹ کا آغاز" کے اختتام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، زیادہ تر لفظوں کی جوڑ جاڑ ہے شاعر کی جرأت اور نقد کی داد دینی چاہیے کہ اس نے اس قدر

یقین کے ساتھ مانتے ان "...... ات" کو چھپوایا ہے کہ ناقدانِ سخن اس کی داد دیں گے اور عوام میں اسے مقبولیت
سل ہو گی ؛ :

ہرادیس از :- وقار راشدی، ضخامت ۲۱۲ صفحات، متعدد تصاویر کے ساتھ دیدہ زیب رنگین سرورق، سفید کاغذ
کتابت و طباعت خوشنما، قیمت تین روپے ۵۰ پیسے، ملنے کا پتہ :- مکتبہ اشاعت اُردو کورٹری

" جناب وقار راشدی ایک جانے پہچانے ادیب ہیں اور جناب وحشت کلکتوی مرحوم سے مستفیض ہیں
انہوں نے کئی مفید کتابیں شائع کی ہیں جن میں "بنگال میں اردو" بڑی اہمیت رکھتی ہے اور داخل
نصاب بھی ہے ... "

عبارت سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے، یہ "پیش لفظ" ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی کا لکھا ہوا ہے،
کے بعد "گنگیر کنارے" میں وقار صاحب لکھتے ہیں :-

" اس حقیقت کا اظہار نامناسب نہ ہوگا کہ میں بنگالی نژاد ہوں، میری مادری زبان بنگلہ ہے
اس لئے میری ابتدائی تعلیم بنگالی زبان اور تربیت بنگالی ماحول میں ہوئی بعد میں اردو سے ایسی
وابستگی ہوئی کہ یہ زبان بھی میری اپنی ہو گئی ... "

یاں اپنا" کو اس کتاب کا دیباچہ سمجھنا چاہیے، جو رفیق خاور نے لکھا ہے، جس میں مشرقی پاکستان کی منظر کشی کی ہے! اس مضمون
سادگی کے باوجود جگہ جگہ خاصہ تکلف پیدا ہو گیا ہے، لکھتے ہیں :-

"..... باچہ پان ہی پان جن میں سے بعض اتنے کرارے کہ ان کے متعلق کہا جاتا ہے، سانپ ان
کی نوکیں منہ میں داب کر بیلوں، چڑھنے میں تو ان میں عجیب چٹپٹی کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے، وہ
گھنگھور دھواں دھار گھٹائیں جو جیسے بنگالہ کا پانی پی پی کر لہراتی، بل کھاتی، گھڑگھڑاتی ہوئی آتی
ہیں اور ساون سون کی بے پناہ طاغوتی قوت کے ساتھ ایک دم ٹوٹ پڑتی ہیں، ان ساری باتوں سے
بڑھ کر جادو اور کیا ہوگا " (ص ۱۰)

غوتی قوت تو اردو زبان میں "شیطانی قوت" کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں کھلا ہوا ذم پایا جاتا ہے، بنگال کی مُون سون کو،
طاغوتی قوت" کہنے کی آخر کیا تک تھی !

"سنہرا دیس کا مصنف اسی سرزمین میں پیدا ہوا، اس کا ہر ہر رنگ دیکھا، اس کے سمے شروع
ہی سے اس کے دل میں رسے بسے ہوتے ہیں " (ص ۱۴)

سمے کہہ کر شاید موسم مراد لی گئی ہے مگر اس طرح کون بولتا اور لکھتا ہے !

جناب وقار راشدی نے مشرقی پاکستان کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، ادبیات، جمالیات، مقامات، مشاہیر اور صوفیائے
ام پر بڑے معلومات آفریں مضامین لکھے ہیں اور اُن کو خاصے سلیقہ سے مرتب کیا ہے،

"عوامی ادب" جس مقالہ کا عنوان ہے، اُسے پڑھ کر ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا ۔

"شمالی ہند میں کبیرؔ کے دوہوں کی جو اہمیت ہے، وہی مشرقی پاکستان میں وہاں کے شاعر "پاول" کو حاصل ہے"

"نذرالاسلام" کی شاعری پر خاصہ مفصل مضمون ہے، جس سے یہ باتیں بھی معلوم ہوئیں:۔

"نذرل بنگلہ ادب کا پہلا شاعر ہے، جس نے اردو فارسی کی طرح بنگلہ میں بھی صنف غزل گوئی کی بنا ڈالی، اس کی شاعری اردو فارسی کی حسین و دلکش ترکیبوں، محاوروں، استعاروں اور اصطلاحوں سے مالامال ہے . . . . اس نے کلام غالبؔ کا گہرا مطالعہ کیا ہے، حافظ شیرازی اور عمر خیام کی رباعیات کے بنگلہ میں نہایت دلکش منظوم ترجمے کئے ہیں، پارۂ عم کا مکمل ترجمہ بنگلہ زبان میں پہلی بار نذرالاسلام نے پیش کیا۔"

سلطان بایزید بسطامی جنہوں نے چاٹگام کے قریب پہاڑی پر چلہ کیا تھا، اُن کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ خیال کہ یہ مشہور صوفی بایزید بسطامیؒ ہیں، صحیح نہیں ہے! (ص ۱۰۰)

اس دیس کی بدلی شوبھا یہ دیس رسیلا پیارا (ص ۱۶۵)

دیس کو "رسیلا" کہنا عجیب سی بات ہے!

جناب وفا راشدی نے بڑی محنت اور تحقیق سے یہ مضامین لکھے ہیں اور ان کو بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے، مشرقی پاکستان کے حالات جاننے کے لئے "سنہرا دیس" کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے، یہ بڑے کام کی کتاب منظر عام پر آئی ہے، جس پر وفا راشدی کو ہم صمیم قلب سے مبارکباد دیتے ہیں! یہ اردو زبان کی ہمہ گیری اور جامعیت کی دلیل ہے کہ ایک بنگالی نژاد اہل زبان کی طرح اردو لکھتا ہے! اور اُس کے مضامین میں تنقید و تاریخ کے اچھے نمونے ملتے ہیں ۔

الٹے بانس بریلی کو

از :۔ رائے محمد احمد خاں، ضخامت ۱۱۸ صفحات، قیمت ۷۵ پیسے
ملنے کا پتہ :۔ مصبروزا اکیڈمی، پبلز کالونی اے، لائل پور

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ ہوں یا مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ، بریلوی عقائد رکھنے والے علماء نے ان میں سے ہر بزرگ کی "تکفیر" کی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ پر "وہابیت" کا فتویٰ لگایا ہے! یہ شعر اس گروہ کے "مکفرین" پر صادق آتا ہے ۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کتاب کے آخر میں مصنف نے علماء بریلی سے دردمندانہ گزارش کی ہے وہ "تکفیر بین المسلمین" سے باز آجائیں!

افسوس ہے اس کتاب کی انشاء بہت کمزور ہے اور اُس کے مصنف تصنیف و تالیف کا تجربہ اور سلیقہ نہیں رکھتے! متعلقہ اقتباسات اور کتابوں کے حوالوں کا ایک جنگل ہے جو یکجا کر دیا گیا ہے ۔

- -

اردو املا کا آسان طریقہ

عبدالغفار مدہولی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۵۰ نئے پیسے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اس کتاب کے تین ابواب ہیں

اردو املا کا آسان طریقہ (۲) اردو رسم خط میں علامتیں اور (۳) آسان اردو جاننے والوں کا تحریری کام ـ

جناب عبدالغفار مدہولی برسوں سے بچوں کی تعلیم و تدریس اور اس موضوع پر تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں، اس فن کے متخصصین میں اُن کا شمار ہوتا ہے انہوں نے اس کتاب میں اُردو کے "فنِ املا" پر عملی تجربے اور غور و فکر کے بعد بڑے کام کی باتیں لکھی ہیں، اُردو ٹائپ کی کیا دشواریاں ہیں، ان دشواریوں کو کس طرح ہلکا بنایا جا سکتا ہے یہ سب باتیں اس کتاب میں ملتی ہیں!

ننھی کلیاں

از:- حافظ عبدالرزاق باقوی، ضخامت ۴۴ صفحات (سر ورق رنگین) قیمت ۱-۳۵ پیسے
ملنے کا پتہ:- کتاب گھر، جمیل آباد، میل وشارم (ارکاٹ، مدراس)

جناب حافظ باقوی نے بچوں اور بچیوں کے لئے ہلکی پھلکی نظمیں کہی ہیں، ان نظموں میں بچوں کی نفسیات کا لحاظ رکھا گیا ہے، زبان آسان و سادہ اور نظموں کی بحریں رواں اور آسانی سے بچوں کو ازبر ہو جانے والی ہیں، سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ بچوں کی دینی اور اخلاقی تربیت شاعر کا مقصود ہے! اُردو کتنی ہمہ گیر زبان ہے کہ جنوبی ہندوستان میں اس کا ڈنکا پٹ رہا ہے! لیکن پاکستان میں ابھی تک وہ سرکاری زبان نہیں بن سکی اس دردِ و غم کو کہیں بھی تو کس سے کہیں، اس کا سننے والا یہاں کون ہے!

(ص ۴۹ کا بقیہ)

نمازی بنا دیا اور جو نمازی ہیں اُن کی نماز درست کر دیا اس معصیت زدہ دور میں یہ عظیم الشان کارنامہ تبلیغی جماعت کی کوششوں سے انجام پا رہا ہے۔ اسلام کا جامع تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے، جس میں سیاست و حکومت بھی شامل ہے، تبلیغی جماعت سیاست و حکومت کے مسائل سے عملاً کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ اس معاملہ میں ان حضرات سے اُلجھنا نہیں چاہئے۔ دنیا کے پردے پر جہاں کہیں اور جب بھی اسلامی نظام برپا ہوگا، اس کی تشکیل کے لئے اچھے پرزے بے نمازیوں اور فاسقوں اور فاجروں کی ٹولیوں سے نہیں، انہیں مبلغین صلوٰۃ و تقویٰ سے لئے جائیں گے

خانقاہی اصطلاح میں جسے "شیخِ وقت" کہا جاتا ہے، یہ لقب حضرت مولانا محمد یوسف رحمتہ اللہ علیہ کو ہر طرح زیب دیتا ہے، اس زمانہ میں ذکر و دعوت کے وہ سب سے بڑے مبلغ تھے۔ کوئی شک نہیں اُن کی ذات سے دین و ملت کو فائدہ پہونچا، پاکستان تقریباً ہر سال آتے، رائے ونڈ میں تبلیغی جماعت کا اجتماع قابلِ دید ہوتا، مولانا مرحوم جہاں جاتے، روزے نماز کے چرچے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ماحول منور اور معطر ہو جاتا، اُن کے وعظ کا خاص انداز تھا، سادہ لب و لہجہ مگر پُرسوز اور اثر انگیز! لاہور میں تبلیغی دورے پر آئے ہوئے تھے کہ پچاس سال کی عمر میں عالمِ قدس سے بلاوا آ پہونچا۔ موت ہر جان کے لئے مقدر کر دی گئی ہے، اس عالمگیر قانون سے انبیاء تک کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا، اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت برزخ تا آخرت کی ہر منزل میں اُن کی رفاقت فرمائے (آمین)

ماہنامہ فاران کراچی

ایڈیٹر ۔ ماہر القادری

جلد ۱۷ | جولائی ۱۹۶۵ء | شمارہ ۴

ترتیب

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

چندہ سالانہ ۔ سات روپے ۶/

معاون ایڈیٹر ۔ وقار

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

پبلشر ۔ مسرور حسین

طابع ۔ مسلم پرنٹنگ پریس

دکتبہ شبیر حسن کوثی

ماہرالقادری

اس کائنات میں، اس جہانِ آب و گل میں بلکہ یوں کہیئے اس عالم عرش و فرش میں اللہ تعالیٰ کی شانِ خلاقیت و ربوبیت اور کمالِ قدرت کی سب سے زیادہ روشن دلیل حضرت سیدنا خاتم النبین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، انسان بہ حیثیت اپنی نوع کے خلاصہ مخلوقات ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شخصیت بلاشبہ خلاصہ انسانیت ہے، کوئی شک نہیں دنیا میں بڑے بڑے برگزیدہ انسان اور دین و اخلاق کے اعتبار سے بلند سے بلند پاکیزہ شخصیتیں گزری ہیں، جن پر ہم صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں مگر انسانیت کی پوری تاریخ میں "انسانِ کامل" بس ایک ہی پیدا ہوا، جس کی ذات پر دین کی تکمیل ہوئی اور نبوت کو ختم کر دیا گیا، اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا اور جو کوئی نبوت کا دعویٰ کرے گا چاہے وہ ظلی اور بروزی نبوت ہی کیوں نہ ہو، اُسے جھوٹا، غلط گو، بلکہ کافر سمجھا جائے گا۔ اتمام نعمت اور تکمیل دین کے بعد نبیوں کے بھیجنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی لہذا اس منصب جلیل پر محمد عربی کے نام کی آخری مہر لگادی گئی، نبوت کا عہدہ "مختوم" کر دیا گیا، دنیا کے پردے پر صرف اُسی امت کو مسلمان کہا جاتا ہے اور قیامت تک کہا جائے گا، جو سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آخری نبی ہونے پر ایمان رکھتی ہے اور حضور کے بعد نبوت کے تمام دعویداروں کو جھوٹا سمجھتی ہے! جو کوئی اپنی ذات کی طرف کسی قسم کی نبوت کے نام سے بھی بلاتا ہے وہ کاذب و مفتری ہے، ہر متنبی پر ہم لعنت بھیجتے ہیں اور اس کی تکذیب و تردید کو ایمان کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں! وہ مسلمان بے غیرت اور بے حمیت ہے اور اس کے ایمان میں کھوٹ پائی جاتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مدعی نبوت کو تکفیر سے بچانے کے لئے منطق و کلام کے نکتے پیدا کرتا ہے! "وحدتِ امت" کے نام پر شیطان کے اس فریب سے اللہ تعالیٰ ہر کسی کو محفوظ رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات اور حضور کی لائی ہوئی شریعت میں جو شانِ جامعیت پائی جاتی ہے اُس کا وجود اگلی پچھلی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا، یہاں فقر و فاقہ کے ساتھ حکومت و سیاست بھی ہے، قرآن کریم کی تشدید کے ساتھ تلوار کی جھنکار اور کمان کی کڑک بھی سنی جاسکتی ہے یہاں صفہ ہی نہیں بدر و احد کے معرکے بھی ہیں اور طائف و ارض حرم کی مظلومیت ہی نہیں مکہ کی فتح اور خیبر کی قلعہ کشائی بھی ہے! یہاں شب بیداری اور احرام و اعتکاف بھی ہے اور ساتھ ہی صبا رفتار گھوڑے بھی دوڑائے جا رہے ہیں، خوشبو اور عورت کی پسندیدگی بھی ہے یہاں پیوند لگے کپڑوں کے ہجوم میں یمن کے حلے اور دھاری دار خوب صورت چادریں بھی نظر آتی ہیں، تلوار کے ذریعہ فتنہ کا استیصال اور کفر و شرک کی بیخ کنی بھی ہے اور اس کے ساتھ قرآن کے سایہ میں بسطِ امن کی مخلصانہ کوششیں بھی ہیں! عورت جسے دنیا کے ہر معاشرے نے ذلیل سمجھا تھا اُس کو عزت کا مقام بھی عطا کیا گیا اور اس کے جائز حقوق بھی متعین کئے گئے، زبانِ وحی ترجمان سے یہ الفاظ بھی دُنیا نے سُنے کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے" مگر

ساتھ ہی عورت کی عصمت و عفت کی حفاظت کے لئے پہرے اور بدن پر جلباب و خمار بھی آگئے، حجاب و غیرت اور شرم و حیا کو عورت کی شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں اور اہم امتیاز سمجھا گیا، کسی استعارے اور رمز و کنایہ کے بغیر کھول کر بتایا گیا کہ عورت کی آواز اس کے زیور کی جھنکار اور اس کے ملبوسات کی خوشبو فتنہ ہے، اور آنکھ کا زنا تو آنکھ کا دیکھنا ہی ہے، مردوں کو غضِ بصر کی ہدایت کی گئی، مرد و زن کے اختلاط پر قدغن لگائی گئی :

شوہر اور بیوی کے تعلقات کی خوش گواری پر اہلی زندگی کے سکون و اطمینان کا بہت کچھ دار و مدار ہے اس لئے زوجین کے حقوق اور نکاح و طلاق کے مسائل کو دوسرے مسائل کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ، طلاق کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، اُسے "ابغض المباحات" فرمایا گیا، اسی طرح مرد کو چار نکاح کرنے کا حکم نہیں "اجازت" دی گئی ؛ خاص طور سے طلاق و خلع کی ایسی نزاکتیں ہیں جن کو شوہر اور بیوی ہی اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں، حکومت یا پنچایت کے جبر و دخل اور قانونی اجازت کی پابندی سے ان معاملات کے سنورنے کی بجائے بگڑنے اور خراب تر ہونے کا امکان ہے۔

سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کو ایک طرف حرام قرار دیا گیا، دوسری طرف ذاتی ملکیت پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی "زکوٰۃ" کی فرضیت اور خیرات و صدقہ کی ترغیب خود اس کی دلیل ہے کہ مال و دولت کے اکتساب پر حلال ذرائع کے علاوہ اسلام کوئی قانونی روک نہیں لگا، قمار بازی اور شراب نوشی کو عمل شیطان کی گندگی بتایا گیا، تاریخ گواہ ہے کہ عہدِ رسالت میں اس "منکر" کو اس طرح مٹایا گیا کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب بہہ بھی پھرتی تھی، شراب بنانے اور پینے پلانے کے برتن تک توڑ دئے گئے، سٹہ، گھوڑ دوڑ کی شرط، بت گری، مجسمہ سازی اور رقص و غنا کے لئے اسلامی معاشرے میں کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہنے دی، انسان کی عزت و تکریم اور شرف و بزرگی کا معیار "تقوٰی" قرار پایا، اس معیار نے حسب و نسب کے غرور اور فخر و مال کے غباروں سے ہوا نکال دی ؛

انسان کے کمائے ہوئے مال و جائداد اور ملکیت پر پابندی لگا کر اس کے ذاتی تشخص کی نفی نہیں کی گئی، کہ اس قسم کی مساوات غیر فطری ہے اور قیدیوں کی طرح انسانوں کے رہنے پہننے اور کھانے کپڑے کا انتظام کرکے انسانوں کے فطری حقوق سلب نہیں کئے گئے، نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لائی ہوئی شریعت نے انسان کو جائز حدود میں معیشت و معاش کا منشورِ آزادی عطا کیا۔

انسانی اخوت کا اس قدر احترام کیا گیا اور اُس کو اس درجہ وسعت دی گئی کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ کہا گیا۔ پڑوسی چاہے وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اس کے حقوق کی حفاظت و احترام کی تاکید فرمائی گئی، انسان تو انسان جانوروں تک پر رحم کرنے کا حکم دیا گیا، قول و قسم عہد و پیمان اور اقرار و میثاق کے پاس و لحاظ اور اُنہیں پورا کرنے کی تعلیم دی گئی، سچ کے لئے فرمایا گیا کہ باعثِ نجات اور جھوٹ سبب ہلاکت ہے، رشوت دینے اور لینے والے دونوں کو وعید سنائی گئی، سود خواروں کے لئے اتنی سخت وعید اور ڈراوا کہ وہ اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں ! اس وعید نے اسلامی معاشرے میں سود خوار مہاجنوں، یہودیوں اور شائیلاکوں کے لئے گنجائش ہی نہیں رہنے دی، پھر فرمایا گیا کہ دولت کو گردش میں رہنا چاہیے :

سرمایہ و محنت کو تصادم سے بچانے کے لئے مالداروں کو سخاوت، جود و کرم کشادہ دستی اور سیر چشمی کے لئے ابھارا گیا، حکم دیا گیا کہ مزدور کے ماتھے کا پسینہ خشک ہو جانے سے پہلے اُس کی مزدوری دے دی جائے، دوسری طرف اہل محنت کو صبر و قناعت کی تعلیم دی گئی۔ اہل سرمایہ خود نما نہ ہوں اور اہل محنت خود فروش نہ بننے پائیں، یہ وہ اخلاقی توازن ہے جس سے سرمایہ و محنت کے درمیان رقابت اور حریفانہ

ہ کشی کی نوبت نہ آنی چاہئے! کسب مال و دولت پر جائز و حلال ذرائع کی قید و پابندی کے بعد سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا بھی نہیں ہو سکتی!
دقِ مقال اور اکلِ حلال یہ وہ زرین اصول ہیں جن سے شخصی اور اجتماعی طور پر انسانیت کو فوز و فلاح میسر آتی ہے اور معاشرے کو
یزگی نصیب ہوتی ہے۔

ہدایت و نصیحت کی گئی کہ مسلمان باہمی مشورت کے ساتھ اپنے امور انجام دیں، اس اصول نے آمریت، ملوکیت اور مطلق العنانی کی
ی کر دی اور حکومت و سیاست کے شورائی نظام کو خیر و فلاح کا صداقت نامہ عطا کر دیا! اچھے حاکموں کی یہ پہچان بتائی گئی کہ جن کے لئے،
ام کے دلوں سے دعائیں نکلیں اور لوگ انہیں پسند کریں نہ یہ کہ — انہیں گھیر کر بڑے آدمیوں کے استقبال کے لئے بے جایا جائے اور "زندہ باد" کے
رے لگانے کا انہیں الاؤنس دیا جائے!

اسلام نے شادی و غمی کے معاملات میں بھی رہنمائی دی، شادی و مسرت کے موقع پر ناچ رنگ، آتشبازی، سوانگ، نقلیں اور اس قسم
، دوسری بازاری باتیں اور دکھاوے کے مظاہرے نہیں ہونے چاہئیں؛ اسلام نے پورے سال میں دو تہواروں کو "عید" قرار دیا ہے، جن کی
سے بڑی خصوصیت ذکر و صلوٰۃ اور تکبیر و تہلیل ہے، کوئی ایسی خوش فعلی اور لہو و لعب نہیں جس سے اخلاق تو خلاق سنجیدگی اور متانت پر بھی حرف
آ ہو، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت کتنا مقدس اور مسرت انگیز ہے مگر اس دن کوئی سالگرہ اور یادگار نہیں منائی گئی، نہ چراغاں نہ
وس نہ ڈھول تاشے! اسی طرح رنج و غم کے موقعوں پر سینہ کوبی، ماتم زنی، جزع فزع کرنے، گریبان پھاڑنے، بال نوچنے اور ماتمی لباس پہننے کی
مانعت کی گئی، مسرت و خوشی کے موقع پر شکر اور غم پر صبر یہ ہے وہ مظاہرہ جس کی مرد مومن سے اسلام توقع رکھتا ہے، مسلمان ظرف کے اعتبار سے بحرِ
یراں اور تحمل کے لحاظ سے کوہِ گراں ہوتا ہے، توکل علی اللہ عزیمت و استقامت اور راضی برضا رہنا یہ ہے اہل ایمان، امتیانِ نبی آخر اور غلامانِ
سرورِ عربی کا صحیح موقف اور سیرت و کردار!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اور آفتاب نبوت کا طلوع کفر و شرک کے لئے گریز و فرار اور غروب و فنا کا پیام تھا، جاء الحق و زہق
الباطل، ان الباطل، کان زہوقا، کی تصویر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، وہ تخیل کے بت ہوں یا پتھر کے صنم سب ایک ایک کر کے ٹوٹ کر رہے،
بدعت کو ضلالت ٹھیرایا گیا، اس طرح دین میں "ایجاد و ابداع" کے راستے بند کر دیے گئے! ہاں! "اجتہاد" کی گنجائش رکھی گئی۔

عدل و انصاف کے معاملات میں کافر و مسلم کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا، جس کا جو واجبی حق ہے وہ اُسے ملنا چاہئے
ور جس نے جس پر جو زیادتی کی ہے اس پر قانون کا احتساب ضروری ہے اور قانون کی نظر میں مسلم و کافر کی حیثیت ایک جیسی ہے!

شعر و ادب کو تقدس و پاکیزگی عطا کی گئی اور تہذیب و تمدن کو نکھارا گیا، زندگی کے ہر شعبہ میں نیکی اور سچائی کو نافذ اور غالب کر دیا گیا اللہ
عالی کی زمین چپہ چپہ اس کے نور سے جگمگانے لگی، ہر طرف خیر و حکمت کے فانوس روشن ہو گئے اور عدل و صداقت کے ستارے جھم جھم کرنے لگے۔
نیکی کا چلن، پاکبازی اور تقویٰ کی فراوانی، دیانت و راستبازی کی جلوہ آرائی!

سیرت مقدس کی چند جھلکیاں

اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ حمد کرنے والے یعنی "حامد" بھی، اور زمین و آسمان میں جن کی نعت
و مدح اور توصیف و منقبت کے نغمے گونج رہے ہیں اس لئے احمد، محمد اور محمود بھی۔ (صلی اللہ
علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے افضل الانبیاء اور خاتم النبیین کے منصب جلیل کے لئے حضورؐ کو منتخب
فرمایا، اس لئے "مصطفیٰ" بھی، کونین میں سب سے زیادہ عزت و شرف حضورؐ کو عطا کیا گیا، اس لئے "مجتبیٰ" بھی! دین و اخلاق

"نور" اور ہدایت وسعادت کے "سراجِ منیر" بھی! قیامت تک دنیا کو ہدایت کا اجالا اسی "روشن چراغ" سے ملے گا، جو اس چراغ ہدایت سے محروم ہے اس کے لئے اندھیرے ضلالت اور گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا۔

احمد مجتبیٰ (اس نام کے قربان) محمد مصطفےٰ (فداہ روحی، ابی وامی) یہ وہ مقدس نام ہے جو اذان، تکبیر اور نماز میں شامل ہے! عزت وتکریم اور رافت ومحبت کی حد ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور کو "رؤف ورحیم" فرمایا، جو اللہ کے نام بندے کے نام، کتنا نازک مقام ہے، ناموں کی یہ لفظی اور معنوی مشابہت، ۔ ۔ ۔ ۔ ! سبحان اللہ عما یصفون !

ع به مقامے کہ رسیدی نہ رسید ہیچ نبیؑ

مگر

ان تمام بلندیوں، مرتبوں اور رفعت وعزت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر عالم میں اپنی "عبدیت" کا اعلان اور اقرار اور زبان مبارک سے کوئی ایسا لفظ نہیں سنا گیا جو ربوبیت اور عبدیت کی حد فاصل پھاندتا ہوا انداز ہوتا ہو، قطرہ دریا میں حل ہوگیا موج موج میں مل گئی، جلوہ جلوہ میں سما گیا، یہ خطرناک نکتے تو شعر وتصوف کے تراشے ہوگئے ہیں، اُس "عبد کامل" کے یہاں اس کا پیرایہ بیان اور اسلوب کلام ہی سرے سے نہیں ملتا !

کوئی کچی پکی روایت نہیں، قرآن کہتا ہے :-

وما ارسلنٰک الا رحمۃ اللعلمین

زمین وآسمان، کون ومکاں، فرش وعرش، تحت وفوق، عالم اجسام ہو یا عالم ارواح، دنیا ہو یا عقبیٰ، غرض ہر عالم کے لئے حضرت رحمۃ اللعلمین کی ذات رحمت ہے، حضور نذیر وبشیر بھی ہیں، یہ شرف اور کسی کو عطا نہیں ہوا، قیامت کے دن شفاعت کا تاج حضور ہی کے فرقِ مبارک پر ہوگا۔ اُس روز سرکار کو لوار الحمد اور مقام محمود عطا کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو شفاعت کی اجازت ملے گی، اور حضور کی شفاعت قبول کی جائے گی !

ان تمام مناقب ومحامد کے ساتھ صاحبِ معراج بھی، انبیاء کرام جس حقیقت کی گواہی دیتے آئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تصدیق آنکھوں کی رویت اور عینی شہادت کے ذریعہ فرما دی، اور اس طرح شہادتِ حق کا یہ سلسلہ استوار ہوگیا شب معراج کیا دیکھا، کس طرح دیکھا؟ اس کی تفصیل وہ انسان کیا بتا سکتا ہے جس کی آنکھیں پھلجھڑی کی چمک دمک بھی تاب نہ لاسکتیں اور ذرا سی چکا چوند نگاہوں پر بار گزرتی ہے! انوار ربانی اور آیاتِ الٰہی کا اس طرح مشاہدہ کیا کہ حضور کی آنکھوں نے چکا چوند اور حیرانی تک محسوس نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو روحانی اور جسمانی طور پر ہر مشاہدہ اور رویت کی قوت بخش دی تھی جبھی تو مکان ولامکاں کی سیر کرائی گئی، کہ جسم اور روح اور دیدہ ودل ہر قسم کے مشاہدات اور واردات کا تحمل کر سکیں

ایک طرف یہ اعزازات ومدارج کہ جن کی کوئی حد ونہایت نہیں، حضور کا ہر وصف بحر بے کنار اور ہر صفت نا محدود ہے لفظ وبیان اور فکر وخیال سے احاطہ نہیں کیا جا سکتا؟ قرآن کیا ہے؟ اس کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ملے گا اور آپ کے اخلاق کیا تھے، اس کا جواب قرآن کریم دے گا! (کان خلقہ القرآن) جوانی کا زمانہ، جسمانی صحت توانائی کے ساتھ حسن وجمال کی دلکشی کی بھی کوئی حد ونہایت نہیں، پھر مکہ کا ماحول جہاں قدم قدم پر ہوسناک جذبات کی پ

اسباب مہیا تھے، مگر محمد ابن عبداللہ نے اس فسق پروردہ ماحول اور معصیت زدہ معاشرے میں جوانی کا زمانہ اس قدر عفت و
پاکیزگی کے ساتھ گزارا کہ آپؐ کے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ محمد (نعوذ باللہ) کی نگاہ سے ذرہ برابر بھول
چوک ہوئی تھی، حضورؐ نے زندگی بھر کسی نامحرم عورت کے ہاتھ تک کو نہیں چھوا، نگاہ و خیال، قلب و ضمیر، دست و پا سبھی سب معصوم و
پاکیزہ! زندگی چاندنی سے بھی زیادہ اُجلی اور صاف ستھری! قوم نے حضورؐ کی امانت و دیانت کو دیکھ کر "الامین" کا خطاب دیا، اسی "الامین"
نے جب نبوت کا اعلان فرمایا تو قوم مخالف ہو گئی یہ ظالم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ جو شخص دنیا کے معاملات میں دیانت و امانت کا ثبوت دیتا ہے، وہ
خدا کے بارے میں (معاذاللہ) غلط بیانی نہیں کرسکتا۔

حضورؐ کے کردار کی صداقت و راستبازی کی سب سے نمایاں دلیل یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ ایمان لاتے وہ آپؐ کے دوست
ابوبکرؓ، آپؐ کی زوجہ مطہرہ خدیجہؓ، چچازاد بھائی علیؓ اور آپؐ کے غلام زیدؓ تھے، کوئی شخص کتنا ہی محتاط اور لئے دئے کیوں نہ رہے ان
چار شخصیتوں (دوست، بھائی، بیوی اور ملازم) سے اپنی زندگی کو پردے میں نہیں رکھ سکتا یہ لوگ آپؐ کی جلوت و خلوت کے رازدار
ہوتے ہیں، اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر کوئی معجزہ اور دلیل طلب کئے بغیر ان چار افراد کا ایمان لے آنا، اس کی دلیل ہے کہ حضورؐ کی صداقت
و راستبازی اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کا انہیں اچھی طرح تجربہ تھا، حضورؐ کے اعلان نبوت پر انہیں یقین ہو گیا کہ "محمد الامین" کی زبان سے حق
کے علاوہ کوئی اور بات نکل ہی نہیں سکتی اور اس صادق الوعد، الامین اور معصوم انسان کے دعوے اور اعلان میں شک کرنے کے یہ معنی ہیں کہ حق
گوئی اور سچائی سے دنیا ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے۔

کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" دراصل ہر باطل قوت کے خلاف اعلان جنگ اور ہر "غیر اللہ" کی نفی تھی، اس کے بعد مکہ کی
سرزمین حضورؐ پر تنگ ہو گئی، ایسا محسوس ہوا جیسے مکہ میں آدمی نہیں سانپ، بچھو، بھیڑیے اور ریچھ رہتے ہیں، ایک انسان کو اس کے مقصد سے
ہٹانے، بددل کرنے اور اس کے مشن کو ناکام بنانے کے لئے جتنی ذلیل ترکیبیں ممکن تھیں وہ سب آزمائی گئیں، عورت، مال و دولت
اور امارت و سرداری کا لالچ بھی دیا گیا، سوشل بائیکاٹ بھی کیا گیا، شعب ابی طالب میں یہ زمانہ کتنا صبر آزما اور روح فرسا تھا، راستے
میں کانٹے بچھائے گئے، اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے کی حالت میں سرِ مبارک پر اونٹ کا اوجھ ڈالا گیا، حضورؐ کے ساتھیوں کو بھی طرح طرح
سے ستایا گیا کسی کسی کو تو یہ ظالم مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے اور کسی کے سینہ کو تپتی ہوئی ریت پر پتھروں سے داغا گیا، طائف کے
بازاروں اور گلیوں میں دنیا کے سب سے زیادہ عظیم اور عزت والے انسان پر آوارہ لونڈے اور شہدے پھبتیاں کستے اور پتھر پھینکتے تھے،
یہاں تک کہ حضورؐ کی جوتیاں خون میں بھر گئیں، زخموں سے چور اٹھتے تھے اور پھر گر پڑتے تھے! مکہ کی زمین رحمۃ للعالمین پر اتنی تنگ کر دی
گئی کہ حضورؐ کو وطن سے ہجرت کرنی پڑی، وطن کو چھوڑتے اور کعبہ کا آخری دیدار کرتے ہوئے قلب مبارک پر نہ جانے کیا عالم گزر گیا ——
کوئی اور سیاسی لیڈر اور دنیوی حاکم اور بادشاہ ہوتا تو ان مظالم اور شدائد سے تنگ آکر ہمت ہار جاتا یا اپنے مقاصد، مشن اور پروگرام
میں کاٹ چھانٹ کر زمانہ کی فضا سے ہم آہنگ بنا لیتا مگر یہ اللہ کا سچا رسولؐ تھا جس کے مقابلہ میں آسمان کی تمام بجلیاں اور زمین کے سب
پہاڑ بھی آجاتے، تو بھی وہ اپنی منزل سے بال برابر ادھر اُدھر نہ ہوتا۔

مدینہ کی مہاجرت، نیا ماحول، اجنبی فضا، یہاں منافقوں کی سازشوں اور یہودیوں کی خطرناک چالوں کا مقابلہ کرنا پڑا، قریش مکہ
نے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا، بدر و احد کے معرکے انہی کی دشمنی کے سبب ظہور میں آئے یہاں تک کہ فتح مکہ نے حالات کا رخ ہی موڑ
دیا

دیا، ملک کی فضا ہی بدل گئی، بڑے بڑے کٹے کافروں اور خون کے پیاسے دشمنوں کو حق کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ رہا! فتح مکہ میں رحمتہ اللعالمین کے عفو و در گزر نے دشمنوں کے دل جیت لئے، جو تلوار سے زیر نہ ہو سکے تھے، وہ احسان و مروت کے سامنے سپر انداختہ ہو گئے۔

فتح مکہ درحقیقت حق و صداقت، احسان و کرم، عدل و انصاف بلکہ یوں کہئے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی فتح تھی، ظلم و ستم، کفر و شرک اور جہل و نادانی کو تاریخ کے کسی دور میں ایسی فیصلہ کن شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا! اس فتح نے حق و باطل کا فیصلہ کر دیا، اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہوا اور باطل کو نیچا دیکھنا پڑا! جو اس سرزمین پر ستائے، گھسیٹے اور لہولہان کئے گئے تھے اب قیادت و امارت کی زمام انہی کے ہاتھوں میں تھی، عتبہ، شیبہ اور ابوجہل جیسے گرانڈیل سردارانِ قریش کا دور ختم ہو چکا تھا، اب بلالؓ و سُمیّہؓ کا زمانہ تھا، آن غلامانِ محمد کا جن کی غلامی پر ہزار ہا ہزار آزادیاں قربان!

مکہ کی زندگی شدید آزمائش و ابتلا کی زندگی تھی، آزمائش کی یہ وہ بھٹی تھی جس میں سیرت و کردار تپ کر کندن بنتے جا رہے تھے، اسلام کی تاریخ میں یہ دور عظیم الشان اہمیت رکھتا ہے، یہ نمونہ کا دور ہے یعنی یہ کہ جب اہلِ حق کو مظلومیت کی زندگی سے سابقہ پڑے تو ان کے صبر و استقامت کا یہ انداز ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی رضا یوں ہی حاصل نہیں ہو جاتی اس کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دینا پڑتا ہے! اور پھر مظلومیت کے اس افق سے فتح و نصرت کا ستارہ طلوع ہوتا ہے!

مدنی زندگی اللہ تعالیٰ کی خلافت کے عمل و تجربہ کی زندگی ہے، اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور دینِ حق کی سربلندی کا دور، ایسے معاشرے کا وجود جس کی بنیاد عدل و انصاف اور خیر و تقویٰ پہ قائم کی گئی تھی! ایک ایسی حکومت کا ظہور جس پر خلافتِ الٰہی کی معنویت صادق آتی ہے جہاں صرف کتاب و سنت کا قانون چلتا تھا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہر طرف عملداری تھی۔ عرب کی سرزمین اور اسلامی حکومت کی خاک سے نیکیاں سبزے کی طرح اُگتی تھیں اور وہاں کی آب و ہوا میں پرہیزگاری اور خشیت و تقویٰ گھل مل گئے تھے۔ مرزا غالب نے تو یوں بھی شاعری کی ترنگ میں کہہ دیا تھا۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

مگر خطۂ عرب کی ہوا میں واقعی تقویٰ اور نیکوکاری کی تاثیر پیدا ہو گئی تھی اور وہاں کی ہوا میں سانس لینا نیکی اور عبادت تھا۔

مکہ کی مظلومیت کو بھی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل تھی اور مدینہ میں دینِ حق کو جو اختیار و اقتدار کی ہیئت و صورت میں غلبہ میسر تھا۔ اس کا مقصود بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا۔ کتاب و سنت کے احکام کا تشریعی حیثیت سے نفاذ اور حکومت و اقتدار کے ذریعہ حدود اللہ کو جاری کرنا، یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس اسوہ اور مبارک سیرت کا نمایاں ورق ہے!

اسوۂ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمٰن خدا کے شرف اتصاف کرنے والے اور احکام خداوندی کے خبر دینے والے ہی نہیں تھے بلکہ جو حکم اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو پہنچایا اس پر خود عمل کر کے دکھایا مثلاً "اقیموا الصلوٰۃ" کی تعمیل اس انداز میں کی کہ رات رات بھر نماز میں حضور کھڑے رہتے تھے، جس کے اثر سے پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے، امت پانچ وقت کی نمازیں پڑھتی تھی اور حضور صلوٰۃ پنجگانہ کے علاوہ اور کئی وقت کی نمازیں ادا فرماتے تھے، ہر نیک عمل میں سب سے پیش پیش خیر و تقویٰ کی کمیت و

کیفیت میں سب سے بڑھ چڑھ کر! سادہ زندگی کا امت کو درس دیا تو اپنی ذات سے فقر و سادگی کی مثال قائم کر دی، قمیص، قبا اور تہمد میں پیوند لگے ہوتے ایک وقت میں دو سالن مشکل ہی جمع ہو پاتے تھے، زندگی زیادہ تر نانِ جویں اور کھجوروں کے سہارے گزرتی تھی، اپنا کام کاج خود اپنے ہاتھ سے کرتے، بکریوں کا دودھ دوہتے، اپنی جوتیاں اپنے ہاتھ سے گانٹھتے، مسجد نبوی کی تعمیر اور غزوۂ خندق میں زمین کھودتے وقت حضور کے دستِ مبارک میں کدال تھی اور پتھر ڈھو رہے تھے! محتاجوں، ضرورت مندوں اور ناداروں کی امداد کے لئے لوگوں کو ابھارا اور ایثار و صلہ رحمی کا سبق دیا تو خود فاقے کر کے بھوکوں کو کھانا کھلایا، ایثار کا یہ عالم کہ دوسروں کو مالِ غنیمت بانٹ رہے تھے مگر جگر گوشۂ نبوی ——— سیدہ فاطمۃ الزہرا ——— کے سر پہ اوڑھنی بھی ثابت نہ تھی، اپنی آل پر صدقہ کو حرام کر دیا! دریا دلی اور جود و سخاوت کا یہ عالم کہ ایک بار ایک سائل آیا، کاشانۂ نبوت میں اللہ کے نام کے سوا اور کچھ نہ تھا، سائل سے فرمایا کہ تم کسی سے میرے نام پر قرض لے لینا۔ شجاعت کی وہ وہ کیفیت کہ جب زور کا رن پڑتا تو اشجع الناس سیدنا علی کرم اللہ وجہٗ کا بیان ہے کہ ہم اُس وقت حضور کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔

محمد عربی ——— رحمۃ اللعالمین ——— یتیموں کے والی، غریبوں کے مولا، مظلوموں کے فریادرس، انسانیت کے دردمند اور مظلوموں کے غمخوار!

جس طرف اُٹھ گئی دم میں دم آگیا
اس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

گھروں پر تشریف لے جا کر مریضوں کی عیادت فرماتے، کوئی مر جاتا تو اُس کے جنازے اور کفن دفن میں شریک رہتے، یتیموں کے سروں پر دستِ شفقت پھیرتے، بیواؤں کی ڈھارس بندھاتے! بے سہاروں کو سہارا دیتے! اپنے ذاتی معاملہ میں انتہائی نرم اور عفو و درگزر کرنے والے مگر حدود اللہ کے معاملات میں بے لچک آپ کے محبوب صحابی حضرت اُسامہ نے ایک سارقہ کے مقدمہ میں سفارش کی، تو چہرۂ مبارک فرطِ غضب سے سرخ ہو گیا جیسے کسی نے انار نچوڑ دیا ہے، مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا۔

محفلِ نبوی کے وقار و ادب کا یہ عالم جیسے حاضرین کے سروں پر پرند بیٹھے ہوئے ہیں اس وقار و سنجیدگی کے ساتھ صحابہ کرام سے کبھی کبھار مزاح بھی فرماتے، اشعار بھی سنتے! وقار و جلال کے باوجود چہرہ اقدس گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ رہتا، عام طور پر کھلکھلا کر نہ ہنستے، زیادہ تر تبسم زیرِ لب! کوئی بات کرتا ہوتا تو جب تک وہ بات پوری نہ کر لیتا اُس کی بات نہ کاٹتے، گفتگو اس قدر دل نشین انداز میں سکون اور ٹھیراؤ کے ساتھ فرماتے کہ کوئی چاہے تو ایک ایک لفظ کو گن سکتا تھا، یاد کر سکتا تھا اور لکھ سکتا تھا اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم سے نوازا تھا، طویل مفہوم اور لمبی بات کو مختصر سے الفاظ میں اس حسن و خوبی کے ساتھ ادا فرماتے کہ فصاحت و بلاغت نطقِ مبارک کی بلائیں لینے لگتیں! کسی کو نصیحت کرنی ہوتی تو مجمع میں اس کا نام نہ لیتے بلکہ یوں فرماتے۔۔۔۔ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی یہ عادت ہو گئی ہے۔۔۔۔۔!

عصمت و پاکبازی کا وہ عالم کہ کروبیانِ عرش اور قدسیانِ ملاءِ اعلیٰ ایسی معصوم زندگی کی تمنا کریں مگر خشیتِ الٰہی سے اکثر آنکھیں بھیگ جاتیں، رات کو سجدے میں اپنے معبود کے حضور گریہ و زاری فرماتے، تیز ہوائیں چلتیں تو خوفِ خدا سے سہم جاتے اور استغفار

کرتے، عرفات کے میدان میں بھکاری کی طرح ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتے! شافع یوم الحساب مگر نطق وحی ترجمان سے یہ الفاظ بھی سُنے گئے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے میری مغفرت ہوگی!

رحمۃ اللعالمین، خاتم النبیین، امام المرسلین، خیر البشر اور افضل الخلق مگر "بشر" جو کوئی حضور کی "بشریت" سے انکار کرتا ہے وہ قرآن کو جھٹلاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے محبوب مگر ساتھ ہی اللہ کے اتنے فرمانبردار بندے کہ جیسا خضوع وخشوع، تضرع اور تذلل بندگی آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا ہے اور کسی نے پیش نہیں کیا زندگی بھر اسی کی عملاً تعلیم دی کہ جو کچھ مانگو اللہ تعالیٰ سے مانگو وہی عالم الغیب والشہادہ ہے وہی مشکل کشا، اور دلوں کا حال جاننے والا ہے وہی ہر کسی کی فریاد و دعا کو سنتا اور مشکلوں کو کھولتا ہے عام مخلوقات ہی نہیں نبی اور رسول بھی اُسی کے کرم کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ پر کسی کا زور نہیں چلتا، بادشاہوں کی طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی مصاحب، درباری اور ہم نشین نہیں، اللہ کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اُس کا سب سے بڑھ کر فرمانبردار ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحرا نشینوں کو جہانبانی کے آداب سکھائے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت اُن کی ٹھوکروں سے لگے ہوئے تھے اور روم و مدائن کا شکوہ اُن کو سلامی دیتا تھا، صلح و جنگ کے کیا حدود ہیں؟ سفارت و حلیفی کے کیا طریقے ہیں؟ تجارت کے کیا اصول ہیں! نماز کس طرح پڑھنی چاہیے، دعا کس انداز میں مانگنی چاہیے۔ اللہ کے حقوق کے ساتھ بندوں کے کیا حقوق ہیں؟ محفل میں نشست و برخاست، سونے، کھانے، پینے اور بولنے چالنے کے کیا آداب ہیں! غرض زندگی کے ہر گوشہ کے لئے ہدایت دی!

صاحب وحی و الہام اور مہبط وحیٔ قرآن! اللہ کی کتاب کے صرف تلاوت کرنے والے ہی نہیں اُس کے معلم بھی اور مزکی نفوس بھی! اللہ غنی! تزکیۂ نفس کی یہ شان کہ کفر و شرک سے جو قلوب غبار آلود تھے انہیں توحید کے آب حیات سے دھو کر آئینہ کی طرح مجلا اور مصفا بنا دیا۔ جن کے شب و روز فسق و فجور میں بسر ہوتے تھے، وہ حضور کی تربیت کی بدولت نیک، متقی اور خدا رسیدہ بن گئے، ہزاروں کو دنیا کی رہبری کے قابل بنا دیا فحاشی و عریانی کے علمبرداروں میں غیرت و حمیت اور پاکبازی کی بجلیاں دوڑا دیں ایک فرد یا دس بیس نفوس کا نہیں پورے معاشرے کا تزکیہ کیا اور سوسائٹی کے مزاج کو بدل کر رکھ دیا، بتوں کے پجاریوں ہی سے خود اُن کے جھوٹے خداؤں کو تڑوا دیا! جہاں اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا، وہاں چاروں طرف نور ہی نور پھیل گیا! لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے والے عورت کے غمخوار و قدرشناس اور اُس کی عصمت و عفت کے محافظ بن گئے۔ جہل کو علم سے، ظلم کو عدل سے، شقاوت کو نرم دلی سے، برائی کو نیکی سے، بے حیائی کو حیا سے اور انتشار و پراگندگی کو ضبط و نظم سے بدلا! انسانیت کو معراج نصیب ہوئی اور بشریت کو سعادت ابدی میسر آئی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اطاعت کو فرض ٹھیرایا اور کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول یہ دونوں دین کی اصل، ماخذ اور مرجع و منبع قرار پائے۔ جس کسی نے قرآن کی آڑ میں سنت رسول کا انکار کیا اس نے دین کے ایک ستون کو ڈھا دیا، قرآن ز . . . اطیعوا الرسول) کے جھٹلانے والے کو قرآن کریم سے گمراہی کے سوا اور مل ہی کیا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن کے لفظ و معنیٰ کے شارح و مفسر اور معلم ہی نہ تھے بلکہ حضور قرآنی احکام کو نافذ اور حدود اللہ کے جاری کرنے والے بھی تھے، زنا کاروں، شراب خواروں، چوروں اور قاتلوں کو حضورؐ نے سزائیں دیں اور حکومت

کی قوت سے منکرات کو مٹایا اور معروف کو قائم کیا۔

اُسوۂ رسول اور سیرتِ نبوی کا یہ وہ آئینہ ہے جس میں اصاغر و اکابر، خواص و عوام، حاکم و محکوم، غریب اور دولتمند عالم اور جاہل، اہل سیاست اور اہل تجارت سب اپنی زندگیوں کو دیکھیں اور سوچیں کہ کہاں کتنا بگاڑ پایا جاتا ہے اور پھر ہم سب اصلاح کی جدوجہد کریں! بگڑے ہوئے سنبھل سکتے ہیں، بگاڑ دور ہو سکتا ہے، گمراہی ہدایت سے بدل سکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے پارس سے مسِ خام آج بھی زرِ خالص بن سکتا ہے، کلب گھر اور ہوٹل ہی نہیں مدرسے اور خانقاہیں بھی اصلاح و انقلاب کی محتاج ہیں اور کوٹ پتلون ہی نہیں عمامے اور قبائیں بھی نیکی اور تقویٰ کے شوب کی آرزومند ہیں، (یہ سطریں قلمبند کرتے ہوئے خود راقم الحروف کتنی ندامت محسوس کر رہا ہے، اللّٰہم اصلح احوالی)

خانقاہوں اور مدرسوں میں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جا رہی ہو اور مسجدوں میں قرآن کریم کی تلاوت جاری ہو مگر معاشرے میں کتاب و سنت کے احکام کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہو رہی ہو، ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیواؤں اور حضور کی غلامی کا دم بھرنے والوں کا کیا فریضہ ہے؟ اللہ کا دین غالب ہونے کے لئے آیا تھا یا مظلوم و مجبور بننے کے لئے!

ماہر القادری — ۲۳ جون ۱۹۶۵ء

سید عبدالسلام زینی

تصویر کے دو رخ

ہم مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ رہا ہے اور آج بھی ہے کہ ہم دنیا کی واحد اور منفرد قوم ہیں جس کے پاس خدا کی ہدایت اپنی خالص اور مکمل شکل میں جوں کی توں بالکل اُسی طرح موجود ہے جس طرح وہ خدا کے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر نازل ہوئی تھی اور سچ یہ ہے کہ ہمارا یہ دعویٰ ایک ایسی صداقت ہے کہ جس کو نہ کبھی جھٹلایا جا سکا ہے اور نہ کبھی جھٹلایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز ہو کم ہے۔

لیکن تصویر کا یہ رخ جتنا دلآویز اور تابناک ہے دوسرا رخ اُسی قدر قبیح اور کریہہ المنظر ہے جس کو دیکھ کر کوئی بھی مسلمان ندامت محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ دوسرا رُخ ہمارے اخلاق و سیرت کا رخ ہے ہمارے اعمال و افعال کا رخ ہے جو نہ صرف اُس ہدایت کے منافی ہے جس کے امین ہونے کے ہم دعوے دار ہیں بلکہ الٹا اُسے رسوا اور بدنام کرنے کا موجب ہے۔

یہ ہدایت کتاب اللہ اور سنّت رسولؐ ہے اس کے امانت دار بلکہ اجارہ دار ہونے کا ہمیں بے حد غرہ ہے لیکن آج ہم جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھ رہے ہیں وہ بڑا ہی شرمناک اور حقارت آمیز ہے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض تو یہ تھا کہ ہم اپنی پوری زندگی کا نقشہ اس ہدایت کی روشنی اور رہنمائی میں ترتیب دیتے لیکن ایمان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ہماری عملی زندگی اس ہدایت کی پیروی سے بالکلیہ آزاد ہے اس ہدایت کے ایک ایک جزو کی خلاف ورزی ہمارا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے، چنانچہ جس کام سے یہ ہدایت ہمیں روکتی ہے وہ ہمارا سب سے زیادہ محبوب شغل ہے اور جس کام کے کرنے کا یہ حکم دیتی ہے اُس کے لئے ہمارا نفس کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا اس کے باوجود نہ ہمارے اسلام میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ ہمارے ایمان ہی میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں سب سے زیادہ زور توحید اختیار کرنے اور شرک سے بچنے پر دیا گیا ہے، لیکن آج شرک ہماری زندگیوں میں بری طرح رچ بس گیا ہے، قبر پرستی میں ہمیں کوئی قباحت نظر نہیں آتی حقیقی حاجت روا اگرچہ خدا ہی ہے لیکن مشکلیں پیر اور فقیر بھی آسان کر سکتے ہیں خدا بھی حاضر و ناظر اور عالم الغیب ہے اور (نعوذ باللہ) حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی اوصاف رکھتے ہیں، حضورؐ نے ہر بدعت کو گمراہی قرار دیا تھا مگر یہاں اب بدعات ہی اصل دین ٹھہری ہیں "قربانی کی فرضیت" "گیارہویں شریف" کی اہمیت کے سامنے ہیچ ہے، سود کو اسلام میں حرام ٹھہرایا گیا تھا لیکن اُسے ہم نے اپنے اقتصادی نظام کے محور کی حیثیت دے رکھی ہے۔ مزید برآں اسلام میں اس کے جواز کی گنجائشیں نکالی جا رہی ہیں شراب کی حرمت، حلّت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے، فحاشی اور بے حیائی کو مہذب اور روشن خیال ہونے کا لازمہ تصور کیا جاتا ہے اور جو لوگ دین پر چلنا چاہتے ہیں نیکی اور پارسائی کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُنہیں بجت مند کہہ کر تمسخر و استہزاء کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری زندگی کا کوئی بھی شعبہ اب ایسا باقی نہیں رہا ہے جس میں فساد اور بگاڑ

رونما نہ ہو چکا ہو ایوانِ حکومت و سیاست سے لے کر مدرسہ و خانقاہ تک اور تاجروں اور صنعت کاروں سے لے کر مزدوروں اور کسانوں تک جدھر بھی نظر ڈالیے صلاح و فلاح کے آثار معدوم ہیں مگر ان تمام گمراہیوں کے باوجود ہماری "حمیّت دینی" اور "غیرت ایمانی" یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ہمارے مسلمان ہونے میں شبہ کرے۔

ایک بزرگ کے بقول اس دور میں سانپ کی قسموں کو گننا آسان ہے لیکن مسلمانوں کی اقسام کا شمار مشکل ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ حالت یہ ہے کہ جو پانچ وقت کی نماز پڑھے اور روزے رکھے وہ بھی مسلمان ہے اور جو ان سب کا مذاق اڑائے وہ بھی مومن ہے اور جو یہ کہے کہ اسلام ہی کو ہمارے ملک کا نظام اور ہماری زندگی کا ضابطہ قرار پانا چاہیے وہ بھی مسلمان ہے اور جو یہ کہے کہ اسلام چودہ سو سال پرانا ہو چکا ہے وہ اب اس دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا اُسے" دائرہ اسلام کے اندر ہی تصور کیا جائے، مسلمان ہونے کے لئے توحید و رسالت و آخرت پر ایمان ہونا ضروری بھی ہے مگر ملتِ مسلمہ کا فرد ہونے کا شرف اُس دہریے کو بھی حاصل رہتا ہے جو ان سب کا منکر ہو لیکن مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوا ہو قرآن کہتا ہے کہ مشرکِ آزاد کے مقابلے میں تمہارے لئے مومن غلام بہتر ہے مگر یہاں خدا کے منکروں اور نعوذ باللہ کارل مارکس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بڑا انسان ماننے والوں کو بھی بڑے بڑے دیندار اور پارسا گھرانوں کی لڑکیاں بیاہ دی جاتی ہیں۔ دین و ملت کے ساتھ ہر چند کہ یہ ایک دردناک ستم ظریفی ہے مگر اب یہ ستم ظریفی گوارا کی جا رہی ہے۔

اس صورت حال کے پیدا کرنے میں اگرچہ معاشرے کے تمام طبقے شریک ہیں اور اس کا ذمہ دار تنہا کسی ایک طبقے کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کا سب سے زیادہ وبال اُن نام نہاد علمائے دین پر ہے جنہوں نے اگرچہ علمائے یہود کی طرح کتاب اللہ میں لفظی تحریف تو نہیں کی لیکن انہوں نے نئی نئی باتیں شامل کر کے اور آیات قرآنی کی من مانی اور عجیب و غریب تاویلات کے ذریعے مسلمانوں کے اندر بے شمار فرقے پیدا کر دیے ہیں اور جن کے ان کارناموں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ مسلمان جو حق کے محاذ پر جمع ہو کر باطل قوتوں کو شکست دے سکتے تھے وہ آج خود آپس میں دست و گریباں ہیں۔

ایک دردمند اور صاحب نظر آدمی جب ان حالات کو دیکھتا ہے تو وہ گہرے سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا علماء کا کام یہی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ تعصبات کو ہوا دیں عام مسلمانوں کے دلوں میں نفرت و عداوت کے بیج بوئیں اور اپنا سارا زور خطابت لاطائل اور بے مقصد فقہی اور کلامی بحثوں پر صرف کرتے رہیں چاہے دین کو کتنا ہی ضعف پہونچتا رہے اور حق کا محاذ کمزور ہوتا رہے۔

بہر حال علماء اور مذہبی طبقوں کا یہ طرز عمل معاشرے کے عام افراد میں اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ اور نوجوان طبقے میں مذہب سے مایوسی اور ذہنی پراگندگی پیدا کرنے کا موجب ہو رہا ہے اُن کی اس ذہنی کیفیت کا اندازہ اسی آدمی کو ہو سکتا ہے جسے معاشرے کے ان مختلف طبقات کے لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملا ہو۔ ہمارے ان علمائے کرام کو لوگوں کے خیالات سے آگہی نہیں وہ نماز با جماعت کے علاوہ نہ کبھی عام لوگوں سے ملتے ہیں اور نہ اُن کے خیالات سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں معاشرے سے کٹ جانے کی وجہ سے انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ۔ ع

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

ہم سمجھتے ہیں کہ عوام اور علمائے کرام کے درمیان یہ بُعد خرابی کی اصل جڑ ہے اصلاح احوال کی کوئی تدبیر اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک عوام میں گھل مل کر اُن کے خیالات اور اُن کی ذہنی کیفیات کو بخوبی سمجھا نہ جائے۔ یہاں ہم لوگوں کی نجی محفلوں میں ظاہر کئے جانے

والے چند خیالات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کرتے ہیں ذرا اندازہ کیجئے کہ قرآن نے جس دین کو "دین مبین" قرار دیا تھا آج عام آدمی کے لئے اُس کا کوئی حقیقی تصور قائم کرنا کتنا مشکل ہو رہا ہے۔

حق کی شناخت مشکل ہے "اسلام میں بھی بہتّر فرقے ہیں کس کو مانیں اور کس کو چھوڑیں شیعہ کچھ کہتے ہیں سنّی کچھ بریلیوں کا مذہب اور ہے وہابیوں کا مذہب اور اپنی تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہر ایک دوسرے کو کافر و مشرک ٹھہراتا ہے خدا ہی جانے کون سچّا ہے کون جھوٹا ہے، قرآن و سنّت سے اپنے برحق ہونے کے دلائل بھی دیتے ہیں"

سیدھے سادھے مسلمان "دین میں تفرقے کیوں نہ پڑیں حضورؐ نے جو ارشاد فرمایا تھا کہ چودھویں صدی میں میری اُمّت بہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی، یہ فرقہ بندی تو ہونا ہی تھی ہم تو سرے سے ان جھگڑوں میں پڑنا ہی پسند نہیں کرتے سیدھے سادھے مسلمان ہیں نماز روزہ فرض ہے سو خدا کے فضل سے کر لیتے ہیں:"

اہل سنّت والجماعت "اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو تو سبھی مانتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ اولیاء اللہ اور بزرگوں کا منکر تو نہیں ہے۔ نیاز فاتحہ اور حضورؐ کے علمِ غیب کا بھی قائل ہے محض عالم ہونا تو کافی نہیں عالم تو وہابی بھی ہو سکتا ہے جو گیارہویں کو مانتے ہیں نہ حضورؐ کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہماری نماز تو اُسی کے پیچھے ہو سکتی ہے جو خالص اہل سنت والجماعت ہو"

خطرۂ ایمان "ٹھیک ہے قرآن پر ہمارا ایمان ہے اس کا پڑھنا خیر و برکت کا موجب ہے لیکن ترجمے کا کیا بھروسہ ہمارے حضرت نے تو ہمیں ہدایت کی ہے کہ ایمان کی سلامتی اسی میں ہے کہ ترجمے والا قرآن نہ پڑھو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی غلط عقیدے کے مولوی کا ترجمہ شدہ ہو اور تمہارا ایمان خراب ہو جائے"

شریعت و طریقت "شریعت و طریقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے شریعت ظاہر سے تعلق رکھتی ہے اور طریقت باطن سے۔ ایک چیز جو بظاہر شریعت کی رُو سے ناجائز معلوم دیتی ہے صوفیا اسے بالکل جائز سمجھتے ہیں مثلاً سماع۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ کسی پیر کو خلافِ شریعت اور بری بات میں مبتلا دیکھو تو بھی اُس سے بدعقیدہ نہ ہو ترجمانِ حقیقت حضرت حافظ شیرازی رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

به مے سجاده رنگیں کن اگر پیرِ مغاں گوید
که عارف بے خبر نبود زِ راه و رسمِ منزلہا

دین و دنیا کی علیحدگی کا تصوّر "مولوی صاحبان کو آخر سیاست سے کیا واسطہ؟ اقتدار کی ہوس ہے جو کچھ دنیا پرست مولویوں کو سیاست میں کھینچ لائی ہے کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ یہ لوگ اپنا کام دین کی تبلیغ تک محدود رکھتے سیاست اور حکومت کے معاملات میں دخل دینے سے باز رہتے"

اسلام ہے کہاں؟ "بے شک ہم مسلمان ہیں۔ مسلمان ماں باپ کی اولاد ہیں مگر آپ ہی بتائیے کہ اسلام ہے کہاں؟ ایک مولوی کچھ دوسرا مولوی کچھ کہتا ہے۔ جتنے مولوی اُتنی باتیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام آدمی کی زندگی کا ایک نجی مسئلہ ہے اس کا دنیا کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ خواہ مخواہ ہر معاملے میں اسلام کی ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں"

اختلافات سے محفوظ رہنے کا نسخہ

"اصولی طور پر ہم اسلامی قانون کے مخالف نہیں ہیں ہم بھی مسلمان ہیں ہم بھی یہی چا ہیں کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو مگر فی الحال ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے پاکستان میں سب مسلمان ہی بستے ہیں۔ مگر عقائد مختلف ہیں کئی فرقے ہیں اور ہر فرقے کی شریعت جدا ہے اگر ایک کی شریعت کو ملک کا قانون بنا ؤ دوسرا اعتراض کرے گا۔ دوسرے کی شریعت کو اختیار کیا جائے تو تیسرا فرقہ ناراض ہوگا۔ ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم حکومت و سیا کے معاملے میں دین کو بیچ میں لائیں ہی نہیں "

قرآن کی ماڈرن تفسیر

"ملّا نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں اُس نے ہمیشہ اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھا۔ جزوی اور فروعی اختلا کے چیستاں میں خود بھی الجھتا رہا اور دوسروں کو بھی الجھائے رکھا۔ دین کی روح کی اُسے خبر تک اب اسی پردے ہی کو لے لیجئے۔ ملّا عورتوں کو برقعے میں لپیٹ کر چلنے پر زور دیتا ہے حالانکہ قرآن میں حجاب کا لفظ آیا ہے جس کے معنی شرم حیا کے ہیں۔ سو پردے کے قرآنی احکام پر عمل کرنے کے لئے آنکھوں کی شرم کافی ہے۔ مغرب نے قرآن کی انہی حقیقتوں کو سمجھا اور ان سے فـ اٹھایا وہاں عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرکے سوسائٹی میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے "

یہ بھی کلمہ گو ہیں

"ذرا مجھے نماز پڑھنا تھی یہاں آس پاس کوئی مسجد بھی ہے ؟"
"نہیں! یہاں قریب میں تو کوئی مسجد نہیں ہے "
"اچھا! ذرا جانماز منگوا دیجئے میں یہیں نماز ادا کر لیتا ہوں "
"جانماز! وہ جسے بچھا کر لوگ نماز پڑھتے ہیں "
"جی ہاں! وہی کپڑا یا چٹائی "
"معاف کیجئے گا وہ تو ہمارے گھر میں نہیں ہے "
"اچھا! یہ تو بتایئے قبلہ کدھر ہے میں نماز یہیں گھاس پر پڑھ لیتا ہوں۔"
"قبلہ! یعنی آپ کا مطلب ہے ڈیڈی کہاں ہیں ؟"
"جی نہیں میری مراد یہ ہے کہ کدھر منہ کرکے نماز پڑھی جائے "
"اچھا ٹھہریئے! میں ڈیڈی سے دریافت کرتا ہوں ؟"

ملّا ٹائپ

"یار تم نے پتلون ٹیڈی طرز کی کیوں نہیں سلوائی "
"کیا کروں۔ ڈیڈی سلوا کر ہی نہیں دیتے "
"ارے یار! تمہیں نہیں معلوم اِن کے ڈیڈی ملّا ٹائپ ہیں۔ اُن کے ڈاڑھی ہے ڈاڑھی "

یہ خیالات جو ہماری قوم کے مختلف طبقات کی گوناگوں ذہنی کیفیات اور فکری سطح کی عکاسی کرتے ہیں، درحقیقت علامات ہیں۔ جن پر غور و فکر کرکے ہی مسلمانوں کے اصل امراض کی تشخیص اور اُن کا علاج تجویز کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے درمیان ایسے افراد موجود ہیں جو اپنی اپنی بساط کے مطابق مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان کی بیماریوں کا علاج کرنے کی سعی کر رہے ہیں لیکن اُن میں سے بہت کم ہیں جنہیں طبیب کا درجہ حاصل ہو۔ بڑی تعداد عطائیوں پر ہی مشتمل ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے کہنہ و پیچیدہ امراض کا پورا پورا ا

رکھتے ہیں اور نہ ان کے علاج کی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ یہ نیم ملا و نیم حکیم دو ایسے مریضوں کو جن میں سے ایک دین و شریعت سے غفلت کا مریض ہے اور دوسرا شرک و بدعت کا ایک ہی نسخہ تجویز کرتے ہیں اور ان کے امراض کی نوعیت کے فرق کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں جوں جوں دوا ہوتی ہے مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مریض کا اعتقاد پہلے طبیب سے اور پھر بڑھتے بڑھتے علاج ہی سے اٹھ جاتا ہے۔ ادھر طبیب یعنی مولوی صاحبان خود مریض کو لاعلاج یعنی بدعقیدہ اور کافر و مشرک قرار دے کر مطمئن ہو بیٹھتے ہیں

عقیدے اور نظریے کی خرابیوں میں ملوث لوگوں کا اگر ہم دقت نظر سے جائزہ لیں تو انہیں بڑی آسانی سے دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک گروہ تو وہ ہے جو بنیادی طور پر مذہب کی ضرورت ہی کا قائل نہیں رہا ہے اور توحید و رسالت اور قرآن و آخرت ہر چیز کا منکر ہے اور اپنی زندگی کے مسائل کا حل اشتراکیت یا مغربی طرز کی لادینیت میں تلاش کرتا ہے دوسرا گروہ وہ ہے جو بنیادی طور پر مذہب کی ضرورت کا قائل تو ہے اور اسلام سے گہری وابستگی بھی رکھتا ہے لیکن لاعلمی اور جہالت کی بنا پر شرک و بدعت جیسی مہلک خرابیوں میں مبتلا ہو چکا ہے اور اب دنیا پرست مولویوں کے بہکانے میں آکر اوہام و خرافات ہی کو اسلامی تعلیمات تصور کر بیٹھا ہے۔ تعصب اور فرقہ پرستی نے آنکھوں پر پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔ لیکن اس بات کا امکان ہر وقت موجود ہے کہ اگر اسے کسی طرح یہ باور کیا جائے کہ جسے تم دین و شریعت تصور کئے بیٹھے ہو یہ دین نہیں بلکہ بے دینی ہے تو اسی وقت ان خرابیوں سے کنارہ کش ہو جائے

ان دونوں گروہوں کے درمیان جو واضح فرق پایا جاتا ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ان کے ساتھ داعی اور مبلغ کے سلوک اور برتاؤ میں بھی واضح فرق موجود ہو اور ان کا علاج تجویز کرتے وقت پوری حکمت اور احساس ذمہ داری سے کام لیا جائے جو لوگ اول الذکر گروہ کی اصلاح و تبلیغ کا فریضہ انجام دیں انہیں قرآن و سنت کے علوم پر عبور کے ساتھ ساتھ فلسفہ اشتراکیت اور مغربی مادی تہذیب کے سرچشموں کا بھی بخوبی علم ہونا چاہئے اور جو لوگ ثانی الذکر گروہ میں کام کریں انہیں محض دین کا عالم اور شرک و بدعات کے صرف نام ہی سے واقف نہیں ہونا چاہئے بلکہ مسلمانوں میں مروج بدعات اور مشرکانہ عقائد کی ماہیت، ماخذ، تاریخ اور اسباب سے بھی کماحقہ باخبر ہونا چاہئے کیونکہ دعوت و تبلیغ کے اس ضروری تقاضے کو پورا کئے بغیر نہ احقاق حق ہی کیا جا سکتا ہے نہ ابطال باطل ہی ممکن ہے وہ منہ پھٹ جاہل اور کج بحث مبلغین جو افہام و تفہیم کی راہ ترک کر کے مناظرہ و مجادلہ کی راہ اختیار کرتے ہیں دراصل اس گروہ کے امراض کو بڑھانے کا سبب بنتے ہیں۔

بدعات و مشرکانہ عقائد جو بدقسمتی سے آج مسلمانوں کی اکثریت کا مذہب بن گئے ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے اخلاق و اعمال میں ہزاروں رخنے پیدا ہو رہے ہیں ان کے متعلق کوئی سطحی رائے نہیں قائم کر لینی چاہئے جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان کا استیصال محض زور خطابت سے کیا جا سکتا ہے وہ سخت خود فریبی میں مبتلا ہیں کیونکہ ان مشرکانہ عقائد و بدعات کی جڑیں ہمارے عام اندازوں سے کہیں زیادہ مضبوطی سے جمی ہوئی ہیں۔ ان کی ایک تاریخ اور ایک فکری اور تہذیبی پس منظر ہے۔ جن لوگوں نے برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا ذرا بھی غور سے مطالعہ کیا ہے وہ گواہی دیں گے کہ یہ خرابیاں شروع سے ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں، ہم نے اسلام تو قبول کر لیا مگر ہمیں مسلمان بننے کے لئے ضروری تربیت میسر نہیں آئی جس کی وجہ سے زمانۂ جاہلیہ کی بے شمار خرابیوں کو ہم آج تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

ملبوسات کی اسلامی بنیادیں

(اظہر علی فاروقی۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل۔ ایف۔ آر۔ اے۔ ایس)

ایک نورصورت ہزار نور کپڑا، یا ملبوسات انسانی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں، یقیناً بعد والی چیزیں ہیں، بنی نوع انسان نے فضاؤں کی برودت، تیز و تند دھوپ کی تمازت اور مرمری ہواؤں کی جھلسا دینے والی لپٹوں سے محفوظ رہنے سے زیادہ شرم و حیا کی بنا پر تن ڈھانکنا ضروری سمجھا۔ وہ شرم و حیا ہی تھی جس نے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اپنے بدن پتوں سے ڈھانکیں۔

فلما ذاقا الشجرۃ بدت لہما سوآتہما و	جب ان دونوں (آدمؑ و حواؑ) نے درخت کا پھل چکھا
طفقا یخصفٰن علیہما من ورق الجنۃ ...	تو انہیں ان کا ننگا بدن دکھائی دینے لگا اور انہوں نے
	پتوں سے اپنا اپنا بدن ڈھانکا۔

اس بدن ڈھانکنے ہی کو عربی میں 'ستر عورۃ' کہتے ہیں اور عورۃ بدن کا وہ حصہ کہلایا جس کا ڈھانکنا ضروری سمجھا گیا۔

اسلام کے علاوہ غالباً دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ایسا نہیں ہے جس نے اس کی حدبندی کی ہو اور ستر عورۃ کا تعین کیا ہو۔ اس عدم تعین کا نتیجہ ہے کہ ہمیں کہیں صرف آگا پیچھا چھپائے لوگ نظر آئیں گے اور کہیں کھلی پنڈلیاں اور بغلیں سربازار نظر آتی ہیں۔

اسلام نے مردوں کے لئے ناف سے گھٹنوں تک بدن چھپانا اور عورتوں کے لئے پورا بدن چھپانا ضروری قرار دیا۔ محرموں کے سامنے ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس طرح ستر عورۃ کی حدیں مقرر کر دیں اور یہی سب سے پہلا اور بنیادی اسی بنیادی اصول کے تحت ثقہ مسلمان شارٹ، ہاف پینٹ یا نیکر پہننے سے احتراز کرتے ہیں اور اسی بنیادی قانون کی جانگیا اور انڈر ویر پہن کر سب کے سامنے نکلنے اور کام کاج کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ مسلمان پہلوانوں کا صرف لنگوٹ چڈھی پہن کر دنگلوں میں کشتی لڑنا۔ کھیل کود کے میدانوں میں جانگیا پہن کر شرکت کرنا اپنے اپنے اکھاڑوں میں ڈنڈ بیٹھک کرنا کرنا سب کچھ اسی تحت میں آجاتا ہے میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ اس سلسلے میں اس بنیادی اصول میں عموم بلویٰ اور عوامی سہولت اور عام کے لئے کچھ لچک پیدا کر دی جائے تو بہتر ہے پولیس اور فوجی افراد کی یونیفارم کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا اگرچہ اب دونوں محکموں شارٹ کی جگہ سلیک (پینٹ) ہو گئے ہیں۔

ستر عورۃ کی تعین اور حدبندی پر عمل درآمد کرنا دو موقعوں پر بہت ضروری سمجھا گیا (۱) عبادۃ اور (۲) خلوۃ سے جلوۃ میں آتے وقت۔ گویا مردوں کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ عبادت اور گھر سے باہر نکلتے وقت بدن کا اتنا حصہ ضرور چھپائیں اور صرف انڈر ویر پہنے سڑکوں پر نہ گھومیں۔

عورتوں کے کپڑوں میں لہنگا، ساری، لکھنوی کلی دار پاجامے اور موجودہ غرارے کے بارے میں اب آپ خود سوچ سکتے

اس حدبندی نے کم سواد عوام میں ایک غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ گھٹنا کھل جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ بلکہ دوسروں کے سامنے گھٹنا کھولنا ناپسندیدہ ہے مگر محض گھٹنا کھل جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا

ستر عورت کی حدبندی سے وابستہ ایک ضمیمہ دوسرا بنیادی قانون بن جاتا ہے:۔

ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار　　　　تہبند کا ٹخنوں سے نیچے لٹکتا ہوا حصہ آگ (دوزخ) میں ہے

تہبند اور پاجامے ٹخنوں سے نیچے لٹکتے ہوئے ہوں اور اگر ہم فی النار کو تادیبی تہدید ہی سمجھ لیں پھر بھی ٹخنوں سے نیچے پاجامے اس بنیادی اصول کی رو سے غیر مشروع قرار پاتے ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت ابن عباس[1] اور حضرت عمرو بن شعیب سے مروی دو حدیثیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ کل ماشئت و البس ماشئت (جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو) اور کلوا، واشربوا وتصدقوا والبسوا (کھاؤ، پیو، صدقہ کرو اور پہنو (جو چاہو)
اب اس تعمیم میں ایک تخصیص ملاحظہ فرمائیے اور مستثنیات پر غور فرمائیے پہلی حدیث کے ساتھ ما اخطاتک اثنتان۔ سرف ومخیلۃ دوسری کے ساتھ ما لم یخالطہ اسراف ومخیلۃ دونوں میں اسراف اور نمود بے جا جس پر تکبر کا شبہ ہو قابل غور ہیں یعنی جو چاہو پہنو مگر اسراف اور بے جا نام ونمود اور تکبر نہ پایا جائے گویا اس سلسلے کا یہ تیسرا بنیادی اصول ٹھہرا۔ یہ اصول بھی یوں ہی محض مبہم نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، بلکہ ان دونوں کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ مخیلہ اور خیلاء کے لفظوں کا بار بار آنا اور اس سے ممانعت میں جو راز ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں اور عجمیوں کے علاوہ دوسری قوموں میں ڈھیلے ڈھالے فرش پر لٹکتے ہوئے اور چلنے میں گھسٹتے کپڑوں کو شان اور عظمت اور دولت وثروت کی ایک نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس بے جا نام ونمود اور متکبرانہ شان کو ممنوع قرار دیا البتہ جہاں تکبر اور نمود بے جا کا شائبہ نہ ہو وہاں اس سے اغماض بھی برتا جاسکتا ہے۔

من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ　　　　جس شخص نے اپنے کپڑے متکبرانہ انداز میں لٹکائے اس کی طرف خداوند کریم قیامت کے دن نگاہ تک نہ کرے گا۔

اس پر حضرت ابو بکر نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (روحی فداک) میرا تہبند لٹکتا رہتا ہے اگر میں اس کا خاص خیال نہ رکھوں رسول اللہ نے جواباً فرمایا انک لست من یفعلہ خیلاء (ان لوگوں میں نہیں جو محض متکبرانہ ایسا کرتے ہیں)۔

اس سلسلے میں ایک بات اور واضح کر دی گئی ہے کہ اپنی حیثیت سے گرے ہوئے اور میلے اور گندے کپڑے بھی نہ پہننا چاہئے۔
ملبوسات کی نوعیت کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی بھی تصریح موجود ہے کہ سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں میں سے کس کے لئے ہے چنانچہ حضرت ابو موسی الاشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا حرم لباس الحریر والذھب علی ذکور امتی واحل لاناثھم (ریشمی کپڑے اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لئے حلال و جائز کیا گیا ہے) حضرت علی سے مروی یہ حدیث بھی اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ رسول اللہ نے انہیں سونے کی انگوٹھی قسی کپڑا پہننے اور میاثر استعمال کرنے سے منع فرمایا تھا۔ قسی ایک قسم کا مصری کپڑا جو بہت باریک ہوتا تھا اور کتان اور حریر سے بنا جاتا تھا۔ میاثر میثرہ کی جمع ہے اور ریشمی گدوں سے مراد ہے۔ گھوڑے

---

(۱) حضرت ابوہریرہ ترمذی شریف (۲) اور (۳) ترمذی شریف اور بخاری شریف (۴) بخاری شریف

کپڑا پہننے سے منع فرمایا جس کا تانا اور بانا دونوں ریشم ہوں۔ اس ممانعت میں جو جذبہ مخفی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے مردوں کی زندگیوں کو سپاہیانہ زندگی بخشی ہے اور اسی لئے رسولؐ اللہ نے ہر ایسے فعل سے ممانعت فرمائی ہے جو اُن کی دلیری اور شجاعت کو ٹھیس لگائے اور مردوں میں تن آسانی پسندی اور تعیش پیدا کرکے ان کی جرأت اور ہمت کو مغلوب بنا کر رکھ دے اور عورتوں میں جو چیزیں بے حیائی پیدا کریں ممنوع قرار دی گئیں۔ ابن مسعودؓ سے مروی حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے ابوموسیٰ الاشعریؓ کو اونی جبہ اونی کمتہ (ٹوپی) اونی کساء (چادر) کے استعمال کی اجازت دی اس سے ظاہر ہے تمام قسم کے سوتی اور اونی کپڑے مرد پہن سکتے ہیں۔ ایما اھاب دبغ فقد طھر (ہر چمڑا جب دباغت کیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے) اس کلیہ سے اُن جانوروں کی کھالیں مستثنیٰ ہیں جن کا گوشت کھانا حرام ہے یا جن کے بدن نجس قرار دیئے گئے ہیں، جیسے سؤر، کتا وغیرہ۔ ایسا ریشمی کپڑا پہننا جائز ہے جس کے تانے یا بانے میں ایک سوت اور ایک ریشم ہو۔

ملبوسات کی ان قدروں میں انسؓ سے مروی ایک حدیث ایک ضمیمے کا کام کرتی ہے اور ہمیں بآسانی یہ نتیجہ نکالنے کی سہولت بہم پہونچاتی ہے ریشم صرف اس لئے ممنوع ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن عوامؓ نے رسول اللہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کے پاس ریشمی قمیصیں ہیں جن میں جوئیں ہیں۔ رسولؐ اللہ نے انہیں ریشمی قمیصیں پہننے کی اجازت دے دی۔

نسوانی ملبوسات کے سلسلے میں حضرت دحیہ بن خلیفہؓ سے مروی یہ حدیث ایک بنیادی قدر کا کام کرتی ہے کہ ایک بار رسولؐ اللہ نے انہیں ایک قسم کا مصری کپڑا دیا جسے قباطی کہتے تھے اور فرمایا کہ اس کے دو ٹکڑے کر دو۔ ایک سے اپنا کرتہ بنا لو اور دوسرا ٹکڑا اپنی بیوی کو دے دینا کہ وہ اس کی اوڑھنی بنا لے یا مقنع (برقعہ) جب وہ اندر جانے کے لئے مڑے تو رسولؐ اللہ نے فرمایا "دیکھو اپنی بیوی سے کہہ دینا کہ اس کے نیچے کوئی دوسرا کپڑا لگائے تاکہ جسم دکھائی نہ دے"۔ ایک حدیث کو ایک بنیادی قدر سمجھنا چاہئے، جو حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے اور دوپٹہ اوڑھنے کا ڈھنگ بتاتی ہے۔

ان النبیؐ دخل علیہا وھی تختمر فامرھا ان تخیل الخمار علی راسہا وتحت حنکہا۔

رسولؐ اللہ حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لائے جب وہ (کسی طرح) دوپٹہ اوڑھ رہی تھیں پس رسولؐ اللہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ اپنا دوپٹہ سر پر لے جا کر گردن کے نیچے سے نکال کر پھر پر ڈالیں (گویا دو پھیرے، الگے ہوئے)

اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک پھیرا (لَیَّۃ) ڈالا جس پر رسولؐ اللہ (روحی فداہٗ) نے فرمایا نہیں، دو پھیرے (لا لیّۃ بل لیتین)۔ اب اُن دوپٹوں کے بارے میں آپ خود سمجھتے ہیں جو محض گردن کی زینت کے لئے ہیں۔

ملبوسات کے رنگوں کے سلسلے میں آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت رسولؐ اللہ کو سفید رنگ سب سے زیادہ مرغوب اور پسند تھا، جیسے اور قبا میں سفید کے بعد سیاہ اور سبز۔ دھاریدار کپڑے پہننے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے ایسی چیزیں عورتوں کے لئے مخصوص ہیں۔

——— ہادی برحق رسولؐ خدا (روحی فداہٗ) نے جزئی جزئی چیزوں کی طرف بھی صریح اشارے فرمائے ہیں۔ چنانچہ جب

۱؎ ترمذی شریف ۲؎ ۳؎ ترمذی اور بخاری شریف ۴؎ ترمذی شریف

کپڑا پہننے اور اتارنے کا طریقہ: پہنو تو داہنی طرف سے اور اتارو تو بائیں طرف سے۔ پاجامہ - کرتہ - قمیص، جوتا اور موزہ سب کے لئے یہ حکم ہے جس کے تحت ایک طرح کا ضبط اور عادتوں میں ڈسپلن پیدا کرنا مقصود ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

من تشبّہ بقوم فھو منھم	جس نے جس قوم سے مشابہت کی وہ اسی میں سے ہے۔

یہ ایک ایسی بنیادی قدر ہے جس میں اپنی انفرادیت کا وقار اور اپنی یونیفارم کا اعزاز شامل ہے جو ہمیں اپنی چیزوں سے محبت کرنا اور ان کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔

یہ ہیں ہمارے ملبوسات کی بنیادی قدریں اور اس میں شک نہیں کہ امتدادِ زمانہ نے ہمارے ملبوسات کی صورتیں بدل دی ہیں لیکن ہمیں ان بنیادی قدروں کو ملحوظ رکھنا اشد ضروری ہے۔ ویسے تو وقت کے تقاضوں اور زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں کے لحاظ سے ان کلیوں میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے اور پیدا کی بھی گئی ہے جیسا آپ نے خود ملاحظہ کرلیا ہے اور سب سے آخر میں جس بنیادی قدر پر زور دیا گیا ہے اُسے بھی نہ بھولنا چاہیے۔

یا بنی آدم انزلنا علیکم لباسا یواری سواٰتکم وریشا ولباس التقویٰ ذالک خیر....	اے بنی آدم ہم نے تمہارے لئے کپڑے اتارے اور ریشم جس سے تم اپنے بدن چھپاتے ہو، مگر یہ نہ بھولو کہ تقویٰ کا لباس زیادہ بہتر ہے۔

یعنی لباس اور زینت و آرائش میں اصل چیز جو قابلِ غور اور لائقِ غور و فکر ہے وہ "تقویٰ" ہے، جہاں "تقویٰ" ہوگا، وہاں بدعنوانیاں نہ ہوں گی! اسلامی معاشرہ جس محور پر گھومتا ہے وہ "تقویٰ" ہے! یہی دین و دنیا میں مسلمانوں کے فوز و فلاح کا ضامن ہے (اللھم اجعلنا من المتقین)

مولانا تمنا عمادی

ماہنامہ تاج اور بدعت!؟

میں تقریباً اٹھارہ برس تک ڈھاکے میں رہ کر ۲۱؍ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ڈھاکے سے مستقل طور سے منتقل ہو کر چاٹگام چلا آیا جو شعبان کی ۲۷ یا ۲۸ تاریخ تھی اور سنیچر کا دن تھا مگر ڈھاکے سے چلا تھا جمعے کا دن گزار کر ۲ بجے شب کو۔ جمعے کی نماز جس مسجد میں برابر پڑھتا تھا اور ہر اتوار کو جس میں تفسیر بیان کرتا تھا اسی مسجد میں رمضان شریف کے اخیر عشرے میں معتکف بھی ہر سال ہوا کرتا تھا، چلنے کے وقت مسجد کے نمازیوں کا اصرار ہوا کہ امسال بھی اعتکاف بھی اسی مسجد میں کیجئے۔ چنانچہ میں چاٹگام سے ۱۷ رمضان شریف ہی کو ڈھاکے پہونچ گیا۔ تین دن بعض مخلص احباب کے یہاں رہا۔ ۲۰ رمضان شریف کو اسی مسجد میں معتکف ہو گیا۔ پھر جمعرات کو اسی مسجد میں عید کی نماز پڑھی پھر جمعہ بھی وہیں پڑھا اور رات کی گاڑی سے چلا سنیچر کی صبح کو چاٹگام پہونچ گیا یہاں خطوط و اخبارات و رسائل جو ۱۷ رمضان سے ۳ شوال تک آئے تھے ان کا ایک ذخیرہ جمع تھا، رسالوں میں ایک نیا رسالہ "تاج" (کراچی) بھی نظر سے گذرا تو پہلے اسی کو دیکھنے لگا، کیونکہ یہ رسالہ پہلے پہل نظر کے سامنے آیا تھا۔

پہلا ہی مضمون "توحید خالص کی رٹ" کے عنوان سے جناب بابا ذہین شاہ صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ آغاز مضمون ہی اس جملے سے ہے ـــ

"معاصر فاران بار بار دینِ خالص، ایمان خالص توحید خالص کی طرف نشان دہی کر رہا ہے ..... الخ" پورا مضمون پڑھ گیا تو دل کو سخت اذیت محسوس ہوئی۔ مولانا ماہر القادری سلمہ اللہ تعالیٰ یا فاران یا مولانا مودودی سلمہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے نہیں۔ اگرچہ مولانا ماہر القادری سے مجھ کو بہت محبت ہے اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ میں مولانا مودودی سے بھی محبت رکھتا ہوں باوجود اس کے کہ متعدد مسائل میں مجھ کو ان دونوں سے اختلاف ہے مگر وہ اختلاف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ان دونوں کے اخلاص اور حسن نیت کے متعلق مجھ کو ہرگز سوء ظن نہیں پھر بھی میں اپنا یہ فرض نہیں سمجھتا کہ میں جن لوگوں سے محبت رکھتا ہوں ان کی طرف سے ہر موقع پر مدافعت بھی کرتا رہوں۔

مگر جناب بابا ذہین شاہ صاحب نے اپنے اس مضمون میں بدعت وسنت کے مفہوم کو کچھ اس طرح پیش فرمایا ہے جس سے طرح طرح کی غلط فہمی پھیل سکتی ہے اس لئے ایسے مضمون کے دیکھ لینے کے بعد میرا خموش رہنا شیطان اخرس بننے کے مرادف ہوگا۔ اس لئے اپنے محسن یادفرما جناب بابا ذہین شاہ صاحب کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

اگر مجھ کو اس کا گمان غالب بھی ہوتا کہ میری گذارش کو جناب شاہ صاحب اپنے رسالہ "تاج" میں من وعن شائع فرما دیں گے تو میں اس مضمون کو انہیں کی خدمت میں بھیجتا مگر بڑے بڑے اہل تقویٰ و ورع مدیران رسائل کا جن سے دیرینہ مخلصانہ تعلقات ہیں یہ تجربہ رہا ہے کہ اپنے خلاف مضمون کو جس کا وہ جواب نہیں دے سکتے کبھی شائع نہیں کرتے اور بابا ذہین شاہ سے تو میری پہلی ملاقات ہے اس سے پہلے میں ان کے اسم گرامی سے بھی واقف نہ تھا۔ کیوں کر امید کر سکتا کہ وہ اپنے مضمون کا جواب من وعن شائع فرما دیں گے؟ تو جب قطعہ سرزمین پر سے زمین کی کوئی امید نہ تھی تو پھر تاج کے بعد فاران میں اس کا حقدار نظر آیا کہ فاران کی طرف سے جواب فاران ہی میں چھپے۔

اتنی ہی طوالت تمہید مجھ کو ناگوار طبع ہو رہی ہے اب اس کو کیوں طول کھینچوں، اس لئے گویا تمہید کو نا تمام چھوڑ کر اصل موضوع پر آتا ہوں۔

؎ یہ رسالہ نومبر ۱۹۶۵ء کا ہے۔ تعجب ہے کہ ماخوذ جنوری ۶۶ء میں نومبر ۶۵ء کا پرچہ کیوں آیا۔ دسمبر یا جنوری کا پرچہ کیوں نہیں آیا۔

جناب بابا ذہین شاہ صاحب نے اپنی بحث ختم کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ہم دلیل کی بنا پر کسی کو اپنی بات منوانے کے لئے ضد اور تعصب کے غلبے میں علم وتحقیق سے اعراض کرنا تنگدلی بلکہ سنگدلی ہے۔

شاہ صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے اور مجھ کو امید رکھنی چاہئے کہ جناب شاہ صاحب خود بھی اپنے فرمودہ کے مطابق ضد اور تعصب سے احتراز فرماتے ہوئے علم وتحقیق کی روشنی میں اپنے معتقدات اور دینی مشاغل کا جائزہ لیں گے۔

جناب شاہ صاحب اس کے بعد فرماتے ہیں :—

"ماہر صاحب بار بار کل بدعۃ ضلالۃ کو دہراتے ہیں اور ان کے نزدیک اس حدیث مبارکہ کا یہ مطلب ہے کہ بدعت کی کوئی قسم حسنہ ہو ہی نہیں سکتی ہر بدعت بلا استثنا، سیئہ ہے گمراہی ہے۔ فرض کیجئے ہم ان کے کہنے سے حدیث شریف کا یہی مطلب مان لیں تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا من عمل بھا۔ ومن سنّ سنۃ سیئۃ فلہٗ وزرھا ووزر من عمل بھا (ترجمہ کو میں چھوڑتا ہوں اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں) اگر ہر بدعت گمراہی مانی جائے گی تو پھر سنت حسنہ اور سنت سیئہ کی تقسیم باطل ہو جائے گی۔ اور دونوں حدیثوں میں تعارض لازم آئے گا۔ کسی ایک حدیث کو ماننا اور دوسری کو قبول نہ کرنا بھی انکار حدیث ہے۔ پس دونوں حدیثوں میں توافق پیدا کرنا چاہئے اور اصل میں توافق موجود ہے تعارض پہلی حدیث میں بدعت کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ دوسری حدیث میں بدعۃ کے معنی متعین ہو گئے کہ کل بدعۃ ضلالۃ میں بدعت سے سنۃ سیئۃ مراد ہے۔ بدعت حسنہ جس کو علمائے امت نے سنۃ الہدیٰ قرار دیا ہے وہ اس بدعت سیئہ کی ضد ہے جس کو سنۃ الضلالہ کہنا چاہئے ..... الخ"

بعض حکما کا قول ہے ہر کارے و ہر مردے۔ بابا ذہین شاہ صاحب صوفی ہیں ان کو ذکر وشغل و مراقبہ و مکاشفہ سے اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ وہ قرآن وحدیث میں فکر وتدبر فرمائیں یہ کام ان لوگوں کا ہے جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی قرآن وحدیث کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ بہر حال اب میں شاہ صاحب کی خدمت میں دونوں حدیثوں کا صحیح مفہوم عرض کرتا ہوں علم وتحقیق ہی کی روشنی میں ہمیں امید ہے کہ شاہ صاحب اپنے قول کے مطابق ضد، غلو اور تعصب سے کام نہ لیں گے اور ٹھنڈے دل سے میرے معروضے پر غور فرمائیں گے

کل بدعۃ ضلالۃ بلا استثنا، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کسی کو حق نہیں ہے کہ اس کلیّے کے عموم کی تخصیص اور اس کے اطلاق کی تقلید کرے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک مجلس میں یہ حدیث پڑھی تو ایک شخص نے پوچھا کہ وان رأھا الناس حسنۃ ؟ اور اگر لوگ اس کو حسنۃ سمجھیں ؟ تو انہوں نے فرمایا وان رأھا الناس حسنۃ اگرچہ لوگ اس کو حسنہ سمجھیں۔[1]

باقی رہ گئی یہ روایت کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تراویح کی نماز باجماعت پڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ نعمت البدعۃ ہٰذہ[2]۔ تو یہ روایت مرسل ہے ابن شہاب زہری عروہ بن الزبیر سے اس کی روایت کرتے ہیں اور ان کے سوا کوئی بھی اس کی روایت نہیں کرتا تو ابن

---

[1] غالباً حدیث ہی فعلیہ و نہ ہے ضعف بصارت کی وجہ سے مراجعت سے معذور ہوں۔ [2] فاران کے ترجمہ نمبر میں "نعمت البدعۃ" کی اطیف شرح کی گئی ہے کہ یہاں نعمت البدعۃ سے کیا مراد ہے! اور جو لوگ حضرت عمرؓ کے اس قول سے "بدعت" کی سیئہ اور حسنہ کی تقسیم پر دلیل لاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔
م۔ ق

آحاد مرسل روایت سے ایک مشہور متفق علیہ حدیث کے عموم کی تخصیص کس طرح صحیح سمجھی جاسکتی ہے اور اگر واقعی حضرت فاروق اعظم نے ایسا فرمایا ہوتا تو انہیں کے صاحبزادے حضرت عبداللہ یہ نہ فرماتے کہ کل بدعۃ ضلالۃ وان راھا الناس حسنۃ۔ اس لئے بدعت کی یہ تقسیم بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ بعض اہل بدعت کا اختراع ہے ورنہ کوئی بدعۃ بھی حسنہ نہیں ہوسکتی ۔ کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار ۔

باقی رہی سنۃ حسنہ اور سنۃ سیئہ والی حدیث تو وہ بھی اپنی جگہ پر بہت صحیح ہے ۔ آپ سنۃ اور بدعۃ کو خواہ مخواہ ایک قرار دے رہے ہیں ۔ بدعۃ ایسے کام کو کہتے ہیں جو کام ہی نو ایجاد ہو ۔ پہلے کبھی وہ کام نہ کیا گیا ہو اور سنۃ نام طریق کار کا ہے ۔ دستور عمل کو بھی سنۃ کہتے ہیں ۔ سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل ۔ کیا آپ اس کی تفسیر میں بدعۃ اللہ کہہ سکتے ہیں ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا وغیرہ آیات کو دیکھیے من سن سنۃ حسنۃ کے معنی یہ ہیں کہ کسی دینی کام کے انجام دینے کا جس نے کوئی نیا طریقہ نکالا ۔ تو طریق کار کی تقسیم کو نفس کار کی تقسیم قرار دینا ایسی صریح غلطی ہے ۔ کل بدعۃ ضلالۃ والی حدیث کہتی ہے کہ دین میں کوئی نیا کام نہ نکالو اور من سن سنۃ والی حدیث بتاتی ہے کہ جس نے کسی دینی کام کی انجام دہی کا کوئی نیا طریقہ نکالا ۔ یہ طریقہ اچھا بھی ہوسکتا ہے اور برا بھی ۔ اچھا اس طرح کہ حدود شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے وہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے اور مفید بھی ہو اور برا دو حیثیتوں سے ہوگا ۔ حدود شرعیہ اس طریق کو اختیار کرنے سے ٹوٹتے ہوں یا حدود تو نہ ٹوٹتے ہوں مگر مضر ہو ۔ نقصان رساں ہو ، تیسری صورت مباح کی بھی نکل سکتی ہے کہ نہ اس طریق کے اختیار کرنے سے حدود شرعیہ ٹوٹتے ہوں اور نہ وہ مضر اور نقصان رساں ہو اور نہ مفید ہو تو وہ مباح تو ہوگا مگر اس کا ترک ہی بہتر ہوگا اس لئے سابق طریق بھی اس کام کی انجام دہی کا کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا ۔ وہ ضرور تعامل اسلاف کی وجہ سے مسنون و ماثور ہوگا اور یہ نیا طریق غیر مسنون وغیر ماثور تو پھر جب اس سے کوئی فائدہ ونفع ہی حاصل نہیں ہوتا تو پھر مسنون و ماثور طریق کو چھوڑ کر بے فائدہ ایک غیر مسنون وغیر ماثور طریق کو اختیار کرنا مرجوح کو راجح بنانا ہوگا اس لئے غلط ہوگا ۔

حدیث رسولؐ کے عموم کی بلا دلیل واضح تخصیص یا اس کے اطلاق کی تقیید درحقیقت حدیث رسولؐ کو حدیث رسولؐ مان کر اس کا انکار ہے اور یہ عام منکرین حدیث کے انکار سے بدترین انکار حدیث ہے اس لئے کہ عام منکرین حدیث ، مجموعہ احادیث کو حدیث رسولؐ تسلیم نہیں کرتے ہیں ان کے حدیث رسول ہونے کے وہ منکر ہیں بخلاف اس کے جو کسی قول کو حدیث رسول تسلیم کر لینے کے بعد اس کے ماننے سے گریز کی راہ نکالے اس کے عموم کی بلا دلیل تخصیص کرکے اس کلیے کے بعض افراد سے اس عام حکم ساقط کر دینے کی سعی غیر محمود کرے ۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک فعل مسنون کا جو ہر شخص اپنے گھر میں انجام دے رہا ہے اور کہیں کہیں چند آدمی با جماعت بھی متفرق طور سے ادا کر رہے تھے ایک طریق کار نکالا تھا ۔ صوفیوں کی طرح سے صلوٰۃ العاشقین اور صلوٰۃ معکوس اور صلوٰۃ الرغائب نئی نئی نمازیں اور سب سے بڑھ کر صلوٰۃ غوثیہ کی قسم سے کوئی نئی نماز نہیں ایجاد کی تھی ۔

اذان کوئی مستقل بالذات عبادت نہیں ہے ۔ قرآن مجید میں اس کو ندا الصلوٰۃ قرار دیا گیا ہے اس کے پکارنے کا جو طریق عہد نبوی میں تھا اس کو ادل بدل نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ وہ طریقہ مسنون و ماثور ہے ۔ حضرت عمر یا حضرت عثمان خلفائے راشدین میں سے ہیں علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین کے رو سے انہوں نے اگر ندائے صلوٰۃ میں مناسب وقت کوئی اضافہ کیا تو وہ لوگ

متبوعین میں سے بنتے تابعین میں سے نہ تھے، قرآن مجید میں سابقون الاولون کے ذکر کے بعد والذین اتبعوھم باحسان فرماکر یہ ثابت کر دیا کہ انہیں کے اتباع پر رضائے الٰہی موقوف ہے اور ان سابقون اولون میں درجۂ خصوصیت خلفائے راشدین کو حاصل ہے، مہاجرین والانصار رضی اللہ عنہم کے بعد کسی کو متبوعیت کا یہ شرف حاصل نہیں ہوسکتا چاہے وہ کوئی غوث الاغواث ہو یا قطب الاقطاب سب کے سب مجبور ہیں مہاجرین والانصار کے اتباع پر۔ اس لئے جس کا جی چاہے دین میں نئے نئے اختراع کرے۔ اس کی اجازت نہ قرآن مجید نے دی ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

افسوس یہ ہے کہ جب سے فرقہ بندیاں اسلام میں پیدا ہوئیں اور پھر عجمی تصوف نے اپنا دام پھیلانا شروع کیا اس وقت سے ہر فرقہ کسی نہ کسی بدعت میں ضرور مبتلا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی نے بھی بدعۃ کی جامع و مانع تعریف ایسی نہیں کی جس سے ہر شخص سمجھ لے کہ فلاں چیز بدعت ہے اور فلاں نہیں۔

میری ایک کتاب البدعۃ مدت سے مسودے کی شکل میں رکھی ہے جس میں قرآن و حدیث دونوں سے بدعت پر مکمل بحث کی گئی ہے بدعت کے متعلق حقیقی حدیثیں ہیں سب کو قرآنی آیات کے مطابق کرکے دکھایا ہے اور صحیح جامع و مانع تعریف بدعت کی قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کردی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کب اس کی اشاعت کا سامان کردیتا ہے۔

مجھ کو افسوس ہے کہ باباذہین شاہ صاحب سے آغاز تعارف ہی میں مجھ کو اختلاف کرنا پڑا انہوں نے اپنا پرچہ میرے پاس بھیجا جس کا میں ممنون ہوں مگر میں مجبور تھا کہ ان کے قول کے مطابق "علم تحقیق" کی روشنی میں بدعت و سنت کا فرق وضاحت سے پیش کردوں امید ہے کہ وہ اس پر ٹھنڈے دل سے دیانت دارانہ غور فرمائیں گے اور تعصب و غلو سے کام نہ لیں گے۔

• المنجد :- ساٹھ ہزار الفاظ کی مکمل عربی ڈکشنری - قیمت ۳۰ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

• الادب المفرد مترجم اُردو - حضرت امام بخاری ترجمہ اردو مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی - قیمت ۱۲ روپے "

• آیات بینات :- نواب محسن الملک سید محمد مہدی علی خاں - جلد اوّل نو روپے جلد دوم نو روپے "

• اخبار الاخیار :- ہندو پاک کے مشاہیر صوفیائے کرام کا مستند ترین تذکرہ قیمت ۱۲ روپے مقالات ابوالکلام آزاد ۲ روپے

• رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی - ڈاکٹر محمد حمید اللہ قیمت ۸ روپے • خلفائے راشدین - مولانا عبدالشکور لکھنوی قیمت ۱۲ روپے

• سیرت عمر بن عبدالعزیز - مولانا عبدالسلام ندوی - ۳ روپے • مضامین ابوالکلام آزاد قیمت ۲ روپے

• تفہیم القرآن - مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اوّل دوم سوم ۲۷ روپے • ترجمان القرآن ابوالکلام آزاد ۲ جلد ۳۰ روپے

• صحیح بخاری شریف عربی مع اردو ۳ جلد ۴۵ روپے • ترمذی شریف اردو ترجمہ ۲ جلد ۲۴ روپے

• رسول اللہ کی دعائیں عربی انگریزی قیمت ۱۶ روپے • ابن ماجہ اور علم حدیث مولانا عبدالرشید نعمانی ۸ روپے

• فیوض یزدانی اردو ترجمہ الفتح الربانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ۱۰.۵۰ روپے

• سیرت النبی ۶ جلد کامل شبلی - ۹۰ روپے • الفاروق شبلی نعمانیؒ ۵ روپے • امام اعظمؒ شبلی ۶ روپے

• الفاروق شبلی نعمانیؒ ۵ روپے • امام اعظمؒ شبلی ۶ روپے • تاریخ اسلام مولانا اکبر شاہ ۳ جلد ۳۶ روپے

• حیاتِ وحید الزماں ۴ روپے • حدیثِ دفاع میجر جنرل اکبر خاں ۵ روپے • خالد بن ولید میجر جنرل اکبر خاں ۵ روپے

• سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ ۵ روپے • عبرت نامہ اندلس اردو ترجمہ اسد محمد اسمٰعیل پانی پتی قیمت ۳۰ روپے

• فتوح البلدان اُردو ترجمہ ابوالخیر مودودی قیمت ۱۵ روپے

• پردہ مولانا مودودی ۴ روپے • تفہیمات مولانا مودودی ۲ جلد قیمت ۱۱ روپے • تجدید و احیائے دین مولانا مودودی ۲ روپے

نسیم اللغات اردو نسیم امروہی ۱۵ روپے — • گلبانگِ حرم مجموعہ نعت حمید صدیقی ۳ روپے

ملنے کا پتہ

مکتبہ فاران، کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

ماہر کی کہانی ماہر کی زبانی

مدیر "چراغ راہ" نے میرے پاس ایک سوالنامہ بھیجا تھا، جس کے جواب[1] میں، خاکسار نے جو کچھ لکھا تھا، وہ درج ذیل کیا جاتا ہے!

ماہر القادری

● — شعر کیوں کہتے ہیں دوسرے لفظوں میں آپ کا نظریۂ شعر کیا ہے؟

ا — میں شعر کیوں کہتا ہوں؟ اس کا جواب میری غزل کے مقطع میں آپ کو مل سکتا ہے!

ماہر! مرے شعروں کے خاکے اس طرح مرتب ہوتے ہیں
کچھ دل بھی تقاضا کرتا ہے کچھ اُن کا اشارا ہوتا ہے

اس "اُن" کا مرجع اور مشارٌالیہ —— حقیقت اور مجاز دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔

شعر کے متعلق میرا وہی نظریہ ہے جو تمام شاعروں، اہلِ نقد و نظر اور اربابِ ذوق کا ہے۔ یہ کہ شعر شاعر کے واردات، محسوسات اور مشاہدات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو کیفیت شاعر کے دل پر گذرتی ہے وہ شعر کے قالب میں ڈھل جاتی ہے "آپ بیتی" کے علاوہ شاعر "جگ بیتی" بھی بیان کرتا ہے اور اس کو اپنے آرٹ کی قوت سے "سحرِ حلال" بنا دیتا ہے، مثلاً فردوسی کا شاہنامہ اس کی "آپ بیتی" نہیں ہے۔ لیکن یہ شاعر کا کمالِ فن ہے جس کی بدولت شاہنامہ شعر و سخن کا معجزہ بن گیا ہے۔

شاعری کا بہت کچھ تعلق جذبات سے ہے اور جذبات بھی طرح کے ہوتے ہیں پاکیزہ بھی اور ایسے بھی جن میں ہوا و ہوس کا امتزاج ہوتا ہے۔ تھوڑی بہت آوارہ مزاجی اور آوارہ خیالی سے شاید ہی کوئی شاعر محفوظ رہا ہو۔ محتاط لفظوں میں آپ اسے رنگین مزاجی کہہ لیجئے۔ اسی لئے شاعری کو نبیؐ کے تقدس اور اعلیٰ منصب کے شایانِ شان نہیں سمجھا گیا۔ مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ کتنے اونچے درجے کے صوفی شاعر ہیں ان تک کی غزلوں میں یہ رنگ ملتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

یک دست زلفِ ساقی و یک دست جامِ مے   رقصے چنیں میانہ میدانم آرزو است

---

[1] "چراغ راہ" (مئی و جون ۱۹۵۰ء) میں جس شاندار تعارف کے ساتھ یہ مضمون شائع ہوا ہے، اُس "تعارف" کو اپنے رسالہ میں نقل کرنے کی ہمت نہ کرسکا! (م۔ق)

میں اپنی شاعری کے چند نمونے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

بے حجابانہ توجہ، بے تکلف التفات ‏ ‏ اس نے رسمِ ناز و تمکیں توڑ دی میرے لئے
وہ ستاروں کا دوپٹہ وہ لباسِ زرق برق ‏ ‏ سر سے پا تک کہکشاں ہی کہکشاں میرے لئے
وہ اس کا تغافل کہ مجھے تم سے سروکار ‏ ‏ میری یہ گذارش کہ مجھے بھول نہ جانا
ماہرؔ تمہارے شعر کی تاثیر الاماں ‏ ‏ اس شوخ کے لبوں پہ بھی ہلکی سی آہ تھی
وہ بھی تڑپ جائیں تو اس عاشقی پہ خاک ‏ ‏ مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

میرے ان شعروں سے اگر کوئی "تصوف کے مقامات" منسوب کرتا ہے اور ان ہوس آمیز جذبات کو تقدیس کا رنگ دینا چاہتا ہے۔ تو ایسا ناقد اور میرے شعروں کا شارح حقیقتِ واقعہ کا غلط ترجمان ہے۔

میری ایک نظم کا ایک شعر ہے جس میں رنگینی کے ساتھ ساتھ فکر و جذبہ کی تقدیس بھی پائی جاتی ہے۔

عارض کی سرخیوں میں جھلکتی ہوئی حیا
لوگوں کے دیکھنے کی شکایت لئے ہوئے

ہوا و ہوس کی رنگین ترجمانی ہی کا نام شاعری نہیں ہے۔ "مقصدیت" اور پیام بھی شعر کا موضوع ہے۔ مگر دنیا میں ایسے شعرا جنہوں نے انسانیت کو "پیغام" دیا ہے۔ بہت کم گذرے ہیں۔ شاعروں کی غالب تعداد جبین و رخسار کی دھوپ اور زلف و گیسو — کی چھاؤں میں جذبات کھیلتی رہی ہے، میری شاعری کا ایک تو وہ رنگ ہے جس کی چند جھلکیاں میں ابھی ابھی پیش کر چکا ہوں اور دوسرا رنگ "مقصدیت پیام" کا رنگ ہے۔

میں ہر افق سے طلوع ہو کر جہاں میں ظاہر ہوا ہوں ماہرؔ
کہیں مرا رنگ عاشقانہ، کہیں مرا طرز ناصحانہ

میرے ایسے چند اشعار جن میں "مقصدیت" کی ترجمانی کی گئی ہے:-

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں ‏ ‏ یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں
سر سے آنچل ڈھلک گئے بھی تو کیا ‏ ‏ تو مگر دامنِ نظر کو سنبھال
میری دنیا میں ہے رمِ آہو ‏ ‏ تیری دنیا ہے صرف چشمِ غزال
نظریں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسماں ‏ ‏ سجدے قبول ہوں تو خموشی پیام ہے
قبروں پہ مسلمان خواتین کا جھرمٹ ‏ ‏ اور اس پہ مجاور کی وہ دزدیدہ نگاہی
ہو نہ جائے بہاروں سے نفرت ‏ ‏ احترامِ خزاں کرتے کرتے
مظلوم نہ دیں عدل و مروّت کی دہائی ‏ ‏ شاہوں کی طبیعت پہ یہ لفظ گراں ہیں
چلی چمن سے یہ کہتی ہوئی نسیمِ سحر ‏ ‏ کہ نا و راہ ضروری نہیں سفر کے لئے
قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے ‏ ‏ وہ سجدہ جس کو ترے آستاں سے نسبت ہے

● — آپ نے شعر کہنا کب سے شروع کیا اور شعر کہنے کی تحریک کس سے ہوئی ؟

۲ :- میں نے غالباً گیارہ بارہ سال کی عمر میں پہلا شعر موزوں کیا ـــــ کیوں کیا ۔ ؟ اس کا محرک کیا تھا ؟ اس کا نہ اس وقت ہوش تھا اور نہ اب کچھ یاد آتا ہے ۔

● — کیا آپ نے شروع میں کسی سے اصلاح بھی لی ؟

۳ :- میں نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی ! جب میں نے شاعری شروع کی تھی اس وقت ہی سے میرا یہ خیال اور نظریہ تھا کہ کسی استاد کو غزل لکھ کر بھیج دی ۔ اس نے غزل دیکھ کر واپس کر دی ۔ اس سے مبتدی شاعر کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچ سکتا ۔ استاد کی خدمت میں دو چار سال گذارے جائیں ۔ اس کی صحبت ، ہم نشینی اور تکلم و گفتگو کا مسلسل موقع ملتا رہے تو اس سے شاگرد کے ذہن و فکر کی تربیت ہوتی ہے اور اس کا مجھے موقع نہ مل سکا اس لئے کسی استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہ نہ کر سکا ۔

میری نشو و نما گاؤں میں ہوئی ہے ، میرے والد شعر کہتے تھے مگر میں ان سے اپنے کلام پر اصلاح کیا لیتا جب کہ انہیں اپنے شعر سنانے کی جرأت ہی نہ کر سکا ۔ عاشقانہ اشعار اپنے باپ کو اپنی زبان سے سناؤں اس گستاخی اور بے باکی کا میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا ۔ ۱۹۲۵ء میں علامہ اقبال کو میں نے اپنے گاؤں سے جوابی کارڈ لکھا کہ آپ کی خدمت میں اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجنا چاہتا ہوں اس کی اجازت مرحمت فرمائی جائے ۔ علامہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ شاعر کے لئے کسی تلمذ کی ضرورت نہیں ہے ہاں زبان کی درستی کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے تو آپ[1] خود یو پی کے رہنے والے ہیں ۔ ! علامہ اقبال کا یہ خط میں نے بائیس سال تک سنبھال کر رکھا مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا ۔

جب تلمیذ و تلمذ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی عرض کر دوں کہ راقم الحروف نے دس بیس نہیں سینکڑوں اصحاب کے کلام پر اصلاح دی ہے مگر میں نے کسی کو نہ اپنا شاگرد کہا اور نہ شاگرد سمجھا ، میری حیثیت استاد کی نہیں " مشیر " کی رہی ہے اور مشورہ کو قبول ہی نہیں رد بھی کیا جا سکتا ہے مشہور شاعروں میں نظر حیدر آبادی مرحوم ان میں شامل ہیں جنہوں نے مجھ سے مشورہ سخن کیا ہے ۔ کم مشہور شعراء میں کھنڈوہ کے شوق ہیں جو اپنے نام کے ساتھ ماہری لکھتے ہیں ان کا یہ شعر کتنا اثر انگیز ہے ؎

وہ کیا کیا کر گئے دشوار منزل ہمارے ساتھ دو اک گام چل کے

ہم شما کا تو کیا ذکر ہے ۔ رئیس المتغزلین جگر مراد آبادی نے یہ شعر سنا تو تڑپ کر رہ گئے ۔

● — اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں آپ کن شخصیات و نظریات سے متاثر رہے ؟

۴ :- میں بدو شعور ہی سے دینی معتقدات اور اخلاقی نظریوں سے متاثر رہا ہوں میرا پہلا مضمون جسے قابل ذکر کہا جا سکتا ہے ۔ اس کا عنوان تھا ـــــ صاحب القرآن فی القرآن ـــــ دہلی کے مشہور رسالہ " پیشوا " کے رسول نمبر میں شائع ہوا تھا یہ اب سے ۴۵ سال پہلے کی بات ہے مجھ پر شروع ہی سے غالب ، حالی ، شبلی ، اکبر ، اقبال کے افکار اور شاعری کا بہت زیادہ اثر رہا ہے ۔ خاص طور پر شبلی نعمانی میرے سب سے بڑے معنوی استاد ہیں ۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت اور عقیدت اور ان کی شخصیت کا تاثر تو یوں کہیئے میری گھٹی میں پڑا ہے ۔ والد مرحوم نے دس سال کی عمر میں گلستاں مجھے سبقاً سبقاً پڑھائی تھی ۔ یہ فیض آج تک جاری ہے ۔ ۱۹۳۲ء کے بعد سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے میں متاثر ہوا ہوں اور دینی افکار کے علاوہ ان کی انشا پردازی کا دل و جان سے معترف اور مداح ہوں ۔

---

[1] یہ جملہ پوری طرح ذہن میں محفوظ نہیں رہا یا غالباً یوں لکھا تھا کہ زبان کی درستی کے لئے اسی طرح میں آپ کو بتانے والے مل جائیں گے ۔

● —— اب تک آپ کے متعدد شعری مجموعے چھپ چکے ہیں آپ کی اپنی نظر میں سب سے اچھا مجموعہ کون سا ہے ؟

۵ :۔ اس کا فیصلہ کرنا میرے لئے بہت دشوار ہے غالباً میرے مجموعہ کلام "فردوس" میں نسبتاً زیادہ پختگی اور بلوغ فکر پایا جاتا ہے ——

● —— ایک اچھے شعر، یا ایک اچھی نظم کے لئے آپ کیا خصوصیات مقرر کرتے ہیں ؟

۶ :۔ میرے خیال میں اچھی نظم اور اچھا شعر وہ ہے جس میں تخئیل کی نزاکت، رعنائی اور جدت کے ساتھ اس کا اظہار بھی موزوں انداز میں ہوا ہو ۔ میں اس معاملے میں شبلی نعمانی کا مقلد اور ہم نوا ہوں جو تخئیل پر اسلوب بیان اور پیرایہ و اظہار و بیان اور آہنگ الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں ۔

علامہ شبلی کی مشہور نظم ہے جس کی بنیاد پر شہرۂ آفاق فلم "پکار" تیار ہوئی تھی ۔ اس میں شبلی اس خیال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جہانگیر کے عہد حکومت میں نور جہاں کا بہت کچھ عمل دخل تھا اس خیال کو انہوں نے کس اچھوتے انداز میں ادا کیا ہے ۔

اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

میں شاعری میں اسی پیرایہ، انداز بیان اور تخئیل کا شیدائی ہوں ۔

اپنی پسند کے چند اشعار مختلف شعرا کے یہاں نقل کرتا ہوں تاکہ پڑھنے والوں کو میرے ذوق شاعرانہ کا اندازہ ہو سکے ۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو — تو کجا بہر تماشا می روی
ہر غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نہ گردد — قربان لب یار کہ غنچہ کہ گل
اے ہم نفسان محفل ما — رفتید ولے نہ از دل ما
پڑے ہیں صورت نقش قدم نہ چھیڑ ہمیں — ہم اور خاک میں مل جائیں گے اٹھانے سے
گرتے گرتے ان کا دامن تھام لے — گرنے والے لغزشوں سے کام لے
ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
جوش جنوں کے ہاتھ سے فصل بہار میں — گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط
دونوں جہان آئینہ دکھلا کے رہ گئے — لانا پڑا تمہیں کو تمہاری مثال میں
جب سے کھویا گیا ہے دل اپنا — چیز رکھتا ہوں بھول جاتا ہوں
یہ کہہ کے چھیڑتے ہیں جوانان میکدہ — ماتی ! تمہیں سلام کیا ہے بہانے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے — کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ایک تو نیناں مدھ بھرے دوجے انجن سار
ارے ہا درے دیت ہیں ! متوارے ہتھیار

مسکراہٹ لبوں پہ مچلتی ہوئی جیسے اک برق کی رو اُدھر سے ادھر
دلبری کے ہنر دلربائی کے فن ایسی باتوں سے بیگانہ و بے خبر
عصمت پاک بازی سے روشن جبیں حسن غیرت سے رخسار تابندہ تر
سر جھکائے ہوئے وہ گذرتی گئی • زخم جس کے لئے ہر ہوس کی نظر

کوئی شک نہیں میرے دوسرے دور کی شاعری میں "فکر و نظر" کا زاویہ ایک حد تک ضرور بدلا ہے مگر جن اجزاء سے شعر ترکیب
تا ہے ان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ وہ تو اور بھی نکھر گئے ہیں۔
حال ہی میں ایک غزل میں نے کہی ہے جس کا ایک شعر ہے۔

تذکرہ جب وفا کا ہوتا ہے میں تمہاری مثال دیتا ہوں

جو حضرات شعر کا صحیح ذوق رکھتے ہیں اور غزل کے مزاج کو پہچانتے ہیں۔ وہی میرے اس شعر کی کیفیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ میں خود
پنی زبان سے کیا کہوں۔

● —— آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے آپ کو غزل کا پیرایہ زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے یا نظم کا ؟

۱۰۔ غزل ہو یا نظم! میں دونوں اصناف سخن میں کسی دشواری کے بغیر شعر کہتا ہوں اصل چیز شعر کے کہنے والے کی مشاقی
پختگی اور قادر الکلامی ہے۔ ہاں! میری طبیعت کا رجحان "تغزل" کی جانب زیادہ ہے۔ میری رائے میں تو جو نظم تغزل سے عاری ہو۔
وہ پرشکوہ ہو سکتی ہے مگر دل کش اور اثر انگیز نہیں ہو سکتی۔

● —— کیا آپ اردو شاعری کی موجودہ رفتار ترقی اور اس کے رجحانات سے مطمئن ہیں ؟

۱۱۔ موجودہ اردو شاعری جس پر نام نہاد "ترقی پسندی" کا سایہ پڑا ہے اس نے لوگوں کے مزاج کو بگاڑ دیا ہے، شعر و ادب کی اس تباہی پر
ما جاتا ہے میرا دل شدید کرب محسوس کرتا ہے۔ نئی نسل کی شاعری لغمگی، توازن خیال و اظہار، لطفِ بیان اور صحت و زبان سے عاری ہوتی چلی
رہی ہے۔ ابہام، اشاریت اور رمزیت کی وہ شدت کہ "اہمال" کی روح پڑی ہے! مہمل گوؤں اور غلط نگاروں کی شہرت کے پل
ٹے پڑ رہے ہیں۔ توبہ!

● —— ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری میں جو تجربے کئے ہیں آپ کی نظر میں اُردو شاعری کی روایت میں ان کی حیثیت کیا ہے ؟

۱۲۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری میں جو تجربے کئے ہیں وہ شاعری کے ساتھ مذاق ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا "آہنگ"
جدان کو چونکا دینے والا ہے۔ اس نئے آہنگ کو جہاں موزوں الفاظ مل جاتے ہیں وہاں "سحر حلال" بن جاتا ہے۔ نہیں ملتے تو "بے سُرا"
لـ بن کر رہ جاتا ہے۔ عام طور پر یہ "جدید آہنگ" پھٹے ہوئے بانس سے نکلی ہوئی آواز کا مزاج رکھتا ہے۔

● —— مشاعروں کی افادیت کیا ہے ؟ کیا ان کی حیثیت وہی ہے جو ہماری دیگر ثقافتی سرگرمیوں کی ہے ؟

۱۳۔ اردو زبان کی ترویج کے لئے مشاعرے بڑی اہمیت اور افادیت رکھتے ہیں۔ ہماری ادبی ثقافت کا یہ جزو لاینفک ہیں۔
س دور کی مغلوں کا یہ نعم البدل بلکہ یوں کہئے "خیر البدل" ہیں۔ مشاعروں میں اچھے شعر سن کر ذہن و فکر پر فنی اعتبار سے بھی نئی راہیں کھلتی ہیں
شعر کہنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔

● کچھ عرصہ پہلے "اسلامی ادب" کی تحریک بڑے زور شور سے چلی تھی۔ اب یہ تحریک بعض کے نزدیک جمود کا شکار ہے اور بعض کے نزدیک اس سے بھی آگے ـــــ تنزل کی طرف جا رہی ہے آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اگر آپ اس کے جمود یا تنزل کے قائل ہیں تو کیا آپ اس کے احیاء کے لئے کچھ تدابیر بتا سکیں گے ـــــ ؟

۱۴:- شعر و ادب میں جہاں بھی اخلاق و نیکی کی جھلک ملتی ہے وہ اسلامی ادب نہیں تو اور کیا ہے۔ "خیر و حکمت" تو مسلمان ہی کی متاع ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ پاکستان میں اسلامی ادب کے فروغ کے لئے جو تنظیم قائم ہوئی تھی وہ باقی نہیں رہی مگر اس کے اثرات باقی ہیں اس تنظیمی جمود کو توڑنے اور حرکت پیدا کرنے کے لئے اسلام پسند ادیب اور شاعر کمر ہمت باندھیں تو یہ کارواں پھر جادہ پیما ہو سکتا ہے۔

آپ کے سوالات کے جوابات دینے میں زیادہ تفصیل سے کام لیتا تو پوری کتاب تیار ہو سکتی تھی۔ مگر اس کے لئے میرے پاس وقت اور فرصت نہیں ہے جو کچھ عرض کر دیا ہے اس کو ان حالات میں غنیمت سمجھیے کہیں بات پوری طرح کھل نہ ہو تو اس کا سبب میری کوتاہی قلم ہے۔

ع لختے ز حال خویش بہ کاغذ نوشتہ ام

ماہر القادری ۱۰ مئی ۱۹۶۵ء

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit
01/63

ماہر القادری
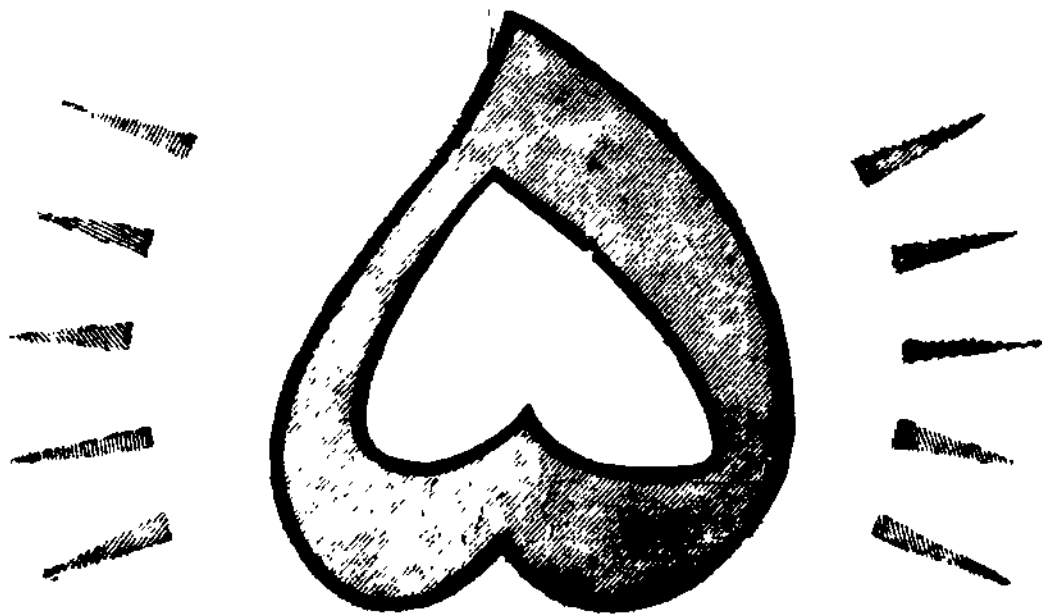
یادِ رفتگاں

پی، آئی، اے کا خونیں حادثہ

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

مئی ۶۵ء کو قاہرہ کے ہوائی اڈے سے چند میل کے فاصلہ پہ پاکستان انٹرنیشنل ایرلائن (P. I. A.) کے ہوائی جہاز کو جو المناک خونیں حادثہ پیش آیا اور اُس میں جتنی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں، ان پہ خون کے آنسو رو کر بھی تعزیت کا تھوڑا سا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس روح فرسا خبر نے پورے پاکستان کو ماتم کدہ بنا دیا تھا، ملک گیر المیہ کئی دن تک افق پہ رنج والم کی دھند چھائی رہی! پائیلٹ سے لے کر ایرہوسٹس تک پی، آئی، اے کا بہترین تجربہ کار اسٹاف اس خاص فلائٹ اور نئے خطِ پرواز کے لئے منتخب کیا گیا تھا، اس جہاز میں بعض ایسے صحافی بھی تھے جن کا بیرونِ ملک کے لئے یہ پہلا سفر تھا، کس چاؤ اور ارمانوں کے ساتھ انہوں نے کراچی سے پرواز کی تھی، سیر و سیاحت کی کیسی کیسی امنگیں اُن کے دلوں میں انگڑائیاں لے رہی تھیں، قاہرہ کے شاندار ہوٹلوں میں ان کے لئے کمرے پہلے سے محفوظ کرا دئے گئے تھے۔ مگر اس پرواز پہ کارکنانِ قضا و قدر نے "آخری سفر" کی مہر لگا دی تھی، یہ لوگ قاہرہ کے راستے دراصل ملکِ عدم کی طرف جا رہے تھے یہ اُن کا سفرِ آخرت تھا!

پی، آئی، اے کا شاندار، برش رو اور آرام دہ طیارہ ہواؤں سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا قاہرہ ایرپورٹ پہ چند منٹ میں اترنے والا تھا، مسافر قاہرہ کے جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ اتنے میں شدید دھماکہ ہوا اور جہاز میں آگ لگ گئی! بس پھر آگ، لہو، چیخیں۔ ہڈیاں چٹخنے کی آوازیں، جلے ہوئے چہرے، جھلسے ہوئے بدن، موت کے فرشتے کو خدا معلوم کتنی بہت سی روحیں بہ یک وقت قبض کرنی پڑیں! ہوائی جہاز کے دھماکے نے نہ جانے کس مسافر کے جسم اور ہڈی پسلیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور آگ کے خوفناک شعلوں میں کس کی جان کس طرح نکلی، یا اللہ تیری پناہ! اور تیری شانِ بے نیازی کو سجدے! اے حیات و موت کے مالک، تیرے نام کی تکبیر! بے شک ہر جاندار کی چوٹی تیرے دستِ قدرت میں ہے! جس کے لئے جو وقت اور جس طرح کی بھی موت لکھ دی گئی ہے اُس سے بال برابر تجاوز نہیں ہو سکتا

کیا بھروسا ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا ہے

مگر یہ بلبلہ "کتنا سرکش اور خودنگر واقع ہوا ہے، موت کو بھولا ہوا، آخرت سے غافل سر سے پاؤں تک اور دل سے نگاہ تک دنیا کے مکروہات میں غرق و مدہوش!۔

جن خبر رساں ایجنسیوں نے اس المناک حادثہ کی اطلاع دی تھی وہی اس المیہ بلکہ "خونخوابیہ" کے بھی ذمہ دار ہیں کہ ایک طرف

ہوائی جہاز کے شعلوں میں لوگ جل رہے تھے، کچھ سسک رہے تھے اور دم توڑ رہے تھے اور لعض کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں کہ اتنے میں مصر کے باشندوں کی ایک ٹولی نے وہاں آکر لوٹ مار شروع کر دی! یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی سنگدلی، خونخواری، کمینگی اور دنائت کے آگے شیطان بھی کان ٹیکتا ہے!

مجھے ۲۰ مئی کو دن کے گیارہ بجے میرے ایک عزیز نے ٹیلی فون کے ذریعہ اس حادثہ کی اطلاع دی، خبر سنتے ہی میں نے گھبرا کر کہا خالد تو ان دنوں چین کی فلائٹ پر مامور ہے جواب ملا، "ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے"! تین بجے کے قریب دل میں کھٹک سی پیدا ہوئی میں نے پی۔ آئی، اے کے مرکزی دفتر سے دریافت کیا کہ اس ہوائی جہاز پر نیویگیٹر کون تھا! قدرے توقف کے بعد جواب میں کہا گیا —— "لودی" اس نام کو سن کر دھچکا لگا۔ میں سوچ میں پڑ گیا، دل ہی دل میں کہا ایک محکمہ میں "لودی" نام کے ایک سے زاید آدمی بھی ہو سکتے ہیں، اس تاویل میں زیادہ دیر تک مطمئن اور قانع نہیں رہ سکا، تیزی کے ساتھ ٹیلی فون کا ڈائل گھمایا، گھنٹی بجنے لگی، اُدھر سے ایک خاتون نے "P. I. A" پوری طرح کہا بھی نہ تھا کہ میں جلدی سے بول پڑا، نیوی گیٹر کا پورا نام بتائیے، آپ کے یہاں خالد ضیا لودی بھی تو ہیں، خاتون نے قدرے توقف کے بعد غمگین لہجہ میں کہا، جی ہاں! کے، زیڈ لودی ہی اس فلائٹ پر گئے تھے' میں نے بیوی کو یہ غمناک خبر سنائی ان کے حقیقی بھانجے کے حادثہ کی خبر تھی، وہ برسوں سے بیمار بلکہ صاحب فراش ہیں، اس خبر کو سن کر ان کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا جیسے کسی نے آناً فاناً ان کے بدن سے لہو کھینچ لیا! خبر انتہائی وحشت ناک اور جاں گداز تھی مگر ابھی آس باقی تھی۔ ہوائی حادثہ میں لوگ بچ بھی تو جاتے ہیں؟ بیوی وضو کر کے دعا کے لئے سجدے میں گر پڑیں! میں تیزی کے ساتھ اپنے فلیٹ سے —— اتر کر نیچے گلی میں آیا، سواری کی اور اپنے ہم زلف کے یہاں پہونچا ان کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا، خالد مرحوم کی ماں کا برا حال تھا، ان کی دلدوز چیخیں سن کر دل ہلے جاتے تھے وہ جو ایک کمزور سی آس لگی ہوئی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ بھی تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئی یعنی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ جو چار پانچ آدمی زندہ بچے ہیں ان میں خالد ضیا لودی نہیں ہیں۔

خالد وجیہہ و تندرست خوبرو نوجوان، عمر ۳۱ سال سے بھی کچھ مہینے کم تھی، ماں باپ کا فرمانبردار بیٹا، پی، آئی، اے کا آزمودہ کار نیویگیٹر، ماہانہ تنخواہ الاونس کے ساتھ ملا کر تین ہزار سے بھی زیادہ تھی، نیا بنگلہ، نئی موٹر، بیاہ رچائے ہوئے گیارہ مہینے ہوئے تھے! گھر پہ بیچ بیچ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، راحت و آسودگی کی وہ سجی سجائی بساط ہی الٹ گئی، گھرانے کا روشن مستقبل ہی دھندلا گیا، نوجوان بیوی کا سہاگ لٹا، بھائیوں کا قوت بازو جاتا رہا اور ماں باپ کے جگر کا ٹکڑا آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا، نہ میت کا آخری دیدار ہوا نہ جنازہ اٹھا نہ قبر بنی!

جاننے اور ملنے والوں میں حضرت مولانا امین احسن اصلاحی کے بڑے صاحبزادے ابو صالح اصلاحی بھی اس حادثہ کا شکار ہوئے وہ کئی سال روزنامہ کوہستان کی ادارت سے وابستہ رہے اور اپنی صحافتی قابلیت کے نقش قائم کر دئے۔ تقریباً تین سال سے روزنامہ "مشرق" کے مدیر اعلیٰ تھے، پریس ٹرسٹ سے تعلق کے سبب اُن کی صحافتی حیثیت تو آزادانہ رہی تھی مگر تنخواہ ڈیڑھ ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہوگی، موٹر نشین تھے، بنگلہ میں رہتے تھے، گھریلو زندگی بہت زیادہ خوش گوار تھی مجھ سے آخری ملاقات پنڈی میں ہوئی تھی، لپٹا ورنگ ہوائی جہاز میں ساتھ رہا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی شریک سفر تھے یہ اب سے تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے، مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کو ہ الم کو مومنانہ شان

ماہ جون کے "فاران" میں جو اداریہ (نقش اول) شائع ہوا ہے وہ اس حادثہ سے قبل لکھا جا چکا تھا، مولانا موصوف کی خدمت میں، راقم الحروف نے تعزیت نامہ بھیجا تھا اسی طرح مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی صاحب کے گھر سے پر جا کر تعزیت کی تھی۔

استقامت کیساتھ برداشت کیا مولانا موصوف پر مرحوم بیٹے کی یتیم اولاد کی ذمہ داری آن پڑی ہے، اللہ تعالیٰ اُن کی رفاقت فرمائے (آمین)

حلقۂ ادب اسلامی جب کراچی میں قائم تھا، تو سبط فاروق فریدی اُس میں شریک ہوا کرتے تھے، اُن کا تعلق انگریزی صحافت اُردو میں اُن کے مقالے بڑے جاندار ہوتے! مذاکرہ میں کوئی ان پر سخت سے سخت لفظوں میں تنقید کرتا، تو بھی برا نہ مانتے، اُن قارئین سنجیدگی کے ساتھ دین کی اسپرٹ نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی۔

سبط فاروق مرحوم کا روزنامہ "ڈان" سے برسوں تعلق رہا اس کے بعد وہ مارننگ نیوز سے متعلق ہو گئے اور اپنی صحافتی قابلیت ملت نیوز ایڈیٹر بن گئے! ان کے چھوٹے بھائی کا ایک حادثہ میں دو سال پہلے انتقال ہوا تھا، اُن کے چھ بچوں کے وہ کفیل اور سر تھے، سبط فاروق مرحوم نے بھی چھ بچے چھوڑے ہیں، اتنا بڑا کنبہ اور مہنگائی کی کشکری تنگ کا بہ ظاہر سہارا اور بندوبست نہیں! اللہ تعالیٰ کی شان رزاقی کا اعجاز ایسے ہی نازک موقعوں پر ظاہر ہوتا ہے، واللہ خیر الرازقین!

پروفیسر خورشید احمد کے چھوٹے بھائی ممتاز طارق بہت سے بہت تیس سال کے ہوں گے، نہایت ذہین، بار سوخ اور سمجھ بوجھ والے! دس گیارہ سال سے انگریزی صحافت سے منسلک تھے، اپنی ذہانت اور حسن تدبیر کی بدولت کویتی سفارت خانہ کے پریس ہوگئے، دو تین سال سے ان کے معاشی حالات میں بڑی آسودگی پیدا ہو گئی تھی اور مستقبل اور دنیا وہ روشن امکانات سے تابناک نظر آتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا دانہ پانی اُٹھ چکا تھا، دودھ پیتا بچہ، جوان بیوہ اور سوگوار بھائیوں کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے ہے پھر کوئی اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آتا۔

معجز منصوری روزنامہ "حریت" کے "قطعہ نگار شاعر" اور اس کے حلقۂ ادارت سے وابستہ تھے بعض مشاعروں میں اُن کی زبان سے نظمیں بھی ہیں، راقم الحروف سے جب بھی کسی مشاعرے یا دعوت میں ملاقات ہوتی نیازمندانہ انداز میں ملتے، ان کی شاعری میں جمہوریت اور دین و اخلاق کی پائی جاتی تھی آمریت اور مطلق العنانی پر انہوں نے بڑی گہری چوٹیں کی ہیں۔ ان کی شاعری اور شخصیت کی طرف کا اب وقت آیا تھا کہ قاہرہ کا ہوائی ہے، اُن کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔

پی، آئی، اے کا ہوائی جہاز کسی ٹیلہ سے ٹکرا گیا؟ انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی؟ مشین کے کسی کل پرزے پر کام کرنے والوں کا غلط ہاتھ یا کسی سازش کا اس کی تباہی میں ہاتھ تھا؟ ——— بس اب عقل تیر تکے ہی لڑاتے رہے' جو ہونا تھا وہ ہو چکا،

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی
مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

اس حادثہ کے بعد سے دل کا یہ عالم ہے کہ ہوائی جہاز کی آواز سن کر طبیعت کو عجیب سی وحشت ہونے لگتی ہے گو وقت کی رفتار کے یہ تاثر دھیما پڑتا جا رہا ہے! آدمی حادثوں اور سانحوں ہی کے فکر و غم میں ڈوب کر رہ جائے تو دنیا کے کاروبار چوپٹ ہو جائیں، جہاں سے ہیں ملتی ہیں وہیں سے مرہم بھی تو ملتا ہے۔

ہم موت اور اس کے تصور سے کتنا ہی گریز کریں مگر موت ایک نہ ایک دن آکر ہی رہے گی! یہ دن تو ہر کسی کو دیکھنا ہے! اللہ تعالیٰ اس میں جاں بحق ہونے والوں کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

مسلم متوفین کو جن میں قادیانی بھی شامل ہیں۔ اہل ایمان "مرحوم" نہیں "آنجہانی" لکھتے ہیں! اور مغفرت کی دعا مسلمانوں ہی کیلئے کی جاتی ہے۔

محمد منصور علی

انسان کے سامنے عہد قدیم میں سب سے بڑا الجھا ہوا مسئلہ جو تھا وہ یہ کہ اس کائنات کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ خود
ن کیا ہے اور اس کا خالق کون ہے؟ اور زندگی کے بعد صرف موت ہے یا موت کے آگے بھی کچھ ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کام یونانی
ر اور فلسفیوں نے کیا اس کے بعد ہندوؤں کے مفکرین نے بھی دوسرے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو اہمیت دی۔

دو فلسفوں کی بنیاد پڑ چکی تھی جو دونوں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

(۱) پہلا فلسفہ یونانی فلسفہ یا (GREEK MYTHOLOGY) کے نام سے موسوم ہے۔ فنی اعتبار سے (THEORY OF ABIOGENESIS)
پتے ہیں۔ نظریہ یہ تھا کہ دنیا کی تمام تر اشیاء ایک دوسری سے بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور اس طرح کوئی وجود تباہ نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے
آدمی پتھر بن سکتا ہے۔ پتھر کیڑے مکوڑوں کا روپ دھار سکتے ہیں، جانور درخت بن سکتے ہیں اور درخت انسان بن سکتے ہیں۔ اس طرح زندگی ایک دائرہ
گھومتی ہے۔ ذیل کا نقشہ ان تبدیلیوں کی واضح تصویر پیش کر سکتا ہے۔
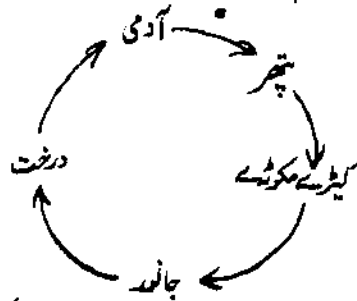
(۲) دوسرا فلسفہ ہندو فلسفہ یا (HINDU MYTHOLOGY) کہلاتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کا صرف جسم فانی ہے روح لافانی ہے
کے علاوہ روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل ہو سکتی ہے یعنی اگر کوئی آدمی مر جاتا ہے تو اس کی روح کسی جانور کے جسم میں داخل ہو کر زندہ رہ سکتی ہے۔ اسی
ح ایک جانور کی روح کسی آدمی کے مردہ جسم کو اپنی پناہ گاہ بنا سکتی ہے۔

یہ دونوں فلسفے درحقیقت صرف خیالی پلاؤ کے سوا کچھ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ انسان اس وقت سائنس سے ناواقف تھا اور اس منزل پر اس کی تربیت
ب اتنی ہی تھی کہ اس سے آگے وہ کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سائنس سے روشناس ہو جانے کے بعد سب سے پہلے ۳۸۴-۳۲۲ ق م میں یونانی فلسفی
طو نے اپنا نظریہ لاحیات پیش کیا اس میں اس نے بتایا کہ دنیا کے تمام جاندار مثلاً درخت، مکھیاں، بھنگے، بچھو، کھٹمل، گھونگے وغیرہ خود تخلیق

شدہ ہیں انسان کے لئے والدین کا ہونا ضروری نہیں - اس امر کے لئے اس نے تجربات سے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً اس نے بتایا کہ اگر سبزیوں کی یخنی بنا کر انہیں ڈھک کر رکھ دیا جائے تو اس میں چھوٹے چھوٹے جاندار خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں - اسی طرح بعض گندی جگہوں پر مثلاً گھوڑے کی لید پر کیڑوں کا نمودار ہو جانا اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ یہ خود بخود پیدا ہو گئے - لیکن تنقید پسند سائنس دانوں کے مسلسل تجربات نے اس نظریہ کو بہت جلد رد کر دیا وہ یہ کہ انہوں نے پکی ہوئی یخنی کو ڈھکنے سے قبل اندر کی ہوا کو گرم کر کے ہوائی جراثیم ختم کر دئے اس کے بعد دیکھا گیا کہ تخلیق عمل میں نہیں آئی اس کے بعد بھی نظریہ لاحیات پر تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا۔ ایڈی (۱۶۹۶ - ۱۶۲۶) - اسپلنزنی (۱۷۹۹-۱۷۲۹) اور لوئی پاسچر نے (۱۸۹۵ - ۱۸۲۲) اس پر مسلسل تجربات کئے اور سب کے نچوڑ میں متفقہ طور پر یہ ثابت کر دیا گیا کہ ہر جاندار کے لئے والدین کا ہونا ضروری ہے یا یہ کہ کسی جاندار میں خود تخلیق ہونے کی صلاحیتیں نہیں ہوتیں بلکہ شمع حیات کسی دوسری شمع سے ہی روشن کی جا سکتی ہے

یہاں آکر چارلس ڈارون کے ان نظریوں نے بھی دم توڑ دیا جو اس نے انسان کی تخلیق کے متعلق بنائے تھے جس میں اس نے انسانی تخلیق کو چند مادی عناصر کی کیمیائی ترکیب کا نتیجہ بتایا تھا۔ لیکن اس نظریہ کو جاننے کے بعد سائنس دانوں کے لئے ایک نیا سوال ابھر آیا وہ یہ کہ آخر وہ پہلی اور آخری شمع کون سی ہے جس نے تمام کائنات کو جلا بخشی ۔ تصوراتی اعتبار سے یقیناً وہ خدا تھا لیکن سائنس کی تحقیق اس وجہ کو جاننے کے لئے بے چین تھی اب بھی بے چین ہے اور نہ جانے کب تک رہے گی۔

تحقیق کے اس نئے میدان میں صرف سائنس دانوں نے ہی نہیں بلکہ فلسفیوں حتیٰ کہ علمائے کرام نے بھی بہت کاوشیں کیں اور حتی الامکان سائنس اور فلسفہ کے ذریعہ خدا کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انسان کی ذہنی پیچیدگی اس قدر تھی کہ اگر ایک ذہن کوئی دلیل تلاش کرتا ہے تو دوسرا اسے رد کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ امام فخرالدین رازی کے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی وجود باری تعالیٰ کے لئے دلائل تلاش کرنے میں وقف کر دی لیکن اس کے بعد بھی انہوں نے بہت سی دلیلیں ایسی بنا لیں جنہیں انسانی ذہن رد نہ کر سکا۔ راوی کہتا ہے کہ جس وقت وہ بستر مرگ پر تھے شیطان ایک انسان کی شکل میں ان کے پاس آیا اور دریافت کیا کہ امام صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت آپ جس زندگی سے ہمکنار ہو رہے ہیں اس میں رہ کر آپ نے دین کے لئے کیا کیا۔ امام صاحب نے جواب میں خداوند تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرنے والی ان دلیلوں کا تذکرہ کیا۔ جب آپ ایک دلیل پیش کرتے شیطان اسے فوراً رد کر دیتا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا حتیٰ کہ شیطان نے آپ کی تمام دلیلیں رد کر دیں۔ اپنی زندگی بھر کی کمائی کو یوں برباد ہوتے دیکھ کر امام صاحب کے جسم پر پسینہ اور آنکھوں میں آنسو آگئے ، لیکن اسی وقت آپ کے کانوں میں ایک غیب کی آواز آئی جس کو سن کر آپ مسکرا اٹھے اور صرف اتنا کہا کہ " میں نے خدا کو بے دلیل مانا ہے "

یہ واقعہ صرف روحانیت سے تعلق رکھتا ہے اور سائنس دانوں کی نظر میں ایک مذاق سے زیادہ نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام فخرالدین رازی کی آخری دلیل کو تاریخ میں جو مستقل حیثیت حاصل ہے وہ سائنس کے کسی نظریہ کو حاصل نہیں۔

سائنس ـــــ یعنی وہ علم جس کی بدولت ہم نے آس پاس کی چیزوں کا مطالعہ کر کے انہیں فلاحی کاموں کا ذریعہ بنایا، وہ علم جس نے کائنات کے سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھایا - وہ علم جس نے ایٹم کی بیش بہا طاقتوں کا راز فاش کیا جس کی بدولت انسان لاتعداد کارآمد اور بے شمار خطرناک ایجادات کا مالک بن بیٹھا ۔ وہ علم جس کی بدولت انسان کائنات کی تسخیر کر کے ، خلا کی سیر کر کے فضا میں بھی اپنی حکمرانی قائم کر چکا ہے اور وہ علم جس کی مدد سے ـــــ آج انسان خالق کائنات کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے آخر اس علم کی اپنی کیا حقیقت ہے اور یہ حقیقت کی تلاش میں کس حد تک کامیاب ہے -

سائنس دراصل اس علم کا نام ہے جس کے نظریات تجرباتی نتائج کی بنیاد پر رکھے جاتے ہیں۔ یعنی پہلے تجربات کئے جاتے ہیں اور مسلسل
ت سے جو یکساں نتائج ظاہر ہوتے ہیں انہیں کو ایک نظریہ کی شکل دے دی جاتی ہے مثال کے طور پر سائنسدانوں نے علم توالد و تناسل میں نظریہ
کیا ہے کہ اگر شادی کے وقت لڑکے اور لڑکی کی عمر ۲ سال سے کم ہو گی تو پہلا بچہ لڑکا ہو گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلا بچہ ہر صورت میں لڑکا ہی ہو گا
چونکہ مسلسل مشاہدہ میں یہ بات آچکی ہے کہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے لہٰذا اسے ایک نظریہ کی شکل دے دی گئی ہے جو کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا اور کسی
ت بھی رد کیا جا سکتا ہے معلوم یہ ہوا کہ سائنس کے تمام تر نظریات مشاہدوں کے محتاج ہوتے ہیں اگر کوئی چیز ہمارے مشاہدے میں نہیں تو ہم ہرگز اس
تعلق کوئی نظریہ نہیں قائم کر سکتے۔ مشاہدات دو طریقوں سے ممکن ہیں۔

(۱) DEDUCTIVE METHOD :- اس طریقہ میں پہلے سے کوئی چیز مان لی جاتی ہے اور اس کے بعد تحقیق کا کام شروع ہوتا ہے
ل کے طور پر یہ کہا جائے کہ ہر پولیس مین کے سر پر سرخ ٹوپی ہوتی ہے۔ یعنی پہلی چیز پولیس مین کا وجود ہوتا ہے اس کے بعد اگر اس کے سر پر
، ٹوپی ہے تو ہم اسے پولیس مین کہیں گے۔ برخلاف اس کے اگر ہر شخص لال ٹوپی لگالے تو سب کو پولیس مین صرف لال ٹوپی کی بناء پر نہیں کہا جا
تا۔ اس طریقہ میں غلطی کا امکان بالکل نہیں ہوتا کیونکہ اصل چیز بلا کسی تحقیق کے پہلے ہی فرض کر لی جاتی ہے۔

(۲) INDUCTIVE METHOD :- اس میں مشاہدات کے بعد کسی چیز کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل سائنسی طریقہ ہے جس کی تحقیق صرف
ہاتی وسائل یعنی احساس خمسہ تک محدود ہوتی ہے۔ مثلاً ہم نے یہ مشاہدہ کیا کہ مچھر سے ملیریا ہوتا ہے۔ اب اگر ملیریا کسی اور سبب سے ہو جائے تو بھی ہم
ہیں گے کہ یہ مچھر سے ہوا ہے اس طرح اگر کہہ دیا جائے کہ پولیس مین کے سر پر لال ٹوپی ہوتی ہے تو ہم جس شخص کے سر پر لال ٹوپی دیکھیں گے اس کو
یس مین سمجھ بیٹھیں گے۔

اب دیکھیں کہ سائنس کس طرح حقیقت کی تلاش کرتی ہے جیسا کہ اوپر بھی ذکر ہو چکا کہ سائنس چونکہ صرف مشاہدات کا نام ہے اس بناء پر اس
تمام نظریات احساس خمسہ تک محدود ہوتے ہیں اور جس جگہ احساس خمسہ جواب دے دیتے ہیں وہاں اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے جہاں تک کسی چیز
حقیقت معلوم کرنے کا تعلق ہے اس کا انحصار تین چیزوں پر ہوتا ہے۔

۱:- احساس خمسہ
۲:- روشنی یا ماحول
۳:- چیز کی ماہیت

فرض کرو میں جس قلم سے لکھ رہا ہوں اس کا رنگ ہرا ہے لیکن کیا یہ واقعی ہرا ہے یا صرف مجھے نظر آرہا ہے یہی قلم جب میں ایک ایسے
ی کو دکھاتا ہوں جس کی آنکھیں COLOUR BLIND ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو سفید ہے پھر اسی قلم کو جب میں بنفشی (ULTRA VIOLET)
اعوں کے نیچے رکھ کر دیکھتا ہوں تو یہ بنفشی نظر آتا ہے پھر اس قلم کو ایک کیمیا دان کے پاس لے جا کر اس سے اس کا رنگ دریافت کرتا ہوں تو وہ کہتے
، کہ دنیا میں کسی چیز کا کوئی رنگ نہیں یہ تو دراصل اس شے کی ماہیت ہوتی ہے جس میں خاص قسم کے سالمات اپنی مخصوص خصوصیات کی بناء پر ایک
ت جذب کرتے ہیں اور باقی منعکس کر دیتے ہیں۔ لہٰذا صرف اس قسم کا ہی نہیں دنیا میں کسی چیز کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حقیقی معنوں میں قلم کس رنگ کا ہے۔ کیا COLOUR BLIND آنکھوں والے آدمی کی آنکھ خراب
، اس لئے وہ دھوکہ کھا رہا ہے؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ میری آنکھیں خود دھوکہ کھا رہی ہوں، یہ آدمی اقلیت کے گروہ سے تعلق رکھتا ہو اور میں

صرف اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اپنا نظریہ منوالوں ۔ اگر وہ اکثریت میں ہوتا تو یقیناً ہماری آنکھوں کو خراب کہتا۔ کیمیا دان کے قول کو بھی نہیں جھٹلایا جاسکتا کیونکہ وہ اپنے مشاہدہ کے مطابق بالکل صحیح کہہ رہا ہے ۔ اندازہ کیجئے کہ احساس خمسہ روشنی اور ماہیت کے فرق نے فلاسفی

دوسری مثال لیجئے ۔ یہ میز جس پر میں لکھ رہا ہوں شیشم کی بنی ہوئی ہے ۔ چاروں طرف سے برابر ۔ سطح مستوی اور چمکدار ہے اور میں یہی سمجھتا ہوں کہ ایک سادہ وجود کی طرح ہر جگہ سے برابر ہے اور اس کی پالش میں چمک ہے ۔ میں ایک آرٹسٹ سے اس میز کی تصویر بنانے کو کہتا ہوں وہ اس کو ایک خاص زاویہ سے دیکھتا ہے اس طرح کہ وہ جو تصویر بناتا ہے وہ ٹیڑھی ہوتی ہے ۔ میں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ اس کی سطح ہر جگہ سے برابر ہے ۔ ایک سائنسدان اس کی سطح کو جب خوردبین سے دیکھتا ہے تو اس کی سطح ایک پہاڑی بنجر علاقہ کی سی نظر آتی ہے جس میں بے شمار نشیب و فراز ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں میز کی کیا پوزیشن ہے اس کا کسی کو کچھ علم نہیں ۔

احساس خمسہ کی تفریق میں کس قدر تضاد ہے باوجودیکہ ہر انسان ہر جگہ اپنے مشاہدہ کے مطابق صحیح خیال ظاہر کر رہا ہے لیکن بات صرف یہ ہے کہ اسے خود بھی حقیقت کا علم نہیں ۔ وہ جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے APPEARANCE ہوتا ہے اور اس کو وہ حقیقت مانتا ہے ورنہ کسی شئے کے پس پردہ جو حقیقت پوشیدہ ہوتی اس کا علم کسی کو بھی نہیں ۔

یہ ہے وہ ناقص مشاہدہ جس کی بنیاد پر ہم حقیقت کو تلاش کرنے اور خدا کو ثابت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جب کہ ہمارے کسی مشاہدہ میں ذرہ برابر بھی (STABILITY) نہیں ہوتی ۔

سائنس کے نظریات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دائرہ ہے جس کے مرکز میں سچائی ہے اس کے آس پاس مختلف مورچوں پر بے شمار تیر انداز جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں تیر پھینک رہے ہیں ہر تیر انداز کا خیال ہے کہ اس کا تیر ٹھیک نشانہ پر جا رہا ہے لیکن کسی کو علم نہیں ہوتا کہ کس کا تیر نشانہ پر ہے اس کا علم ہو بھی نہیں سکتا اس وقت تک کہ جب کہ ان کی آنکھوں سے پٹی کھل نہ جائے ۔

مرکزی سچائی
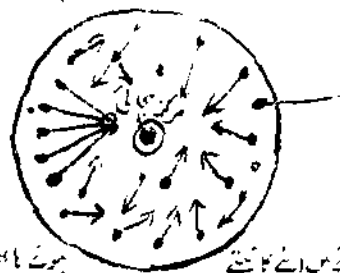
تیر اندازوں کا مورچہ

ایسی صورت میں تمام تیر انداز آگے بڑھتے ہیں اپنے ناپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہیں بالآخر ایک ایسی جگہ پاتے ہیں جہاں تیر ایک روم سے ... گئے ... کہ وہ سچائی مان لیتے ہیں اور اس طرح سچائی سے کچھ قریب تر ہو جاتے ہیں ۔ لیکن کوئی شخص حقیقت تک پہونچ کر بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے سچائی کو پا لیا کیوں کہ اس کے پاس بظاہر اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی ۔

سچائی کو تلاش کرنے میں پیش پیش ایک طبقہ ماہرین حیاتیات کا بھی آتا ہے یہ بے چارے بھی اپنی عقل ، سائنس اور مشاہدات کی بنا پر خدا کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ کسی بھی طبقہ کے جاندار کے جسم میں لاتعداد اکائی خلیات ہوتے ہیں اور ہر خلیہ میں ایک مخصوص تعداد میں (CHROMOSOMES) پائے جاتے ہیں ان کی تعداد ہر جاندار میں مخصوص ہوتی ہے اور جانداروں میں مختلف اعمال کی جو صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور جو کچھ تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں وہ دراصل کروموسوم کی تعداد کی تبدیلی ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر انسانی جسم کے خلیہ میں ۴۶ کروموسوم ہوتے ہیں جب کہ بندر کے خلیہ میں اس کی تعداد ۴۸ ہوتی ہے ۔ کروموسوم کی تعداد میں زیادہ فرق نہ ہونے کی وجہ سے آدمی اور بندر کو اعتبار سے ایک دوسرے

سے مماثلت رکھتے ہیں۔ بہت سی بیماریاں جو صرف آدمیوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں، بندروں میں بھی انہیں علامات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ بندر چائے اور کافی انسان ہی کی طرح پیتے ہیں، سگریٹ بھی اتنی ہی شوق سے پیتے ہیں۔ بندروں میں جب EVOLUTION بڑھتا جائے گا کروموسوم کی تعداد کم ہوتی جائیگی اسی بنا پر جب اس کے کروموسوم REDUCE ہو کر ۴۶ ہو جاتے ہیں تو وہ انسان کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن یہ معمولی تبدیلی نہیں بلکہ اس کے لئے لاکھوں اور کروڑوں سال کا عرصہ درکار ہوگا یہ تو ان ماہرین کا نظریہ ہے جو ایک ایسی چیز کے مشاہدہ پر کمر باندھتے جس کے مشاہدہ کے لئے کسی ایک نسل کی تمام عمر بھی کافی نہیں۔ پھر بھی ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس میں کہاں تک حقیقت ہے۔

وہ ماہرین جنہوں نے بندر میں ۴۸ کروموسوم معلوم کئے ہیں ان کے کہنے کے مطابق اس کی کمی یا زیادتی سے جنس میں تبدیلی واقع ہو جائے گی۔
انہیں کے مشاہدہ کے مطابق یہ حوالہ دے رہا ہوں کہ صرف بندر میں ہی ۴۸ کروموسوم نہیں ہوتے بلکہ

PLATY FISH	میں بھی	۴۸ کروموسوم ہوتے ہیں
PLUM	میں بھی	۴۸ کروموسوم ہوتے ہیں
تمباکو کا پودا	میں بھی	۴۸ کروموسوم ہوتے ہیں
آلو کے پودے	میں بھی	۴۸ کروموسوم ہوتے ہیں

یعنی کروموسوم کی تعداد برابر ہونے کی صورت میں بھی ان میں کتنا فرق ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام تعداد برابر ہے تو یہ تمباکو اور آلو کے پودے بندر ہی کیوں نہ ہوگئے یا تمام بندر PLATYFISH اور PLUM ہی کیوں نہ بن گئے۔ یہاں آکر ان کی اپنی تحقیق ہی اس نظریہ کا گلا گھونٹ دیتی ہے اور خدا کو ثابت کرنے کا کام ناتمام حالت میں رہ جاتا ہے۔

اس طرح خدا کے وجود کو سائنس سے ثابت کرنے کے لئے سائنس والوں اور مفکرین نے بہت کچھ کاوشیں کیں لیکن ان کے نظریات کوئی مستقل وجود برقرار نہ رکھ سکے بالآخر اس تحقیق پر کام کرنے والے زیادہ تر سائنس دانوں نے یہ نظریہ دے دیا کہ سائنس میں خود سچائی نہیں ہے اور مشاہدات میں تضاد کے سبب یہ حقیقت کو معلوم کرنے میں ناکام ہے اور چونکہ انسان کے اندر وہ تمام عناصر جو کسی چیز کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے ضروری ہیں مستقل طور پر موجود نہیں ہیں اس بنا پر سائنس نہ تو خدا کو تلاش کر سکتی ہے اور نہ اسے ثابت کر سکتی ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ انسان کا مقام قدرت کے اس بحر ذخار میں اس قدر حقیر ہے کہ وہ سچائی تو کجا اپنے مقام کو بھی پہچاننے میں ناکام ہے دراصل انسان ایک غار میں پرورش پا رہا ہے غار کا دروازہ بند ہے اور روشنی غار کے باہر سے آ رہی ہے جب انسان اس غار میں رہ کر اپنی حقیقت کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے صرف دیواروں پر ایک دوسرے کے سائے نظر آتے ہیں جب وہ حقیقت کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے تو اپنے غار کے دروازے بند پاتا ہے پھر قیاس آرائیاں شروع ہوتی ہیں کہ یہ روشنی غار سے باہر کسی منبع نور سے آ رہی ہیں کوئی کہتا ہے کہ باہر کچھ نہیں بلکہ غار کے منہ پر کچھ چمکتے ہوئے ذرات جو نورانی شعاعیں خارج کر رہے ہیں۔ غرضیکہ بے حقیقت قیاس آرائیاں جن کا کوئی مستقل وجود نہیں بالکل یہی حال آج کی سائنس کا ہے جو علم خود ادھورا ہے ایک مکمل وجود تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ انسان جو خود اندھیرے میں ہے اور روشنی کے وجود پر قیاس آرائیاں کر رہا ہے اس کے مستقبل میں مایوسی اور ناکامی کے سوا کیا ہو سکتا ہے ؎

نہ تجھے دماغ نگاہ ہے نہ کسی کو تاب جمال ہے
انہیں کس طرح سے دکھاؤں میں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا نہیں

خدا کے وجود کو اگر ماننا اور ثابت کرنا ہے تو اس کے لئے سادہ طریقہ یہی ہے کہ مادی علوم کو ایک طرف رکھ دیں اور مذہبی علوم کو ایک طرف رکھ دیں

مذہب کے مشاہدہ میں DEDUCTIVE METHOD استعمال کیا جائے یعنی پہلے ہم خدا کو بے چون وچرا مان لیں اس کے بعد اس کے احکام کو تسلیم کریں لیکن اگر ہر صورت میں عقل سے ثابت ہی کرنا ہے تو اس کے دلائل کے لئے تاریخ کے اوراق کو دیکھیں اور انسان کی حقیقت سمجھیں۔ تاریخ کو لوگ عموماً ماضی کا مردہ کہتے ہیں جس کا مطلب یہ کہ تاریخ حقیقت سے دور ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے تاریخ ماضی کے وہ واقعات ہوتے ہیں جن کا مقصد آئندہ زندگی کے لئے سبق حاصل کرنا ہوتا ہے مثلاً اگر آج شہر سعود پر ایک حادثہ ہوتا ہے جس سے ایک آدمی بس کے نیچے آکر مر جاتا ہے۔ دوسرے دن اخبار اس خبر کی تفصیلات بتاتے ہیں کہ یہ حادثہ کیوں ہوا اور غلطی کس کی تھی۔ اس کا صرف یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہم خبر کی سنسنی سے لطف اندوز ہوں بلکہ آئندہ ہم ایسی غلطی نہ کریں جس طرح کہ اس آدمی نے کی۔ تاریخ کی کتابوں کا مقصد بھی صرف پڑھنا نہیں بلکہ سبق حاصل کرنا ہوتا ہے۔

دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اکرام آئے۔ ان کے زمانے میں بھی خدا کو ثابت کرنے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا حضرت صالح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو بتایا کہ تمہارا مالک اور خالق خدا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے خدا کو اس وقت مانیں گے جب تم اس سامنے والے پتھر میں سے ایک اونٹنی برآمد کر دو اور وہ بھی ایسی جو نکلتے ہی ایک بچہ بھی جنے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے خدا کے حضور دعا کی اور پھر جب آپ کا یہ معجزہ پورا ہوا تو لوگوں کو خدا کا یقین آیا۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی کہا تھا کہ ہم ایسے خدا کی عبادت نہیں کریں گے جو نظر بھی نہ آتا ہو۔ لہٰذا خدا سے کہو کہ وہ ہمیں اپنا جلوہ دکھائے، آپ نے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے بالآخر انہوں نے خدا سے درخواست کی اور پھر اس کے حکم کے مطابق آپ بنی اسرائیل کا ایک جم غفیر لے کر کوہ طور پر پہونچے اور پھر جب خدا نے نور کی جھلک دکھائی تو موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو چکے تھے۔ آپ کے ساتھی فنا ہو گئے اور کوہ طور جل کر سرمہ بن گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو بیت اللہ شریف خدا کی عبادت کے لئے تعمیر کیا اور جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا لوگوں نے اس کو تباہ کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک باقاعدہ کافر نے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی۔ خدا نے کعبہ کی حفاظت کے لئے جو طریقہ اختیار کیا اس کا پورا قصہ قرآن میں سورہ فیل میں موجود ہے اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کو اس سے قبل کہ وہ کعبہ کو ہاتھ لگاتے اپنی حکمت سے ابابیلوں کے ذریعے ان کو تباہ کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عرب کے جاہلوں نے وجود باری تعالیٰ کے دلائل طلب کئے اس کے لئے آپ کے متعدد معجزات مشہور ہیں جس میں سب سے زیادہ اہم معجزہ شق القمر ہے جب کہ کفار نے کہا کہ اگر آپ چاند کے دو ٹکڑے کر دیں تو ہم آپ کے خدا کو مان لیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی کا اشارہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاند دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ایک مشرق کی جانب چلا گیا اور دوسرا مغرب کی جانب قرآن میں سورہ قمر میں اس کا ذکر موجود ہے (اقتربت الساعۃ وانشق القمر وان یروا آیۃ یعرضوا ویقولوا سحر

(قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا۔ اگر کافر کوئی بھی نشانی دیکھیں تو اس سے انکار ہی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے)

اس طرح قرآن کا معجزہ خداوند تعالیٰ کے وجود کی ایک روشن دلیل ہے۔ خدا کا دعویٰ ہے کہ اس کی حفاظت وہ خود کرے گا اور قیامت تک کوئی اس میں ترمیم نہ کر سکے گا۔ دنیا میں آج بڑے بڑے دماغ ہیں لیکن وہ خدا کی ہر شے کو جھٹلا تو سکتے ہیں لیکن ایک ایسی آیت بنا کر لا نہیں سکتے جو کلام خداوندی کی مانند ہو۔ انہوں نے قرآن میں ترمیم کی بھی کوشش کی لیکن آج تک ایک زبر زیر تک کو نہ مٹا سکے۔ اگر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اس

ت کرنے والی کوئی بڑی طاقت ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہی خدا ہے۔ اسی نے آپ کو پیدا کیا وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔

یہ صبح کا طلوع اور شام کا غروب، یہ بدلتے ہوئے موسم، یہ بادل، یہ ہوائیں یہ قوس قزح یہ انسان اور پھر اس کے محکم ارادے جو ٹوٹتے یہ سب اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں! فعل سے فاعل کا، نقش سے نقاش کا، مخلوق سے خالق کا، صنعت سے صانع کا، فطرت سے فاطر کا اور عبد کا، پتہ ملتا ہے! پھر خدا کے رسولوں اور نبیوں کی پاک زندگیاں، جنہوں نے کبھی کوئی غلط بات زبان سے نہیں کہی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان سبھی نے معاذ اللہ اس بات پر آپس میں سمجھوتا اور ایکا کر لیا ہو کہ ہم خدا کے وجود کے بارے میں لوگوں کو دھوکا دیں گے! ایسا نہیں ہو سکتا! نبیوں اور رسولوں نے جو کچھ کہا وہی سچ ہے!

خدا تھا، خدا ہے، خدا ہمیشہ رہے گا، یہی وہ حقیقت الحقائق ہے جس پر ایمان لائے بغیر انسان کی فکر بلوغ کو نہیں پہنچی!

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے
خدا کیا ہے خدا ہے اور کیا ہے (اکبر الٰہ آبادی)

"اسکول کے ہیڈ ماسٹر لالہ غریب چند میری تباہ حالی پر بہت متاسف ہوئے، اسکول کی فیس معاف کر دی، کبھی کبھی کپڑوں کے عطیہ کا بھی وعدہ فرمایا، اسکول آبائی گاؤں کے سات میل کے فاصلہ پر تھا، ایک کم سن اور فاقہ زدہ بچے کا روزانہ پیدل آنا جانا ناممکن تھا، اسکول کی کوئی عمارت نہ تھی، درختوں کے پتے چھت کا کام دیتے تھے . . . . . . :

. . . . . وہ ساعت مجھے مرتے دم تک نہ بھولے گی، سب زخم تازہ ہوگئے، جیب میں صرف دو پیسے باقی تھے، ایک پیسے کے چنے اور ایک پیسے کا گڑ کھا کر کولھو کے بیل کی طرح پھر اُسی راہ پر چل دیا۔"

رتن پنڈوری کی ملازمت کا آغاز اسکول کی چپراس گیری سے ہوا پھر وہ پرائمری اسکول میں ٹیچر ہو گئے اس کے بعد انہوں نے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے، پروفیسر شاداں بلگرامی نے اُن کی دلدہی اور معاونت کی، یہاں تک کہ سری گوبند پور ہائی اسکول میں مدرس فارسی کے عہدے پر اُن کا تقرر ہو گیا۔

رتن پنڈوری کو حضرت دلی شاہ جہاں پوری مرحوم سے شرفِ تلمذ حاصل ہے اور حضرت دلی کی علالت کے زمانے میں انہوں نے جناب بھورام جوشش ملسیانی سے استفادہ کیا انہوں نے لکھا ہے :-

"۱۹۳۴ء میں بزم ادب لاہور کے زیر اہتمام علامہ تاجور نجیب آبادی کی صدارت میں جلسہ ہوا جس میں خاکسار کو نباض سخن، ممتاز الشعراء کے خطابات سے نوازا گیا۔"

"۱۹۵۰ء میں بزم ادب جالس (یو۔ پی) کی طرف سے لسان الہند اور راس الادباء کے خطابات عطا ہوئے"

جناب رتن پنڈوری متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور انہوں نے اپنے شاگردوں کی جو نام بنام فہرست دی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کئی درجن شاگردوں کے استاد ہیں۔ رتن صاحب نے شادی نہیں کی ان دنوں سری ہرگوبند پور کے ایک غیر آباد مندر میں سادھوؤں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں! ایک طرف بیاس کا کنارہ اور مندر کا ماحول، دوسری طرف اُن کو نعت رسول لکھنے کی بھی سعادت میسر آتی ہے :-

شافع اگر حضور رسالت مآب ہوں
پھر کیوں نہ فیض عام ہو رب کریم کا
بحرِ عدن میں لاکھ ہوں لولوئے شاہوار
کچھ رنگ روپ اور ہے دُرِ یتیم کا
کیوں کر بیاں ہو مدحتِ خیر البشر رتن
ہے تنگ قافیہ مری طبعِ سلیم کا

رتن پنڈوری کے کلام میں سادگی کے ساتھ سنجیدگی ملتی ہے، سیدھی سچی باتیں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں اور شوخ و رنگین نہیں سنجیدہ اور متین واقع ہوئے ہیں۔ یہی چیز اُن کی شاعری میں جھلکتی ہے، فرماتے ہیں :-

بڑھا دی زندگی کی قدر و قیمت موت نے ورنہ | بغیر اس کے بہت بے لطف اپنی زندگی ہوتی
دل تو یوں ہی ادا میں ہاتھ سے جاتا رہا | جان کی بازی لگے ہاتھوں لگا کر دیکھ لوں

ہستی و مرگ میں کچھ فرق نہ دیکھا میں نے — اپنے ہی گھر سے چلا اپنے ہی گھر تک پہونچا
موجوں نے ہاتھ پاؤں تو مارے مرے لئے — تقدیر نے مگر لبِ ساحل ڈبو دیا
دنیا ملی تو ہاتھ سے عقبیٰ نکل گئی — اک مشتِ خاک کے لئے گوہر کو کھو دیا
اب جو اقرار بھی ہو تو کیا فائدہ — زندگی تھی مری تیرے انکار تک
عقل نے جال پھیلا دئے اے جنوں! — اب ہے دشمن ترا پھول سے خار تک
کیا مری حسرتِ دیدار بھی رسوا ہوگی — اس نے بھیجا ہے لفافہ تو کھلا بھیجا ہے
بند کر لیتا ہوں جب آنکھیں نظر آتے ہیں وہ — ہے یہی وہ خواب جس میں شان بیداری بھی ہے
ہم تو چلتے ہیں زمانے کی ہوا کے ساتھ ساتھ — دوستی ساقی سے واعظ سے شناسائی بھی ہے
کیا مری خشک لبی یوں ہی ڈبوئے گی مجھے — کشت اُمید پہ برسوں سے نہ برسا پانی
منزل پہ جا کے غور سے دیکھا تو یہ کھلا — پہلے تھا جس مقام پہ اب تک وہیں ہوں میں
بعد مرنے کے بھی ہے روزِ جزا کا کھٹکا — غم ہستی سے کہاں چھوٹ کے جاتے کوئی
زندگی کیا ہے چلنا سفر میں — موت کیا ہے پلٹنا سفر سے
لو سنو وہ بھی تجاہل سے یہ فرماتے ہیں — نظر انداز ہوا کرتی ہیں آہیں کیوں کر
زباں کھلی نہ کبھی شرحِ داستاں کے لئے — خموشیاں ہی مری کم نہیں بیاں کے لئے
بادلوں نے باندھ رکھی ہے ہوا برسات کی — آج اے ساقی کوئی تو چیز لا برسات کی

دوسرا رخ :

کہاں تک اے دلِ مضطر یہ شغلِ گریہ پیہم — جگر پارے بہے جاتے ہیں خونیں آبشاروں میں (ص ۲۵)

ہیں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ — یہ کہ آنکھوں سے لہو کے آبشار جاری ہیں اور ان میں جگر کے ٹکڑے ہیں کہ بے تحاشا بہے جاتے ہیں۔

کیف کے دریا سے بیڑا مے کشوں کا پار ہے — رہ گئی ہے آج ساقی تیرے پیمانے کی بات (ص ۳۲)

ے کا دریا پھر اُس سے میکشوں کے بیڑے کا پار ہونا . . . تکلف ہی تکلف ! کیف کے دریا میں میخوار ڈوب جاتے تو ایں ہو جاتے کہ پیمانے کی بات بگڑ جاتی۔ پھر کیف میں ڈوبنا تو میکشوں کی عین تمنا ہوا کرتی ہے۔

اتنی ہی سرگذشت ہے باغِ حیات کی — غنچے نے مسکرا دیا شبنم نے رو دیا (ص ۳۸)

مسکرا دیا اور شبنم رو دی یا رو پڑی — یہ ہے صحیح زبان !

بارِ آنسوؤں کا آیا ہوں لے کر میں آپ تک — سرمایہ تھا جو پاس حضوری میں ڈھو دیا

کہنا یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ تھا آنسوؤں کا سرمایہ تھا، وہ میں نے سب کا سب محبوب کے حضور حاضر کر دیا مگر اس خیال کو ادا کا انداز . . . ؟! " ڈھو دیا " نے رہی سہی شعریت کو غارت کر دیا۔

دلبری آپ کی ہم کو تسلیم ہے — لیکن اس میں نہیں بوئے ایثار تک (ص ۴۱)

محبوب کے طرز دلبری سے "ایثار" کی توقع رکھنا ہی توقع موہوم ہے، پھر اس کا شکوہ کیوں! ردیف (تک) اس شعر میں سب سے زیادہ کھٹکتی ہے!

گو لاکھ آرزوئیں دلِ ناتواں میں ہیں — تقدیر سو رہی ہو تو انسان کیا کرے (ص ۴۲)

مصرعہ اولیٰ بھی اگر مصرعہ ثانی کے جوڑ کا ہوتا تو اچھا خاصہ شعر وجود میں آجاتا۔

کلیجے کا کلیجہ جب امنڈ آتا ہے آنکھوں میں — تو ہر اک اشک کو لختِ جگر کہنا ہی پڑتا ہے (ص ۵۴)

یہ شعر قدامت و فرسودگی کا ایک نمونہ ہے۔

حسن کی معصومیت میں اک خطا کاری بھی ہے — اس کی شرمیلی ادا کے ساتھ عیاری بھی ہے (ص ۵۵)

پختہ مشق شاعروں کو ایسے شعر زیب نہیں دیتے۔

دزدیٔ دل کا راز اُن کی نظر سے پوچھ — یہ بات اپنے گھر کی ہے اپنے ہی گھر سے پوچھ (ص ۷۶)

"دزدیٔ دل" اردو زبان و ادب میں مروج نہیں ہے۔

جب سے سرمایہ ادراک لٹایا ہم نے — بے نشاں کا بھی نشاں سامنے پایا ہم نے (ص ۸۸)

شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُس کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل سکے۔

رتن پنڈوری کی نظمیں اور رباعیاں بھی اُن کے غزلوں کا آہنگ رکھتی ہیں، اس دور میں جب کہ زبان کی نزاکتوں سے شعراء اور نثر نگار بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں، رتن صاحب کے ایسے اشعار:-

اُف یہ بجھو لپٹے اور گھبرا اتنا
سخت حیرت ہے کہ کس برتے پہ تتا پانی

اُردو زبان کی نزاکت و خصوصیت کا حسین مظہر ہیں۔

ہر قسم کا سوتی اور اُونی کپڑا کورا اور دُھلا لٹھا
ہر قسم کا
دھاگہ
باوانی
تیار ہوتا ہے
وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
منگھوپیر روڈ
کراچی
کا تیار شدہ کپڑا
باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے
پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی آپکا قومی فریضہ ہے
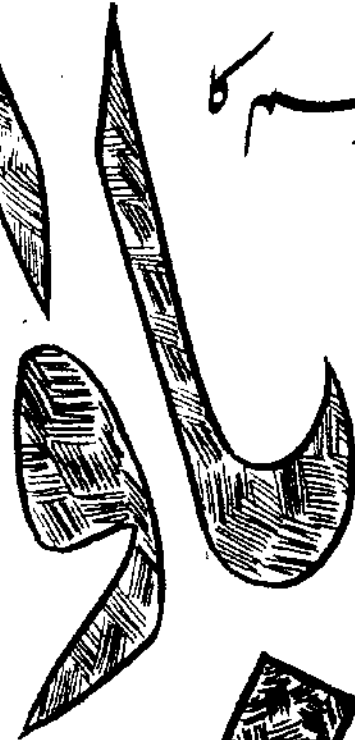
قوسِ قزح

عاصی کرنالی :-

کتنے سورج ہیں فلک پر جلوہ گر کوئی نہیں
جیسے اس شامِ مسلسل کی سحر کوئی نہیں

ایک تیشہ ایک کوہِ بے ستوں، اک کوہکن
اور دنیا میں حیاتِ معتبر کوئی نہیں،

اب مسافر کی بصیرت پہ ہے سارا انحصار
منزلیں چاروں طرف ہیں رہگزر کوئی نہیں

یہ تو اک موجِ ہوا سے ہِل گئی زنجیرِ در
اے دلِ درد آشنا اے چشمِ تر کوئی نہیں

کتنا احساں ہے کہ لبریزِ تجلی ہے نظر
کتنی شوخی ہے کہ تا حدِ نظر کوئی نہیں

تیغ چلتی ہے مگر کوئی نہیں تیغ آزما
ظلم ہوتا ہے مگر بیدادگر کوئی نہیں

کب اٹھائے لطفِ فردا، کب لگائے دل نو ر...
غم نہ دل میں ہے جس کا چارہ گر کوئی نہیں

ہے یقیں میرے آنگن میں دبے قدموں کی چاپ
در... سے دل کیوں دھڑکتا ہے اگر کوئی نہیں

کس سے ہوں ہم بدگماں کس ... ... ہم بدگماں
معتبر کوئی نہیں، نامعتبر کوئی نہیں

جس ... ... کوئی جیسے کہ بچھا دے فرشِ گل
جادہ ہستی میں ایسی رہگزر کوئی نہیں

عرفان چشتی :-

... کا جیسے بنا لیں یا صورت شہزادوں کی
دور سے پہچانی جاتی ہے شکل ترے بربادوں کی

... دل پر چھنے لگی ہے گردِ ماہ و سال تو کیا
ذہن میں ہے محفوظ ابھی تک صورت ان کی یادوں کی

اب بھی ترے کوچے میں ہوائیں خاک اڑاتی پھرتی ہیں
باقی ہے یہ ایک روایت اب بھی ترے بربادوں کی

سید خورشید افسر سوانی :-

ہم نشیں تجھ سے حالِ سفر کیا کہوں یا گھنی چھاؤں تھی یا کڑی دھوپ ہے
ان کے رخ پر کبھی زلف شکن در شکن گلفشاں سائے ہیں، ملگجی دھوپ ہے

افسر مرے ساتھ اب اُسے چلنا ہی پڑے گا
کتنے ہی بہانے غمِ ایام تراشے

شوق اثری :-

راہِ طلب میں جہاں روشنی نظر آئے
انہیں کا شہر انہیں کی گلی نظر آئے

یہ اک خیال کہ اپنا بنا لوں دنیا کو
یہ اک فریب کہ اپنا کوئی نظر آئے

نازش عمر :-

الاماں! راہوں میں بے پردہ خوبانِ حرم، جلکدوں میں جیسے ہو یا سنگِ مرمر کے صنم
تنگ دیں تنگ وطن تنگ سلف تنگ وجود، زینت بزم نہ رہ پر سعی نازد نعم
سرو قد، گلرخ، سمن بر، غنچہ لب، گلشن جمال
نازنیں، زہرہ جبیں، جادو نظر، آہو قدم

روحِ انتخاب

سیدنا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ بارگاہِ خداوندی میں

جب پردۂ شب گر چکا ہو اور پوری کائنات ایک گہرے سکوت میں غرق ہو، ستارے افقِ مغرب کی طرف بڑھ رہے ہوں تو اس وقت ذرا اپنے دل کو حاضر کیجئے اور اپنے رب کے حضور میں بیٹھ کر اس سے سرگوشیوں میں مصروف ہونا چاہئے۔ اپنی بے بسی، اپنی عاجزی کا استحضار کیجئے خدا کی برتری و عظمت کا تصور کیجئے۔ ایک طرف اس کی رحمت بے پایاں اور اس کی رحمت بے کراں کا یقین ہو تو دوسری طرف اپنے گناہوں کا اعتراف اور تہی دامنی کا احساس ہو، سب سے پہلے آپ استغفار کیجئے، اپنی کوتاہیوں پر ندامت کا اظہار کیجئے، پھر اپنی ناتوانی، اپنے عجز کا جہاں تک ہو سکے صدقِ دل سے اقرار کیجئے اور پورے تضرع و عاجزی کے ساتھ مانگئے اور قبولیت کی پوری امید رکھئے۔

ذیل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مناجات پڑھئے اور اس سے روشنی حاصل کیجئے۔

الٰہی! اگر میری زندگی میں بہت سی باتیں ایسی نہ ہوتیں جن سے میں ناآشنا ہوں تو میں اپنی لغزشوں کا شکوہ کیوں کر آپ سے کر سکتا اور اگر میں اپنی زیادتیوں کو نہ یاد کرتا تو میری آنکھوں سے آنسو کیوں رواں ہوتے خدایا تو میری لغزشوں کو قائم رکھنے والی چیزوں کو میرے بہنے والے آنسوؤں کے طفیل میں ختم کر دے ...... بارالٰہا! اگر تو محض اپنے فرمانبردار بندوں پر نظرِ رحمت ڈالے گا تو یہ تیرے خطاکار بندے کہاں جائیں گے اور اگر تو صرف نیکوکاروں کا کرم فرما ہوگا تو تیرے یہ گنہگار بندے کدھر کے ہوں گے، اور اگر محشر میں صرف اہلِ تقویٰ فوز و فلاح سے ہم کنار ہوں گے تو خطاکاروں کی فریاد رسی کہاں ہوگی۔

الٰہی! میرے گناہوں کے بار نے میری زبان کو گنگ کر دیا ہے اور میں ہر طرح کی عذر خواہی سے معذور ہوں اور اپنے گناہوں کے شکنجہ میں گرفتار اور اپنے اعمال کا مرہون ہوں، تیری رحمت و درود نازل ہو تیرے مقرب و محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تیری رحمتیں ہم گنہگاروں پر۔ اے اللہ اگرچہ میرے اعمال تیری اطاعت کے مقابل میں بالکل حقیر ہیں لیکن میری امیدیں تیرے عفو درگزر کے سامنے بہت بلند ہیں

الٰہی! میں تیرے حضور سے محروم و ناکام ہو کر کیسے لوٹ سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تو محض اپنے فضل و کرم سے میری رحم کی درخواست کو قبول فرمائے گا میں نے تیرے ساتھ حسنِ ظن رکھنے میں قنوطیوں کی مایوسی کو اپنے اوپر کبھی مسلط نہیں کیا۔ اس لئے میری امیدوں کو تو متحقق فرما دے الٰہی! میرا جرم بہت بڑا ہے اگرچہ گناہوں کے خوف سے میں متوحش ہوں لیکن تیرے لطف و کرم کے وعدوں سے میرا قلب منشرح ہے اگر تیرے حضور حاضر ہونے کی تیاری سے میں نے غفلت برتی تو تیری نعمتوں کی لذت نے مجھے اس پر متنبہ کیا۔ الٰہی! اگر تو نے اسلام کی راہ نہ دکھائی ہوتی تو بلاشبہ ہم گمراہ ہوتے اور اگر دعا کے لئے تو نے ہماری زبان نہ کھولی ہوتی تو ہم اس نعمت سے محروم رہتے اگر تو نے اپنی نعمتوں کی لذت سے آشنا نہ کیا ہوتا تو ہم اس کی قدر نہ کر سکتے اگر تیرے عذاب کی شدت ہم پر ظاہر نہ ہوئی ہوتی تو ہم اس سے پناہ نہ مانگتے۔ اے میرے اللہ اگرچہ ابرار و اولیاء کے اخلاق کا ساتھ میں نہ دے سکا لیکن تیری رحمت کے اعتماد نے تیرے بندوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اے میرے رب جس نفس کو تو نے ایمان کی تائید

ے عزت بخشی اس کو جہنم کے شعلوں میں تو کیوں کر ذلیل ہوتا دیکھ سکے گا۔ اے میرے پروردگار ہر شخص غم زدہ پریشان حال ہے اور وہ تیری ہی پناہ ڈھونڈتا ہے اور ہر مصیبت زدہ تجھی سے امید رکھتا ہے۔ الٰہی تیرے عبادت گذار بندوں نے ثواب کی امید میں اپنی حقیقت کو فراموش کردیا۔ گنہگاروں نے تیری رحمت ومغفرت کے دریائے بے پایاں کو دیکھ کر تجھ سے عفو وکرم کی امید قائم رکھی یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے تیرے باب رحمت پر خطا کاروں کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی۔ کوئی ان میں گریہ وزاری کرکے تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہ رہا ہے تو کوئی صرف سرد آہ بھر کر زبان حال سے تیری مغفرت کا طلبگار ہے۔

بار الٰہا! تو نے جنت کی حقیقت معلوم ہونے سے قبل ہم کو جنت کی درخواست کا جذبہ عطا فرمایا لیکن اب جب کہ اس حقیقت سے ہم کو آشنا کر دیا ہے اور ہم اس کی درخواست لے کر تیرے حضور میں آئے ہیں کیا تو اسے نامنظور کردے گا! تو بڑا صاحب کرم ہے اور تیرا ہر کام حمد وثنا کا باعث ہے۔ اے میرے اللہ! اگر میں تیرے نزدیک تیرے رحمتوں کا مستحق نہیں ہوں تو محض اپنے کرم سے ہم گنہگاروں کی مدد فرما، خدایا! میں تیری ذات پر مکمل اعتماد کرکے تیرے سامنے کھڑا ہوں تجھے اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو معاملہ چاہے کر، اور اپنی رحمت کو جس طرح چاہے مجھے عطا فرما۔

اے اللہ! میرا دل تیری توحید سے سرشار ہے، میری زبان کلمۂ حمد وشکر سے تر ہے، قرآن نے تیرے بے انتہا کرم کی نشاندہی کی ہے، میں کیوں کر تجھ سے رحم وکرم کی امید نہ رکھوں اور تیرے وعدوں کے پورے ہونے کی توقع ختم کردوں۔

الٰہی! میں جب وقت قبر کی تاریکیوں میں تنہا لٹا دیا جاؤں گا اور عزیزوں، دوستوں اہل واقارب سب ہی مجھ کو چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے، دشمنوں نے بھی اس وقت مجھ کو معاف کردیا ہوگا اور ہر شخص پر میری بے چارگی وبے بسی عیاں ہوچکی ہوگی۔ فرشتے کہہ رہے ہوں گے کہ بے چارے کو اس کے عزیز واقارب چھوڑ کر چلے گئے اور اس کے اہل وعیال نے بھی اس سے بے رخی برت لی اور جن سے اس کی امیدیں قائم تھیں وہ اس کو بے یار ومددگار چھوڑ گئے وہ اب ہمارے قریب آگیا ہے اور آخرت کا سفر شروع ہوچکا ہے کیا اس وقت بھی میں تیری رحمتوں کی امید نہ رکھوں، نہیں اے میرے پروردگار اس وقت تو میری دستگیری فرما اور میرے اہل وعیال سے بھی زیادہ میرے لئے مشفق ومہربان ہوجا کہ میں اس تاریکی میں بجز تیرے اور کس سے لو لگا سکتا ہوں۔ الٰہی! تو نے دنیا میں جب میرے عیوب کو چھپایا تو آخرت میں برسر عام تو مجھے رسوا نہ کرنا، الٰہی میری بے کسی کا مداوا تیرے ہی جود وکرم سے ممکن ہے اور میری آرزو تیرے ہی ہاتھوں پوری ہوسکتی ہے۔

اے اللہ میں اس چیز میں تیری توفیق کا طلبگار ہوں جو مجھ کو تجھ سے قریب کرسکے اور جو چیز تجھ سے قریب کرسکے اور جو چیز تجھ سے دوری کا باعث بنے اس سے پناہ مانگتا ہوں۔ الٰہی تمام باتوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور نفع بخش وہ ہے جس کی توفیق تو نے مجھے عطا کی اور اس کی رہنمائی کی۔

اے مسکینوں اور بے نواؤں پر رحم کرنے والے قبر میں میری وحشت کو دور فرما۔ اور میری تنہائی پر رحم کر۔ اے ظاہر وباطن کے جاننے والے اور دلوں کے بھید پر آگاہ ہونے والے، اے مصیبتوں اور آزمائشوں کو دور کرنے والے جب تو زندگی میں مجھ پر مہربان تھا تو قبر کے تنگ وتاریک گڑھے میں اپنی نظر وکرم سے مجھے محروم نہ فرما اور میرے مرنے کے بعد تو اپنے احسانات کے فیض کو ختم نہ کر۔ اے الہ العلمین مجھ پر تیرے احسانات بے حد حساب ہیں بس میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں اور تیری حمد وثنا بیان کرتا ہوں، میری دعاؤں کا مرکز تو ہی ہے میری تمناؤں اور امیدوں کا ملجا وماویٰ بجز تیرے کون ہوسکتا ہے۔

الٰہی! تو صاحب جلال ہے تو زندہ وپائندہ ہے تیرے ہی ہاتھ میں ساری کائنات کی باگ ڈور ہے اور تیری قدرت سب پر غالب ہے۔

(ترجمہ) — سعید الرحمٰن الاعظمی

ہماری نظر میں

تاریخ فقہ اردو از :- علامہ شیخ محمد خضری بک مترجم :- مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا حبیب احمد ہاشمی ، ضخامت ۴۰۰ صفحات (مجلد ، رنگین ، گرد پوش) قیمت :- نو روپے -

ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ ، کراچی ۱

کتاب کا پیش لفظ مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھا ہے ، اس میں وہ فرماتے ہیں :-

" علامہ محمد خضری بک مصر کے آخری دور میں ایک وسیع المطالعہ عالم گذرے ہیں ، تاریخ ان کا خاص موضوع رہا ہے اپنے طرز فکر اور اسلوب تحریر کے اعتبار سے اگر یوں کہا جائے کہ " مصر کے مولانا شبلی ہیں " تو میرے خیال میں یہ ان کا مکمل تعارف ہوگا ۔ ۔ ۔ !

زیر نظر کتاب میں دو تین مقام ایسے آئے ہیں ، جہاں احساس مرعوبیت کے تحت علامہ خضری نے جمہور امت سے اختلاف کیا ہے ، جہاد ، نسخ اور غلامی پر انہوں نے جہاں گفتگو کی ہے ، وہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل میں خود ان کا ذہن صاف نہیں ہے ۔ ۔ ۔ "

کتاب کے ۴۰ صفحوں کا ترجمہ مولانا محمد تقی نے اور بقیہ کتاب کا ترجمہ مولانا حبیب احمد ہاشمی نے کیا ہے ، ترجمہ خاصہ رواں ، شستہ اور عام فہم ہے ، کہیں کہیں البتہ کھٹک پیدا ہوتی مثلاً :-

" بجز اس تلچھٹ کے جو نہ پیاس کو بجھاتا ہے اور نہ بیماری کو شفا دیتا ہے " (ص ۳۵۴)

ہم میں بعض کی زبانوں سے تلچھٹ کو " مذکر " بھی سنا گیا ہے ، لیکن جمہور اہل زبان اسے " مونث " بولتے ہیں !

ولا تکونوا کالتی نقضت غزلہا من بعد قوۃ	تم اس عورت کے مشابہ مت بنو ، جس نے اپنا سوت کاتنے
انکاثا تتخذون	پیچھے بوٹی بوٹی کرکے نوچ ڈالا ۔ (ص ۸۰)

" انکاثا " کا ترجمہ " بوٹی بوٹی " غلط ہے اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ اس نے اپنا کرتہ بوٹی بوٹی کرکے پھاڑ ڈالا یا اپنی رسی کو بوٹی بوٹی کرکے توڑ دیا اس عبارت میں " قوۃ " کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے اس آیت کی زیادہ صحیح ترجمانی یوں ہو سکتی تھی ۔

" تم اس عورت جیسے نہ ہو جاؤ جس نے اپنا کاتا ہوا سوت محنت کرنے کے بعد (نوچ کر) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ، "

صفحہ ۸۰ کا ایک جملہ :-

" قرآن مجید نے جس امر کی طرف خاص توجہ دلائی ہے وہ عہدناموں اور اقراروں کی پابندی ہے "

اردو میں انکار کی جمع " انکارات " اور اقرار کی جمع " اقرارات " نہ کوئی بولتا ہے اور نہ لکھتا ہے اس جملہ کا آخری ٹکڑا اس طرح ہونا چاہیے تھا
" . . . . . وہ عہدناموں اور قول و قرار کی پابندی ہے "

صفحہ ۴۹ پر " لازواجک " کا ترجمہ اپنی بیبیوں کیا گیا ہے، جو محل نظر ہے " زوجہ " کو اردو میں " بی بی " نہیں " بیوی " کہتے ہیں، جب کوئی عورت کسی کے نکاح میں آتی ہے تو وہ اس کی بی بی نہیں " بیوی " ہوتی ہے ! شوہر کے مقابلہ میں " بی بی " نہیں " بیوی " بولا جاتا ہے !

کتابت کی غلطیوں میں سب سے فاحش غلطی یہ ہے کہ مشہور عالم حضرت ابوالزناد کا املا " ابوالزنا " (ص ۱۷۶ - ۱۷۷) کیا گیا ہے !

ص ۱۹۸ پر " قراء شیعہ " نظر آیا دراصل " قراء سبعہ " ہے۔

" غالباً سنت نے انہیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ رمضان کی راتوں میں بھی اپنی عورتوں سے جماع نہ کریں، پھر قرآن کریم نے ان سے اس سختی کو بھی ختم فرما دیا " (ص ۵۶)

فاضل مصنف نے " غالباً " لکھ کر جو بات کہی ہے وہ صحیح نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا قول اور فعل سننے اور پڑھنے میں نہیں آیا کہ حضور رمضان کی راتوں میں ازواج مطہرات سے دور رہا کرتے تھے !

" اللہ تعالیٰ نے صرف ماں بیٹی اور دو بہنوں کو بہ یک وقت نکاح میں لینے سے منع فرمایا ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے :—

واُحِلَّ لکم ما وراء ذٰلکم　　ان کے سوا سب عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں "

" اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا . . . . . " (ص ۷۴)

حالانکہ سورہ نساء میں واضح طور پر پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی . . . وغیرہ سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے !

فاضل مترجمین نے بعض اصطلاحوں کی ضروری تشریح بھی کر دی ہے، مثلاً متن میں لکھا ہے " حدیث سے ہماری مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریر ہے " تقریر " کیا ہے؟ اس کی شرح " ذیلی حاشیہ " میں ملے گی۔

" تقریر کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے کوئی کام کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی، مگر آپ نے کوئی نکیر نہیں کی "

قرآن کریم میں " اُحصرتم " آیا ہے، فٹ نوٹ میں اس کی مناسب شرح کر دی گئی ہے :—

" احصار کا مطلب یہ ہے کہ احرام باندھنے کے بعد کسی کو کوئی ایسا عذر پیش آجائے کہ وہ طواف وسعی اور وقوف عرفات پر قادر نہ رہے "

ترجمہ کا ایک نمونہ :—

" وہ (یعنی حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ) بنی اُمیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے، مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، مصر میں نشوونما پائی اور حضرت انسؓ، مالک اور اکثر تابعین سے علم حاصل کیا، امام، فقیہ، مجتہد، سنت کے جاننے والے، بڑی شان کے بزرگ، صاحب وثوق، صاحب دلیل، حافظ، اللہ تعالیٰ کے مطیع، خشوع کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف

رجوع کرنے والے تھے، عدل میں حضرت عمر بن الخطاب کے مشابہ تھے اور زہد میں حضرت حسن بصریؒ کے اور علم میں حضرت زہریؒ کے برابر تھے، حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ ہم ان کو سکھانے آئے تھے اور اس وقت تک ان کے پاس رہے کہ ہم خود اُن سے سیکھنے لگے، ۱۰۱ھ میں وفات پائی " (ص ۱۸۶)

کیونکہ یہ حکومت و سیاست کی تاریخ نہیں بلکہ فقہ کی تاریخ ہے اس لئے فاضل مصنف نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا تذکرہ انتہائی اختصار کے ساتھ کیا ہے مگر ان چند جملوں میں انہوں نے حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کی سیرت و کردار کا ست نکال کر رکھ دیا ہے۔

" تقلید " کے اس پہلو کی علامہ خضریؔ نے صحیح ترجمانی کی ہے کہ :-

" . . . لیکن اس دور میں ایسے مجتہدین ظاہر ہوتے کہ جمہور نے ان کو ائمہ تسلیم کیا، ان کے نقش قدم پر چلنے اور ان کی رایوں پر عمل کرنے لگے، حتیٰ کہ ان کی رایوں کو کتاب و سنت کے احکام قطعی کا درجہ دینے لگے، کہ کسی کو اُن سے تجاوز کرنا جائز نہ تھا . . . " (ص ۲۴۵)

" تقلید " کا یہ غلو اور جمود پسندیدہ نہیں ہے !

" تدوین مذاہب کا تیسرا سبب یہ ہے کہ جس مذہب کو مدونین قابل اعتماد مل گئے تھے، وہ تو کامیاب ہو گیا اور جمہور نے اس کو قبول کر لیا۔ دیکھو شافعیؒ کا قول کہ لیثؒ مالکؒ سے زیادہ فقیہ تھے مگر ان کے شاگرد ان کے مذہب کو قائم نہ رکھ سکے . . . "

اس سلسلہ میں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لینا ضروری تھا کہ وہ اجتہاد و فقہ کے عظیم المرتبت امام تھے مگر ان کے فقہی مذہب کی تدوین نہیں ہوتی اس لئے وہ گم نام ہو کر رہ گیا !

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر آج تک کے دور کے فقہ اسلامی کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو نہایت جامع اور مفصل ہے، پھر چاروں ائمہ (ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ) اور ان کے شاگردوں کے حالات درج کئے ہیں کہ انہوں نے علم فقہ کے باب میں کیا کارنامے انجام دئے !

" آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو نافع اور مقبول بنائیں " (ص ۸)

یہ اسلوب نگارش اور طرز خاص علماء دیوبند کی تحریروں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے از روئے تکریم و تعظیم جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں، مگر جب بھی اس قسم کی عبارت نگاہ سے گذری ہے ہم نے خاصی کھٹک بلکہ خلش محسوس کی ہے! اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال جب کہ اردو نثر نگاری عالم طفولیت میں تھی بعض علماء یوں لکھتے تھے :-

" اللہ صاحب یہ فرماتے ہیں "

مگر زبان ترقی کرتے کرتے جب معیاری بن گئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی نسبت سے یہ طرز تحریر متروک ہو گیا، اس زمانے میں " اللہ صاحب " کوئی کا دے یا بول دے تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے! اہل ادب، ارباب معنی اور شعراء اردو زبان و ادب میں غایت تکریم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے لئے واحد (تو، تیرا، وہ، اُس کا . . .) کا صیغہ استعمال کرتے ہیں یہی انداز فصیح ہے اور مقبول ہے! اردو شاعروں کی شاعری دیکھئے، قصیدہ ہو، غزل یا مثنوی اور رباعی ہو ہر صنف میں اللہ تعالیٰ کے لئے صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے، اس طرح :-

سہ الٰہی تو ہے وحدہٗ لاشریک　　بنایا ہے تو نے ہر اک شے کو ٹھیک[1]

سہ تیری ذات پاک ہے اے خدا تیری شان جل جلالہٗ

سہ تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

سہ بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے

سہ کون دمکاں کے مالک مالک ہے نام تیرا

سہ یہاں اللہ ہی اللہ ہے وہاں اللہ ہی اللہ ہے

سہ میں خدا کس کو بتاؤں جو خفا تو ہو جائے

شاذونادر ہی کسی شاعر نے اللہ تعالیٰ کے لئے "آپ" یا "تم" استعمال کیا ہوگا؟ شعراء زبان و بیان کی نزاکتوں اور تکریم و ادب کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں، وہ جس طرز یا اسلوب پر اتفاق کرلیں زبان میں وہ سند بن جاتا ہے شعراء کے علاوہ ادیبوں اور نثر نگاروں کی غالب اکثریت بلکہ یوں کہنا چاہئے سو فی صد اکثریت اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کے لئے صیغہ واحد بولتی اور لکھتی ہے ——— اس لئے ہم دیوبند سے وابستگی رکھنے والے نوجوان اہل قلم کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ اس طرز نگارش (اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمالیں، اللہ بگڑی بنا دیں اللہ تعالیٰ نبیوں پر وحی بھیجتے رہے ہیں . . . .) کو ترک کردیں اور اسلاف کی تقلید کے جوش میں اُس طرزِ نگارش پر اصرار نہ کریں جسے ذوق سلیم گوارا نہیں کرتا۔

یہ کتاب کوئی شک نہیں، اپنے موضوع پر اونچے درجہ کی کتاب ہے اس کے ترجمہ نے اُردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ہے اس کے مطالعہ سے نہ صرف طلبا بلکہ علماء کو توفیق ملے گی اور فقہی مسائل میں بصیرت پیدا ہوگی۔

حیاتِ امدادؒ

از:- پروفیسر محمد انوار الحسن انور۔ ضخامت ۷۷ اصفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ:- شعبہ تالیف و تصنیف مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ۵

اس کتاب میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۸۱۴ء وفات ۱۸۹۶ء) کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کا آغاز دارالعلوم دیوبند کے تعارف سے ہوتا ہے اس سلسلہ میں علامہ رشید رضا اور شیخ الاسلام فلپائن دیگر مشاہیر علماء اسلام کے ساتھ ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی سابق صدر حکومت ہند کی رائے بھی درج ہے، اس کتاب میں دیوبند کے نامور علماء کی تصانیف اور ان کی ادبی و علمی خدمات تذکرہ کیا گیا ہے کانگریس اور مسلم لیگ سے دیوبند کا کیا تعلق رہا ہے اس کی تفصیل بھی زیر تنقید کتاب میں ملتی ہے! پھر ان غلط عقائد کی تردید کی گئی ہے جن کو اہل بدعت دیوبند کو بدنام کرنے کے لئے دیوبندیوں سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ جتایا یا نی اہل قلم مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو متہم کرتے ہیں۔ کہ مولانا موصوف ختم نبوت کے قائل نہ تھے۔ اس کی تردید میں، حضرت مولانا محمد قاسم کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے :—

"بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے اس کو

---

[1] یہ شعر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

کافر سمجھتا ہوں (مناظرہ عجیبہ ص۱۰۳)

حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی فاضل مصنف نے نہ جانے کہاں کہاں سے تحقیق و تفحص کر کے فراہم کئے ہیں، حضرت حاجی صاحب کی اردو فارسی نثر و نظم، فارسی ادب اور فارسی شاعری پر تفصیل سے بحث کی ہے اُن کی غزل کے یہ شعر کتنے اچھے ہیں ——

رفتم چو بمکہ ہوسِ کوئے تو کردم | دیدم رُخِ کعبہ ہوسِ روئے تو کردم
محرابِ حرم گرچہ بہ پیش نظرم شد | من سجدہ ولے در خمِ ابروئے تو کردم
در سعی و طواف و بحطیم و بہ مقامے | ہر سمت تماشائے رخِ نیکوئے تو کردم

مکۂ معظمہ میں ہجرت کے بعد کیا حالات پیش آئے؟ اس کی تفصیل کتاب میں نہیں ملتی! کاش! کوئی دوسرا سیرت نگار اس کمی کو پورا کر سکے!

"حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے خود مثنوی مولانا روم سے پڑھی" (ص ۹۱)

اس قسم کے مکاشفات اور واردات کی کاش! کوئی علمی، دینی یا طبیعاتی یا روحانی توجیہ کوئی صاحب فرما دیتے۔

"حاجی صاحب کے درس میں مثنوی شریف ختم ہو گئی تو گیارہ گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھ کر نیاز کی گئی اور شربت بٹنا شروع ہوا...." (ص ۹۰)

بریلوی اعتقاد رکھنے والے بھی یہی کچھ کرتے ہیں؟ نذر و نیاز کا یہ طریقہ کیا مسنون اور ماثور ہے؟ اگر ہے تو ثبوت پیش کیا جائے، نہیں ہے تو پھر....؟

"....جب اس میں مشق ہو جائے تو اس کے بعد اپنی تلاوت کے متعلق خیال کرے کہ وہ بلند ذات خود ہی پڑھ رہی ہے اور خود ہی سُن رہی ہے" (ص ۱۶۸)

یہ حضرت حاجی صاحب کی کتاب "ضیاء القلوب" (فارسی) کا اردو ترجمہ ہے، قاری کا اپنی قرأت کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ "وہ خود نہیں پڑھ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ خود پڑھ رہا ہے" کس قدر وحشت انگیز تصور ہے، توحیدِ خالص اس نکتہ آفرینی کو گوارا نہیں کر سکتی۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے حالاتِ زندگی پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو اس قدر تفصیل کے ساتھ آئی ہے!

سفینہ چاہیئے از :- شاد عارفی، مرتب :- سلطان اشرف، ضخامت ۱۵۲ صفحات (مجلد، خوبصورت سرورق)
ملنے کا پتہ :- رام پور پبلشنگ سوسائٹی، بنگلہ آزاد خاں، رام پور (یو- پی - انڈیا)

یہ کتاب شاد عارفی کے کلام کا مجموعہ ہے، جس میں ان کی نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں! شاد عارفی کی زندگی ہی میں اس مجموعہ کی اشاعت کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں، مگر اس زمانے میں شاد صاحب کو شدید قسم کی بیماری نے آن گھیرا یہاں تک کہ ۸ر فروری ۱۹۶۴ء کو وفات پا گئے! فہرست کے بعد اس کتاب کا آغاز "روداد سفر" سے ہوا ہے جو سکریٹری صاحب رام پور پبلشنگ ہاؤس کی لکھی ہوئی ہے، سکریٹری صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں :——

"..... کوشش یہی کی گئی ہے کہ شاعر کے زیادہ سے زیادہ رنگِ سخن کی نمائندگی اس مجموعہ کے ذریعہ ہو جائے"۔

رام پور کے اس ادارہ نے شاد عارفی کے سوگ میں کوئی تعزیتی جلسہ نہیں کیا بلکہ اس کی بجائے شاعر کی قدر شناسی اور اس کی ذات سے محبت و عقیدت کا یہ عملی ثبوت پیش کیا کہ اُس کے مجموعہ کلام کو مرتب کر کے چھپوا دیا، اس ادارہ کے سکریٹری صاحب کے خلوص اور بے نفسی کا زندہ ثبوت

یہ ہے کہ پیش لفظ " درد و داد سفر " میں اپنا نام نہیں لکھا، ورنہ آج کے زمانے میں شعر و ادب کا زیادہ تر کاروبار نام و نمود ہی کے لئے ہو رہا ہے۔
جناب گوپال متل کا ایک مختصر سا مقالہ اس مجموعہ کی زینت ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

" شاد عارفی مجتہد بھی تھے اور مجاہد بھی انہوں نے شاعری میں ایک نیا اسلوب سخن ایجاد کیا "

ڈاکٹر عابدہ رضا بیدار نے اپنے مقالہ میں شاد عارفی کے فن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے :۔

" اور شاید یہ بھی اس کے بڑے پن کی ایک نشانی ہے کہ اس کی شخصیت اور شاعری میں کہیں دو رنگی نہیں "

آخری مضمون خود شاد عارفی کا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں تین صفحے لکھے ہیں، جس کی ہر سطر میں ان کی " خودی بیدار نظر آتی ہے! وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اردو شاعری میں نئی راہ نکالی ہے اور ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے، شاد عارفی کا کلام پڑھتے ہوئے ایک نئے " آہنگ " کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں ابھرتے انداز میں سماج کی عکاسی کی گئی ہے ان کی پہلی نظم " آپ کی تعریف " ہے اس کے دو بند کتنے جاندار ہیں ۔

پیر گلشن شاہ سے بیعت ہیں آپ
سر نگھتے ہیں پھول کھاتے کچھ نہیں — جھوٹ ہے پیتے پلاتے کچھ نہیں
خلوتوں میں " مرغ و ماہی " کے سوا — کر چکے ہیں ترک میوان و غذا!
بخشتی ہے آپ کی میٹھی نظر — بانجھ کو اولاد اور کنواری کو بر
بند کیجے منہ بڑے حضرت ہیں آپ
پیر گلشن شاہ سے بیعت ہیں آپ

(۵)

کیا انہیں بھی آپ پہچانے نہیں
بلبل فردوس کے سالے ہیں یہ — بات اتنی ہے ذرا کالے ہیں یہ
چھن چکی جب گیر آمد بند ہے — اب فقط افیون میں آنند ہے
پھل پھلاری بیچتے ہیں آج کل — بھوگتا ہے آدمی کرنی کا پھل
ہیں پریشاں حال دیوانے نہیں
کیا انہیں بھی آپ پہچانے نہیں

اس نظم میں ایسے اشعار بھی نظر آئے :۔

اس تامل میں کہ ہو جائے نہ جیل — جلتے ہیں اشعار پر سانڈے کا تیل

اول تو " تامل " یہاں اکھڑا اکھڑا لگتا ہے، پھر مصرعہ ثانی خاصہ عریاں ہے اور اشعار پر سانڈے کا تیل ملنا یہ خلاف واقعہ ہے۔

ناچنے میں آپ کا ثانی نہ تھا — " بھاؤ " میں امکان ارزانی نہ تھا

مصرعہ ثانی مبہم نہیں مہمل ہے !

انقلاب آیا تو نیم کاہ تھے — آپ ظل اللہ عالی جاہ تھے

عربی کے الفاظ ـــ شر، جر، بر ـــ وغیرہ کی "ر" تو بیشک مشدد ہے، مگر "پکار" کی "ر" پر تشدید غلط بھی ہے اور وجدان سامعہ کے لئے ناگوار بھی!

یہ صحافی ہیں پرائے ہاتھ سے

جہل وطغیانِ معز کی قسم ہیں ملازم چند اذہانِ قلم

جو لکھا کرتے ہیں ان کے نام سے کام ہے جن کو شبابِ جام سے

ہو نہ جائے مطبع واخبار ضبط قوم کی خدمت کو فرماتے ہیں خبط

جس طرح اندھا کوئی نٹ پاتھ پر یہ صحافی ہیں پرائے ہاتھ پر

اس نظم میں نوشتوں کا سا انداز سماں باندھا جاتا ہے، سلطان اشرف صاحب کو چاہئے تھا کہ ترتیب دیتے وقت وہ اس قسم کے سطحی اشعار کو چھانٹ دیتے:

ہیں ملازم چند اذہانِ قلم

میں "اذہانِ قلم" سے آخر کیا مراد ہے، پھر "شباب جام" کس بلا کا نام ہے؟ قوم کی خدمت کو فرماتے ہیں خبط۔۔ یہ مصرعہ بچکانہ ہے!

شاد عارفی نے "بلینک ورس" میں بھی طبع آزمائی کی ہے، "شب برات" کا یہ بند واقعہ کی ہو بہو عکاسی ہے ـــ

تاش کھیلیں گے ورانڈے میں لگا کر بازی

میری بیبیا پہ لگایا تھا ترپ کا اکھا

ہاتھ میں اینٹ کی یکی جو لئے بیٹھا تھا

یاد رہتا ہے مجھے ہر پتہ

یہ بڑا بول نہیں البتہ

اسی نظم کا یہ مصرعہ ـــ

نہ چاہنے دماغوں کو کرے گی گھائل

پڑھ کر طبیعت خاصی منغض ہوتی:

"ٹکڑ گدے" کے ان شعروں میں کس قدر لطف ہے ـــ

سرفراز خاں نانا تھے حضور کی مانند اس کھجور کی مانند

جس پہ بادوباراں کا حملہ ہائے طوفاں کا

کچھ اثر نہ ہوتا تھا شیخ طور کی مانند

عمر کے تناسب سے آپ سن رسیدہ ہیں، فلسفہ دیدہ ہیں۔

آنکھ ہے سیاست پر، دانت ہے وزارت پر
فکرِ شہر میں دُبلے ، بلکہ آبدیدہ ہیں

صفحہ ۱۶ پر غالباً علامہ اقبال کے اتباع میں شادؔ عارفی نے قطعہ کو رباعی لکھا ہے (کسی مشین کے پرزے اگر غلط ہو جائیں ...) لکھا ہے۔
"گنگا اشنان" معرکہ آرا نظم ہے مگر افسوس ہے کہ اُس کے شروع کے دونوں مصرعے کمزور ہیں :-

اشنان کے تقریب میں گنگا کے کنارے — جمعیت افراد پہ حاوی ہیں نظارے

"تقریب" تو مونث ہے پھر "کے" کیوں ؟ مصرعہ ثانی بھرتی کے لفظوں سے عبارت ہے ! ان اشعار میں جوش و ولولہ اور روانی دیکھئے

پگھلے ہوئے بلّور کی لہروں میں "جوانی"
بکھرے ہوئے سیماب کے پہلو میں شرارے
وہ "سوریا پوجا" وہ "ہری اوم" کی جاپیں
زاہد بھی جو سن لے تو "ہری اوم" پکارے

لمحاتِ سبک سیر کو پرواز کا ایما
گھڑیوں کو دبے پاؤں گزرنے کے اشارے

چند منتخب اشعار :-

اگر فطرت عطا کرتی نہ احساسِ زیاں مجھ کو — تو چکمہ دے چکا ہوتا امیرِ کارواں مجھ کو
خلوتوں کا بھید کوئی جاننے والا بھی ہے — مت سمجھ لینا ہمارے درمیاں کوئی نہیں
جب گریباں گیر ہو جاتا ہے ٹھکرایا ہوا — سوچتا ہے تب ہر اک ظالم ارے یہ کیا ہوا

ہمیں ستا کر جو ہیں پشیمان دل میں شاید وہ بچ بھی جائیں
ہمیں ستا کر جو مطمئن ہیں انہیں سزا لازمی ملے گی

تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی — لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کرے کوئی
خود مبتلا ہیں پنچ پریشانیوں میں ہم — فرصت کسے کہ آپ کو رسوا کرے کوئی

برائے زاہد، برائے ناصح ، برائے واعظ ، برائے قاضی
ملا کے مشک و گلاب و عنبر شراب کو خوشگوار کر لوں

اسی غزل میں شادؔ نے "بدلگاموں" کو "بدلجاموں" نظم کیا ہے عربی میں تو بے شک "لجام" بولتے ہیں مگر اردو میں تو "لگام" ہی مروج ہے

بے رونقیِ شمعِ تمنا نہ پوچھئے — جیسے کوئی چراغ کسی قبر پہ جلے
ہجومِ گل میں بھی تسکینِ جستجو نہ ہوئی — کسی میں رنگ نہ پایا کسی میں بو نہ ہوئی
آئی ہیں مری طنز کی چھینٹیں تو سبھی پر — یہ کیا ! کہ فقط آپ پریشان سے ہیں

یہ انتخاب غیر مبارک نہ ہے مگر
ہیرا سمجھ کے آپ نے پتھر اُٹھا لیا

منکرِ وحدت کی یکسوئی پہ کثرت چھا گئی
ایک کو چھوڑا تو لاکھوں کو خدا کہنا پڑا

آتے جاتے ہوئے لوگوں کو نہ گزرے کوئی شک
اس تصور نے ترے در پہ ٹھہر نہ دیا

بعد وجود کو خوبی تو ہم بھی کہتے ہیں
حکومتوں میں نہیں بلکہ مہ جبینوں[1] میں

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

ہم خدا کے ہیں ، وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے
کیا کریں گے ابرِ گوہر بار کا

ہم وفا شعاروں کی، تا کجا دل آزاری، طنزِ تلخ ناداری، طعنۂ سبک ساری
چاہیے رواداری اے بتانِ سنگین دل ، آبرو نہیں بھی آرزو کی ہے

دل پہ کیا دکشش محبت جو چھپائے نہ بنے
یہ وہ دریا ہے جو کوزے میں سمائے نہ بنے

اگر ہم سے پھولوں کو ضد ہو گئی ہے ، اگر باغباں بھی ہمارا نہیں ہے
یہ گلبن تمہارا ، یہ گلشن تمہارا ، تو کیا آشیاں بھی ہمارا نہیں ہے

دیکھتا ہوں پھول کو کھویا ہوا شبنم میں ہوں
کوئی کیا جانے کہ کس حالت میں کس عالم میں ہوں

یوں بھی الزامِ محبت کوئی الزام نہیں
اور پھر آپ مرے ساتھ جس الزام میں ہوں

میں چراتا نہیں مضمونِ شگفتہ اے استاد
چھین لیتا ہوں اگر دامنِ الہام میں ہوں

تم نے عرضِ حال پہ ہنس کر
ظلم کیا ہے، داد تو کیا دی

اپنی مرضی سے اُگتے نہیں خود رو پودے
ہم غریبوں کا بہ ہر حال نگہباں ہے کوئی

زرد چہروں کے تبسم نے کیا ہے رسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اُٹھا لا ساقی
شیخ صاحب میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

چلو ہلکی سی مے پی کر چلے آئیں کہ میخانہ
بس اتنا دور ہے جتنا مرا گھر آپ کے گھر سے

زاہد کی مے کشی کا سلیقہ نہ پوچھئے
جیسے کوئی نماز پڑھے اور وضو نہ آئے

اب ہاتھ بڑھ گیا ہے تو میرا قصور کیا
میں کہہ رہا تھا جام مرے روبرو نہ آئے

یہ بتانِ مرمریں بت کدہ
جیسے اب انگڑائی لی اب بات کی

نیسرحُن کی نظروں کو ترے گیسو کے سائے میں
غزل کے خوش نما اسلوب آن کے ہاتھ آئے ہیں

---

[1] نازنینوں، موزوں تر لفظ تھا۔

اس کو دیکھا تھام کر دل رہ گئے — کچھ نہ کہہ پائے بہت کچھ کہہ گئے
یہ تو ایسا ہے کہ جیسے کوچۂ دار و رسن — ہم نہ جانے کر رہے تھے کیا گمانِ کوئے دوست
ہر صداقت ننگ لاتی ہے مگر تا خیر سے — دوست بنتے جا رہے ہیں دشمنانِ کوئے دوست
مشکین و معنبر ہیں اس بت کی گزرگاہیں — واللہ لبِ آہو، گردِ رمِ آہو ہے

پھر اور چلن پھر اور چلن پھر اور چلن پھر اور چلن
جبھی تو بزمِ ہزار جلوہ پہ کوئی پہرہ نہ کوئی قدغن

دوسرا رُخ :—

گمنام آرزو ہیں بڑا نام پالیا — دامن کی بھینٹ دے کے گریباں بچا لیا (ص ۱۰۰)

"گمنام آرزو" نے مصرعہ اولیٰ کو مبہم بنا دیا۔

عظمتِ فن کو روایات نے مرنے نہ دیا — شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا (ص ۱۰۴)

مصرعہ ثانی میں شاعر کا مفہوم گھٹ کر رہ گیا۔

صداقتوں کے ہمنوا پچاس فیصدی نہیں — مرے وطن میں میرے دشمنوں کی کچھ کمی نہیں (ص ۱۰۸)

" دندانِ تو جملہ در دہانند" جیسا شعر!

بحث تھی جس پہ وہ موضوعِ سخن باقی نہیں — فن پژوہوں میں مذاقِ انجمن باقی نہیں (ص ۱۱۱)

"فن پژوہوں" شعر کی لطافت پر بار ہے!

حقیقت ناگوارِ خاطرِ نازک نہ بن پائی — کچھ اس "تکنیک" سے ہم نے انہیں قصے سنائے ہیں (ص ۱۳۸)

"تکنیک" کی جگہ "انداز" آسکتا تھا!

"قطعات" میں ایسے قطعے بھی شامل کر لئے گئے ہیں:—

مشک میں بھر دی گئی ہو جیسے اک ملّا کی روح — یا نمائش گاہ کے سپکنوں کا انفاخِ شکم
مولوی کا فاتحہ سے ربط ہے ضرب المثل — اس لئے نیت کے مارے فاتحہ خواں تو کہ ہم

یہ قطعہ زبان و بیان اور خیال ہر اعتبار سے بے لطف اور سطحی درجہ کا ہے!

سیٹھ بالو رام کہلاتا ہے آج — بیچتا تھا کل جو کابل کے چنے
اور دفتر کا یہ بوڑھا اردلی — عمر گزری اس کو چپراسی بنے

اس قطعہ میں "طنز" کتنی چبھتی ہوئی ہے! شاد عارفی کی شاعری، نقار خانے میں طوطی کی آواز نہیں بلکہ ایسے ساز کی آواز ہے جو سننے والوں کو چونکا دیتی ہے!

قافلہ سخت جاں

از :- اسعد گیلانی ، ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد، گردپوش کے ساتھ) قیمت اعلیٰ ایڈیشن :- چھ روپے ، سستا ایڈیشن چار روپے ۔

ملنے کا پتہ :- ادارہ ادب اسلامی ، ۲۳ سٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا ۔

ت اسلامی کو حکومت نے کالعدم قرار دے کر، اُس کے جن رہنماؤں کو جیلوں میں بند کر دیا تھا اس کتاب میں اُن شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر مولانا صفات اللہ تک ساٹھ افراد ہیں جن کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے، ہر شخصیت کے کردار و سیرت کا بڑی دیدہ وری اور سلیقہ کے ساتھ ذکر کی گئی ہے ۔

اس کتاب میں جماعت اسلامی کے اُس اجتماع عام کی روداد بھی ملتی ہے، جس میں غنڈوں نے جماعت کے ایک رفیق کو شہید کر کے رکو درہم برہم کرنے کی ناپاک کوشش کی تھی ، یہ روداد اتنی اثر انگیز ہے کہ کئی مقامات پر ہماری آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہو گئیں ، کے علاوہ جماعت کے خلاف قانون قرار دئے جانے اور اُس کے رہنماؤں کی گرفتاری کی تفصیل بھی اس کتاب میں ملتی ہے، جس کا حرف حرف یں ڈوبا ہوا ہے ۔ اسعد گیلانی نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں حقیقت کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے، نہ کسی پر الزام تراشی نہ مبالغہ آرائی نہ کوئی بات کے خلاف ! جیل میں اسعد صاحب نے کیا دیکھا ؟ کن حالات سے سابقہ پڑا کیسے کیسے مرحلے سامنے آئے ؟ جیل میں نماز کا کیا رنگ رہا ، ت الٰہی نے دلوں میں کس طرح نفوذ کیا ! یہ تمام تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے ۔ صبر و شکر ، توکل علی اللہ ، عزیمت و استقامت کے جذبات تاب کی ایک ایک سطر معمور ہے، کوئی سنگدل سے سنگدل آدمی بھی اس کتاب کو پڑھے گا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

صفحہ ۴۴ پر "غیظ" کا املا "غیض" دیکھ کر طبیعت بہت مکدر ہوئی اگر اسعد گیلانی صاحب "فاران" کا باقاعدگی کیساتھ مطالعہ کرتے ، تو وہ املا کی یہ غلطی نہ کرتے ۔ صفحہ ۶۲ پر خورشید احمد صاحب کا جو حلیہ بیان کیا ہے ، اس میں "رنگ گورا" لکھا ہے حالانکہ خورشید صاحب کے رنگ گندمی کہا جاسکتا ہے ۔ صفحہ ۱۱۴ پر فضل معبود صاحب کے تذکرے میں جو "شیریں شخصیت" لکھا گیا ہے وہ بھی وجدان کو کھٹکا ۔ شخصیت کو یریں، نمکین یا تلخ کوئی نہیں کہتا ۔

اس کتاب سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ ڈیرہ غازی خاں کے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی اور انہوں نے لمی نام (Pen Name) عاصی عراقی اختیار کر رکھا ہے ان کی غزل کا یہ شعر کتنا اچھا ہے ۔

تیرے مصالح ساحل ساحل		میرے عزائم طوفاں طوفاں

"قافلہ سخت جاں" کے خطوط حق و صداقت کے ادب پارے ہیں ، جماعت اسلامی کے خلاف اب تک جتنا لٹریچر آیا ہے کے توڑ کے لئے تنہا یہ کتاب کافی ہے ۔

فرش نظر

از :- رتن پنڈوری ، ضخامت ۱۴۴ صفحات (مجلد، مصنف کی تصویر کے ساتھ) قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ :- سندھ پبلیکیشنز ۳ کیسر باغ پٹھان کوٹ (انڈیا)

"فرش نظر" جناب پنڈت رتن پنڈوری کے کلام کا مجموعہ ہے ، حضرت مہر جالسی نے اس کتاب پر مختصر سی "تقریظ" لکھی ہے ! رتن پنڈوری نے جو حالات تحریر فرمائے ہیں وہ ایک طرف واقعیت کے اعتبار سے سچائی کے آئینہ دار ہیں دوسری طرف اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر ں کام کی لگن اور سچا جذبہ ہو تو غربت و ناداری اور فقر و فاقہ کے مصائب بھی اُسے منزل مقصود پر پہونچنے سے نہیں روک سکتے وہ لکھتے ہیں :-

ماہنامہ

فاران

کراچی

ایڈیٹر .... ماہرالقادری

جلد ۱۷	اگست ۱۹۶۵ء	شمارہ ۵

ترتیب

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

مقام اشاعت
دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱
(مکتبہ ، شبیر حسن کوٹھی)

چندہ سالانہ سات روپے

سرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں طبع کرا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

رن کچھ کے مسئلہ پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بڑی تناتنی پیدا ہو گئی تھی، دونوں طرف فوجی تیاریاں، محاذِ جنگ کی سی کیفیت! یوں سمجھئے کہ لڑائی کی بارود بچھ چکی تھی، بس ذرا شتابہ دکھانے کی دیر تھی! محدود پیمانہ پر تھوڑی بہت معرکہ آرائی ہوئی، بات آگے بڑھنے نہیں پائی، یہاں تک کہ دونوں حکومتوں کے مابین سمجھوتہ ہو گیا! صلح بہ ہر حال جنگ سے اچھی چیز ہے اور پھر آج کل کی جنگ خدا کی پناہ! تلوار اور تیر و کمان سے برسوں میں انسانوں کا جتنا خون بہتا تھا، آج سیکنڈوں اور منٹوں میں اس سے کہیں بڑھ کر غارت گری خونریزی اور انسانوں کی ہلاکت و تباہی ہو سکتی ہے!

پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی اسی میں بھلائی ہے اور خیریت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حریف نہیں حلیف بن کر رہیں! ایک دوسرے کی طرف سے بے اطمینانی، خطروں اور اندیشوں کی فضا کا اس کے سوا اور کوئی حاصل نہیں ہے کہ دماغوں کو تشویش لاحق ہے، دل مضطرب و پریشان اور زندگیاں بے آرام ہیں! رن کچھ کی طرح دوسرے تنازعے بھی طے ہو سکتے ہیں اور طے ہونے چاہئیں! بھارت کی یہ رٹ کہ "مسئلہ کشمیر" کا ذکر ہی نہ آنے پائے، واقعہ اور حقیقت کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے! مسئلہ کشمیر زندہ ہے اور یہ تنازعہ بدستور موجود ہے۔ بعض اوقات مسائل اس لئے بھی الجھا دیے جاتے ہیں پڑ جاتے ہیں کہ ملک کی اندرونی ابتری سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے بیرونی تنازعوں کو باقی رکھا جاتا ہے اور ان مسائل پر گفت و شنید تو ہوتی رہتی ہے مگر انہیں حل نہیں ہونے دیا جاتا! بقول شاعر۔

؎ مسئلہ کشمیر کا لیڈر کو ہے تھامے ہوئے

پاکستان اور ہندوستان کا کھل کر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندوستان میں ایسی متعصب جماعتیں موجود ہیں جو پاک و ہند کے درمیان صلح و صفائی نہیں چاہتیں اور جو اب تک "اکھنڈ ہندوستان" کا خواب دیکھ رہی ہیں، اور جن کے مشن کی کامیابی اسی میں ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہمیشہ دشمنی اور کشمکش باقی رہے اور یہ حکومتیں ایک دوسرے کی دوست نہ بننے پائیں! بھارت کی یہ متعصب ندہ اور جھگڑالو جماعتیں اس کوشش اور سازش میں برابر لگی ہوئی ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے! ان کی عزت، مذہب، جان و مال اور ناموس ان میں سے کوئی چیز بھی محفوظ نہ رہے! سال دو سال میں کوئی نہ کوئی رڈکیلا اور جبل پور بھارت کے مظلوم مسلمانوں کے لئے تیار ہوتا رہتا ہے، اس کے برخلاف پاکستان کی کوئی جماعت بھی پاک و ہند کے تعلقات کی کشیدگی کی آرزو مند نہیں ہے! پاکستان میں بسنے والے ہندوؤں کو پریشان کرنے اور ستانے کے لئے اُن سے وفاداری کا کبھی کوئی ثبوت نہیں مانگا گیا، پاکستان کا دینی لٹریچر موجود

جس میں بار بار اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ پاکستان میں جو ہندو اور دوسرے غیر مسلم رہتے ہیں، اُن کی جان و مال اور عزت کی حفاظت
مہ داری اللہ اور رسولؐ نے ہم پر ڈالی ہے، جس کا ہر حال میں لحاظ رکھنا ہمارا دینی فریضہ ہے، اور انسانی اخوت کے رشتہ کا ہر قیمت
رام ہونا چاہئے۔

ہندوستان کے شہری قوانین جو دین و شریعت سے متصادم نہ ہوں، اُن کی پابندی وہاں کے مسلمانوں پر ضروری ہے، اس نوعیت کے
ت بھارت کے داخلی معاملات میں کسی بیرونی حکومت کو دخل در معقولات کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، مگر وہاں کے مسلمانوں کو صرف اس جرم
اداش میں ستایا، برباد کیا اور کھاٹا جائے کہ وہ دین اسلام کے حلقہ بگوش ہیں، تو اُن کی عزت، مذہب اور جان و مال کی حفاظت کا
سئلہ رن کچھ اور کشمیر کے مسائل سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہو جاتا ہے! اگر اس مسئلہ سے صرف نظر کیا گیا یا غفلت برتی گئی تو اللہ
لی کے یہاں ہم سے سخت بازپُرس ہو گی!

رن کچھ کے معاملہ میں سب سے زیادہ مدح و ستائش کے مستحق وہ مجاہد سپاہی ہیں جنہوں نے خطروں کے ہجوم میں اللہ تعالیٰ کے حضور۔
ع و سجدے کئے ہیں اور نمازیں ادا کی ہیں، یہی اسپرٹ مسلمان کی سب سے قیمتی متاع اور سب سے بڑی قوت ہے! یہ قوت جب تک موجود ہے امریکہ یا
ی اور دوسری حکومت اپنا دستِ تعاون کھینچ کر ہمیں کمزور نہیں کر سکتی یہ قوت خدانخواستہ نہ رہے تو ساری دنیا کی حکومتیں بھی ہماری مدد
رہیں پھر بھی ہم کمزور و ناتواں ہی رہیں گے!

اللہ غنی! نشیبِ فراز کا یہ ڈرامہ، اقبال و ادبار کے یہ صبح و شام اور عروج و زوال کی یہ دھوپ چھاؤں کہ شام کے وقت تختِ حکومت پر
صبح کو جیل خانہ کی کوٹھری میں! الجزائر کے صدر بن بالّا کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا! جب تک وہ برسرِ اقتدار رہا عوام و خواص سب کے سب
کی قصیدہ خوانی کرتے رہے، اس کی فراست و تدبر کی تعریف، خلوص و دیانت کی مدح سرائی، اُس کے کردار کو خراجِ عقیدت جیسے الجزائر میں
یہی ایک "انسانِ کامل" صدیوں کے بعد پیدا ہوا ہے، مگر زوالِ حکومت اور عنانِ اقتدار چھن جانے کے بعد اب اسی "عظیم و کامل انسان" میں
ح طرح کے عیب نکالے جا رہے ہیں! یا تو اقبال کا وہ عالم کہ بن بالّا صاحب کا ذرا کان بھی گرم ہو جائے تو صبح و شام بلیٹن شائع ہوتے تھے یا اب
ک پتہ نہیں کہ وہ بے چارہ اگر واقعی زندہ ہے تو کہاں ہے کس حال میں ہے؟ اس واقعہ میں قلبِ غافل کے لئے سبق نہیں مگر قلبِ حساس اور
بیدار کے لئے بڑی عبرت ہے! چھوٹے ہوں یا بڑے، تخت نشین ہوں یا خاک نشین، ہر شخص کو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہئے، دنیا کے حالات
تے بدلتے رہتے ہیں، تغیرِ زمانہ کی سرشت اور انقلابِ دنیا کا مزاج ہے! انقلاب کی زد سے کوئی بچ بھی جائے تو "موت" سے نہیں بچ سکتا۔ یہ
ایک انقلاب اور زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہے، جس سے مفر نہیں! موت آتی ہے تو سارے کروفر اور ٹھاٹ باٹ دھرے کے دھرے ہی رہ جاتے ہیں!

شاہ فاروق ہوں یا بن بالّا، سکندر مرزا ہوں یا غلام محمد، جب تک یہ لوگ برسرِ اقتدار رہے ان کی خدمت میں گارڈ آف آنر،
اسنامے اور قصیدے پیش کئے جاتے تھے، ان کی حکمتِ عملی، سیاست دانی، فراست، ذہانت، ہوشمندی اور معاملہ فہمی کی کیا کیا تعریفیں
تی تھیں، اخباروں اور رسالوں میں کس اہتمام و شان کے ساتھ ان کی تصویریں چھپتی تھیں، خود حکومتوں کے محکمہ جات اطلاعات یہ ڈیوٹی
ام دیتے تھے کہ باہر کے کسی ایڈیٹر، سیاح، سیاست داں اور مشہور شخصیت کا ایک حرف بھی اُن کی تعریف میں آتا تو اُسے ملک کے اخباروں میں
یاں کر کے چھپایا جاتا تاکہ عوام باخبر اور مرعوب و متاثر ہوں کہ تمہارے خداوندِ نعمت کی عزت و شہرت کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بج رہے ہیں۔

خوشامدی لوگ کس کس تقریب اور حیلہ سے ان "بڑے آدمیوں" کی بارگاہوں میں باریابی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، مگر حکومت کے چھنتے اور اقتدار و اختیار سے بے دخل ہوتے ہی ان کے "مناقب" دفعتہً "مثالب" سے بدل گئے، جیسے ان سب نے طاقت کے زور سے حکومت پر غاصبانہ قبضہ جمار کھا تھا، دراصل حکمرانی اور فرماں روائی کے یہ حقدار اور اہل ہی نہ تھے، معائب اور کمزوریوں کی لمبی فہرست اور الزامات کی طویل فردِ جرم ان کے خلاف مرتب کی گئی! اور اس کے بعد منقبت و قصیدہ مدح و تعریف اور عزت و تکریم کے قافلہ کا رخ نئے حکمرانوں کی طرف مڑ گیا، آن کی تصویریں اُتریں اور ان کی تصویریں لگ گئیں!

حکومتوں کے انقلابات اور اتار چڑھاؤ کے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ حکمرانی کے دور میں صاحبانِ اختیار و اقتدار کی جو تعریفیں کی جاتی ہیں، وہ کوئی خاص وزن اور اعتبار نہیں رکھتیں، یہ تمام عزتیں اور اجلال و تکریم کے مظاہرے "اضافی" ہیں، جس حاکم نے لوگوں کے منہ کی تعریفوں سے اپنی شخصیت اور مقبولیت کا اندازہ لگایا، اس نے غلطی کی! جب اختیار و اقتدار نہ رہے، اُس وقت عوام خوبیاں بیان کریں، یہ ہے وہ واقعی تعریف جو جریدۂ عالم پر نقش دوام بن جاتی ہے، خلفاء راشدین کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ساڑھے تیرہ سو سال سے دنیا کسی وقفہ کے بغیر مسلسل ان کو خراجِ عقیدت پیش کر رہی ہے، دل اُن کی محبت اور عقیدت سے معمور ہیں، اُن کے ناموں پر نام رکھنا باعثِ سعادت و برکت سمجھا جاتا ہے! یہ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جو اپنی تعریفیں سننا پسند نہیں کرتے تھے، ان کی مدح و منقبت کے دفتر تو ان کے بعد لکھے گئے ہیں! (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

دنیا کے حاکموں اور فرمانرواؤں کو تاریخ پیغام دے رہی ہے ——— اچھے بن جاؤ، اچھے کام کرو اور دنیا سے داد و ستائش کی تمنا نہ رکھو ——— بس پھر تم چاہے حکومت کی کرسی پر ہو یا نہ رہو ہر حالت میں تمہیں سراہا جائے گا، مورخین کے قلم تمہیں گارڈ آف آنر دیں گے — ادیبوں اور شاعروں کی زبانیں تمہیں سپاسنامے پیش کریں گی۔ اور تمہیں اچھے ناموں سے یاد کیا جائے گا!

نیکی کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر

زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

جن لوگوں کو حکومت کے نشہ نے غافل رکھا، اُن کی آنکھیں اختیارات سے بے دخل ہوتے یا مرتے وقت کھلیں، اُس وقت انہوں نے جانا کہ ہم نے کیا کیا اور دراصل کرنا کیا چاہتے تھا، مگر اب پچھتانے سے کیا ہونا تھا، ندامت و توبہ کی مہلت ختم ہو چکی تھی!

وزارت امور مذہبی کے بارے میں اخبارات میں خبریں آرہی ہیں اور عوام کی زبانوں پر بھی اس کے چرچے ہیں، گزشتہ حکومتوں کے دور میں بھی کچھ مولویوں نے اس قسم کی وزارت کا مطالبہ کیا تھا، اس مطالبہ کو لوگ بھول گئے تھے مگر اب اسے ذہنوں میں تازہ کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس خبر میں کتنی صداقت ہے اور ارباب اقتدار کے پیش نظر کیا اسکیم ہے۔

پاکستان کی تو پوری حکومت اور تمام محکموں، شعبوں اور وزارتوں پر دین کا غلبہ ہونا چاہئے کہ پاکستان درحقیقت اسی مقصد کے لئے وجود میں آیا تھا، یہ وزارتوں میں امور مذہبی اور غیر امور مذہبی کی تقسیم کیوں؟ ریاست حیدرآباد دکن میں امور مذہبی کا محکمہ اس لئے قائم تھا کہ وہاں کی حکومت اسلامی نہ تھی بلکہ مسلمان خانوادے کی بادشاہت تھی! اس لئے دولتِ آصفیہ میں دین و سیاست کی تفریق پائی جاتی تھی، پاکستان میں کچھ محکمے سودی کاروبار چلاتے، اور جوئے اور شراب کی آمدنی وصول کرتے رہیں اور ایک محکمہ مساجد و اوقاف کی نگرانی کرتا اور موذنوں اور خطیبوں کو تنخواہیں دیتا رہے تو ایسا کرنے سے کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تقاضا پورا ہو جائے گا، اور اگر محکمہ امور مذہبی دین کے تقاضوں کو پورا

کرنے کی جدوجہد کرے گا، تو حکومت کے جن شعبوں اور محکموں میں دین کا غلبہ نہیں ہے اُن سے اس محکمہ کا تصادم ہوگا ــــ مگر یہ تو ہماری قیاس آرائی اور خوش خیالی ہے، اس تصادم کی نوبت کیوں آنے لگی، محکمۂ امورِ مذہبی اگر قائم ہوا تو اس کے حدودِ عمل متعین کر دیئے جائیں گے، وہ اُن سے تجاوز کیسے کر سکتا ہے! رہے عوام تو اُن کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ یوم میلادالنبیؐ پر سرکاری عمارتوں کو بجلی کے قمقموں سے جگمگاتا دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ عشقِ رسولؐ اور احترامِ نبیؐ کا یہ مظاہرہ ہو رہا ہے" امورِ مذہبی" کے نام میں بے شک اُن کے لئے بہت بڑی کشش ہے، مگر جن کو اللہ تعالیٰ نے فہم اور کتاب و سنت میں بصیرت عطا فرمائی ہے اور اسلامی روایات کے حقیقی تقاضوں سے واقف ہیں وہ دین میں حشو و زوائد کی نشان دہی کرتے رہیں گے۔

کوئی شک نہیں اسرائیلی حکومت مشرقِ بعید کے لئے بہت بڑا فتنہ ہے، جس طرح یہودیت اللہ تعالیٰ کے غضب و لعنت کا دوسرا نام ہے اسی طرح یہودی حکومت بھی سطحِ ارض پر نفاق و نحوست اور دنائت کی علامت ہے، مغرب کے سامراج نے اس ناشدنی حکومت کو قائم کر دیا اور اس کی طرح پشت پناہی کی جا رہی ہے! اسرائیلی حکومت کے ارد گرد جو مسلمان ممالک ہیں اُن کے باشندے اگر مل جل کر خاک بھی ڈال دیتے تو یہ حکومت اُس کے غبار میں دفن ہو کر رہ جاتی، مگر افسوس ہے کہ یہ ملک ایک دوسرے سے بیگانے اور دگردگر رہے اور ان کے اندرونی اختلافات شائیلاک کی اس گورنمنٹ کو مستحکم کرتے چلے گئے! ان ممالک میں "اخوان المسلمون" ہی تنہا ایک ایسی جماعت تھی، جس کا وجود تمام عرب ممالک کے لئے نقطہ کی حیثیت رکھتا تھا کہ یہ لوگ اسلام اور دینی اخوت کے سب سے بڑے مبلغ اور علمبردار تھے! "اخوان المسلمون" کی ایمانی و اخلاقی قوت اور مجاہدانہ اسپرٹ سے اسرائیلی حکومت ڈرتی تھی، اخوان نے محاذِ جنگ پر اسرائیلی فوجوں کا بڑی جانبازی، پامردی اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا تھا اور زک پہونچائی تھی۔ "اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت" تو اخوان کا نعرہ تھا! مگر افسوس ہے کہ ان مخلص ترین دین پسند افراد کو جس طرح مٹایا گیا ہے! جو تھوڑے بہت بیچارے جہاں بھی باقی رہ گئے ہیں وہ جس پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہیں اُس پر کسی دردمند اور خدا ترس انسان کا جی خون رو بھی ہلکا نہیں ہو سکتا! "اخوان" کی تباہی اور بربادی یہودیوں کی مسرتوں کا مقصود تھی! اس جماعت کے مٹ جانے سے عرب ممالک میں دینی محاذ کو نقصان پہونچا ہے اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا! ان کی تباہی کے بعد کتنی نسلی اور قومی عصبیتیں ہیں جنہوں نے اُبھر کر اسلامی وحدت کو مجروح کیا یہ مصیبت اس حد تک پہونچ گئی کہ فرعون جس پر قرآن لعنت بھیجتا ہے اُس کی اولاد ہونے پر فخر کیا جا رہا ہے۔

"اخوان" کے مرشدِ عام اور اس جماعت کے بانی حضرت حسن البنا شہید اور ان کے اعوان و انصار پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو کہ وہ خدا کی راہ میں سرفروشی، اخلاص، وفاداری، بےنفسی، للّٰہیت اور صبر و استقامت کے ایسے نشان قائم کر گئے جو آنے والی نسلوں کو روشنی دیں گے! ــــ (و اولٰئک ہم المفلحون)

جن زمانے میں صدارتی انتخاب کی مہم پاکستان میں چل رہی تھی، اور محترمہ فاطمہ جناح کے طوفانی دورے ہو رہے تھے اُس وقت اور بعض بڑے لوگوں کے بیانات اخباروں میں آ رہے تھے کہ قانون و دستور کو اسلام کے مطابق بھی بنایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ عائلی قوانین پر اور نظرثانی ہو سکتی ہے! لیکن صدارت اور اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد اس لہجہ میں تبدیلی پیدا ہو گئی، اب اسلام کا نام تو بہت کم لیا جاتا ہے، باسبار ذکر "فلاحی حکومت" کا آتا ہے۔ حالانکہ پاکستان صرف "فلاحی حکومت" کے لئے نہیں بنا تھا، مسلم لیگ کا یہ نعرہ اور مطالبہ نہیں تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک ایسا خطہ چاہتے ہیں جہاں امریکہ اور انگلستان کے باشندوں کی طرح وہ چین آرام سے رہ سکیں! گائیں بجائیں،

کھیلیں، شرابیں پئیں، سودی کاروبار کریں، جنس کی نمائش کی جائیں، مرد وزن کا بیباکانہ اختلاط ہو، فسق و فجور پر کوئی پابندی نہ ہو ! اگر مسلم لیگ اس قسم کا کوئی مطالبہ لے کر اٹھتی تو اس پر لبیک کہنے کے بجائے مسلمان لعنت و ملامت کی بوچھار کرتے، مسلم لیگ کا مطالبہ تو یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان کے مسلمان اپنی اکثریت کے علاقوں میں ایک ایسی حکومت چاہتے ہیں جہاں وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں ! اور کتاب و سنت کی بنیادوں پر جس حکومت کا آئین مدون و متشکل ہو سکے ! (مسلم لیگ کے اکابر نے اس مطالبہ کے سلسلہ میں جو تقریریں کی تھیں اور بیانات دئے تھے اُن کا خلاصہ ہم نے بیان کردیا ہے)

یہ مسلمانوں کے دین و ایمان کا معاملہ ہے، یہاں کسی ایک شخص یا چند آدمیوں کی پسند اور مرضی کوئی وقعت نہیں رکھتی، پاکستان کو "اسلامی حکومت" بننا ہے کہ یہی پاکستان کے قیام کا اصل مقصود ہے" اسلامی حکومت" میں "عوام کی فلاح" کا عملی تصور اس طرح شامل ہے جیسے گلاب میں خوشبو ! جب" اسلامی حکومت" کا ذکر آتا ہے تو اُس میں عوام کی رفاہ و فلاح بھی لازماً شریک ہوتی ہے ! ہاں ! اسلام مغربی ملکوں جیسی آسودگی اور عیش و فلاح نہیں چاہتا کہ جس کے نام پر فسق و فجور، بدکاری اور حیوانی جذبات کو فروغ حاصل ہو !

اگر اونچے طبقہ کے لوگ" فلاحی حکومت" (ویلفیر اسٹیٹ) ہی کو "اسلامی حکومت" ہی کا قیام چاہتے ہیں تو پھر کسی اختلاف و تردید، بحث و تکرار اور آئینی احتجاج و نزاع کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، معاشرے اور حکومت کو اسلامی و اخلاقی بنانے کا کام ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر فوراً شروع ہو جانا چاہئے، عوام اس دن کے برسوں سے منتظر ہیں، سب کی آنکھیں اسی افق پر لگی ہوئی ہیں جہاں سے" اقامت دین" کا مہر جہاں تاب طلوع ہوگا !

اسلام میں کیا چیزیں" معروف" ہیں اور کیا" منکر" ہیں، یہ سب کو معلوم ہیں، ان کے لئے نہ تو کسی ادارۂ تحقیقات اسلامی کی ریسرچ کی ضرورت ہے اور نہ کسی مجلس مشورت کی رائے درکار ہے" معروف" بھی سب پر کھلے ہوئے ہیں اور" منکر" بھی ظاہر ہیں۔ معروف کو قائم کیجئے اور "منکر" کو مٹائیے، اسلم ممالک میں عنانِ حکومت اور زمامِ اقتدار انہی کو زیب دیتی ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کی تڑپ اور داعیہ اپنے اندر رکھتے ہیں ! اس طاقت و اقتدار سے اللہ کی پناہ جس کے بل بوتے پر نیکیاں ماند پڑ جائیں اور برائیوں کو فروغ حاصل ہو، اور اس قوت و اختیار پر درود و سلام جو برائیوں کو مٹانے اور نیکیوں کے قیام میں کام آئے ۔

تا بہ زندگی

۱۰/ [illegible] ۶۵ء

مولانا محمد تقی عثمانی مدرس دار العلوم کراچی

بائیبل کی تضاد بیانیاں

(حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی مشہورِ آفاق کتاب اظہار الحق سے اقتباسات)

ہندوستان پر مغربی اقتدار کے تاریک دور میں ایک زمانہ ایسا آیا تھا کہ عیسائی مشنریوں نے اپنی پوری طاقت ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم پر صرف کر رکھی تھی۔ ایک طرف تو مسلمانوں کے سر پہ انگریز کی تلوار لٹک رہی تھی، دوسری طرف عیسائی مبلّغ ان کے دین کے خلاف زہر اگلتے پھر رہے تھے، یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک تھی اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں تو مسلمان دھڑا دھڑ مرتد ہو رہے تھے، لیکن تاریخ اسلام کا کوئی زمانہ ان سرفروشوں سے خالی نہیں رہا جو دین کے ناموس پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں بھی علمائے اسلام کی ایک مقدس جماعت کھڑی کر دی جس نے اپنی جان پر کھیل کر اس صبر آزما فتنے کا مقابلہ کیا، اور اس مقصد کے لئے اپنے جان و مال کی وہ بیش بہا قربانیاں پیش کیں جو اسلامی تاریخ میں یادگار رہیں گی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی اسی جماعت کے سرخیل تھے، جنہوں نے اپنا گھر بار لٹا کر اس فتنے کا مقابلہ کیا، حق گوئی کے صلے میں بے شمار اذیتیں سہیں، طرح طرح سے ستائے گئے، یہاں تک کہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور آج جنت المعلیٰ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قدموں میں آرام فرما ہیں۔ یہ مولانا ہی تھے جنہوں نے اکبر آباد کے شہرۂ آفاق مناظرے میں عیسائیوں کے مشہور پادری فنڈر کو شکستِ فاش دی تھی، یہ مناظرہ اپنی نوعیت کا منفرد مناظرہ تھا، پوری مسلمان دنیا میں اس کی دھوم تھی اور اس میں پادری فنڈر نے انگریز حاکموں، ججوں اور سینکڑوں مسلمان اور ہندو عوام کے سامنے بائبل میں تحریف کا اعتراف کیا تھا، اس مناظرے نے عیسائی مشنریوں کی کمر توڑ دی تھی اور اس کے بعد یہ فتنہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکا۔

مولانا نے عیسائیت کے موضوع پر اپنی تصانیف کا جو قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے، ان میں سب سے زیادہ معرکۃ الآرا کتاب اظہار الحق ہے، اس کتاب میں عیسائیت کے ہر گوشہ پر جو بھرپور، باوقار اور عالمانہ تنقید کی گئی ہے، شاید کسی زبان میں بھی اس کی مثال نہیں ہے، اصل کتاب عربی میں ہے، پھر اس کے فارسی، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور گجراتی زبانوں میں ترجمے بار بار شائع ہوئے ہیں، عیسائی پادریوں نے بارہا اس کے نسخے خرید خرید کر جلائے ہیں، اور ایک مدت تک یہ کتاب جامع ازہر کے

فضا میں داخل رہی ہے، بڑے بڑے علماء نے اسے مولاناؒ سے پڑھنے کے لئے دور دراز کے سفر کئے ہیں، اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ ٹائمز آف انڈیا نے یہ لکھا تھا کہ اگر یہ کتاب دنیا میں پڑھی جاتی رہی تو روئے زمین سے عیسائیت کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

افسوس ہے کہ آج جب کہ عیسائی مشنریوں نے پھر کروٹ لی ہے، یہ کتاب نایاب ہے، اور تعجب کی بات ہے کہ چھ زبانوں میں چھپنے کے باوجود اس کا کوئی اردو ترجمہ آج تک شائع نہیں ہو سکا[1]، آج جب کوئی مسلمان عیسائیت پر قلم اٹھاتا ہے تو اس جیسی کتابوں کی نایابی اس کی ہمت توڑ دیتی ہے۔

اس ضرورت کے پیش نظر میرے استاذ مکرم حضرت مولانا اکبر علی صاحب مدرس دار العلوم کراچی نے اپنے ضعف اور تدریسی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے، جو بحمد اللہ مکمل ہو چکا ہے اور اب راقم الحروف اس کی ترتیب و تہذیب اور اس پر تشریحی حواشی (FOOT NOTES) لکھنے کا کام کر رہا ہے۔ جلد اول کتابت کے ابتدائی مراحل میں ہے، اور جلد دوم پر کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

یہ کتاب ایک مقدمے اور چھ بابوں پر مشتمل ہے، پہلے باب میں "بائبل" کا مطلب، اس کی ایک ایک کتاب کا تاریخی جائزہ بائبل کی تضاد بیانیاں اور اس کی علمی، اخلاقی و تاریخی غلطیاں واضح کی گئی ہیں، دوسرے باب میں ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ بائبل میں طرح طرح سے تحریف ہوئی ہے، تیسرے باب میں مسئلہ نسخ پر سیر حاصل گفتگو ہے چوتھے باب میں عقیدۂ تثلیث کو عقل اور نقل کی روشنی میں باطل قرار دیا گیا ہے، پانچویں باب میں قرآن کریم کی حقانیت اور چھٹے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر بے نظیر بحث ہے۔

ذیل میں احقر اس کتاب کے پہلے باب سے کچھ اقتباسات اپنے لکھے ہوئے حواشی سمیت قارئین فاران کی خدمت میں پیش کر رہا ہے جس سے ایک مقصد تو اس کتاب کا تعارف کرانا ہے، دوسرے یہ پیش نظر ہے کہ قارئین مختصر سے وقت میں بائبل سے متعلق بڑی اچھی معلومات حاصل کر سکیں گے، تیسرے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی خدمت میں اسے اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ وہ اس پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر دیکھیں کہ اسے اردو کے لباس میں پیش کرنے کے لئے اور کس قسم کے کام کی ضرورت ہے! ابھی کتاب کے طبع ہونے میں کچھ دیر ہے، اگر جلد ہی احقر کو کچھ مفید مشورے مل گئے تو اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو سکے گا، اس لئے بطور خاص اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مجھے اپنے مفید مشوروں سے مطلع فرمائیں۔ ممنون ہوں گا[2]۔

[1] ایک عرصہ پہلے اس کا اردو ترجمہ ہوا تھا، مگر نامعلوم وجوہ کی بناء پر چھپ نہ سکا، اس کا مسودہ سورت کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ۱۲ - تقی

[2] احقر سے مراسلت کے لئے "دار العلوم کراچی ۱۴" کا پتہ کافی ہے۔ ۱۲

بائبل کیا ہے؟

عیسائی حضرات اپنی مقدس کتابوں کی دو قسمیں کرتے ہیں، ایک وہ کتابیں جن کی نسبت ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ان پیغمبروں کے واسطہ سے ہمارے پاس پہونچی ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے گذر چکے ہیں، دوسری وہ کتابیں جن کی نسبت وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد الہام کے ذریعہ لکھی گئی ہیں، پہلی قسم کی کتابوں کے مجموعے کو عہد عتیق[۱] اور دوسری قسم کے مجموعہ کو عہد جدید کہتے ہیں اور دونوں کے مجموعہ کا نام بائبل[۲] رکھتے ہیں، یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی "کتاب" کے ہیں، پھر دونوں عہدوں کی قسموں میں سے ایک وہ قسم ہے جس کی صحت پر تمام پچھلے عیسائی متفق ہیں، دوسری قسم وہ ہے جس کی صحت میں اختلاف ہے۔

عہد قدیم کی پہلی قسم

اس مجموعہ میں ۳۸ کتابیں ہیں، (۱) سفر[۳] تکوین[۴] اس کا دوسرا نام سفر الخلیقہ بھی ہے، (۲) سفر خروج[۵] (۳) سفر احبار[۶] (۴) سفر عدد[۷] (۵) سفر استثناء[۸]، ان پانچوں کتابوں کے مجموعے کا نام "توریت" ہے جو عبرانی لفظ ہے اور جس کے معنی "شریعت" اور "تعلیم" کے ہیں، کبھی کبھی مجازاً یہ لفظ عہد عتیق کے مجموعے پر بھی بولا جاتا ہے۔

---

[۱] آج کل اسے پرانا عہدنامہ (OLD TESTAMENT) اور عہد جدید کو نیا عہدنامہ (NEW TESTAMENT) کہتے ہیں

[۲] BIBLE [۳] یہ لفظ سین کے کسرہ اور فا کے سکون کے ساتھ "سِفر" ہے جس کے معنی عربی زبان میں صحیفہ اور کتاب کے ہیں۔

[۴] اردو میں اس کا نام "پیدائش" اور انگریزی میں (GENESIS) ہے اس میں زمین و آسمان کی تخلیق سے لے کر حضرت آدم حضرت نوح۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے کی تاریخ ہے اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات پر ختم ہو گئی ہے، اس کے ۵۰ باب ہیں، [۵] اردو میں اس کا نام "خروج" ہی ہے اور انگریزی میں (EXODUS) کہتے ہیں، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر ان کی دعوت اسلام، فرعون کے غرق اور کوہ سینا پر اللہ سے ہم کلامی کے واقعات اور توریت کے احکام مذکور ہیں، اور یہ بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں خیمہ زن ہونے کے واقعات پر ختم ہو گیا ہے۔ اسے "خروج" اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا واقعہ مذکور ہے ——— اس میں ۴۰ باب ہیں۔

[۶] اردو میں اس کا نام بھی "احبار" ہے اور انگریزی میں (LEQ. ricus) اس میں وہ احکام مذکور ہیں جو بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں خیمہ زن ہونے کے دوران۔ انہیں دئے گئے اس کے ۲۷ باب ہیں۔

[۷] اسے اردو میں "گنتی" کہتے ہیں اور انگریزی میں (NUMBERS) اس میں بنی اسرائیل کی مردم شماری سے لے کر ان کے کنعان جانے سے پہلے تک کے احوال اور وہ احکام مذکور ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریائے اردن کے کنارے پر دئے گئے اس کے کل ۳۶ باب ہیں۔

[۸] اسے اردو میں بھی استثناء اور انگریزی میں (DEUT. RONOMY) کہا جاتا ہے اور اس میں وہ احکام اور واقعات مذکور ہیں جو "گنتی" کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات تک پیش آئے اس کے کل ۳۴ باب ہیں۔

(۶) کتاب یوشع بن نون (۷) کتاب ؐ القضاۃ (۸) کتاب ؑ راعوت (۹) سفر سموئیل اول (۱۰) کتاب سموئیل ثانی (۱۱) سفر الملوک الاول۔
(۱۲) سفر الملوک الثانی (۱۳) السفر الاول من اخبار الایام (۱۴) السفر الثانی من اخبار الایام (۱۵) السفر الاول لعزرا (۱۶) السفر الثانی لعزرا
اس کا دوسرا نام سفر نحمیاہ بھی ہے (۱۷) کتاب ایوب (۱۸) زبور (۱۹) امثال سلیمان (۲۰) کتاب ؑ الجامعہ (۲۱) کتاب نشید الانشاد (۲۲)
کتاب اشعیاہ۔ (۲۳) کتاب یرمیاہ (۲۴) مراثی یرمیاہ (۲۵) کتاب حزقیال (۲۶) کتاب دانیال (۲۷) کتاب یوشع (۲۸) کتاب یوایل
(۲۹) کتاب عاموس (۳۰) کتاب عبدیاہ (۳۱) کتاب یونان (۳۲) کتاب میخا (۳۳) کتاب ناحوم (۳۴) کتاب حبقوق (۳۵) صفنیا (۳۶)
کتاب حجی (۳۷) کتاب زکریا (۳۸) کتاب ملاخیا۔ یہ ملاخیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ۴۲۰ سال قبل گذرے ہیں۔ یہ تمام ۳۸ کتابیں جمہور
قدما مسیحین کے نزدیک معتمد اور معتبر اور تسلیم شدہ تھیں۔ البتہ سامری ؑ فرقہ کے نزدیک صرف سات کتابیں مسلم ہیں، وہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی
طرف منسوب ہیں، اور کتاب یوشع بن نون اور کتاب القضاۃ ان کی توریت کا نسخہ عام یہودیوں کی توریت کے نسخے کے خلاف ہے ؑ۔

لہ اسے اردو میں بھی "قضاۃ" اور انگریزی میں (JUDGES) کہا گیا ہے اس میں حضرت یوشع علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی حالت زار کی تفصیل
بیان کی گئی ہے، جس میں ان کا کوئی بادشاہ نہ تھا، ان کی بت پرستی اور بدکاریوں کی بنا پر بار بار اللہ تعالیٰ ان پر کوئی اجنبی بادشاہ مقرر کرتا جو ان پر ظلم
کرتا، پھر جب وہ خدا سے توبہ و فریاد کرتے تو ان کے لئے کوئی قائد بھیجا جاتا جو انہیں اس مصیبت سے نجات دلاتا، مگر وہ پھر بدکاریاں کرتے اور
کوئی بادشاہ ان پر مسلط ہو جاتا۔ اور چونکہ اس زمانہ میں جو قائد آتا اسے وہ قاضی کہتے تھے اس لئے اس کتاب کا نام قضاۃ ہے اور اس میں ۲۱ باب ہیں ۱۲ سے اس کا نام اردو
میں "روت" ہے۔ اور انگریزی میں (RUTH) ہے اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے دادا عوبید کی والدہ جناب راعوت" کے احوال مذکور ہیں جو ایک موآبی خاتون تھیں،
بیت اللحم میں آگئیں اور وہاں بوعز سے شادی کی جن سے عوبید ان سے لیشی اور ان سے داؤد علیہ السلام پیدا ہوئے، اس میں چار باب ہیں ۱۲ سے اسے آج کل
اردو میں "واعظ" اور انگریزی میں (ECCLESIASTES) کہا جاتا ہے کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام جامعہ یا واعظ تھا اور اس کتاب
میں اس کی نصیحتیں مذکور ہیں اس کے کل ۱۲ باب ہیں۔ ۱۲ سے اس کا نام اردو میں "غزل الغزلات" اور انگریزی میں (SONG OF SOLOMON) ہے اور یہ
بقول نصاریٰ ان گیتوں کا مجموعہ ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے لکھے تھے، اور جن کا ذکر کتاب السلاطین اول میں ہے کہ: "اور اس نے تین ہزار مثلیں کہیں اور اس کے
ایک ہزار پانچ گیت تھے" (ریشپہ) اس کے آٹھ باب ہیں ۱۲ سے سامری یہودیوں کا ایک فرقہ، یہ فلسطین کے شہر سامرہ (SAMARIE) کی طرف منسوب ہیں جو تباہ ہونے
کے بعد دوبارہ نابلس کے نام سے مشہور ہوا، یہاں کے باشندے عام یہودیوں سے بنیادی طور پر دو امور میں اختلاف کرتے ہیں، ایک مسلمہ کتب کی تعداد جیسا کہ مصنف نے
بیان فرمایا ہے، دوسری عبادت گاہ، یعنی وہ عام یہودیوں کے برخلاف یروشلم کے بجائے کوہ جرزیم پر عبادت کرتے ہیں، جو نابلس کے جنوب میں ایک پہاڑ ہے اور وہاں
چوتھی صدی قبل مسیح میں منسی نے (جس کا ذکر عزرا ۱۳ میں ہے) ایک ہیکل تعمیر کیا تھا، ۱۲ سے یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ پروٹسٹنٹ
فرقے کے نزدیک عہد قدیم کی کل کتابیں انتالیس ہیں، حالانکہ مشہور مورخ یوسیفس تقریباً سنہ ۱۰۰ء میں لکھتا ہے کہ:
"ہمارے پاس صرف بائیس کتابیں ہیں جن میں زمانہ ماضی کے حالات مندرج ہیں اور الہامی تسلیم کی جاتی ہیں" (بحوالہ ہماری کتب مقدسہ از جی۔ ٹی منلی ص ۷۴)
عیسائی حضرات تین کو ایک تو قرار دیتے ہی تھے۔ اب انتالیس کو بائیس بھی قرار دینے لگے اور اس مقصد کے لئے عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں کہ: انبیاء صغیر کی بارہ
کتب کو ایک، عزرا اور نحمیاہ کو ملا کر ایک، روت اور قضاۃ کو ملا کر ایک اور یرمیاہ اور نوحہ کو ملا کر ایک شمار کیا جائے تو بائیس ہو جاتے ہیں"۔ اس مضحکہ خیز
حرکت پر ہم ان حضرات کے لئے ہدایت کی دعا کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟

عہد عتیق کی دوسری قسم یعنی وہ کتابیں جن کی صحت میں اختلاف ہے، یہ کل ۹ کتابیں ہیں :-

(۱) کتاب آستیر (۲) کتاب باروخ (۳) کتاب دانیال کا ایک جزو (۴) کتاب طوبیا (۵) کتاب یہودیت (۶) کتاب دانش (۷) کلیسائی پندو نصائح (۸) کتاب المقابین الاول (۹) کتاب المقابین الثانی۔

"عہد جدید کی کتابیں یہ کل بیس کتابیں ہیں"

وہ کتابیں جن کی صحت پر اتفاق ہے یہ کل بیس کتابیں ہیں (۱) انجیل متی (۲) انجیل مرقس (۳) انجیل لوقا (۴) انجیل یوحنا ان چاروں کو اناجیل اربعہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور انجیل کا لفظ ان ہی چاروں کے ساتھ مخصوص ہے، اور کبھی کبھی مجازاً تمام عہد جدید کی کتابوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یہ لفظ معرب ہے، اصل یونانی لفظ "انکلیون" تھا جس کے معنی بشارت و تعلیم کے ہیں (۵) کتاب اعمال حواریین (۶) پولس کا خط رومیوں کی جانب (۷) پولس کا خط قورنتیوں والوں کی جانب (۸) دوسرا خط انہی کی طرف (۹) پولس کا خط غلاطیہ والوں کی طرف (۱۰) پولس کا خط افسس والوں کی طرف (۱۱) پولس کا خط فلپیوں کی طرف (۱۲) پولس کا خط قولاسائس والوں کی طرف (۱۳) اس کا پہلا خط تسالونیکی والوں کی طرف (۱۴) پولس کا دوسرا خط ان کی جانب (۱۵) پولس کا رسالہ تیموتاوس کی طرف (۱۶) اس کا دوسرا رسالہ ان کی طرف (۱۷) پولس کا رسالہ تیطوس کی طرف (۱۸) پولس کا خط فلیمون کی جانب (۱۹) پطرس کا پہلا رسالہ (۲۰) یوحنا کا پہلا رسالہ سوائے بعض جملوں کے۔

٭ مکابیوں کی دوسری کتاب میں چند سالوں کی تاریخ اور نہایت بیہودہ قسم کی روایات ہیں، ان کتابوں کے علاوہ پہلا اور دوسرا الیسڈرس، تین بچوں کا گیت، بعض دعا، اور منسی کی دعا اور پانچ کتابیں اور بھی مختلف فیہ ہیں اور انہی چودہ کتابوں کے مجموعے کو "اپاکرفا" (APOCRYPHA) کہا جاتا ہے، اور فرقہ پروٹسٹنٹ انہیں الہامی تسلیم نہیں کرتا، ت یہ متی حواری کی طرف منسوب ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں میں سے ایک ہیں، آپ کفرناحوم (CAPHARNAUM) میں جو فلسطین کا ایک شہر تھا، عشر وصول کرنے پر مامور تھے، آپ کو شہید کیا گیا، مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کب؟ اور کہاں؟ اناجیل اربعہ میں سے ایک انجیل آپ ہی کی طرف منسوب ہے اور اسے عیسائی حضرات قدیم ترین انجیل مانتے ہیں، اگرچہ وہ درحقیقت ان کی ہرگز نہیں، ۱۲ ــ ت مرقس (میم اور قاف پر پیش ہے) یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری جناب پطرس کے شاگرد ہیں، عیسائی حضرات کہتے ہیں کہ اسکندریہ کا کلیسا انہوں نے ہی قائم کیا تھا، انہیں ۶۸ء میں قتل کیا گیا، ان کی انجیل سابقہ انبیاء کے ان بیانوں سے شروع ہوتی ہے جو حضرت مسیح کی تشریف آوری پر دیئے گئے اور حضرت عیسیٰ کے عروج آسمانی پر ختم ہو جاتی ہے، اس میں ۱۶ ابواب ہیں انگریزی میں اسے (MARK) کہا جاتا ہے، ت "لوقا" (LUKE) اپنے زمانے میں طبیب تھے، پولس کے سفروں میں اس کے ساتھ جیسا کہ کلسیوں کے نام ۴: ۱۴ اور اعمال ۱۶ سے معلوم ہوتا ہے تقریباً ء میں انتقال ہوا، ان کی انجیل حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے واقعہ سے شروع ہوتی ہے، اور ۲۴ بابوں میں عروج آسمانی تک کے واقعات و احکام درج ہیں ۱۲ ت "یوحنا" حائے مفتوحہ ہے (JOHN) حبیب بن زبدی حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اناجیل اربعہ میں سے چوتھی انجیل آپ ہی سے منسوب ہے اور عہد نامہ جدیدہ کے مجموعہ میں تین خط اور ایک کتاب مکاشفہ بھی آپ کی طرف منسوب کی گئی ہے، آپ نے عمر بھر یہودیوں کے ظلم و ستم برداشت کئے، اور پہلی صدی عیسوی ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔ یاد رہے کہ عیسائی حضرات حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی یوحنا کہتے ہیں مگر اس کے ساتھ "المعمدان" کی قید ہے، یہاں وہ مراد نہیں۔ ان کی انجیل میں حضرت یحییٰ علیہ السلام (جن کو بائبل میں (JOHN) کہا ہے) کی تشریف آوری کے بعد کے حالات سے حضرت عیسیٰ کے عروج آسمانی تک کے حالات درج ہیں اور اس کے ۲۱ باب ہیں۔ ۱۲ ت

عہد جدید کی دوسری قسم یعنی جن کی صحت میں اختلاف ہے :-

یہ کل سات کتابیں ہیں اور بعض جیسے یوحنا کے پہلے خط کے (۱) پولس کا خط عبرانیوں کی جانب ہے (۲) پطرس کا دوسرا رسالہ (۳) یوحنا کا دوسرا رسالہ (۴) یوحنا کا تیسرا رسالہ (۵) یعقوب کا رسالہ (۶) یہودا کا رسالہ (۷) مشاہدات یوحنا،

کتابوں کی تحقیق کیلئے عیسائی علماء کی مجلسیں اس کے بعد ناظرین کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ۳۲۵ء میں بادشاہ قسطنطین[1] کے حکم سے عیسائی علماء کا ایک عظیم الشان اجتماع شہر نائس میں ہوا، تاکہ مشکوک کتابوں کے بارہ میں مشورہ کے ذریعہ کوئی بات طے ہو جائے، بڑی تحقیق اور مشورہ کے بعد ان علماء نے یہ فیصلہ کیا کہ کتاب یہودیت واجب التسلیم ہے، اس کے علاوہ باقی کتابوں کو بدستور مشکوک رکھا، یہ بات اس مقدمہ سے خوب واضح ہو جاتی ہے جو جیروم[2] نے کتاب یہودیت پر لکھا ہے،

اس کے بعد ایک دوسری مجلس ۳۶۴ء میں منعقد ہوئی جو لوڈیشیا کی مجلس کے نام سے مشہور ہے، اس مجلس کے علماء نے بھی پہلی مجلس کے علماء کا فیصلہ کتاب یہودیت کی نسبت برقرار رکھا، اور اس فیصلہ میں ان سات دیگر کتابوں کا اضافہ کرکے ان کو واجب التسلیم قرار دیا، کتاب استیر، یعقوب کا رسالہ، پطرس کا دوسرا رسالہ، یوحنا کا دوسرا اور تیسرا رسالہ، یہوداہ کا رسالہ، پولس کا رسالہ عبرانیوں کی جانب، اس مجلس نے اپنے اس فیصلہ کو عام پیغام کے ذریعہ مؤکد کر دیا اور کتاب مشاہدات ان دونوں مجلسوں میں بدستور خارج اور مشکوک ہی باقی رہی۔

اس کے بعد ۳۹۷ء میں ایک اور بڑی مجلس جو کارتھیج کی مجلس کے نام سے مشہور ہے، منعقد ہوئی اس مجلس کے شرکاء میں عیسائیوں کا مشہور فاضل آگسٹائن اور ۱۲۶ دوسرے مشہور علماء تھے، اس مجلس کے اراکین نے پہلی دونوں مجالس کے فیصلہ کو بدستور باقی رکھتے ہوئے اس پر حسب ذیل کتابوں کا اضافہ کیا (۱) کتاب دانش (۲) کتاب طوبیاہ (۳) کتاب باروخ (۴) کتاب کلیسائی پند و نصائح (۵، ۶) مکابین کی دونوں کتابیں (۷) کتاب مشاہدات یوحنا، مگر اس جلسہ کے شرکاء نے کتاب باروخ کو کتاب یرمیاہ کا تقریباً جزو قرار دیا، اس لئے کہ باروخ علیہ السلام ارمیاہ علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ تھے، اس لئے ان لوگوں نے اسماء کتب کی فہرست میں کتاب باروخ کا نام علیحدہ نہیں لکھا، اس کے بعد تین مجلسیں منعقد ہوئیں، مجلس ٹرلو اور مجلس فلورنس اور مجلس ٹرنٹ ان تینوں مجالس کے علماء نے بھی پہلی کارتھیج کی مجلس کے فیصلہ کو قائم اور باقی رکھا، صرف آخر کی دو مجلسوں نے کتاب باروخ کا نام ان کتابوں کے اسماء کی فہرست میں علیحدہ لکھ دیا۔

ان اسلاف کے فیصلوں سے فرقہ پروٹسٹنٹ کی بغاوت ان کتابوں کی یہ پوزیشن سنہ ۱۳۰۰ء تک بدستور قائم رہی، یہاں تک کہ فرقہ پروٹسٹنٹ نمودار ہوا جنہوں نے اپنے بزرگوں کے فیصلہ کے خلاف کتاب باروخ، کتاب طوبیا، کتاب یہودیت اور کتاب دانش کتاب پند کلیسا اور مکابین کی دونوں کتابوں کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ سب واجب الرد اور غیر مسلم ہیں، اسی طرح اس فرقہ نے کتاب آستر کے بعض ابواب کی نسبت اسلاف کے فیصلہ کو رد کر دیا اور بعض بابوں کے سلسلہ میں

---

[1] یہ قسطنطین اول (CONSTANTINE I) ہے جس کے نام پر بیزنطیہ کو قسطنطنیہ کہا گیا ہے کیونکہ اس نے اسے اپنا پایہ تخت بنایا تھا وفات ۳۳۷ء ۱۲ ت

[2] (ST. JEROME) عیسائیوں کا مشہور عالم اور فاضل سنہ ۳۴۰ء میں پیدا ہوا، اسی نے بائبل کا لاطینی میں ترجمہ کیا اور بائبل کے علوم میں معروف ہوا اس سلسلہ میں اس کی بہت سی تصانیف ہیں سنہ ۴۲۰ء میں انتقال ہوا یاد رہے کہ یہ جان ہس کا شاگرد جیروم متوفی سنہ ۱۴۱۶ء نہیں ہے۔ تقی

ان کے فیصلہ کو تسلیم کیا، کیونکہ یہ کتاب ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے جس میں کے شروع کے ۹ ابواب اور ۱۰ باب کی تین آیتوں کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ یہ واجب التسلیم ہیں اور باقی ۱۶ ابواب واجب الرد ہیں اس انکار اور رد کے سلسلہ میں انہوں نے چھ دلائل پیش کئے۔

(۱) یہ کتابیں اپنی اصل زبانوں عبرانی اور کسدی میں جھوٹی ہیں، اور اس وقت ان زبانوں میں یہ کتابیں موجود بھی نہیں ہیں (۲) یہودی ان کتابوں کو الہامی تسلیم نہیں کرتے (۳) تمام عیسائیوں نے ان کتابوں کو تسلیم نہیں کیا ہے (۴) جیروم کہتا ہے کہ یہ کتابیں دینی مسائل کی تقریر و اثبات کے لئے کافی نہیں ہیں (۵) کلوس نے تصریح کی ہے کہ یہ کتابیں پڑھی جاتی ہیں، لیکن ہر مقام پر نہیں، (۶) یوسی بیس نے کتاب رابع کے باب ۲۲ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتابیں محرف ہو چکی ہیں، خصوصاً مقابین کی دوسری کتاب)

ملاحظہ کیجئے دلیل ۱ و ۳ و ۶ کو کہ ان لوگوں نے کس طرح اپنے اسلاف اور بزرگوں کی اس بددیانتی کا دعویٰ کیا کہ ہزاروں اشخاص کا ان کتابوں کے واجب التسلیم ہونے پر اتفاق کرنا غلط تھا، جن کی اصل اور ماخذ ناپید ہو چکے ہیں ان کے صرف تراجم باقی ہیں اور جو یہودیوں کے نزدیک محرف ہو چکی ہیں بالخصوص مکابین کی دوسری کتاب، اب بتایئے کہ ایسی حالت میں اپنے کسی مخالف کے حق میں ان کے اجماع یا اتفاق کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اس کے برعکس فرقہ کیتھولک والے آج تک ان کتابوں کو اپنے اسلاف کی اتباع میں تسلیم کرتے آئے ہیں۔

بائبل اختلافات سے لبریز ہے:-

بائیس برس یا بیالیس برس؟

کتاب سلاطین ثانی باب ۸ آیت ۲۶ میں کہا گیا ہے کہ "اخزیاہ بائیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور کتاب تواریخ ثانی کے باب ۲۲ آیت ۲ میں یوں ہے: "اخزیاہ بیالیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا" دیکھیے ان دونوں عبارتوں میں کس قدر سخت اختلاف ہے، دوسرا قول یقینی طور پر غلط ہے، چنانچہ ان کے مفسرین نے اس کا اعتراف کیا ہے اور غلط کیونکر نہ ہو؟ جب کہ اس کے باپ یہورام کی عمر بوقت وفات کل چالیس[1] سال تھی اور اخزیاہ اپنے باپ کی وفات کے بعد فوراً تخت نشین ہوتا ہے، جیسا کہ گذشتہ باب سے معلوم ہوتا ہے، ایسی صورت میں اگر دوسرے قول کو غلط نہ مانا جائے تو بیٹے کا اپنے باپ سے دو سال بڑا ہونا لازم آتا ہے۔

چالیس ہزار یا چار ہزار

کتاب سلاطین اول باب ۴ آیت ۲۶ میں اس طرح ہے کہ:

"اور سلیمان کے ہاں اس کے رتھوں کے لئے چالیس ہزار تھان اور بارہ ہزار سوار تھے"

اور کتاب تواریخ ثانی کے باب ۹ آیت ۲۵ میں یوں ہے کہ:

"اور سلیمان کے پاس گھوڑوں کے لئے چار ہزار تھان اور بارہ ہزار سوار تھے"

فارسی اور اردو ترجموں میں بھی اسی طرح ہے، البتہ عربی ترجمہ کے مترجم نے کتاب تواریخ کی عبارت کو بدل ڈالا یعنی چار کے لفظ کو چالیس سے تبدیل[2] کر دیا آدم کلارک مفسر نے کتاب سلاطین کی عبارت کے ذیل میں تراجم اور شروح کا یہ اختلاف نقل کیا ہے، پھر کہتا ہے کہ "بہتر یہی ہے کہ ہم ان اختلافات کے پیش نظر تعداد کے بیان میں تحریف واقع ہونے کا اعتراف کر لیں۔"

---

[1] باب ۲۱ میں ہے کہ "وہ بتیس برس کا تھا جب سلطنت کرنے لگا اور اس نے آٹھ برس یروشلم میں سلطنت کی" [2] ہمارے پاس عربی ترجمے مطبوعہ ۱۸۶۵ء میں چار ہزار ہی کا لفظ ہے، "وکان لسلیما　　اربعۃ آلاف مذود" انگریزی ترجمہ میں بھی ایسا ہی ہے۔ ۱۲ تقی

لٹو، بیل یا ککڑیاں کتاب سلاطین اول کے باب ۷ آیت ۲۴ میں اور کتاب تواریخ ثانی کے باب ۴ آیت ۳ کے درمیان اختلاف موجود ہے ، آدم کلارک اپنی تفسیر جلد ۲ کتاب تواریخ کی عبارت کی شرح کے ذیل میں لکھتا ہے کہ : بڑے بڑے محققین کی رائے یہ ہے کہ اس موقعہ پر کتاب سلاطین کی عبارت کو تسلیم کرلیا جائے البتہ ممکن ہے کہ لفظ "بقریم" "بقیم" کی جگہ استعمال ہوگیا ہو حالانکہ "بقریم" کے معنی بیل کے ہیں اور "بقیم" کے معنی لٹو ہیں ، بہرحال اس علامہ نے کتاب تواریخ میں تحریف واقع ہونے کا اعتراف کرلیا ہے اس لئے اس کے نزدیک کتاب تواریخ کی عبارت غلط ہوئی ہنری واسکاٹ کی تفسیر کے جامعین کہتے ہیں کہ "یہاں پر حروف بدل جانے کی وجہ سے فرق پیدا ہو گیا ہے "

بیس یا پچیس؟ اس طرح کتاب تواریخ ثانی کے باب ۲۸ آیت میں اس طرح ہے کہ :

"آخز بیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے سولہ برس یروشلم میں سلطنت کی"

اور باب ۲۹ میں ہے کہ : "حزقیاہ پچیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا"

یہاں پر بھی ایک عبارت یقیناً غلط ہے اور بظاہر پہلی عبارت ہی غلط معلوم ہوتی ہے ۔

بعشا کا یہوداہ پر حملہ کتاب سلاطین اول باب ۱۵ آیت ۳۳ میں ہے کہ : "شاہ یہوداہ آسا کے تیسرے سال سے اخیاہ کا بیٹا بعشا ترضہ میں سارے اسرائیل پر بادشاہی کرنے لگا اور اس نے چوبیس برس سلطنت کی "

مگر کتاب تواریخ ثانی باب ۱۶ آیت میں یوں ہے کہ :

"آسا کی سلطنت کے چھتیسویں برس اسرائیل کا بادشاہ بعشا یہوداہ پر چڑھ آیا" ۔

ان دونوں عبارتوں میں اختلاف ہے ، ان میں سے ایک یقینی طور پر غلط ہے ، کیونکہ پہلی عبارت کے بموجب بعشا آسا کے چھبیسویں سال میں وفات پا[2] چکا ہے ، اور آسا کی سلطنت کے چھتیسویں سال میں اس کی وفات کو دس سال گذر چکے ہیں تو پھر اس سال اس کا یہوداہ پر حملہ کرنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے ؟ ہنری واسکاٹ کی تفسیر کے جامعین نے کتاب تواریخ کی عبارت کے ذیل میں کہا ہے کہ :

"ظاہر یہ ہے کہ یہ غلط ہے "

آشر جو ایک بڑے پائے کا مسیحی عالم ہے ، کہتا ہے کہ یہ سال یعنی ۳۶ سنہ آسا کی سلطنت کا سال نہیں ہے ، بلکہ بادشاہت کی تقسیم کا سال ہے جو یربعام کے عہد میں ہوئی تھی ، بہرحال ان علماء نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ کتاب تواریخ کی عبارت غلط ہے یا تو ۲۶ کی جگہ ۳۶ کا لفظ لکھا گیا ہے یا لفظ تقسیم بادشاہت کے بجائے آسا کی بادشاہت لکھا گیا ۔

---

[1] ان دونوں مقامات پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بنائے ہوئے ایک حوض کا تذکرہ ہے اور اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کتاب سلاطین میں ہے " اور اس کے کنارے کے نیچے گرداگرد دس ہاتھ تک لٹو تھے ، جو اسے یعنی بڑے حوض کو گھیرے ہوئے تھے ، یہ لٹو دو قطاروں میں تھے اور جب وہ ڈھالا گیا تب ہی یہ بھی ڈھالے گئے " (۲۴ ہے) ، اور کتاب تواریخ میں ہے " اور اس کے نیچے بیلوں کی صورتیں اس کے گرداگرد دس ہاتھ تک تھیں ، اور اس بڑے حوض کو چاروں طرف گھیرے ہوئے تھیں ، یہ بیل دو قطاروں میں تھے اور اسی کے ساتھ ڈھالے گئے تھے " (۳ ہے) یہ الفاظ اردو اور انگریزی ترجمے کے ہیں ، عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۶۵ء کتاب تواریخ میں لٹو اور بیلوں کے بجائے ککڑیوں کا تذکرہ ہے : " وشبہ قثاء تحتہ مستدیرۃ " ملاحظہ فرمایئے کہاں لٹو ؟ کہاں بیل ؟ اور ککڑیاں ! [2] کیونکہ اس نے چوبیس برس سلطنت کی ، اور آسا کے بادشاہ ہونے کے دو سال بعد وہ بیٹھا تھا ، اس طرح ۲۶ سال ہوئے ، اور سلاطین اول ہی میں ہے کہ بعشا اپنے باپ دادا کے ساتھ سوگیا (۱۶ ہے) اور شاہ یہوداہ آسا کے چھبیسویں سال سے بعشا کا بیٹا ایلہ ترضہ میں بنی اسرائیل پر سلطنت کرنے لگا (۸ ہے)

بل کی قید سے رہا ہونے والوں کی تعداد

جو شخص کتاب عزرا کے باب ۲ کا مقابلہ کتاب نحمیاہ کے باب ۷ سے کرے گا، اکثر مقامات پر دونوں میں بڑا سخت اختلافات پائے گا اور اگر ہم اختلاف سے قطع نظر بھی کر لیں، تب بھی ایک غلطی
نوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ کہ دونوں حاصل جمع میں متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ جو لوگ بابل کی قید سے رہائی پانے کے بعد وہاں سے اورشلیم آئے ہیں، ان کی
داد بیالیس ہزار تین سو ساٹھ افراد تھی، لیکن اگر ہم جمع کرتے ہیں تو یہ تعداد حاصل نہیں ہوتی نہ عزرا میں نہ نحمیاہ میں بلکہ پہلی میں حاصل جمع انتیس ہزار آٹھ سو
ٹھارہ اور دوسری میں اکتیس ہزار نو سو اسی ہوتی ہے اور تعجب یہ ہے کہ یہ متفقہ میزان مؤرخین کی تصریح کے مطابق غلط ہے۔
تیفس اپنی تاریخ کی کتاب ۱۱ باب میں کہتا ہے کہ: "جو لوگ بابل سے اورشلیم آئے — ان کی مردم شماری بیالیس ہزار چار سو باسٹھ افراد
ی: ہنری واسکاٹ کی تفسیر کے جامعین عزرا کی عبارت کی شرح کے ذیل میں کہتے ہیں کہ: "اس باب میں اور کتاب نحمیا کے باب ۷ میں کاتبوں کی غلطی
ے بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے، اور جب انگریزی ترجمہ کی تالیف ہوئی تو اس کے بہت حصہ کی دوسرے نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تصحیح کر دی گئی
باقی میں یونانی ترجمہ عبرانی متن کی شرح میں متعین ہو گیا۔"
رفرمائیں کہ یہ حالت ان کی مقدس کتابوں کی ہے۔ یہ لوگ تصحیح کے پردے میں ایسی زبردست تحریف کرتے ہیں کہ صدیوں سے تسلیم شدہ چیز ایک ہی آن
خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے، اس کے باوجود اغلاط موجود ہیں۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ کتابیں اصل ہی سے غلط ہیں، تصحیح کرنے والوں
اس کے سوا کوئی تصور نہیں کہ وہ بے چارے جب عاجز ہو گئے تو انہوں نے ان بے گناہ کاتبوں کے سر ڈال دیا، جن کو اس سازش کی خبر بھی نہیں،
ب جو صاحبان دو بابوں میں غور کریں گے تو اغلاط اور اختلافات کی تعداد میں سے بھی زیادہ دستیاب ہونگی، آئندہ کا حال خدا جانے کہ وہ کس طرح
ـــــریف کریں گے؟

لٰلہ یا شیطان؟

سفر سموئیل ثانی باب ۲۴ آیت ۱ میں یوں ہے کہ:
"اس کے بعد خداوند کا غصہ اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے داؤد کے دل کو ان کے خلاف یہ
کہہ کر ابھارا کہ جا کر اسرائیل اور یہوداہ کو گن۔"
: تواریخ اول باب ۲۱ آیت ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال ڈالنے والا شیطان تھا اور چونکہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق خدا خالق شر نہیں ہے اس لئے
ا سخت اختلاف لازم آگیا۔

، اس مقام پر دونوں بابوں میں ناموں کے اختلافات کو چھوڑ کر صرف گنتی کے بیس اختلافات موجود ہیں جن میں سے بعض ہم نمونہ کے طور پر ذیل کے نقشے میں پیش کرتے ہیں۔ اس
ں بابل کی قید سے رہائی پانے والوں کی مردم شماری کی گئی ہے۔

یت نمبر	الفاظ کتاب عزرا ۲	آیت نمبر	کتاب نحمیاہ ۷
۶	بنی پخت ..... دو ہزار آٹھ سو بارہ	۱۱	بنی پخت آب ..... دو ہزار آٹھ سو اٹھارہ
۸	بنی زتو نو سو پینتالیس	۱۳	بنی زتو آٹھ سو پینتالیس
۱۲	بنی عزجاد ایک ہزار دو سو بائیس	۱۷	بنی عزجاد دو ہزار تین سو بائیس
۱۵	بنی عدین چار سو چون	۲۰	بنی عدین چھ سو پچپن
۱۹	بنی حاشوم دو سو تیئیس	۲۲	بنی حاشوم تین سو اٹھائیس
۲۸	بیت ایل اور عی کے لوگ دو سو تیئیس	۳۲	بیت ایل اور عی کے لوگ ایک سو تیئیس

ولادت مسیح کے بعد حضرت مریمؑ کہاں رہیں

متی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے والدین مسیح کی پیدائش کے بعد — بیت اللحم ہی میں رہتے تھے، اور اس کے بعد ایک کلام سے واضح ہوتا ہے کہ بیت اللحم کی قیام کی مدت تقریباً دو سال تھی اور چونکہ وہاں آتش پرستوں کا تسلط ہو گیا تو ان کے والدین مصر چلے گئے اور ہیرودیس کی زندگی مصر ہی میں رہتے رہے، اس کے مرنے کے بعد واپس لوٹے تو ناصرہ میں قیام کیا اس کے برعکس لوقا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے والدین ان کی پیدائش کے بعد زچگی کے دن پورے کرتے ہی اورشلیم چلے گئے تھے، اور قربانی ادا کر کے ناصرہ چلے آئے تھے، اور وہاں دونوں کا مستقل قیام رہا، البتہ سال بھر میں صرف عید کے موقع پر اورشلیم چلے جاتے تھے، ہاں مسیح علیہ السلام نے ضرور سال باپ کی اجازت و اطلاع کے بغیر عمر کے بارہویں سال میں اورشلیم میں تین روز قیام کیا۔ اس کے بیان کے مطابق آتش پرستوں کے بیت اللحم میں آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر ان کی آمد کو تسلیم ہی کیا جائے تو وہ ناصرہ میں ہو سکتی ہے کیونکہ راستے میں ان کی آمد بہت ہی بعید ہے یہ بھی ممکن نہیں کہ ان کے والدین مصر آ گئے ہوں اور وہاں ہی ان کا قیام رہا ہو کیونکہ اس کلام میں تصریح موجود ہے کہ یوسف نے یہوداہ کے علاقہ سے کبھی باہر قدم ہی نہیں نکالا نہ مصر کی جانب دوسری طرف۔

لاٹھی ساتھ لینے کی ممانعت

انجیل متی کے باب ۱۰ آیت ۱۰ اور انجیل لوقا کے باب ۹ آیت ۳ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسیح نے جب حواریوں کو روانہ کیا تو ان کو اپنے ساتھ لاٹھی رکھنے سے منع کیا، انجیل مرقس باب ۶ آیت ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے ان کو لاٹھی لینے کی اجازت دی تھی۔

حضرت یحییٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کو کب پہچانا؟

انجیل متی کے باب ۳ میں کہا گیا ہے کہ جب عیسیٰؑ یحییٰؑ کے پاس اصطباغ کے لئے آئے، تو یحییٰ نے ان کو یہ کہہ کر منع کیا کہ میں خود آپ سے بپتسمہ لینے کا محتاج ہوں اور آپ میرے پاس آتے ہیں، پھر عیسیٰؑ نے ان سے اصطباغ لیا، اور پانی میں چلے، پھر آپ پر کبوتر کی شکل میں خدا کی روح نازل ہوئی اور انجیل یوحنا کے باب ۱ میں لکھا ہے کہ:

> "یوحنا نے یہ گواہی دی کہ میں نے روح کو کبوتر کی طرح آسمان سے اترتے دیکھا ہے اور وہ اس پر ٹھہر گیا اور میں تو اسے پہچانتا نہ تھا مگر جس نے مجھے پانی کے بپتسمہ دینے کو بھیجا اسی نے مجھ سے کہا کہ جس پر تو روح کو اترتے ٹھہرتے دیکھے وہی روح القدس سے بپتسمہ دینے والا ہے"

ہ پس وہ اٹھا اور بچے اور اس کی ماں کو لے کر اسرائیل کے ملک میں آ گیا (متی ۲:۲۱) ؎ ہیرودیس (HEROD THE GREAT) یہوداہ کا بادشاہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت بنی اسرائیل پر حکومت کرتا تھا۔ ۱۲ ؎ اور پھر جب موسیٰ کی شریعت کے موافق ان کے پاک ہونے کے دن پورے ہو گئے تو وہ اس کو یروشلم میں لائے تاکہ خداوند کے آگے حاضر کریں (لوقا ۲:۲۲) ؎ اور جب وہ خداوند کی شریعت کے مطابق سب کچھ کر چکے تو گلیل میں اپنے شہر ناصرہ کو پھر گئے (۲:۳۹) اس کے ماں باپ ہر برس عید فسح پر یروشلم جایا کرتے تھے (۲:۴۱) ؎ راستہ کیلئے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے، نہ جوتیاں نہ لاٹھی (۱۰:۱۰) ؎ راستہ کے لئے لاٹھی کے سوا کچھ نہ لو (مرقس ۶:۸) ؎ اصطباغ (BAPTISM) عیسائیوں کی ایک رسم ہے کہ وقت کا بزرگ ترین شخص لوگوں کو پانی میں یا کسی رنگ میں نہلاتا ہے، عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس طرح گناہ دھل جاتے ہیں کوئی شخص نیا نیا عیسائی ہو تو اس کو سب سے پہلے اصطباغ کیا جاتا ہے اور اہل یورپ اس عمل کو "بپتسمہ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ۱۲ تقی ؎ آیت ۳۲، ۳۳ ؎ یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام ——— (م ق کا حاشیہ) ؎ یہ ایک یہودی کاہن تھا اپنے عہد کے بادشاہوں کا منظور نظر اس نے یونانی زبان میں اپنی قوم کی تاریخ لکھی تھی ؎ اس وقت بھی انگریزی ترجمہ میں تقریباً ... موجود ہیں ... فرمایئے کہ بہت سے ... اسرائیل کے خلاف اللہ کو ... کہ اسرائیل کا شمار کرے؟

نجیل متی کے باب۱۱ میں یوں ہے کہ "اور یوحنا نے قید خانہ میں مسیح کے کاموں کا حال سن کر اپنے شاگردوں کی معرفت پچھوا بھیجا کہ آنے والا تو ہی ہے ،
دوسرے کی راہ دیکھیں ، "

عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ عیسیٰ کو نزول روح کے پہلے سے جانتے تھے[۱] اس کے برعکس دوسری عبارت یہ کہتی ہے کہ نزول روح سے پہلے بالکل ناواقف
بعد میں پہچانا ، تیسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول روح کے بعد بھی ان کو نہیں پہچانا ،[۲]

منف میزان الحق نے اپنی کتاب حل الاشکال کے صفحہ ۱۳۳ پر پہلی دونوں عبارتوں کی ایسی توجیہ کی ہے جس کی تردید استفسار کے مصنف نے کامل طور
دی ہے اور یہ تردید مجھ تک پہونچی ، اسی طرح میں نے بھی اس کی تردید اپنی کتاب فوائد الشکوک میں کی ہے[۳]۔ چونکہ توجیہ کمزور تھی اور اس سے متی کی
ان عبارتوں کا اختلاف دور نہیں ہوتا تھا ، اس لئے میں نے تطویل کے اندیشہ سے یہاں ترک کر دی ہے -

پطرس کا انکار

چاروں انجیل والے پطرس کے انکار[۴] کے سلسلہ میں آٹھ لحاظ سے اختلاف کر رہے ہیں -

(۱) متی[۵] اور مرقس[۶] کی روایت کے مطابق پطرس کو حضرت عیسیٰ کا شاگرد ٹھہرانے والی دو لڑکیاں تھیں اور کچھ پاس کھڑے
کے مرد - اور لوقا کی روایت کے مطابق[۷] ایک باندی اور دو مرد تھے ،

(۲) اپنی باندی کے سوال کرتے وقت متی کی روایت کے مطابق پطرس مکان کے صحن[۸] میں تھے ، اور لوقا کی روایت کے مطابق مکان کے درمیان میں تھے
مرقس کے بیان کے موافق مکان کے نیچے کے حصے میں[۹] اور یوحنا کے قول کے مطابق[۱۰] کے اندر -

(۳) پطرس سے کیا سوال کیا گیا ؟ اس میں چاروں انجیلوں کا اختلاف پایا جاتا ہے[۱۱]۔

(۴) مرغ کا بولنا متی اور لوقا و یوحنا کی روایت کے مطابق صرف ایک مرتبہ ہوا یعنی جب کہ پطرس تین مرتبہ انکار کر چکا اور مرقس کے بیان کے مطابق تین
مرتبہ ، ایک دفعہ پہلے انکار کے بعد اور دو مرتبہ دوبارہ انکار کے بعد ،

(۵) متی اور لوقا لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پطرس سے کہا تھا کہ مرغ کے بانگ دینے سے پہلے تین بار میرا انکار کرے گا اور مرقس کہتا ہے کہ عیسیٰ
علیہ السلام نے کہا تھا کہ تو مرغ کے دو مرتبہ بولنے سے پہلے تین بار میرا انکار کرے گا۔

---

[۱] کیونکہ آپ نے بپتسمہ دینے سے پہلے اسی بناء پر انکار کیا ۔ [۲] اسی لئے شاگردوں کو بھیجا ۱۲۔ [۳] ص ۲۰۲ ج ۱ اول ، اس موضوع پر مصنف نے بڑی قیمتی بحث کی ہے شائقین
مطالعہ کریں ۱۲ [۴] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (بروایت انجیل) گرفتار ہونے سے ایک روز پہلے رات کو پطرس سے کہا تھا کہ تم مرغ کے اذان دینے سے پہلے
مرتبہ مجھے پہچاننے سے انکار کرو گے ، چنانچہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر لیا تو پطرس ان کے پیچھے پیچھے گئے اور تین یہودیوں نے انہیں
ری باری آگ میں دیکھ کر کہا کہ یہ بھی ان کا ساتھی ہے ، مگر پطرس نے ہر بار حضرت عیسیٰ کا ساتھی ہونے اور آپ کو پہچاننے سے انکار کیا اتنے میں مرغ بول پڑا
انہیں حضرت عیسیٰ کی کہی ہوئی بات یاد آئی ، مصنف نے یہاں اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے ۱۲۔ [۵] متی ۲۶ / ۶۹ ، ۷۲ [۶] مرقس ۱۴ / ۶۶ ، ۷۲ میں مذکور ہے
ایک لونڈی نے دو مرتبہ یہ بات کہی ، پھر آخر میں پاس کھڑے ہونے والوں نے بھی اس کی تصدیق کی [۷] ۲۲ / ۵۶ ، ۶۰ [۸] آیت ۶۹ [۹] آیت
۶۶ [۱۰] یوحنا ۱۸ / ۱۶ ۔ [۱۱] یوحنا میں ہے کہ " کیا تو بھی اس شخص کے شاگردوں میں سے ہے ؟ " (۱۸ / ۱۷) لوقا میں ہے کہ لونڈی نے
سوال نہیں کیا اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ بھی اسی کے ساتھ تھا ، مرقس اور متی کا بیان ہے کہ خود پطرس سے خطاب کر کے کہا : " تو بھی
یسوع گلیلی کے ساتھ تھا "

(۶) پطرس کا جواب اس باندی کو جس نے پہلے سوال کیا تھا متی کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ "میں نہیں جانتا کہ تو کیا کہتی ہے" اور یوحنا کی روایت کے مطابق صرف "میں نہیں ہوں" اور مرقس کی روایت کے بموجب "میں نے تو نہ جانا اور نہ سمجھتا ہوں کہ تو کیا کہتی ہے!" اور لوقا کے بیان کے موافق "اے عورت میں اس کو نہیں جانتا"

(۷) متی کی روایت کے مطابق پطرس نے دوسرے سوال کا جواب قسم کھا کر اس طرح دیا: "میں اس آدمی کو نہیں جانتا" اور یوحنا کی روایت کے مطابق اس کا قول یہ ہے کہ: "میں نہیں ہوں" اور مرقس کی روایت کے مطابق فقط انکار، اور لوقا کی روایت کے مطابق "میں نہیں ہوں"

(۸) کھڑے ہوئے لوگ مرقس کے بیان کے موافق سوال کے وقت گھر سے باہر تھے، اور لوقا کے کہنے کے موافق وہ صحن کے درمیان میں تھے۔

مسیح علیہ السلام کے ساتھ ڈاکوؤں کا سلوک

متیؔ اور مرقس ان ڈاکوؤں کے بارے میں جن کو حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ سولی دی گئی کہتے ہیں کہ "وہ ڈاکو بھی جو اس کے ساتھ مصلوب ہوئے تھے اس پر یہی طعن کرتے تھے" لیکن لوقا[۱] کا بیان یہ ہے کہ ایک نے مسیح کو بے شرم کہا اور دوسرے نے اس سے چلا کر کہا کہ: "اے یسوع! جب تو اپنی بادشاہی میں آئے تو مجھے یاد کرنا[۲]" پھر مسیح نے اس کو جواب دیا کہ آج ہی تو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا۔ ہندی ترجموں مطبوعہ ۱۸۳۹ء و ۱۸۴۰ء و ۱۸۴۴ء و ۱۸۳۶ء کے مترجموں نے متی اور مرقس کی عبارت میں تحریف کر ڈالی اور اختلاف دور کرنے کے لئے "تثنیہ" کو مفرد سے بدل ڈالا[۳] یہ بات ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے جس کی چھوٹنے کی امید نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ کا دوبارہ زندہ ہونا

متی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے[۴] کہ مریم مگدلینی اور دوسری مریم[۵] جب قبر کے پاس پہنچیں تو خدا کا فرشتہ نازل ہوا اور پتھر قبر سے لڑھک گیا، اور وہ اس پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ تم مت ڈرو اور جلدی[۶] چلی جاؤ، اور مرقس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں اور سلومی جب قبر کے پاس پہونچیں تو دیکھا کہ پتھر لڑھکا ہوا ہے اور جب قبر میں داخل ہوتے تو ایک سفید ریش جوان کو قبر میں داہنے جانب بیٹھا دیکھا[۷] اور لوقا کا بیان یہ ہے کہ: "یہ جب پہونچیں تو پتھر کو لڑھکا ہوا پایا، پھر وہ قبر میں داخل ہوگئیں مگر مسیح کا جسم نہ پایا تو حیران ہوگئیں، اچانک اپنے پاس دو شخصوں کو دیکھا کہ سفید کپڑے پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔

پولس کے عیسائی ہونے کا واقعہ

کتاب الاعمال کے باب ۹ باب ۲۲ اور باب ۲۶ میں پولس کے ایمان لانے کا حال لکھا ہے[۸] اور تینوں ابواب میں کئی لحاظ سے اختلاف ہے ہم اس کتاب میں صرف تین وجوہ نقل کرتے ہیں، البتہ اپنی کتاب ازالۃ الشکوک میں ہم نے دس وجوہ لکھی ہیں۔

---

۱ متی ۲۷/۴۴ و مرقس ۱۵/۳۲ ۔ ۲ ۲۳/۴۲ ۳ صرف یہی نہیں! اس سے پہلے یہ بھی ہے کہ جب آپ کو لعن طعن کیا تو "دوسرے نے اسے جھڑک کر جواب دیا کہ کیا تو خدا سے بھی نہیں ڈرتا حالانکہ اسی سزا میں گرفتار ہے؟" (۲۳/۴۰) ۳ مگر موجودہ اردو ترجموں میں تثنیہ ہی کا صیغہ ہے۔ ۴ متی ۲۸/۱ ۵ یہ دونوں انجیل کی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیرو تھیں۔ اور آپ کی قبر پر زیارت کے لئے آئی تھیں، ۱۲ ۶ انہیں متی ۲۷/۵۶ میں یوسیس کی ماں کہا گیا ہے اور لوقا ۲۴/۱۰ میں یعقوب کی ماں ۱۲ ۶ پورے الفاظ "تم نہ ڈرو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم یسوع کو ڈھونڈتی ہو جو مصلوب ہوا تھا وہ یہاں نہیں ہے کیونکہ مردوں میں سے جی اٹھا ہے (۲۸/۵) ۷ مرقس ۱۶/۵ پھر اس نے وہی بات کہی جو متی ۲۸/۲ سے ہم نے نقل کی ۸ لوقا ۲۴/۴ ۹ اس اختلاف کو بخوبی سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بائبل کے مطابق پولس جو یہودی تھا عیسائیوں کی دشمنی میں دمشق جا رہا تھا راستے میں ایک نور اس پر چمکا اور اسے عیسائی ہونے کی ترغیب میں حضرت مسیح کی آواز سنائی دی۔

(۱) یہ کہ باب ۹ میں یوں[1] ہے کہ: "جو آدمی اس کے ہمراہ تھے وہ خاموش کھڑے رہ گئے کیونکہ آواز تو سنتے تھے مگر کسی کو دیکھتے نہ تھے اور باب ۲۲ میں یوں[2] ہے کہ: "اور میرے ساتھیوں نے نور تو دیکھا، لیکن جو مجھ سے بولتا تھا اس کی آواز نہ سنی"

دیکھئے پہلی عبارت میں "آواز تو سنتے تھے" اور دوسری میں "آواز نہ سنی" دونوں کس قدر مختلف ہیں!

(۲) دوسرے باب ۹ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ: "اس سے خدا نے کہا کہ: اٹھ اور شہر میں جا اور جو تجھے کرنا چاہئے وہ تجھ سے کہا جائے گا اور باب ۲۲ میں بھی ہے کہ "خداوند نے مجھے کہا کہ اٹھ کر دمشق میں جا، جو کچھ تیرے کرنے کیلئے مقرر ہوا ہے وہاں تجھے سب کہا جائے گا۔

لیکن باب ۲۶ میں اس طرح ہے کہ:

"اٹھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کیونکہ میں اس لئے تجھ پر ظاہر ہوا ہوں کہ تجھے ان چیزوں کا بھی خادم اور گواہ مقرر کروں جن کی گواہی کے لئے میں تجھے اس امت اور غیر قوموں سے بچاتا رہوں گا جن کے پاس تجھے اس لئے بھیجتا ہوں کہ تو ان کی آنکھیں کھول دیگا کہ اندھیرے سے روشنی کی طرف اور شیطان کے اختیار سے خدا کی طرف رجوع لائیں اور مجھ پر ایمان لانے کے باعث گناہوں کی معافی اور مقدسوں میں شریک ہو کر میراث پائیں"

دیکھئے پہلے دونوں بابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پولس کے ذمہ جو کام تھا اس کی تفصیل و توضیح کو شہر میں پہونچنے پر موقوف رکھا گیا تھا اور تیسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آواز سننے کے مقام پر ہی اس کو بیان کر دیا گیا، پہلی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کے ساتھ تھے وہ خاموش کھڑے ہو گئے، اور تیسری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین[3] پر گر پڑے اور دوسری عبارت کھڑے رہنے اور گرنے کے معاملہ میں خاموش ہے،

حضرت یحییٰ کی گرفتاری کا سبب

انجیل مرقس باب ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرودیس یحییٰ علیہ السلام کی نیکی کا معتقد اور ان سے بہت خوش تھا۔ ان کا وعظ بھی سنتا تھا[4] اس نے ان پر جو کچھ بھی ظلم کیا وہ محض ہیرودیاس[5] کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے، لیکن اس کے برعکس لوقا کی انجیل باب ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف[6] ہیرودیاس کی رضا جوئی کی خاطر یحییٰ پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنی خوشنودی بھی اس میں شامل تھی، کیونکہ وہ یحییٰ سے اپنی بدکاریوں کی بنا پر نالاں اور ناراض تھا۔

بارہ[12] حواریوں کے نام

متی و مرقس اور لوقا تینوں ان گیارہ حواریوں کے نام میں اتفاق رائے رکھتے ہیں یعنی پطرس[1] ۲۔ اندریاس ۳۔ یعقوب بن زبدی ۴۔ یوحنا ۵۔ فیلپس ۶۔ برتلمائی ۷۔ توما ۸۔ متی ۹۔ یعقوب بن حلفئی ۱۰۔ شمعون قنانی ۱۱۔ یہوداہ اسکریوتی، لیکن بارہویں حواری کے نام میں سب کا اختلاف ہے، متی کا بیان ہے کہ اس کا نام لبادس ہے اور لقب تدی[7] تھا مرقس تدادس[8] بیان کرتا ہے، لوقا کہتا ہے کہ وہ یہوداہ ہے یعقوب کا بھائی[9] ۔

---

[1] آیت ۷ [2] آیت ۹ [3] "جب ہم سب گر پڑے تو میں نے عبرانی زبان میں یہ آواز سنی" (اعمال ۲۶/۱۴) [4] ہیرودیس یوحنا کو راستباز اور مقدس آدمی جان کر اس سے ڈرتا اور اسے بچائے رکھتا تھا اور اس کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا تھا مگر سنتا خوشی سے تھا (۶/۲۰) [5] ہیرودیس کی بیوی جو پہلے اس کی بھاوج تھی اس سے شادی کرنے پر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ہیرودیس کو منع کیا تھا جس پر ہیرودیس نے آپ کو گرفتار کرا دیا (دیکھئے مرقس ۶/۱۷) [6] اپنے بھائی فلپس کی بیوی۔ ہیرودیس کے سبب سے اور ان سب بدیوں کے باعث جو ہیرودیس نے کی تھیں (۳/۱۹) [7] عربی اور انگریزی ترجموں میں ایسا ہی ہے مگر اردو ترجمے میں صرف "تدی" مذکور [illegible]

اعظم الحوارین یا شیطان

متی نے اپنی انجیل کے باب ۱۶ میں نقل کیا ہے کہ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پطرس کو اعظم الحوا قرار دیا ہے، اس طرح کہ ان سے فرمایا "میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پر اپنی کلیسیا بناؤں گا اور عالم ارواح کے دروازے اس پر غالب نہ آئیں گے میں آسمان کی بادشاہی کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا۔" پھر اسی باب میں آگے پطرس ہی کے حق میں حضرت عیسیٰ کا قول اس طرح نقل کیا ہے: "اے شیطان! میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے، کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے" علماء پروٹسٹنٹ نے اپنے رسالوں میں قدیم عیسائیوں کے جو اقوال پطرس کی مذمت میں نقل کئے ہیں، منجملہ اس کے یوحنا نے اپنی تفسیر متی میں تصریح کی ہے کہ پطرس میں تکبر کی بیماری تھی۔ اور شدید مخالفت کی "وہ بہت کم عقل انسان تھا۔"
اگسٹائن کہتا ہے کہ: یہ شخص ثابت قدم اور پختہ نہیں تھا، کبھی تصدیق کرتا تھا اور کبھی شک کرنے لگتا، غور کیجئے کہ جو شخص ان صفات کے موصوف ہو کیا وہ آسمانوں کی کنجیوں کا مالک ہو سکتا ہے! اور کیا کوئی شیطان ایسا بھی ممکن ہے کہ جس پر جہنم کے دروازے قابو نہ پاسکیں

انجیر کے سوکھنے کا واقعہ

متی کے باب ۲۱ میں حضرت عیسیٰ کے متعلق نقل کیا ہے کہ:

"اور راہ کے کنارے انجیر کا ایک درخت دیکھ کر اس کے پاس گیا اور پتوں کے سوا اس میں کچھ نہ پاکر اس سے کہا کہ آئندہ تجھ میں کبھی پھل نہ لگے اور انجیر کا درخت اسی دم سوکھ گیا، شاگردوں نے یہ دیکھ کر تعجب کیا اور کہا یہ انجیر کا درخت کیونکر ایک دم میں سوکھ گیا، پھر حضرت مسیح نے انہیں جواب دیا"

اس کے برعکس انجیل مرقس باب ۱۱ میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

"اور وہ دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے، مگر جب اس کے پاس پہونچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا، کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا اس نے اس سے کہا کہ آئندہ کوئی تجھ سے کبھی پھل نہ کھائے اور اس کے شاگردوں نے سنا۔"

اس کے بعد مذکور ہے کہ آپ یروشلم تشریف لے گئے اور جب شام ہوئی تو شہر سے باہر تشریف لے گئے پھر صبح کے وقت جب آپ کا گذر دوبارہ ادھر سے ہوا تو اس انجیر کے درخت کو جڑ تک سوکھا ہوا دیکھا، پطرس کو وہ بات یاد آئی۔ اور اس سے کہنے لگا "اے ربی! دیکھ یہ انجیر کا درخت جس پر لعنت کی تھی سوکھ گیا ہے" اس پر حضرت مسیح نے جواب دیا، غور فرمایئے کہ دونوں عبارتوں میں کتنا شدید اختلاف ہے، پھر اختلاف کے علاوہ ایک دوسری اور بھی ہے وہ یہ کہ شرعی حیثیت سے عیسیٰؑ کو یہ حق کب حاصل تھا کہ اس درخت کا پھل بغیر اس کے مالک کی اجازت کے کھائیں؟ اور درخت کو بددعا دینا جس سے سراسر مالک کا نقصان مقصود ہے یقیناً عقل کے خلاف ہے اور یہ بات بھی بعید از عقل ہے کہ بغیر موسم میں درخت سے پھل کی توقع کی جائے اور نہ ہونے پر اس غریب پر غصہ کیا جائے، بلکہ شانِ اعجاز کا مقتضی تو اس موقع پر یہ تھا کہ درخت کے حق میں ایسی دعا کی جاتی کہ وہ فوراً پھلدار ہو جاتا اور پھر مالک کی اجازت سے آپ بھی اس کو کھاتے اور مالک کا بھی فائدہ ہوتا۔

۱؎ آیت ۱۸ و ۱۹ ۲؎ چنانچہ رومن کیتھولک فرقہ پطرس کو تمام حواریوں میں افضل قرار دیتا ہے اور پروٹسٹنٹ اسے تسلیم نہیں کرتا۔
۳؎ آیت ۲۳ ۴؎ ۱۸ تا ۲۰ ۵؎ آیت ۱۳ و ۱۴۔

یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مسیح خدا نہ تھے، اس لئے کہ اگر خدا ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ درخت پر پھل نہیں ہے اور نہ یہ پھل کا موسم ہے
آپ اس پر غضبناک ہوتے،

حضرت مسیح کے سر پر عطر ڈالنے کا واقعہ

جس شخص نے بھی اس عورت کا واقعہ[1] جس نے مسیح پر خوشبو کی شیشی الٹ دی تھی انجیل متی کے باب ۲۶ میں اور انجیل مرقس کے باب ۱۴ میں اور انجیل یوحنا کے باب ۱۲ میں
ملاحظہ کیا ہوگا اس کو چھ قسم کے اختلاف نظر آئیں گے۔

۱) مرقس[2] نے تصریح کی ہے کہ یہ واقعہ فسح[3] سے دو روز قبل کا ہے، یوحنا کا بیان ہے کہ ۶[4] روز قبل کا ہے، متی عید[5] سے قبل کی مدت بیان کرنے سے خاموش ہے۔[6]

۲) مرقس اور متی دونوں اس واقعہ کا محل وقوع شمعون ابرص کا گھر بیان کرتے ہیں اور یوحنا اس کی جگہ مریم[7] کا مکان ذکر کرتا ہے۔

۳) ..... متی اور مرقس[8] خوشبو کا مسیح کے سر پر ڈالنا ذکر کرتے ہیں اور یوحنا پاؤں[9] کا ذکر کرتا ہے۔

۴) مرقس کا بیان ہے کہ معترضین حاضرین میں سے کچھ لوگ تھے[10] اور متی کہتا ہے کہ اعتراض کرنے والے خود مسیح کے شاگرد تھے اور یوحنا کے نزدیک معترض یہودا[11] تھا۔

۵) یوحنا خوشبو کی قیمت ۳۰۰ دینار بتاتا ہے اور مرقس نے مبالغہ کرتے ہوئے تین سو سے زائد مقدار بیان کی ہے، متی قیمت کو گول مول کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ بیش قیمت تھا۔

۶) تینوں راوی عیسیٰ علیہ السلام کا قول مختلف نقل کرتے ہیں۔

تعدد قصوں پر اس کو محمول کرنا نہایت بعید ہے، کیونکہ یہ بات بہت ہی بعید ہے کہ ہر مرتبہ خوشبو لگانے والی عورت ہی ہو، اور ہر وقت کھانے

---

[1] یہ واقعہ انجیل متی کی رو سے مختصراً یہ ہے کہ عید سے دو روز قبل حضرت مسیح بیت عنیاہ میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک عورت نے نہایت ہی قیمتی عطر لا کر آپ کے سر میں ڈال دیا جس پر حواری خفا ہوئے کہ خواہ مخواہ ایک قیمتی عطر ضائع کیا گیا ورنہ غریبوں کے کام آسکتا تھا حضرت مسیح نے سن کر انہیں تنبیہ کی کہ غریب تو ہمیشہ تمہارے پاس ہیں میں ہمیشہ تمہارے پاس نہ رہوں گا۔ ۱۲ [2] نیز متی نے بھی تصریح کی ہے (آیت ۲) [3] عید فسح PASSOVER یہودیوں کا مذہبی تہوار ہے جو ماہ نیسان (اپریل) کی چودھویں تاریخ کو منایا جاتا ہے اور درحقیقت یہ بنی اسرائیل کے مصریوں سے نجات پانے کی یادگار تھی، چونکہ اسی تاریخ میں موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تھے، (فسح) دنبے کو کہتے ہیں، اور چونکہ اس دن میں ایک دنبہ ذبح کیا جاتا تھا اس لئے اُسے عید فسح کہتے ہیں اس عید کو منانے کے تفصیلی احکام خروج ۱۲/۱۵ احبار ۲۳/۵-۸ اور گنتی ۲۸/۱۶-۲۵ میں دیکھے جاسکتے ہیں ۱۲ تقی
[4] مرقس ۱۴/۱، [5] پھر یسوع عید فسح سے چھ روز پہلے بیت عنیاہ میں آیا، (یوحنا ۱۲/۱)
[6] لیکن ہمارے پاس سب ترجموں میں اس نے دو دن پہلے کی مدت بیان کی ہے (۲۶/۲) شاید مصنف کے نسخہ میں یہ عبارت نہ ہو۔
[7] بائبل میں اگرچہ لعزر کا مکان مذکور ہے مگر چونکہ وہ مریم کا بھائی تھا اس لئے اس کے گھر کو مریم کا گھر بھی کہہ سکتے ہیں ۱۲
[8] متی ۲۶/۷ مرقس ۱۴/۳، [9] یسوع کے پاؤں پر ڈالا (یوحنا ۱۲/۳)
[10] بعض اپنے دل میں خفا ہو کر کہنے لگے" (۱۴/۴) [11] یعنی اسکریوتی (۱۲/۴)

وقت ہی یہ صورت پیش آئے اور ہر قصہ میں دعوت طعام کی ہی شکل ہو؟ ہر مرتبہ ہر موقع پر معترضوں نے بالخصوص شاگردوں نے وہ ہی اعتراض کیا ہو، حالانکہ یہ لوگ پہلی مرتبہ تھوڑے دن قبل عیسٰی سے اس عورت کے فعل کی درستی اور اچھائی سُن چکے تھے اور یہ کہ ہر واقعہ میں اس خوشبو کی قیمت ۳۰۰ دینار یا اس سے کچھ زیادہ ہی ہو اس کے علاوہ عیسٰی کی دو مرتبہ عورت کے فعل اسراف کی تصویب کرنا گویا ۶۰۰ دینار سے زیادہ کی فضول خرچی کو صحیح کہنا خود اسراف ہے، سچی بات یہ ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے اور یہ اختلاف انجیل کے ناقلوں کی عادت کے مطابق ہے۔

عشائے ربانی کا واقعہ

جو شخص لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ کا مقابلہ متی کی انجیل کے باب ۲۶ سے اور مرقس کی انجیل کے باب ۱۴ سے عشاء ربانی[1] کے حال کے بیان میں کرے گا تو اس کو دو اختلاف نظر آئیں گے۔ لوقا دو پیالے کا ذکر کرتا ہے ایک کھانے کے وقت دوسرا اس کے بعد[2]۔ اور متی و مرقس صرف ایک کا ذکر کرتے ہیں، غالباً متی اور مرقس کا بیان درست ہے اور لوقا کا غلط ہے ورنہ کیتھولک والوں پر خصوصیت کے ساتھ بڑا اشکال پڑے گا، اس لئے کہ ان کو اس بات کا اقرار ہے کہ روٹی اور شراب پورے مسیح کی ذات میں منتقل ہو جاتے ہیں اب اگر لوقا کا بیان درست مان لیا جائے تو لازم آتا ہے کہ ہر پیالہ کامل مسیح بن گیا، اس طرح تو روٹی اور شراب سے تین کامل مسیحوں کا وجود ہونا لازم آئے گا لہٰذا پہلے مسیح کے ساتھ مل کر کل چار مسیح ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ عیسائیوں کے خلاف یہ جرم عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے اس رسم[3] کو کیوں ترک کر دیا، اور ایک ہی پر اکتفا کیوں کر لیا؟

(۲) دوسرے یہ کہ لوقا کی عبارت بتاتی ہے کہ عیسٰی کا جسم شاگردوں کی جانب سے قربان ہو گیا[4]۔ مرقس کی روایت واضح کرتی ہے کہ عیسٰی

---

[1] عشاء ربانی (EUCHARIST) یا (LORDS SUPPER) عیسائیوں کی مشہور رسم ہے جس کی اصل بقول اناجیل یہ ہے کہ گرفتاری سے ایک رات پہلے حضرت عیسٰی اپنے حواریوں کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ آپ نے پیالے کر برکت کی دعا کی، یا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ اسے آپس میں بانٹ لو، پھر روٹی لے کر اس پر بھی برکت کی دعا فرمائی اور یہ کہہ کر انہیں دی کہ: یہ میرا بدن ہے جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے میری یادگار کے لئے یہی کیا کرو۔ اس کے بعد عیسائیوں میں یہ رسم چل پڑی کہ وہ ایک پیالہ میں انگور کا رس لے کر پیتے ہیں اور شکر کرتے ہیں اور روٹی توڑ کر کھاتے ہیں، پھر پروٹسٹنٹ فرقہ تو بات یہی حد تک رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس عمل سے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ لینے والا مسیح کے کفارے میں شریک ہے اس پر پورا ایمان رکھتا ہے کہ مسیح سے نجات مل سکتی ہے، اس عمل سے ان کے نزدیک عقیدہ کفارہ پر ایمان رکھنے کا تعلق یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عیسٰی نے اپنے بارے میں یہ کہا ہے کہ: "میں ہوں وہ زندگی کی روٹی جو آسمان سے اتری اگر کوئی اس روٹی میں سے کھائے ابد تک زندہ رہے گا (یوحنا ۶: ۵۱) اس کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ جس طرح ایک انسان روٹی کو قربان کر کے کھاتا ہے اور اس سے توانائی حاصل کرتا اسی طرح حضرت مسیح قوم کے لئے قربان ہو جائیں گے اور اس سے پوری قوم کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا، اب یہ روٹی کھانے کی رسم اسی عقیدہ کو تازہ کرتی ہے اور کیتھولک فرقہ اس پر اضافہ کرتا ہے کہ اس عمل سے اس کھانے پینے کی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب کوئی پادری "عشاء ربانی" دیتے وقت لاطینی زبان میں کہے کہ "ہاکیست کارپس میم" یعنی یہ میرا بدن ہے" تو فوراً روٹی مسیح کا گوشت بن جاتی ہے اور انگور کا رس مسیح کا خون بن جاتا ہے، اگرچہ وہ کھانے والے کو محسوس نہیں ہوتا۔ اس عمل کو "عشاء ربانی" کا نام پولس نے دیا ہے جیسا کہ کرنتھیوں (۱۱: ۲۰) سے معلوم ہوتا ہے۔ (تفصیل انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مقالہ (EUCHARIST) اور پادری ایچ۔ ایس نربث کی کتاب "حقائق بائبل و بدعات قدم" سے لی گئی)

[2] کھانے کے بعد پیالہ یہ کہہ کر دیا کہ یہ پیالہ میرے خون میں نیا عہد ہے" یعنی صرف ایک پیالہ ہے "عشاء ربانی" کیوں بنتے ہیں؟ وہ دوسرے کیوں نہیں

بیت مول کی جانب سے بہایا گیا[۵] اور متی کی روایت کا مقتضی یہ ہے کہ عیسیٰ کا جسد کسی کی طرف سے قربان ہوا ہے اور نہ ان کا خون کی
رف سے بہایا گیا ہے۔ بلکہ جو چیز بہائی جاتی ہے وہ عہد جدید ہے حالانکہ عہد نہ بہانے کی چیز ہے اور نہ بہائی جائے گی۔

اور بڑا تعجب اس بات پہ ہے کہ یوحنا جو خوشبو لگانے اور گدھے پر سوار ہونے اور دوسرے معمولی واقعات جو تینوں انجیلوں والے بیان
ہیں، ذکر کرتا ہے، لیکن جو چیز دین مسیحی کے اہم ارکان میں سے ہے اسے قطعی ذکر نہیں کرتا۔

[...]کا واقعہ متی نے باب ۸ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک فقیہ کی یہ درخواست کہ میں آپ کے ہمراہ جانا چاہتا ہوں[۱] اور ایک
دوسرے شخص کا یہ کہنا کہ میں پہلے اپنے باپ کو دفن کر آؤں پھر آپ کے ساتھ چلوں گا، اور بہت سے حالات اور واقعات
[...]لے کے بعد تجلی کا واقعہ اپنی انجیل کے باب ۱۷ میں بیان کیا ہے اور لوقا نے درخواست اور اجازت طلبی اپنی انجیل کے باب ۹ میں تجلی کے واقعہ[۲] کے بعد
[...]ہے اس سے ظاہر ہے کہ ایک بیان غلط ہے۔[۳]

"یہ میرا عہد کا خون ہے جو بہتوں کے لئے بہایا جاتا ہے" (مرقس ۱۴) [۶] لیکن ہمارے پاس سب سے قدیم جو نسخہ ہے اس میں "عہد کا خون ہے" کے الفاظ ہیں مصنف
[...] نئے عہد کا خون ہے ... ۔۔ متی ۸ [۷] یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام گدرینیوں کے ملک سے تشریف لے جا رہے تھے۔
[...] تجلی کا واقعہ از روئے انجیل مختصراً یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ، پطرس، یعقوب اور یوحنا کو ساتھ لے کر ایک اونچے پہاڑ پر تشریف لے گئے وہاں
[...]ان کے سامنے آپ کی صورت بدل گئی اور چہرہ چمکنے لگا، حضرت عیسیٰ و الیاس آپ سے باتیں کرتے ہوئے نظر آئے پھر اچانک ایک نورانی بادل نے
[...]سایہ کیا اور اس میں سے آواز سنائی دی کہ: یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس سے خوش ہوں" [۸] آیت ۵۷ تا ۶۰ لوقا ۹ [۹]

سید محمود الحسنی
ایڈیٹر ہفت روزہ "ندیم" (بھوپال)

روحِ انتخاب

پیامِ اقبال پر ایک نظر

> آج شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی برسی ایشیا بھر میں منائی جا رہی ہے، اس موقع پر ہم اس عظیم شاعر کے کلام و پیام پر مسٹر محمود الحسنی کا ایک مقالہ پیش کر رہے ہیں جو اپنی جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے اب تک علامہ اقبال پر بے شمار مضامین اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، اور ان کے فلسفۂ شعر پر مختلف انداز سے اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے۔ محمود الحسنی صاحب نے اس مختصر مقالہ میں جس تعمق اور تفکر سے علامہ کی شاعری کے تدریجی ارتقاء کا جائزہ لیا ہے وہ دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے اس مقالہ کی معنویت سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔
>
> (ادارہ "ندیم")

اقبال کی شاعری آغاز سے مقصدی شاعری تھی۔ کیونکہ شعر برائے شعر کا عارضہ ایک صاحبِ فکر تعلیم یافتہ اور ذہین انسان کو لاحق نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ مقصد کا شعوری تصور بتدریج ہی ظلمتِ شب سے روشنی میں آتا ہے اور نظر تاروں، چاند اور سورج سے ہوتی ہوئی بالآخر کائنات کی مرکزی حقیقت تک پہنچتی ہے اسی تدریجی ارتقا میں اقبال کا متحرک ذہن اور شخصیت کے نشو و نما کے آثار صاف نظر آتے ہیں اسی تدریج سے ان کی شاعری کا مقصدی پہلو واضح ہوتا ہے اور ان کے پیغام میں واقعیت اور جرأت دونوں پیدا ہوتی ہیں:

اقبال اور اس کی شاعری پر غور کرتے وقت اکثر لوگوں کو مختلف الجھنیں پیش آیا کرتی ہیں۔ ایک طرف وہ وطن پرست کی حیثیت سے کہتا:
"خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے" دوسری طرف وہی کہتا ہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

کہیں وہ اس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے:

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہی وجہ ہے کہ کوئی اس کو وطن پرست سمجھتا ہے، کوئی اسلام پرست شاعر، کوئی اس کو فاشیت کا علمبردار، اور کوئی اشتراکیت کا حامی اور ایسے لوگ [illegible] شاعر قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے اشعار سخت کوشی کی تعلیم دینے میں جو جبر نظام اجتماعی کے لئے ضروری ہے، فاشزم کی

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

م چونکہ دینِ فطرت ہے اور اس کی یہی چیز دیکھ کر اقبال اس کا گرویدہ اور ترجمان بنا ہے اس لئے قدرتی طور پر فطرت کے تمام تقاضے جو اسلام ی اس کے کلام میں بھی ہونا چاہیے۔ اب یہ دیکھنے والوں کا قصور ہے کہ وہ کوئی ایک چیز یا اپنے مطلب کی چیزیں اس کے کلام میں سے لے کر اُسے خیالات و جذبات کا ترجمان سمجھنے لگیں۔

مثال کے طور پر وطن کی محبت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اسلام بھی وطن کی محبت کو جزوِ ایمان یعنی انسانی فطرت اور شرافت کا ایک بتا ہے۔ لیکن اس کی پرستش نہیں سکھاتا بلکہ عبدیت اور پرستش کو وہ صرف خدا کے لئے مخصوص کرتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا کہ خاکِ وطن کو ہر ذرہ دیوتا ہے۔ لیکن جب ایک سیاسی عقیدے کی حیثیت سے وطن کو اجتماعیت اور ساری وفاداریوں کا مرکز و محور بنا لیا گیا اور بت پرستیوں کے ساتھ ایک وطن پرستی بھی وجود میں آگئی تو اقبال چیخ اٹھا ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ل وطن بہت کہلاتے ہیں اور اہلِ وطن کے دل میں وطن کی محبت ہی نہیں بلکہ وہ وفاداری پیدا کرنا چاہتے ہیں جو خدا کے لئے ہونا چاہیئے تو وہ فوراً ل کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے کہنے لگتے ہیں کہ دیکھو اقبال جیسے پیغامبر نے بھی، وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا کہا ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اقبال کے جستجو کا پہلا مرحلہ ہے۔

ن سے انسان کے فطری تعلق کا ایک پہلو ہے جو غلط انداز میں اجاگر کیا گیا ہے یا مثلاً معاشی انصاف انسانی فطرت کا یہی مطالبہ ہے اور ت نفس کا بھی اس لئے جب اقبال سرمایہ داری کا زوال دیکھتا ہے تو خوش ہو کر کہتا ہے ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
پرانی سیاست گری خوار ہے

ی اس چیز کو وہ لوگ جو انسان کے جسم میں صرف معدے کا وجود مانتے ہیں دلیل میں پیش کر کے کہتے ہیں اقبال بھی انہی کی طرح روٹی کا پرستار حالانکہ روٹی اور معاش کو ذریعۂ زندگی کہنے اور اس کو مقصدِ زندگی ماننے میں جو فرق ہے وہ ہر اس شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جس کی ور اس ـــــ بھوک کی شدت اور جذبات کی گرمی سے اندھا نہ ہو گیا ہو! . . . .

تبرکات

حضرت احسن مارہروی مرحوم

غفلتیں دم ساز ہیں ابتر ہے سازِ زندگی　　　　زندہ ہیں لیکن نہیں کچھ امتیازِ زندگی
نازِ قاتل پہ فدا ہوگا نیازِ زندگی　　　　جب قضا ہوگی ادا ہوگی نمازِ زندگی
کھل گیا خالی ہوا بندی سے رازِ زندگی　　　　یعنی اک تارِ نفس ہے نغمہ سازِ زندگی
شمع گھل گھل کر دیا کرتی ہے شعلہ کو فروغ　　　　سوز ہے مظلوم کا ظالم کا سازِ زندگی
نزع کی غفلت سے چونکا بھی تو کیا چونکا کوئی　　　　خاک اب دیکھے گی چشمِ نیم بازِ زندگی
اے شبِ فرقت! مبارک تجھ کو طول اپنا کہ ہم　　　　کر چکے صدپارہ دامانِ درازِ زندگی
دل شکستہ ہوں مگر امید سے وابستہ ہوں　　　　بس یہی وابستگی ہے دل نوازِ زندگی

لے چلی ہے سوئے جنت حور و غلماں کی ہوس
مر کے بھی احسن نہ چھوٹی حرصِ آزِ زندگی[1]

نو بہ نو

ماہر القادری

اے نگاہِ دوست! یہ کیا ہوگیا کیا کر دیا　　　　پہلے پہلے روشنی دی پھر اندھیرا کر دیا
آدمی کو درد دل کی قدر کرنی چاہیے　　　　زندگی کی تلخیوں میں لطف پیدا کر دیا
وہ خرامِ ناز، موجِ آب رکنا یاد ہے　　　　جس نے ویرانوں کو گلگشت مصلےٰ کر دیا
اُس نگاہِ شوخ کی تیر افگنی رکھی رہی　　　　میں نے پہلے اُس کو مجروحِ تماشا کر دیا
اُن کی محفل کے تصور نے پھر اُن کی یاد نے　　　　میرے غم خانہ کی رونق کو دوبالا کر دیا
میکدے کی شام اللہ وہ کانپتے ہاتھوں میں جام　　　　تشنگی کی خیر ہو، کس کس کو رسوا کر دیا

چشمِ ساقی جو بیگانہ بیگانہ ہے　　　　مدتوں سے یہی رنگِ میخانہ ہے
ہے توجہ مگر بے نیازانہ ہے　　　　میرا حسنِ طلب کیا گدایانہ ہے
دل کی گرمی ہے یا آرزو کی تپش　　　　رنگ مے ہے کہ رنگِ پیمانہ ہے

چل رہا ہے یوں ہی کاروبارِ جہاں
کوئی فرزانہ ہے، کوئی دیوانہ ہے

---

[1] یہ غزل حضرت احسن مارہروی مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر وقار احسن صاحب نے عنایت فرمائی ہے۔ مولانا احسن مرحوم کی یاد میں ۲۰ اگست کو طرحی مشاعرہ کراچی میں ہو رہا ہے۔

ہماری نظر میں

فتاویٰ عبدالحیٔ اردو

از:- علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحیٔ لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ ترجمہ و تبویب:- مولانا خورشید عالم (کامل مُبوّب) (فاضل دیوبند) ضخامت ۵۰۸ صفحات (مجلد رنگین گردپوش) قیمت پندرہ روپے۔

ملنے کا پتہ:- قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی

حضرت مولانا محمد عبدالحیٔ لکھنوی (پیدائش ۱۲۶۴ھ) کا شمار متحدہ ہندوستان کے اُن اکابر علماء میں ہوتا ہے، جو دینی علوم میں مجتہد بصیرت رکھتے تھے اور جن کی شخصیت عقلی و نقلی علوم کی جامع تھی، مولانا موصوف کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد نوّے کے قریب بتائی جاتی ہے، جامعیت کا یہ عالم کہ حدیث میں موطا امام محمد پر حاشیہ (التعلیق الممجد) لکھا، فقہ میں شرح الوقایہ کی شرح کی اور اس پر حاشیہ — (عمدۃ الرعایہ) تحریر فرمایا، فقہ حنفی کی شہرہ آفاق کتاب ہدایہ کی تحشیہ کی، نحو میں خیر الکلام، صرف میں التبیان، مناظرہ میں الہدایۃ المختارہ، منطق میں رسالہ قطبیہ کے حواشی الزاہد پر تحقیقات، تاریخ میں ابناء الخلان، یہ وہ معرکہ آرا کتابیں ہیں جو مولانا عبدالحیٔ مرحوم کے نام کو ہمیشہ باقی رکھیں گی، اور اہل علم ہر دور میں ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

مولانا رحمتہ اللہ علیہ کے فتاویٰ جو زیادہ تر عربی اور فارسی زبان میں تھے تین حصوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں ہر باب کے مسائل نہ تھے، محمد سعید اینڈ سنز کو یہ سعادت میسر آئی کہ انہوں نے اپنے اہتمام سے ان فتاویٰ کا اردو ترجمہ کرایا پھر فاضل مترجم (مولانا خورشید عالم) نے ان فتاویٰ کی ایک جلد میں تبویب کی:

اس کتاب میں عقائد، فقہ، علم کلام اور معاشرت کے گوناگوں مسائل پر استفتار کے جوابات ملتے ہیں، پوری کتاب معلومات سے پُر ہے، جس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی حقیقت میں "بحر العلوم" تھے۔ — بعض اقتباسات —

"سوال (۱) اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ارواح مشائخ حاضر و ناظر ہیں اور ہر چیز کو جانتے ہیں اس کا کیا حکم ہے۔

جواب:- وہ کافر ہے — فی البزازیہ من قال ارواح المشائخ حاضرۃ تعلم یکفر انتہی یعنی جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ارواح مشائخ ہر وقت حاضر ہیں اور ہر چیز جانتے ہیں، وہ کافر ہے۔ اور حنفیہ نے صراحۃً تکفیر کی اُس شخص کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم غیب ہونے کا معتقد ہو۔ . . .

سوال:- ایسے آدمی کے بارے میں کیا حکم ہے جو اعتقاد رکھتا ہے کہ اولیاء کرام تمام چیزوں کو جانتے اور پکارنے والے کی آواز نزدیک و دُور سے سُن لیتے ہیں اور آپس میں بولے جانے والے الفاظ سے۔

ان سے مدد مانگتے ہیں اور ان کے نام پر جانوروں کی نذر مانتے ہیں ۔

جواب :۔ یہ شخص بدعقیدہ ہے بلکہ اس کے اعتقاد سے کفر کا خوف ہوتا ہے ۔ کیونکہ اولیاء اللہ کا دور سے آواز سننا ثابت نہیں ہے اور تمام مغیبات کا ہر وقت علم کلی حاصل ہونا خاص ہے باری تعالیٰ کے ساتھ ۔ ۔ ۔

مثلاً بنایہ میں دوسری جگہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " غیر اللہ کے لئے نذر ماننا حرام ہے "

سوال :۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ ہر مقام سے ندا دینے والے کی آواز کو سن لیتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے ؟

جواب :۔ یہ عقیدہ اہل اسلام کے مخالف بلکہ شرک کے مترادف اور برابر ہے ہر شخص کی ندا کو ہر جگہ سے اور ہر وقت سننا یہ صرف پروردگار عالم کے ساتھ خاص ہے کسی مخلوق کی یہ صفت نہیں ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی سفر السعادۃ کی شرح میں فرماتے ہیں ، یہ عادت نہ ہونی چاہیئے کہ نماز کے اوقات کے علاوہ کسی دوسرے وقت کے ایصالِ ثواب کے لئے نہایت اہتمام کے ساتھ جمع ہو کر ختم قرآن کریں قبر پر اور نہ کسی دوسری جگہ پر کیونکہ یہ بدعت ہے اور مکروہ !

" تفسیر مظہری میں " عرس " کو ناجائز کہا گیا ہے ۔ "

سوال :۔ اگر کوئی پیر اپنے مریدوں کو تعلیم دے کہ یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کو بطور دعا اور ورد کے مستقل پڑھا کرو ، یہ قضائے حاجات کے واسطے مفید ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جواب :۔ اس قسم کے وظیفہ سے احتراز کرنا لازم و ضروری ہے ، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ وظیفہ شیئاً للہ پر مشتمل ہے اور فقہا نے اس قسم کے الفاظ پر کفر کا حکم لگا دیا جیسا کہ دُرِ مختار میں ہے کذا قول شئ للہ قیل یکفر کہا گیا ہے کہ شیئاً للہ کہنے والے کی تکفیر کی جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہمارے علماء کا اتفاق ہے جو شخص اولیاء اور مشائخ کی ارواح کو حاضر و عالم سمجھے وہ کافر ہے ۔ حضرت شیخ عبدالقادر اگرچہ امت محمدیہ کے کبار اولیاء میں سے ہیں اور ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں ، مگر دور سے آواز سننے کی اور فریاد رسی کی طاقت اُن کے لئے بھی ثابت نہیں ، اب اُن کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اپنے مریدوں کے حال سے واقف ہیں اور اُن کی آوازوں کو سنتے ہیں ، یہ شرک ہے "

و عوام مسلمان " اشہد ان محمد رسول اللہ " کہے جانے کے وقت انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہیں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کی احادیث صحیح نہیں ہیں ، دیلمی نے مسند الفردوس میں حضرت ابوبکر سے مرفوعاً جو نقل کیا ہے وہ صحیح حدیث نہیں ہے اور ——

" اسی میں ہے کہ جو شخص اشہد ان محمد رسول اللہ سننے کے وقت مرحبا بحبیبی وقرۃ عینی محمد بن عبداللہ کہے اور انگوٹھوں کو چوم کر لگائے اسے کبھی بیماری نہ آئے گی ، اور آنکھیں آشوب نہ کریں گی ، ابن طاہر اس کے بارے میں بھی فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے اور شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی مقاصد حسنہ فی الاحادیث المشتہرہ علی الالسنہ میں چند روایات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کوئی حدیث صحیح مرفوع نہیں ہے ، اور ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں یہی لکھا ہے "

سوال :- جو شخص مذہب (فقہی) کا انکار کرے اور کسی مذہب کے اختیار کرنے کو بُرا سمجھے اور کتب حدیث کے اتباع کا دعویٰ کرتے تو ایسا شخص مبتدع ہے یا نہیں -

جواب :- اصحاب مذاہب خواہ ابوحنیفہ ہوں، یا شافعی، امام مالک اور احمد حنبل ہوں، کسی نے بھی تدوین مذاہب اور استخراج مسائل خلاف شرع نہیں کئے ہر ایک امام کے پاس مستند دلائل موجود ہیں اور اُن کے اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ آیات قرآنی و احادیث سمجھنے میں اختلاف ہو گیا۔ ورنہ کسی تعصب یا قیاس کو شریعت پر مقدم کرنے کی وجہ سے ایسا نہیں ہے اور تمام ائمہ تقدیم قیاس علی الشرع سے منزہ و مبرا ہیں، اگر کوئی شخص اس کی نسبت (اُن سے) کرتا ہے تو وہ کاذب اور افتراء پرداز ہے، بعض متعصبین اصحاب حنفیہ کو اصحاب الرائے کہتے ہیں مگر ان کا قول سراسر غلط ہے اور اگر اصحاب الرائے ہیں تو میرے خیال میں یہ تو حنفیہ کی تعریف ہوئی، کیونکہ یہاں رائے سے خاص رائے دقیق مراد ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی مجمع کوسس فی المعجم المفہرس میں اقرار کرتے ہیں مذہب حنفیہ میں اصول و قواعد جس طرح ضبط کئے گئے ہیں ہمارے مذہب شافعی میں نہیں ہیں —— حاصل کلام یہ ہے کہ مذاہب مدونہ مروجہ آیات قرآنی، سنت رسول اور اجماع و قیاس کے مخالف نہیں ہیں ہر ایک مسئلہ کی اصل ان اوساط اربعہ میں مل جائے گی :

حضرت شاہ ولی اللہ "انصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں فرماتے ہیں —— لما مهد و الفقه —— انتہی . . . . لہذا اگر کوئی شخص مذاہب اربعہ کو صرف اس وجہ سے بُرا سمجھتا ہے کہ یہ مذاہب خلاف شرع اور خلاف نصوص ہیں تو وہ یقیناً کافر ہے . . . . . .

اب ذرا غور کرنا چاہیئے کہ ائمہ مجتہدین مسائل موجودہ کی تحقیق اور تدوین نہ کرتے تو تمام عالم گمراہ ہو جاتا اور کسی کو احکام شرع کی ہوا بھی نہ لگتی، کیونکہ بہت سے احکام ظاہر نصوص و آیات سے مستنبط نہیں ہوتے پس ان مذاہب کو بُرا سمجھنا درحقیقت احسان فراموشی ہے . . . "

کاش! یہ حقائق مولانا عبدالستار دہلوی امام غرباء اہل حدیث کی نگاہ سے گزر جاتے !

اس کتاب میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن کو پڑھ کر خلجان پیدا ہوا، مثلاً مولانا عبدالحی لکھنوی "بدعت" کی اقسام کے قائل ہیں، یا اہل تصوف کے یہاں خلافت و سجادہ نشینی کی جو رسم پائی جاتی ہے، اس میں وہ کوئی کھٹک تک محسوس نہیں کرتے" استوا علی العرش" کے مسئلہ میں انہوں نے دوسروں کے اقوال نقل کر دیے ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ کی "مکانیت" کا وہم پیدا ہوتا ہے، حالانکہ اللہ جسم و مکان سے منزہ ہے، سبحٰن اللہ عما یصفون -

کوئی شک نہیں "فتاویٰ عبدالحی" دینی علوم و معلومات اور فقہی مسائل کی نہایت جامع کتاب ہے! اس کے ترجمہ نے اردو ادب میں اضافہ کیا ہے -

ماہنامہ افکار کا فیض نمبر مرتبہ:- صہبا لکھنوی اور کشش صدیقی، ضخامت ۶۰۰ صفحات (زرِ سالانہ ۱۲ روپے) اس خاص نمبر کی قیمت بارہ روپے (فیض احمد فیض کی متعدد تصاویر، فوٹو گروپ اور اُن کی تحریر کے ساتھ) سرورق دیدہ زیب، جو فیض کی جاذبِ توجہ کارٹون نما تصویر سے مزین ہے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی

اس سے پہلے ماہنامہ افکار کے "جوش نمبر" اور "حفیظ نمبر" بڑی شان اور آن بان کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اور "فیض نمبر" تو ان دونوں نمبروں سے بازی لے گیا، غالباً اس کا سبب وہ خلوص و عقیدت ہے جو صہبا لکھنوی صاحب ترقی پسندوں کے امام فیض سے رکھتے ہیں ترقی پسند ہوں یا نیم ترقی پسندان سب کے یہاں کسی نہ کسی حد تک وحدتِ فکر و مزاج بھی پائی جاتی ہے۔

یہ خاص نمبر اس اعتبار سے کامیاب بلکہ یوں کہئے کامیاب ترین ادبی پیشکش ہے کہ فیض کی زندگی اور شاعری کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے تشنہ رہ گیا ہو یا ناقدین کی نگاہ اُس تک نہ پہونچی ہو، شاعر کی پوری شخصیت اپنے تمام خد و خال کے ساتھ اس آئینہ میں نظر آتی ہے، دس بیس اور چالیس پچاس نہیں سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں نے فیض صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، ماہر القادری کے مقالہ —— فیض کی شاعری اور زبان و بیان) کے علاوہ تمام مقالے مدحیہ اور تحسین آمیز ہیں، ہاں! کہیں کہیں بعض مضامین میں فیض صاحب کے بعض شعروں پر ہلکی سی گرفت ملتی ہے، متعدد مقالے دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں، سید ابوالخیر کشفی صاحب کا مقالہ ہمیں خاص طور سے پسند آیا، نظموں میں جوہر سعیدی کی نظم —— دیدۂ بیدار —— بہت جاندار اور دلکش نظم ہے، وہ کہتے ہیں:-

فیض انساں کو حقائق کا وطن کہتا ہے　　　فیض خوابوں کے جزیروں میں نہیں رہتا ہے

—— اور ——

؎ فیض زنجیر کے حلقوں کو زباں دیتا ہے

"فیض نمبر" دس ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب اپنے آغوش میں رنگا رنگ مضامین اور مقالے رکھتا ہے، فیض کی تحریر کے جو نمونے دئے گئے ہیں ان میں سب سے اچھا مضمون —— داغستان میں چند روز —— ہے! یہ مقالہ ان کی نثر نگاری کا شاہکار ہے، اس مضمون سے معلوم ہوا کہ علاقہ مذکور کی درسی زبان ماضی قریب تک عربی تھی، مگر اب وہاں کی درسیات و نصاب سے عربی زبان کو خارج کر دیا گیا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سوویٹ روس نے اسلام اور مسلمانوں کی روایات و خصوصیات کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور اسلامی عقائد و تمدن اور روایات کے جو آثار باقی رہ گئے ہیں۔ اُن کی سخت جانی وہاں کے ماحول کا دیکھئے کب تک مقابلہ کرتی ہے۔

اسلامی اخلاق کی معجز نمائی دیکھئے کہ اشتراکی افکار و تہذیب کے تسلط اور غلبہ کے باوجود مسلم آبادی کے بعض علاقوں کا اب تک یہ حال ہے

> "برہنہ سر پھرنا مردوں اور عورتوں دونوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے! اگرچہ داغستانی گھروں میں زنانہ اور مردانہ کی تقسیم نہیں، لیکن عام طور سے عورتیں مردوں کی محفل میں بہت کم شرکت کرتی ہیں بلکہ مرد مہمان گھر میں ہوں تو کھانے کی میز پر بھی اُن کے ساتھ نہیں بیٹھتیں۔" (ص ۶۹۱)

کاش ہمارا پاکستان کی تعلیم یافتہ بیگمات داغستان کی مسلمان عورتوں ہی سے کچھ سیکھ سکتیں!

فیض صاحب جن شخصیتوں سے متاثر ہوئے ہیں، اور جن کی تخلیقات سے افادہ کیا ہے، اُن میں اُردو اور فارسی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ انگریزی، عربی، روسی اور سنسکرت کے شعراء کے نام بھی ملتے ہیں! اس سے اندازہ ہوتا ہے اُن کا مطالعہ خاصہ وسیع اور ہمہ گیر ہے! وہ سنسکرت کے سورداس اور بھبوتی وغیرہ سے بھی متاثر ہیں، فیض صاحب سنسکرت تو نہیں جانتے، سورداس اور بھبوتی وغیرہ کا کلام غالباً انہوں نے انگریزی میں پڑھا ہوگا! اس بات کی ہم تحقیق نہ کر سکے کہ سنسکرت کے ان شعراء کا کلام انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے یا نہیں۔ اُردو میں تو کالیداس کے مشہور ناٹک "شکنتلا" کا ترجمہ ہماری نظر سے گزرا ہے ـــــ عربی شاعروں کا کلام فیض صاحب نے اگر براہ راست عربی میں پڑھا ہے، تو اُن کے قلم سے "بے نیل و مرام" کیسے نکل گیا ... کہتے ہیں ـــ

یوں بہار آتی ہے اس بار کہ جیسے قاصد   کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

عنایت الٰہی کی کتاب "راگ رنگ" پر فیض نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ پورے کا پورا یا اُس کا اقتباس صفحہ ۹۰۷ پر نظر آیا وہ لکھتے ہیں:-

" اور جس موضوع پر عنایت الٰہی ملک نے قلم اُٹھایا ہے اس پر تو اُردو میں کوئی کتاب شاید ہے ہی نہیں "

فیض صاحب کو شاید اس کا پتہ نہیں ہے کہ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے راجہ نواب علی خاں (تعلقدار اور موسیقی پر بڑے معرکہ کی کتاب (معارف النغمات) لکھ چکے ہیں!

فیض کا جو منتخب کلام ادارۂ "افکار" اور مضمون نگاروں نے پیش کیا ہے اس میں "یتیم لہو" بڑی کامیاب نظم ہے ـــ "دلفگار چلو" کا بھی آہنگ اور انداز بہت خوب ہے ـــ

چشم نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو
خلوتِ خاص بھی، مجمع عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبح ناشاد بھی، روز ناکام بھی
ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہر جاناں میں اب باصفا کون ہے
دست قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو، دلفگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

فیضؔ کے وہ اشعار جو ہمیں پسند آئے ۔ ــــ

باغباں ہوش! کہ برہم ہے مزاجِ گلشن ہر کلی ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے[1]
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے اک نظر، تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی نگاہیں بجھ رہی ہیں راستہ زرکار ہونے تک
رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائیں گے کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے میرے نالوں کی گمشدہ آواز
اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

(فیض کے اس شعر کے ساتھ ہی صہبا اختر کی نظم ـــــ لال قلعہ ـــــ کا یہ مصرعہ ہمیں یاد آیا ۔
دھوپ دیوار کو چھو لے تو گلابی ہو جائے)

گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرام ابر سر کوہسار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

---

[1] کلی کہاں گھومتی پھرتی ہے۔ تلوار لیے بیٹھی ہے" کہنا چاہیے تھا۔ کاش یہ مصرعہ یوں ہوتا۔ جیسے صحرا میں دبے پاؤں چلے بادِ نسیم

پھر سے بجھ جائیں نہ شمعیں جو ہوا تیز چلی — لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے — اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ڈھونڈ لیتا ہے یہیں شوق نئی آسائشِ منزل — رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے — لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں — دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں — اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف — خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے — یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

بہت عزیز ہو لیکن شکستہ دل یارو! — تم آج یاد نہ آؤ کہ جشن کا دن ہے

دوسرا رخ : ——

آج پھر اپنے غیروں سے سر جوڑ کر — تیری عصمت کا بھاؤ لگانے چلے (ص ۴۳)

"بھاؤ" کا لفظ اس شعر میں ذوق و وجدان کو کس قدر ناگوار گزرتا ہے "تیری عصمت کی قیمت" کہا جا سکتا تھا۔

سن تو لو، دیکھ تو لو، مانو نہ مانو اے دل — شامِ غم سینکڑوں اقرار لئے پھرتی ہے (ص ۴۶)

پورا شعر مبہم نہیں مہمل ہے، "شامِ غم کا سینکڑوں اقرار لئے پھرنا" آخر یہ بات کیا ہوئی! "اے دل" واحد ہے اس لئے "سن تو لے" "مان نہ مان" کہنا چاہتے تھا، فعل (امر) کو جمع لانے کی وجہ سے شعر میں شتر گربگی پیدا ہو گئی۔

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے (ص ۵۰)

دونوں شعروں کے پہلے مصرعے دوسرے مصرعوں سے مختلف الوزن ہیں —

آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم — زندگی زرنگار کر لیں ہم (ص ۵۶۵)

پہلا شعر بچکانہ ہے۔

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی — بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے (ص ۵۶۵)

"نیم شب" اور "چاندنی کے بعد" خود فراموشی، کس قدر اکھڑا اکھڑا لگتا ہے! پھر آدھی رات کو جب چاند نکل رہا ہے تو محفل بہت دور آخر کیوں ویران ہے!

تہ نجوم، کہیں چاندنی کے دامن میں　　　ہجوم شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی (ص ۵۶۷)

یہ کیا دل ہے جو ستاروں کی تہ میں یا اُن کے نیچے جا پہونچا ہے؟

اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں　　　دل حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں

دوسرے مصرعہ میں کوئی لطف نہیں، ایسے مصرعے نومشقی کے زمانے میں کہے جاتے ہیں۔ "کئی" اور زیادہ کھٹکتا ہے!

فیض کی ایک نظم ہے۔ ـــــ

"آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ"

اس نظم کے بعض مصرعے شگفتہ ہیں اور بعض بے لطف ہیں۔

فکر فردا اتار دے دل سے　　　عمر رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہد غم کی حکایتیں مت پوچھ　　　ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ (ص ۵۶۸)

اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ اُس نے دل سے غم کو اُتار دیا، یا بھئی! اپنے دل سے فکرِ فردا کو اُتار دو، اتارنے کے ساتھ "بارِ غم یا بارِ فکر" بولا جائے گا تو بات بنے گی! دوسرا شعر پڑھ کر، آدا بدایونی کی مشہور غزل کا یہ مصرعہ ذہن میں اُبھرا ـــــ

گزر چکی ہیں جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

نظم "ایک منظر" کا ایک شعر ـــــ

چاند کا دکھ بھرا فسانہ نور　　　شاہراہوں کی خاک میں غلطاں (ص ۵۶۹)

چاند کا "افسانہ نور" آخر کس لئے دُکھ بھرا ہے؟ بات کہنے کا کوئی قرینہ اور سوچنے کا کوئی ڈھنگ بھی تو ہوتا ہے،

اُن کی مشہور نظم ہے۔ ـــــ

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

یہ زبان وروزمرہ نہیں ہے، یوں کوئی نہیں بولتا کہ فلاں شخص، فلاں شخص سے محبت، مانگ رہا ہے شاعر کہنا یہ چاہتا ہے اور اسی طرح کہنا بھی چاہئے تھا ـــــ کہ میرے محبوب مجھ سے پہلی سی محبت کی امید نہ رکھ، یا اگلے دوستانہ روابط کا تقاضا نہ کر!

اس نظم کا سب سے اچھا شعر یہ ہے۔ ـــــ

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اور اس نظم کا اختتام جاذبِ توجہ ہے! باقی پوری کی پوری نظم پست اور سطحی ہے، اس کا پہلا بند ہے۔ ـــــ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے، تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں کیا رکھا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا ؎

تیرا غم ہے تو غم دہر کی پروا کیا ہے ؟

یہ مصرعہ ؎　　تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

بھلا کسی مشاق شاعر کو زیب دیتا ہے ! پھر اس میں "دنیا" کا الف کس بری طرح دب رہا ہے۔

یوں تو سب کہتے ہیں کہ فلاں کام ہو جانے سے تقدیر جاگ اٹھی، قسمت کھل گئی، نصیبہ نے یاوری کی مگر اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ محبوب کے مل جانے یا کسی مرحلہ میں عاشق کے کامیاب ہو جانے سے تقدیر سرنگوں ہو گئی اور مقدر شرمندہ ہو گیا ! پھر ٹیپ کا یہ مصرعہ ؎

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

شاعری کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

"طلسم کا ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوانا" یہ آخر کیا انداز بیان اور اسلوب اظہار ہے پھر اطلس و کمخواب تو کپڑوں کے نام ہیں اور کوئی چیز تاروں اور دھاگوں سے بنی جاتی ہے، کپڑوں سے نہیں بنی جاتی !

"کوچہ و بازار میں جسم بکتے ہوئے" سے نہ جانے شاعر کی کیا مراد ہے، بازار میں جسم بکنے کا مطلب تو عصمت فروشی ہوتی ہے مگر جن عورتوں کے جسم خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہائے ہوئے ہوں اُن کا کوئی ہوس پرست مول تول نہیں کر سکتا ! اگر اس سے مزدور مراد ہیں تو یہ منتہائی مبالغہ آمیز ہے، ایسا کہیں دیکھنے میں نہیں آیا کہ مزدور خاک و خون میں لتھڑے اور نہائے ہوئے سرمایہ داروں کے جبر سے کام کرتے ہیں۔

نظم "رقیب سے" کا بھی یہی رنگ ہے ؎

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی تو ند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

آخر دنیا کے کس بازار میں مزدور کا گوشت بکتا ہے ـــــــ یہ کیا رمز، علامت، اشاریت، تلمیح اور انداز بیان ہے۔
ـــــ توبہ! پھر "توند کا سیلاب" کیا ہوتا ہے! ہر بات کہنے کی کوئی تک اور قرینہ ہونا چاہئے، دوسرا مصرعہ نرا بچکانہ ہے: سرمایہ و محنت کی جنگ و تصادم اور سرمایہ داری کے مظالم کا اس طرح اظہار کس قدر بے جان بلکہ مضحکہ انگیز ہے! "عظیم شاعر" تو ایک طرف ہے معمولی درجہ کے شاعر بھی ایسے بے تکے، غلط اور پست شعر نہیں کہا کرتے۔

"چند روز اور مری جان" ـــــــ کے دو شعر ہیں:۔

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں	ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارستم	آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد	اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار (ص ۵۷۵)

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ کس قدر کمزور اور ڈھیلا ہے اور دوسرے شعر میں "اجنبی" اور "بےنام" نے شعر کی معنویت میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ اُسے اور اُلجھایا اور مبہم بنایا ہے ـــــــ تیسرے شعر میں کوئی لطف اور خوبی نہیں پائی جاتی!

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض	مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے (ص ۵۸۶)

"دلِ ناکردہ کار" کی ترکیب سے شعر کی معنویت کا آخر کیا تعلق ہے!

اک تری دید چھن گئی مجھ سے	ورنہ دنیا میں کیا ہے باقی

مفہوم تو واضح ہے مگر کہنے کا انداز ......!

اب سعی کا امکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا (ص ۵۹۱)

"پرواز کا مضموں ہو بھی چکا" زبان اور بیان ہر اعتبار سے ناپسندیدہ ہے!

جینے کے فسانے رہنے دو اب ان میں اُلجھ کر کیا ہوگا
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری لحد

اس تک بندی پر ہم کن الفاظ میں تنقید کریں، کوئی اوسط درجہ کا شاعر بھی اس قسم کے پست شعروں کی اپنی ذات سے نسبت گوارا نہیں کر سکتا۔

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری نہ میری ہے	اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

" نہ " کو " ناں " پڑھنے سے شعر کا وزن پورا ہوتا ہے اور " ناں " رسیا ، بارہ ماسہ ، چربولوں اور دیہاتی گیتوں کی زبان ہے ! غزل اور نظم میں " ناں " کا استعمال اس صورت میں پسندیدہ ہوگا ، جب کہ دوسرے الفاظ بھی اسی انداز کے ہوں اور یہی لہجہ اختیار کیا گیا ہو ! مشعلِ دل " کو " بسمل " کہنا جدت ہے مگر ناگوار جدت !

بنی بساطِ غزل جب ڈبو لئے دل نے — تمہارے سایۂ رخسار ولب میں ساغر وجام (ص ۵۹۴)

" بنی بساطِ غزل " اس شعر کا یہ پہلا ٹکڑا ہی عجیب ہے ، غزل کی بساط اور پھر اُس کا بننا ، اور اس کے بعد یہ کہ دل کے پاس کچھ جام وساغر ہیں ، جو اُس نے محبوب کے سایۂ رخسار ولب میں ڈبو لئے ہیں ـــــ اس شعر کی کوئی چُول بھی سیدھی ہے ! زلفوں اور پلکوں کا سایہ آ بولتے ہیں ، مگر لب ورخسار کا سایہ پہلی بار نگاہ سے گزرا اور پھر سایہ میں پیالوں کا ڈبو لینا اس پر ستزاد ! تحسین صاحب کی " جدت " کی تقلید میں اب نئے کہنے والے " کان کا سایہ " اور " ناک کا سایہ " کہا کریں گے ۔

اب ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے — اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر (ص ۵۹۶)

" درد کا شجر " " درد کا چاند " " درد کے ستارے " آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے ؟ ذوقِ سلیم اسے کس طرح برداشت کرسکتا ہے دوسرا مصرع بھی بس گوارا ہی کہا جاسکتا ہے ۔

خیریتِ جاں ، راحتِ تن ، صحتِ داماں — سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی (ص ۵۹۷)

اس شعر میں کس قدر ابہام بلکہ اہمال پایا جاتا ہے ، " صحتِ داماں " نے شعر کا رہا سہا حلیہ بگاڑ دیا ـــــ

عکسِ جاناں کو وِدع کرکے اٹھی میری نظر — شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر (ص ۶۰۷)

" وداع " کی جگہ " ودع " نظم کیا گیا ہے ، الف کا اس طرح سقوط جائز نہیں ہے ، ہاں یو۔پی کے قصبات میں " وداع " کی جگہ " بدا " بولتے ہیں ، اس طرح ـــــ " بیٹی والے نے برات کو شام کے وقت بدا کیا "

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں — تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب (ص ۶۰۸)

کہنے کو ہر بات کہی جاسکتی ہے ـــــ جذبات کا کنواں ، محسوسات کی گرد ، تصور کی کیاریاں اور خیالات کی کیچڑ ـــــ اسی طرح اس شعر میں " آواز کے سائے " اور " ہونٹوں کے سراب " نظم کئے گئے ہیں ۔

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں — تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں (ص ۶۱۲)

اس شعر میں اہمال کے سوا کیا رکھا ہے ! ایک تو حدیثِ یار کے عنواں پھر اُن کا نکھرنا ، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے نکھرنے سے ہر حریم میں گیسو کیوں سنورنے لگتے ہیں !

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام — اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام

اس شعر کا وہی رنگ ہے جو اس سے اوپر کے شعر کا ہے ،

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں — وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں (ص ۶۱۵)

شعر کیا ہے چیستاں ہے ! توبہ

یہ رات اُس درد کا شجر ہے — جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

رات کیسے درد کا شجر ہو سکتی ہے ـــــ یا للعجب !

نظم "رقیب" کا بھی یہی رنگ ہے ۔۔۔

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

آخر دنیا کے کس بازار میں مزدور کا گوشت بکتا ہے ، یہ کیا رمز ، علامت ، اشاریت ، تلمیح اور انداز بیان ہے ۔۔۔ تو بہ پھر "توند کا سیلاب" کیا ہوتا ہے ! بات کہنے کی کوئی تک اور قرینہ ہونا چاہئے ! سرمایہ و محنت کی جنگ و تصادم اور سرمایہ داری کے مظالم اس طرح اظہار کس قدر بے جان بلکہ مضحکہ انگیز ہے ۔

دلبری ٹھیرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام ۔۔۔ اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام (ص ۶۱۳)

شعر ایک "پہیلی" ہے کہ بس بوجھتے ہی رہئے !

"ملاقات" طویل نظم ہے مگر پوری کی پوری نظم بے لطف ہے ، جگہ جگہ ابہام اور اہمال ! ذرا اس نظم کا آغاز دیکھئے ۔۔

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں

رات کو یہ کہنا کہ وہ " اُس درد کا شجر " ہے ، کتنی بے تکی اور غیر شاعرانہ بات ہے ! پھر یہ رات جس میں ستاروں کے کارواں کھو گئے اور ہزار مہتاب اس کے سائے میں اپنا نور ضائع کر گئے ہیں ! اپنی اس خصوصیت کے سبب ۔

" مجھ سے تجھ سے عظیم تر "

آخر کیوں ہے ؟ رات اور انسان میں کوئی وجہ شبہ و مماثلت تو ہونی چاہئے ! اس نظم کا آغاز جس طرح ایک مہمل شعر سے ہوا تھا اس کا اختتام بھی اسی طرح کے ایک شعر پر ہوا ہے ۔

یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

اس "کریم تر" کا بھلا کوئی جواب ہے !

فیض صاحب کی نظم ہے ۔۔۔۔

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"

یہ نظم فیض صاحب خود اپنی پسند اور شوق سے بھی مشاعروں میں سُناتے ہیں اور بعض لوگ فرمائش بھی کرتے ہیں!

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

"دار کی خشک ٹہنی" کیا ہوتی ہے! لفظوں کا اس قدر عجیب انتخاب! ؟

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی

اس طرح لفظوں کو جوڑ دینا، شاعری کی توہین ہے! لفظوں کی نشست، مصرعوں کا دروبست، شاعر کا بنیادی خیال اور پیرایۂ اظہار ان میں سے ہر چیز اپنی جگہ "مضحکہ خیز" ہے۔ ....

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

"راہوں میں شام ستم کا گھلنا" آخر یہ کس دیس کی زبان ہے؟ یہ کیا جو الم غلم خیال جی میں آیا اُسے نظم کر دیا۔

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے عَلَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جان گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

ان مصرعوں میں کوئی شاعرانہ لطف؟ کوئی سمجھ میں آنے والا پیام! کوئی ڈھنگ اور قرینہ کی بات؟ ایک شخص جو جی میں آتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے جیسے بھی بُرے بھلے الفاظ ملتے ہیں، انہیں جوڑتا چلا جاتا ہے اور اس طرح ایک نظم کھڑی ہو جاتی ہے! "قتل گاہوں میں عَلَم" آخر کہاں سے آ گئے، یہ "علم" کس پیام اور مقصد کی آخر علامت ہے! پھر اُن کا "چُنا" اس پر مستزاد اس لفظ سے دو مفہوم ذہن میں آتے ہیں، ایک یہ کہ قتل گاہوں میں بہت سے علم نصب ہیں، اُن میں سے بعض علموں کو منتخب کیا گیا، یا پھر یہ کہ "علم" قتل گاہوں میں زمین پر بکھرے پڑے تھے، اُن کو چنا گیا (یعنی اٹھایا گیا)! تیسرے مصرعہ میں حرف "جار" (سے) کا استعمال سب سے زیادہ کھٹکتا ہے! "درد کے فاصلے" کیا ہوتے ہیں! تیسرے اور چوتھے مصرعوں کی نثر کر کے دیکھیے تو مفہوم اور الفاظ کی کوئی چول سیدھی نہیں بیٹھ سکتی! — پھر محبوب کی دلبری کے بھرم "کو جان گنوا کر" جہاں گیر "بنا دینا کتنا غیر شاعرانہ اندازِ بیان ہے —

ایک نظم ہے "درد آئے گا دبے پاؤں" فرماتے ہیں ـ

اور کچھ دیر میں جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا چارہ کیا ہے
درد آئے گا دبے پاؤں لئے سُرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

کیا شاعر کا دل درد سے خالی ہے! جو یہ کہا گیا ہے کہ درد دبے پاؤں سُرخ چراغ لے کر آئے گا! پھر یہ کیسا درد ہے جو دل کی سرحد سے دور کہیں دھڑکتا ہے؟ کیا "درد" دھڑکا بھی کرتا ہے "سُرخ چراغ" سے اشتراکیت مراد ہے یعنی وہ اشتراکیت جو روس میں "درد" بن کر دھڑک رہی ہے ——— یہ اندازِ بیان کتنا عجیب ہے!!

اس نظم کا یہ بند واقعی خوب ہے ———

حلقۂ زلف کہیں گوشۂ رُخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

مگر "ہجر کا دشت" ان حسین مصرعوں میں بے جوڑ لگتا ہے، جب پیار، لطف، دیدار اور زلف و رُخسار کا ذکر چھڑا ہے تو "ہجر کا دشت" کہنے کی کیا تُک تھی؛ یہ مصرعہ ہو سکتا تھا ـ

؎ چمنِ شوق کہیں، گلشنِ دیدار کہیں

ایک "رجز" ہے ——— "AFRICA COME BACK" ———

آجاؤ میں نے سُن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ مست ہو گئی میرے لہو کی تال
"آجاؤ افریقا"

"ڈھول کی آواز کو" "ڈھول کی ترنگ" تو نہیں کہتے اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ ڈھول کی ترنگ کانوں میں آ رہی ہے یا میں باجے اور تاشے کی ترنگ سُن رہا ہوں! پھر لہو کی تال کیا ہوتی ہے؟ ان کمزوریوں کے علاوہ "آجاؤ" کے بعد "ترے" نے شعر میں شترگربگی بھی پیدا کر دی ـ

آجاؤ میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال (ص ۶۲)

غم کی چھال کیا ہوتی ہے، پھر اُسے شاعر نے اپنی آنکھوں سے چھیل کر بھی پھینک دیا؟ یہ تصور جہالت کے لئے کس قدر اذیت دہ اور کیسا انگیز ـ

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین — دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

بھالوں کے "مرگ نین" اور ہجراں کا کچھاروں میں چلنا، یہ کیا انداز اظہار اور پیرایہ بیان ہے!

جو ہم پہ گذری سو گزری مگر شبِ ہجراں ۔۔۔ ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے (ص ۶۴۳)

عاشق کے اشک محبوب کی عاقبت آخر کس طرح سنوار چلے! کوئی ثبوت! بات کہنے کا کوئی قابلِ فہم قرینہ!

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر ۔۔۔ کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

اس شعر کے پڑھتے ہی جناب حفیظ ہوشیارپوری کی غزل کا مطلع یاد آیا۔

یوں دل گرفتہ ہم تری محفل سے آئے ہیں
آنکھوں میں اشک بھی بڑی مشکل سے آئے ہیں

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

"بساطِ رقص" سے شاید ڈانسنگ ہال مراد ہے! شرق و غرب تو سب بولتے ہیں مگر یہ "صد شرق و غرب" کیا ہوتا ہے! پھر "دوستی" کی جگہ محبت، لطف و عنایت اور تعبیر بیا کرتی لفظ لانا تھا۔

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب ۔۔۔ ہر ایک روئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسین

صحبتِ شب کے یاد میں ڈھلنے سے اس محفلِ رقص و سرود کا ہر ایک "روئے حسین" "حسین تر" کیوں نظر آنے لگا۔

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے ۔۔۔ ان کو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے ۔۔۔ اس سے خوش وقت کاروبار کہاں (ص ۶۴۴)

"درد بیچنے" سے آخر شاعر کی کیا مراد ہے؟ غم و درد کس بازار میں مول لئے جاتے ہیں کہ انہیں بیچ کر گزر اوقات ہو سکتی ہے! چوتھا مصرعہ بھی الجھا ہوا ہے! "حسن کے فقیر" بھی مہمل ترکیب ہے؟

"کہاں جاؤ گے" ــــ کے عنوان، اور اس کے ذیل میں یہ اشعار درج ہیں ـــ

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند ۔۔۔ عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری ۔۔۔ سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی (ص ۶۴۶)

چاند کے غروب ہو جانے کو "لٹ جانا" کون کہتا ہے! عرش کا دیدہ نمناک کیوں ہے! کیا چاند غروب ہوتا ہے تو عرش کو اس سے تکلیف ہوتی ہے؟ پھر "شبستان" کیا چیز ہیں جن کو "تھکے ہارے" کہا گیا ہے! ان تمام بے تکی باتوں کو کسی نہ کسی طرح فرض کر لیجئے، تاویل بھی کر لی جائے لیکن اس مصرعہ ـــ

اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی

کی کیا توجیہ کی جائے گی ؟ تنہائی کا سمٹنا اور بچھنا یہ کہاں کی زبان ہے کیا انداز بیان ہے ! شاعر کہنا کیا چاہتا ہے ! زبان و ادب اور شاعری کی اس صفائی کو کوئی اہلِ ذوق کس طرح گوارا کر سکتا ہے !

"جب تیری سمندر آنکھوں میں"

(گیت)

یہ دھوپ کنارا شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سکھ سوئیں گے گھر در والے
اور راہی اپنی راہ لے گا

(ص ۶۴۹)

جب دھوپ ڈھل کر شام کا جھٹ پٹا ہوتا ہے تو ایسے وقت کو "آج" کیوں نہیں کہہ سکتے ! ہونٹوں کے ساتھ "لپک" فیض صاحب بار بار لائے ہیں، محبوب کے ہونٹوں کا۔ لپکنا "اس میں کتنی ہوسناکی اور بازاری پن پایا جاتا ہے !" کیوں راز کرو "اگر اس میں کتابت کی کوئی غلطی نہیں ہوئی تو یہ بالکل مہمل جملہ ہے ! "کیوں دوش دھرو" یعنی کیوں کسی پر تہمت جوڑو اور الزام دھرو، یہ مفہوم اس نظم میں کوئی معنی نہیں دے رہا ہے ! محبوب کی آنکھوں کو "سمندر کہنا" ذوقِ جمال کی توہین ہے، پھر اس کی سمندر آنکھوں میں شام کا سورج کس طرح ڈوبے گا ! یہ کیا اشاریت ہے، اور کیسی منظر آرائی اور مشاہدات کی عکاسی ہے ! اس طرح کون بولتا ہے "وہ سکھ سو رہا ہے" چین سو رہا ہے یا آرام سو رہا ہے، سکھ کی نیند سو رہا ہے، چین اور آرام سے سو رہا ہے، یہ ہے روزمرہ اور صحیح زبان ! اس نظم کے اختتام پر "راہی" ایک دم کہاں سے آگیا، شام ہونے کے بعد مسافر سستایا کرتے ہیں "اپنی راہ نہیں لیا کرتے" یعنی سفر نہیں کیا کرتے۔

بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں　　(ص ۶۵۲)

۔ وفا کا پیمان سنبھالا" یہ کیا اندازِ بیان ہے! ہر کھا کس چیز کی جا سکتی ہے کہ جس سے ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، اقرار کیا کوئی زمین پہ بنا ہوا نقش ہے، جیسے برسات کے پانی نے دھو دیا اور مٹا دیا ہے" پیغام بجھ گئے ہیں" یہ جدت ہے مگر وجدان اور ذوقِ سلیم کے لئے کس قدر اذیت کوش جدت!

قریب آ اے مہِ شبِ غم! نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

چاند کا بجھنا، پیغام کا بجھنا، نام کا بجھنا۔۔۔ یہ فیض صاحب کی "طرزِ ایجاد" ہے، مگر اہلِ ذوق کے حلقوں میں اسے قبول اور پسندیدگی حاصل نہیں ہو سکتی! ہاں! ترقی پسند اس کا خیر مقدم کریں گے! کہ اُن کے ذوق اور فکر و خیال کا یہی رنگ ہے!

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے (ص ۶۵۴)

سر کو طلب کون کرتے تھے؟ پھر "سرِ رہگزار چلے گئے" سے شاید یہ مراد ہے کہ فٹ پاتھ پر یعنی راستہ کے کنارے کنارے چلے گئے! دوسرا مصرعہ خیال و اظہار کی بری مثال ہے!

نہ سوالِ وصل نہ عرضِ غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

مصرعہ ثانی مکرر ہے، "سبھی اختیار چلے گئے" خاص طور سے محلِ غور ہے۔

نہ گنوائو ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا (ص ۶۵۵)

غزل کا مطلع اور اس قدر بے کیف، بے لطف، کا ناک اور غلط و مبہم! مصرعہ اولیٰ میں "گنوائو" کی تکرار ناگوار و قبیح محسوس ہوتی ہے! شاعر غالباً محبوب سے یہ کہتا ہے کہ میرے پاس جو دل ریزہ ریزہ تھا وہ میں نے کھو دیا، اب تم اُس کی جانب ناوکِ نیم کش پھینک کر اپنے تیر کا کیوں ناحق نقصان کرتے ہو! بات تو سمجھ میں آگئی مگر بات کس بُرے انداز میں کہی گئی ہے، مصرعہ ثانی نرا مہمل ہے! کوئی معمولی درجہ کا شاعر سمجھتے ہیں ابھی ایسے غلط اور مہمل مصرعے نہیں کہہ سکتا، پھر یہ "سنگ" کہاں سے آگئے، شاید فیض صاحب کا محبوب کمان سے ناوک اندازی کے ساتھ غلیل یا گوپھن سے پتھر بھی پھینکتا جاتا ہے! "تن داغ داغ لٹا دیا" اس ٹکڑے نے شعر کو اور زیادہ بے آبرو کر دیا۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

پیشانی پر کلاہ کا کج کرنا تو شان و تمکنت کی علامت ہے مگر کفن کا کنارا اگر پیشانی پر ٹیڑھا کر دیا، اور جھکا دیا گیا تو اس سے کیا مُردہ کی شخصیت کا طمطراق ظاہر ہو سکتا ہے؟ غرورِ عشق" تو درست ہے مگر "غرورِ عشق کا بانکپن" کیا ہوتا ہے! پورا شعر سطحی اور پست ہے!

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے دھوکے دئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے (ص ۶۵۶)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ باد سحر اس انداز میں آج چلی کہ ہر جھونکے پر یہ محسوس ہوا گویا محبوب آرہا ہے! اگر "آمد کے قرینے" اور سحر ان کا پریشان نما "بیان ما فی الضمیر" کے ساتھ اس مذاق کو کیا کیجئے گا!

فیض نمبر میں جن اہل قلم ادیبوں اور نقادوں نے فیض کی شاعری پر مقالے لکھے ہیں اور خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے ان میں بیشتر لکھنے والوں نے فیض صاحب کے اچھے شعروں کے ساتھ ایسے اشعار بھی پیش کئے ہیں، جو کسی صورت بھی انتخاب میں آنے کے قابل نہ تھے اور مدح و ستائش کی بجائے رد و قدح کے مستحق تھے، پروفیسر سلامت اللہ خاں صاحب کے مضمون میں یہ اشعار نظر آتے ہیں۔

جلد یہ سطوت اسباب بھی اٹھ جائے گی یہ گراں باری آداب بھی اٹھ جائے گی (ص ۳۴۸)

"سطوت اسباب" کس بلا کا نام ہے! کس قدر نامانوس ترکیب! پھر اس طرح کون بولتا ہے کہ "گراں باری آداب کو اٹھا دیا"۔ "آداب کی گراں باری اٹھ جائے گی" شعر کو حسین اور اثر انگیز بنانے میں الفاظ اور زبان و بیان کو بہت کچھ دخل ہے، افسوس ہے فیض صاحب اس معاملہ میں بہت زیادہ بے پروا واقع ہوئے ہیں، اور یہ بے پروائی اور بے احتیاطی ان کا مزاج بن گئی ہے!

اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور الجھے ہوئے موہوم سے درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس چاک گریباں کی تلاش (ص [illegible])

"گیت" لانے کی یہاں کوئی تک نہ تھی۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ ہیں ایسے شدید درد سے دو چار ہوں، جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا! نسیم الحروف کی غزل کا شعر ہے۔

دل کی چوٹیں کہیں الفاظ میں ڈھل سکتی ہیں
کتنی پر سوز ہے، اس پر بھی ہے ادھوری ہے فغاں

پھر درد کا دل کے تاریک شگافوں سے نکلنا "اس انداز بیان میں کوئی لطف نہیں! دل ہے، اس کے "تاریک شگاف" ہیں ان سے درد کسی صورت نکل کر باہر نہیں آتا۔ ... اس تصور سے وجدان کو کس قدر وحشت ہوتی ہے۔ "درماں" کو موہوم کہنے کے بعد "الجھا ہوا" کہنا بھی کھٹکتا ہے اور آخری شعر میں "دشت و زنداں" تو بالکل بے معنی استعمال ہوا ہے، چاک گریباں کی ہوس سے "دشت و زنداں" کا کیا تعلق ہے! "دشت" کے بعد شعر کا وزن پورا کرنے کے لئے ایک لفظ کی ضرورت تھی۔ فیض صاحب کے ذہن میں "زنداں" آیا اور اسے رکھ کر شعر جوڑ دیا۔

حیرت ہے شاد عارفی مرحوم کے مضمون میں فیض کے ایسے شعر نظر آتے ہیں۔

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی (ص ۳۶۳)

یہ اشعار تبدیلی کو نہیں پہنچتے ہیں! شاعر اور دل کے درمیان کیا کوئی جھگڑا تھا، جسے صاف کر کے وہ محبوب کے یہاں روانہ ہوا تھا؟ دوسرے مصرعہ "کہنے میں" نے کسی کام کا نہیں رکھا، پھر "بات بدل بدل گئی" ان کے مخاطب ہوں تو ستارے اور اللہ تعالیٰ دونوں کا حال جانتا ہے کہ مجھے اپنے اشعار پیش کرتے ہوئے ندامت سی ہوتی ہے کہ اس میں "خود ستائی" کا ایک پہلو نکلتا ہے۔ مفہوم سمجھانے کے لئے اس جرأت کا خطرہ گوارا کر لیا گیا ہے۔ میں نے آج سے سات سال پہلے ایک غزل کہی تھی، اس کا شعر ہے۔

اُس بزم میں دیکھے تو کوئی میری حیرانی کیا سوچ کے آیا تھا کیا منہ سے نکلتا ہے

اس مقالہ میں فیض کا یہ شعر بھی نظر آیا۔

یا یوں ہی بجھ رہی ہیں شمعیں یا شب ہجر ٹل چلی ہے

"ٹل چلی ہے" نے شعریت کو خاک میں ملا دیا۔

جناب جمیل جالبی فرماتے ہیں۔

"فیض کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت ان کے خیالات کی پختگی، شخصیت کا توازن پن، ذہنی ٹھہراؤ اور شعری اعتدال ہے" (ص ۳۷۵)

"شخصیت کا متوازن پن" کس بلا کا نام ہے؟ "ذہنی ٹھہراؤ" سے آخر کیا مراد ہے؟ "شعری اعتدال" کیا چیز ہے ——— فیض صاحب کے مبہم اور مہمل شعروں کا رنگ اس عبارت میں جھلک رہا ہے۔

"اس کی شاعری براہ راست جذبات سے اپیل نہیں کرتی، بلکہ آہستہ آہستہ دل و دماغ میں اپنا گھر کرتی ہے اور قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہے" (ص ۳۷۶)

کس شاعر کی شاعری ذہن قاری کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی! پھر یہ عجیب بات بیان کی گئی ہے کہ فیض کی شاعری "خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہے" یعنی دوسرے شاعروں کی شاعری چیخنے چلانے پر اکساتی ہے۔!

"اس کی شاعری ایک ایسے چور کی طرح ہے جو رات کی ہمت افزا تاریکی میں دروازے پر بیٹھے ہوئے خونخوار کتے کو گوشت کا ٹکڑا ڈال کر مکان میں داخل ہو جاتا ہے..."

وہ شاعری کیا ہوگی، جو خونخوار کتے کو گوشت کا ٹکڑا ڈال کر مکان میں داخل ہو جائے! یہ مدح ہے یا ذم اور ہجو ملیح ہے! اچھے شعر کے بارے میں سوچنے کا یہ انداز!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

جمیل جالبی کے اس اسلوب تنقید سے متاثر ہو کر آنے والے نقاد یوں لکھا کریں گے ——— غالب کی شاعری ایسی ہے، جیسے کوئی شخص گلی میں کھیلتے ہوئے بچے کے ہاتھ پر ریوڑیوں کا دونا رکھ کر کسی فلیٹ کے زینے پر چڑھ جائے ——— اور مومن کی شاعری ایسی ہے جیسے مرغیوں کے سامنے چارہ ڈال کر کوئی چمپت ہو جائے

"فیض نفسیات کا شاعر ہے" (ص ۳۷۷) کسی ایسے شاعر کا نام بتایئے جو "نفسیات" کا شاعر نہ ہو! پھر فرماتے ہیں۔ ——

"فیض لطیف جذبوں کا شاعر ہے۔"

اور بعض شعراء دبیز [illegible] کے شاعر ہوتے ہیں! واہ میاں جالبی!؟

"... وہ یہ بات ضرور ذہن نشین رکھتے کہ جہاں وہ [illegible] وہاں وہ شاعر بھی ہے، اس لئے اپنے جذبات میں سیاسی، ملکی و قومی تاثرات کو شاعرانہ لہجے میں ڈھالے، تاکہ بیک وقت شعر و سیاست کا بہترین امتزاج اور مکمل اختلاط کا رابطہ استوار رہ سکے" (ص ۳۷۷)

و عبارت میں کس قدر "کچا پن" پایا جاتا ہے! جمیل جالبی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں ــــ

"فیض کے سیاسی اشعار میں شعریت، شاعرانہ بہاؤ، رنگین لہجہ، لطیف و خوشگوار احساسات، دائمی ارتسامیت

و ہم جذبات اور منطقی سلجھاؤ، کامیاب امتزاج کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے ہیں . . ."

شاعرانہ بہاؤ" اور پھر "دائمی ارتسامیت" اس اسلوبِ نگارش کا بھلا کوئی جواب ہے! اتنا کچھ فرمانے کے بعد "منطقی سلجھاؤ" ایک ترکیب ذہن میں آئی وہ بھی جھٹ سے لکھ ڈالی! اُن کے ذوقِ ادب اور شعر فہمی کا یہ عالم ہے کہ فیض صاحب کے علاوہ علی جواد زیدی کے یہ پست اشعار بھی مثال میں پیش کئے ہیں ــــ تقابلی انداز میں!

مفقود و فنا ہو جائیں گے جو ظلم و ستم کے خوگر ہیں
افلاس بچائے گا اُن کو جو نادار وں کے یاور ہیں
مزدوروں نے کی ہے صدیوں سے دنیا بھر میں بیگاری
ہٹ جائے گی یہ فسطائیت شاہنشاہی سرمایہ داری

ایسا ہی زمانہ آتا ہے ایسا بھی زمانہ آئے گا (ص ۳۷۹)

"مفقود" نظم کیا جا سکتا ہے مگر سلیقہ کے ساتھ! "افلاس بچائے گا ان کو" ــــ پھر دوسرا ٹکڑا "جو ناداروں کے یاور ہیں" اس مصرع میں کوئی لطف اور جان نہیں! یہی حال بعد کے دونوں مصرعوں کا ہے! اس کے بعد جمیل جالبی نے فیض کے وہ شعر درج کئے ہیں، جن کو کوئی صاحبِ ذوق نقاد منتخب کر ہی نہیں سکتا۔

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

دوسرے دو شعروں پر ہم تنقید کر چکے ہیں! شعر نقل کرتے ہوئے ان کے دوسرے عیوب سامنے آئے ــــ مثلاً یہ کہ شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو اسی وقت بہتا ہے جب بازار میں مزدور کا گوشت بکتا ہے . . . ! حالانکہ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ ایک طرف مزدور کا گوشت بازار میں فروخت ہوتا ہے، دوسری طرف غریبوں کا لہو سڑکوں پر بہتا ہے!

جمیل جالبی نے اشتراکی شعراء میں فیض کے علاوہ مخدوم محی الدین، علی جواد زیدی، ساحر لدھیانوی اور علی سردار جعفری وغیرہ کا ذکر کیا ہے! اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں ــــ

"کوئی شاعر براہِ راست یا بالواسطہ روس کے نظریات سے متاثر ہو یا نہ ہو یہ خیالات جدید شاعری بناتا ہے کیونکہ یہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت، وقت کی سب سے بڑی پکار اور تاریخی تقاضا ہے۔" (ص ۳۷۹)

نی کتاب "پاکستانی کلچر" میں وہ اسلام کو ایک انقلاب آفریں اور انسانی و ابدی دین اور دستورِ حیات بنا کر پیش کرتے ہیں — آخر یہ تضاد
یں جمیل جالبی نے ساحر لدھیانوی کی نظم "تاج محل" کا یہ بند بھی اپنے مقالہ میں نقل کیا ہے —

میری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا (ص ۳۸۰)

تشہیر بُری شہرت کو کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے حکم سے بعض مجرموں کو گدھے پر بٹھا کر اور اُن کا منہ کالا کر کے گلی کوچوں میں —
پھروں کو عبرت حاصل کرنے کی غرض سے گھمایا جاتا تھا، اسے تشہیر کہتے تھے۔ حیدرآباد دکن میں البتہ یہ لفظ تشہیر ——
ADVERTISEMENT کے معنی میں بولا جاتا ہے، بہرحال ساحر لدھیانوی "تشہیر" کے صحیح معنی نہیں جانتے۔ اُن کا یہ مصرعہ —

تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوگا

قدر کمزور ہے۔ فیض صاحب ہی "سطوتِ اسباب" نظم کیا ہے، جو بے معنی ہے، ہم اس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں! الفاظ کے
خاب و استعمال کے معاملہ میں "ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں" کا قریب قریب ایک ہی جیسا مزاج اور ذوق ہے۔
فیض کی جو اچھی نظمیں ہیں، ان میں بھی خاصے کمزور مصرعے آگئے ہیں اور الفاظ کا استعمال سلیقہ کے ساتھ نہیں ہوا۔ مثلاً
یل جالبی نے اُن کی ایک نظم نقل کی ہے —

ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں
شباب جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
ادائے لغزشِ پا پر قیامتیں قرباں
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے
وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہار لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش (ص ۳۸۷)

س نظم میں یہ مصرعہ —

زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

لوئی تنک نہیں لاجواب ہے! مگر دوسرے مصرعہ میں انھوں نے "نگاہ" کو "چشم" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ خمار سے نگاہ نہیں آنکھیں
سرخ ہو جاتی ہیں۔ جلیل رام پوری کا شعر ہے —

ہوا چل کر جو بادل چھا گئے ہیں مری آنکھوں میں ڈورے آگئے ہیں

چند مصرعوں میں "دوار کی رفاقت میں جو خوش خیال برسائی ہیں" آپ دیکھیں کس قدر تکلف پایا جاتا ہے اس مصرعے میں۔

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے

"بناؤ" کی جگہ "بناوٹ" موزوں تر لفظ تھا فیض صاحب "بناؤ" اور "گھاؤ" کو ... بری طرح شعر میں استعمال کرتے ہیں جن کا تلفظ لطف پر گراں گزرتا ہے! غالب کا شعر ہے ـــ

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

"بناؤ" شعر میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے!

"فیض کے یہاں بھی بہت سی تراکیب، استعارات اور تصویریں ایسی پائی جاتی ہیں جو بالکل نئی اور جدید ہیں! اس قسم کی تراکیب اور تصویروں میں شعریت اپنے سولہ سنگھار کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہے ..... (ص ۳۹۰)

نقاد کے ذوق کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ـــ

"تاریک بیابانِ طلسم، بے خواب کواڑ، بے نام گراں بار ستم، چشم تن آسان، پُر اسرار کڑی دیواریں، آئنہ آثار، شہر گریزپا ..... "

جیسی بے مزہ اور وجدان کو کھٹکنے والی ترکیبوں میں شعریت کا سنگھار نظر آتا ہے! ہم ہر ترکیب پر گفتگو کریں گے تو بات بہت طویل ہو جائے گی مگر جب بات چھڑی ہے تو کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا ـــ "کڑی دیوار" کیا ہوتی ہے؟ غالباً سخت دیوار مراد ہے۔ مگر عام طور پر دیوار یا مکان کو جو سخت اور مضبوط ہو "کڑا" نہیں بولتے پھر "کڑی دیوار" یا "کڑا [illegible]" ... "کڑی دیوار" یہ نئی ترکیب کیا ہوتی؟ "بے نام گراں بار ستم" مہمل ترکیب ہے! "اجنبی خاک" ایسی ترکیب نہیں ہے جس کی تحسین کا سہرا فیض کے سر باندھا جائے! "چشم تن آسان" ایسی ترکیب ہے جو مشکل ہی سے گوارا کریں گا مقبول ہونا تو بڑی بات ہے۔ اختر صاحب کو کون بتائے کہ نئی ترکیبوں کا کیا مزاج اور کیا ماہیت ہوتی ہے؟

میرا ایک شعر ہے ـــ

الجھیں ترے رخسار سے گستاخ نگاہیں
تو اور ہو مجروحِ تماشا مرے آگے

"مجروحِ تماشا" اردو زبان و ادب میں یہ بالکل نئی ترکیب ہے جس کے قبول کرنے میں ذوقِ سلیم ذرہ برابر تامل نہیں کر سکتا ـــ اس شعر کو مثال میں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نئی ترکیبیں اس ڈھنگ و انداز پر بنائی جاتی ہیں۔

ہمیں جاں نے فیض صاحب کے چند مصرعوں میں زبان کی غلطیاں بھی نکالی ہیں۔ کاش وہ ان مقامات سے آنکھ بچا کر جلدی سے نہ گزر جاتے!

"مریض کی داخلیت زندگی کے تجربے سے آزاد و ماورا اپنے خول میں بند ہوتی ہے، زندگی کی وسعتِ بے پایاں سے آنکھیں چرا کر وہ ایک ایسی نفرت کا شکار ہو جاتی ہے جو اندر ہی اندر خود اپنے خالق کا

کمزور بنتی ہے، لیکن فیض کی داخلیت پسندی اردو شاعری کا واضح رویہ ہے جو اُسے شعرا کے ایک خاص گروہ سے منسلک کرتا ہے۔ (ص ۴۲۴)

یہ ہیں انجم اعظمی صاحب ان کے مقالہ کا آغاز ہی اس عبارت سے ہوتا ہے، جو ژولیدگی اور ابہام کا ترقی پسندانہ نمونہ ہے۔ ——
صفحہ ۴۲۷ پر لکھتے ہیں ——

"۔۔۔ فیض اس سطح کا شاعر نہیں ہے، وہ ایک خوب صورت لہجہ کا شاعر ہے، اس کے یہاں ادراک کے بجائے سیاسی شعور کی منزل ہے"

لہجہ اور آواز کی چونکہ کوئی صورت نہیں ہوتی، لہٰذا اُسے خوب رُو اور خوب صورت "نہیں حسین" کہنا چاہیے! اس فکر کا اور اظہارِ بیان کا بھی بھلا کوئی جواب ہے کہ فیض کے "یہاں ادراک کی بجائے "سیاسی شعور کی منزل ہے"! ترقی پسندوں نے تنقید اور شاعری کو کس طرح اجھاڑے میں ڈالا اور اُن کا حلیہ بگاڑا ہے —— کوئی صاحب سابق میجر اسحٰق محمد صاحب ہیں، وہ لکھتے ہیں ——

"۔۔۔۔۔ اسی لئے ایسے کنائے جو کسی یا تشبیہی طور پر مستعمل ہوتے رہتے ہیں جیسے خدا، شیطان، جبرئیل، جنت، دوزخ، آدم و حوا اور اسی قبیل کے دوسرے استعارے آج کی دنیا کے لئے ناقابل فہم ہیں" (ص ۴۴۳)

اب تک یہ منحوس وقت اور سخت گھڑی نہیں آئی ہے کہ خدا، جبرئیل اور جنت و دوزخ کے استعارے دنیا کی سمجھ میں نہ آ سکے ہوں، سابق میجر صاحب کی یہ نافہمی ہے جو وہ ایسا سمجھ رہے ہیں!

احتشام الرحمٰن صاحب نے اپنے مقالہ میں فیض کی ایک نظم (ملاقات) درج فرمائی ہے ——

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں کی آنچ
میں تو یہی شرر ہے (ص ۵۴۲)

"نہرِ خوں" سے آخر شاعر کی کیا مراد ہے؟ پھر وہی نہرِ خوں شاعر کی صدا بھی ہے! اس پر مستزاد یہ کہ اسی نہر کے سائے میں محبوب کی نظر جو "موجِ زر" ہے نور گر بھی ہے! پھر باہوں کا کوئی گلستاں ہے جس میں کوئی غم بھی سلگ رہا ہے! یہ ابہام نہیں اہمال بلکہ یاوہ گوئی ہے!

امجد کنہیائی صاحب لکھتے ہیں ——

"فیض بنیادی طور پر احساسات و تاثرات کے شاعر ہیں" (ص ۵۴۳)

"مغوطی" یا "طبعاً" اور "مزاجاً" کی بجائے ترقی پسند ادیب اور نقاد کچھ دنوں سے "بنیادی" لکھنے لگے ہیں اور یہ غلط رواج پڑ گیا ہے:

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
جلال فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے (ص ۵۴۴)

یہ نعلیہ و مہمل شعر بھی آجکنیانی صاحب نے اپنے مقالے میں نقل فرما کر اپنی بدمذاقی کا ثبوت دیا ہے۔

"وہ ان سب حالات پر غور کرتے ہیں، ان سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن ضبطِ محبت شرطِ اولین محبت ہے، وہ جھنجلاہٹ اور چیخ و پکار میں یکسر مصروف نہیں ہوتے، بلکہ اسے ایک سنجیدہ اور ملائم انداز میں ادا کرتے ہیں، اُن کے اسلوب میں ٹھہراؤ کے ساتھ متانت بھی ہوتی ہے . . ." (ص ۵۵۲)

یہ سا آحرالالہ آبادی کے مقالے کی عبارت کا اقتباس ہے، جس میں کس قدر الجھاؤ پایا جاتا ہے، جو لوگ خود اس قسم کی الجھی ہوئی کاوک عبارتیں لکھتے ہیں اور اپنے مفہوم کو اچھے پیرایہ میں ظاہر کرنے کا سلیقہ نہیں رکھتے، انہیں کسی شاعر کے کلام میں شعلیگی، ابہام اور اہمال کا کیا احساس ہو سکتا ہے، یہ تو ان کا مرضِ نگود میں بچے امتیاز نہیں کر سکتا۔

محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، لیکن ہمارے اس دور کے بیشتر اہلِ قلم نقاد ہیں مگر شاعر نہیں ہیں، اس لئے نہ تو شعر کے اصل جوہر اُن کو نظر آتے ہیں اور نہ شعر کے عیوب پر اُن کی نگاہ جاتی ہے، اُن کا قلم انگریزی لٹریچر کے مطالعہ کا سہارا لے کر چلتا ہے، اس لئے ان کے مضامین میں بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مضمون نہیں لکھ رہے ہیں ترجمہ فرما رہے ہیں! مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کی تنقید پڑھتے ہوئے طبیعت کو کس قدر شگفتگی اور فرحت و انبساط محسوس ہوتا ہے، شعر کا صحیح تجزیہ، محاسن کی دل نشین تشریح، معائب پر واقعی گرفت! مگر ان جدید تنقید نگاروں کے مضامین میں ذوق و وجدان کو کہیں حیرانی ملتی ہے، کسی جگہ طبیعت بیچارگی محسوس کرتی ہے اور کہیں دماغ تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

فیض نمبر کے کتنے ہی لکھنے والوں کی شعر فہمی اور ذوقِ شعری کا یہ رنگ ہے کہ انہوں نے فیض کے سطحی اور مہمل اشعار تک کو نمونہ بنا کر پیش کیا ہے اُن جوہریوں کو کیا کہئے، جن کی نگاہ لعل و گہر اور خزف ریزوں میں تمیز نہ کر سکے، نئی نسل اس قسم کے مضامین اور شاعری کو پڑھ کر شعریت اور ادبیت سے عاری ہوتی چلی جا رہی ہے اور بیان و زبان اور اظہار کے نقص کو لوگ خوبی سمجھنے لگے ہیں، اس طرح فکر و نظر کے زاویے ٹیڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔

فیض کی ایک پوری نظم کا ہم ذیل میں تجزیہ کرتے ہیں:—

"اے روشنیوں کے شہر"

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی بڑھتی، اُٹھتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

"دھوپ کے سوکھنے" سے آخر شاعر کی کیا مراد ہے؟ کیا دھوپ بھیگا بھی کرتی ہیں؟ پھر دھوپ کا ذکر کرتے کرتے یہ "تنہائی" کہاں سے آگئی جس کا زہر دیوار کو چاٹ رہا ہے! اول تو تنہائی کا زہر ہی محل نظر ہے پھر اُس کا دیواروں کو چاٹنا اور زیادہ کھٹکتا ہے۔

تیسرے مصرعہ کے آخری ٹکڑے ـــــ گرتی رہتی ہے ـــــ میں اُس لہجہ اور آہنگ نے دم توڑ دیا، جو دو بہر "اُداس ہر" میں پایا جاتا ہے
سدا کی جمع "سداؤں" اردو میں نہیں آتی، ہاں! اردو نظم کے لئے یوں بولتے ہیں ـــــ اُس عورت کے سدا ہو رہے ہیں ـــــ! "سداؤں" فلم کی جدت نازک ہے! پھر سداؤں کی گدلی لہر کیا ہوتی ہے! مہمل ترکیب! کیا سدا کی لہر دکھائی دیتی ہے جو گدلی ہو کر کہر کی مانند بے رونق ہو گئی ہے

بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت سے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے، ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

نہ جانے "روشنیوں کے شہر" سے کس رمز و علامت کا اظہار مقصود ہے! خیر! پھر اُس روشنیوں کے شہر سے اس طرح خطاب کیا جا رہا ہے ـــ

کون کہے کس سمت سے ہے تیری روشنیوں کی راہ

شاعر نہ جانے کیا کہنا چاہتا ہے یہ کہ اُس شہر کی روشنیوں کو اس کہر آلود فضا میں آنے کی راہ نہیں ملتی، یا اس فضا کے رہنے والوں اور ہجر و تنہائی کے مارے ہوؤں کو روشنیوں کے شہر میں پہنچنے کی سبیل نظر نہیں آتی!

"شوق کی ماند سپاہ" ـــــ نری مہمل ترکیب! ماندہ یا تھکی ماندی سپاہ کہنا چاہتے تھے یہ "ماند سپاہ" کیا ہوتی ہے! ـــ نور اللغات ہمارے سامنے ہے اُس میں "ماند" کے حسبِ ذیل معنی لکھے ہیں:ـ

"(مونث) گوبر کا ڈھیر سرگین، جیسے اُپلوں کی طرح جلاتے ہیں ـ۲ـ غار، بھٹ، کھوہ ۳ـ صفت وہ چیز جس کی آب و تاب جاتی رہی ہو۔"

بجتے ہیں سونے روپے کے پھلے حضور میں
ہے جس کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

نظم کا آخری بند ہے ـــ

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی ان سب سے کہہ دو
آج کی شب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

نظم کے آغاز میں "تنہائی کا زہر" دلِ اُداس کو چاٹ رہا تھا، آخری بند میں "شب خوں" نہ جانے کہاں سے آگیا؟ آخر یہ "شب خوں" کون مار رہا ہے! روشنی، تاریکی! پھر یہ کہنا کہ ارمانوں کی رو، شب خوں سے منہ پھیر جائے...! کس قدر پھس پھسا اندازِ بیان ہے! پھر اس بند کے دوسرے مصرعہ میں "لیلائیں" کہاں سے ٹپک پڑیں! اس نظم کا آخری مصرعہ بس اچھا ہے، باقی تمام نظم بے روح، بے جان ہے اور بے لطف ہے خیال، اظہار، لفظوں

ہر قسم کا سوتی

اور

اونی کپڑا

ورا اور دُھلا لٹھا

اور

ر قسم کا

اگہ

ھاگہ تیار رہتا

وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

منگھا پیر روڈ کراچی

باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کا تیار شدہ کپڑا

ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی

آپ کا قومی فریضہ ھے

ن اور ہندوستان کی اُردو داں نئی نسل اس سے متاثر اور مرعوب ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ فیض کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔

انگریزی دورِ حکومت میں سیاسی آزادی کی غیر مسلح جنگ میں ہزاروں کارکنوں، لیڈروں، عالموں، مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں نے قید و بند
ہیں جھیلی ہیں، اُردو شاعروں میں صرف احمق پھپھوندوی کو یہ عزت حاصل ہوئی کہ انگریزی سامراج پر اپنی شاعری میں انہوں نے جو طنز اور چوٹیں کی تھیں
پاداش میں انہیں دھر لیا گیا اور کئی سال کی قید انہیں کاٹنی پڑی۔ فیض صاحب کو پاکستان میں کسی اصلاحی یا انقلابی نظم یا مضمون لکھنے کی
فتار نہیں کیا گیا، وہ راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ تھے اور اس سلسلے میں انہیں چار سال جیل خانہ میں رہنا پڑا، یہ سازش اگر خدا نخواستہ کامیاب
تو شہید ملت لیاقت علی خاں مرحوم یا تو گرفتار ہو جاتے یا قتل کر دیے جاتے اور اس کے بعد اس ملک میں جو انقلاب آتا وہ نہ پوچھیے کہ کتنا خوفناک
ہوتا! مشہور کمیونسٹ لیڈر سجاد ظہیر بھی اس سازش میں ملوث تھے! اس اعتبار سے فیض صاحب کی یہ قید و بند کی زندگی کمیونسٹوں کی نگاہ
ی "کارنامہ" ہو تو ہو مگر ہر پاکستانی محبِ وطن کا ضمیر اس میں خلش اور بیزاری محسوس کرے گا اور . . . . . !

فیض صاحب کے جو اشعار تحسین و ستائش کے مستحق ہیں اُن کا انتخاب ہم اوپر دے چکے ہیں، ان میں سے بعض اشعار ہم نے کئی بار لطف لے کر
، مگر مشہور اشتراکی شاعر ظہیر کاشمیری کے اس شعر،

یہ جانتے ہیں کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

سے ذوق و وجدان کو جتنا متاثر کیا ہے، فیض کے کسی شعر نے اتنا متاثر نہیں کیا۔

کراچی میں بعض ایسے شاعروں کو ہم جانتے ہیں، جن کو شہرت کے مواقع میسر نہیں آئے اور جن کے منتخب اشعار، ہم فیض صاحب کے اچھے شعروں کے
ہیں بلا دریغ پیش کر سکتے ہیں، مثلاً وفا راجپوری کا یہ شعر ـــ

جاؤ تو روکتے نہیں، آؤ تو فرشِ راہ
ہم بے غرض ہیں، سایۂ دیوار کی طرح

ن سیہمدی کی غزل کا یہ مطلع ـــ

فریب وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے ـــ وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اُجالا ہے

فیض کی غزلوں اور نظموں کا جو خاص رنگ اور آہنگ ہے اُسی انداز پر ہم نے یہ مضمون لکھتے ہوئے ایک ہی مختصر سی نشست میں فی البدیہہ مندرجہ
اشعار موزوں کئے ہیں۔

آج زنداں کے در و بام پہ پھیلی تھی سحر
لیکن اس طرح کہ جیسے کسی مدفون کی چال
رونقِ درسے جو چھن کر تری یاد آتی ہے
آج بکھرایا ہے آنکھوں نے عبیر اور گلال

وہ ظلم و ستم، جور و جفا کرتے رہیں گے ـــ ہم فرضِ محبت کو ادا کرتے رہیں گے
یہ لالہ و گل ہیں وہ شفق ہے یہ مرا دل ـــ کس کس کو وہ رنگین قبا کرتے رہیں گے

اس وفا کے ہم لوگ خداوند جو ٹھیرے　　ہم پہ درشتی اور ستم کرتے رہیں گے

اہلِ دل کے کارنامے مٹ نہیں سکتے کبھی　　ان کو ہونا ہے فروزاں ماہ و انجم کی طرح
باغبانوں کے بگڑتے تیوروں کو دیکھ کر　　ہیں ابھی پھول خاموش کلیوں کے تکلم کی طرح
روزِ فردا کی ابھی سے پڑھ رہا ہوں سرخیاں　　صبح ابھرے گی سمندر کے تلاطم کی طرح

گنگناتی ہوئی آہوں کہ مجھے کہنا ہے　　جھلملاتی ہوئی راہوں کہ مجھے کہنا ہے
کیف برسائی نگاہوں کہ مجھے کہنا ہے　　پارسائی کے گناہوں کہ مجھے کہنا ہے
ایک پیغام کہ جس کا کوئی عنوان نہیں، نام نہیں، کام نہیں
یہی پیغام ہے خنجر یہی پیغام صلیب　　یہی مقتل یہی گلزار یہی کوئے حبیب
آرزوؤں کا پیمبر وہ تمنا کا نقیب　　غم کا پالا ہوا آغوشِ محبت کا ربیب
ایک پیغام جہاں صبح نہیں، شام نہیں، بادہ نہیں، جام نہیں

درد کا چاند بجھا جسم کا ستارہ ٹوٹا
کتنی بے رنگ سی ہے رات کی زرتار جھلک
نرمیٔ دستِ حنا اپنی جگہ خوب مگر کیا کیجیے
وہی سینہ میں جلن ہے وہی سانسوں میں گھٹن
میرے محبوب ابھی اور ذرا دور رہو، دور رہو، دور رہو

دہر میں اور بھی غم ہیں غمِ جاناں کے سوا
الجھنیں اور بھی ہیں زلفِ پریشاں کے سوا
سنگریزے بھی ہیں یاں لعلِ بدخشاں کے سوا
اور خطرے بھی ہیں رسوائی داماں کے سوا
میرے محبوب ابھی اور ذرا دور رہو، دور رہو، دور رہو

یہ شام اُس شاخ کا ثمر ہے
جو مجھ سے تجھ سے بلند تر ہے
بلند تر ہے کہ اُس کے سائے
میں کتنی دھوپوں کے آبگینے

بدل گئے ہیں، پگھل گئے ہیں
افق سے آگے نکل گئے ہیں

یہ شام اُس شاخ کا ثمر ہے
جو مجھ سے تجھ سے بلند تر ہے

فلک ہمیں کیا پیام دے گا
زمیں ہی سب کچھ ہے تیرے پیارو
یہیں کے ہر نقش کو اُبھارو

یہ دھوپ چھاؤں یہ نور و ظلمت
ابھی فسانہ، ابھی حقیقت

اسی کو کرنا ہے جاودانی
کہ زندگی موڑ پر کھڑی ہے
جنوں کو آواز دے رہی ہے

ں)

تمام حسن کو حسنِ خیال کہتے ہیں — یہ بدر ہے مگر اس کو ہلال کہتے ہیں
عجیب شہر ہے شہرِ ستم براں کہ جہاں — نگاہِ شوق کو دستِ سوال کہتے ہیں
وہ آئے طرق و سلاسل کے لے کے گلدستے — جو قتل گاہ کو دشتِ غزال کہتے ہیں
بنامِ یادِ نگاراں برنگِ غنچہ و گل — خموش رہتے ہیں اور اپنا حال کہتے ہیں

یہ واعظانِ قبا پوش و مفتیانِ کرام
عروجِ مہر کو وقتِ زوال کہتے ہیں

ہیں کہ اُردو کے ادب و صحافت پر ترقی پسندوں اور نیم ترقی پسندوں کو بہت کچھ تسلط و غلبہ حاصل ہے ہماری اس تنقید پر نہ جانے کد
نکن آلودہ ہو جائیں گی۔ مگر ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے عواقب سے بے پروا ہو کر ہمیشہ حق گوئی کا فرض ادا کیا ہے اور اس تنقید کی صورت
س فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں!